جلد 45 • شمارہ 05 • مئی 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس: 35802551 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

لیجیے... مئی کا گرما گرم شمارہ حاضر ہے۔ پچھلے دنوں اٹلی کے نواحی سمندر میں ایک کشتی سیکڑوں غیر قانونی تارکینِ وطن سمیت غرقاب ہوئی... نیپال میں ہولناک زلزلے نے عالمی ورثے میں شمار ہونے والی عمارتوں سمیت پوری بستیوں کو ملبے کے ڈھیر میں بدل دیا... ہلاکتوں کا اندازہ پانچ ہزار سے کہیں اوپر ہے۔ اصل صورتِ حال امدادی کارروائیاں مکمل ہونے کے بعد ہی سامنے آسکے گی۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی برفانی وادیوں میں اس زلزلے نے کتنے کوہ پیما دفن کیے، وہ تاحال نامعلوم ہے۔ اسی تسلسل میں پختون خواہ میں طوفانی بگولوں اور برسات نے بہت سی انسانی جانیں لے لیں۔ ہمارا یہ چلن خوب ہے کہ ہر ہندوناک حادثے پر اقتدار سے چمٹے ہوئے لیڈر نوٹس لیتے ہیں، بیانات جاری کرتے ہیں اور پھر اگلی کسی آفت تک مزے کی نیند سو جاتے ہیں... حتیٰ کہ کوئی نئی مصیبت یا آفت پرانے حادثوں کو بھلا دیتی ہے۔ بڑی تباہیوں کے سدباب اور ان سے نمٹنے کے لیے این ڈی ایم اے بنائی گئی ہے... جانے وہ کیا کررہی ہے... ہم مصائب کا انتظار کیوں کرتے ہیں، ان سے بچنے یا ان سے ہونے والے نقصانات کو کم ترین رکھنے کی منصوبہ بندی کیوں نہیں کرتے۔ کیا اس قوم کے مقدر میں یہی لکھ دیا گیا ہے کہ وہ قدرتی اور انسانوں کی لائی ہوئی مصیبتوں کو جھیلتے رہیں اور حکمراں اپنے عشرت کدوں میں چین کی بنسریاں بجاتے رہیں... یہ کب تک ہوتا رہے گا۔ لوٹ کھسوٹ کو اپنا موروثی حق سمجھنے والے مکافاتِ عمل کے اصول کو کب سمجھیں گے۔ جب گرفت کا لمحہ آئے گا تو لوٹ کا مال اور مسندوں کا گھمنڈ کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ کام آنے والے اعمال وہی ہوں گے جو اس بے زبان رعایا کی فلاح اور بہبود کے لیے کیے جائیں۔ دھیرے دھیرے وہ وقت قریب آتا جارہا ہے جب بے زبان بھی بولنے پر مجبور ہوجائیں گے اور وہ بدقسمت رہنماؤں کے لیے کوئی بھلا وقت نہیں ہوگا۔ اس وقت کے انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے لیے چلتے ہیں اپنی شوخ و شنگ محفل میں جہاں چٹکی کے ساتھ کڑواہٹ بھی ہے۔

جھنگ سٹی سے محمد مرتضیٰ احتشام کی سخت برہمی ’’اس دفعہ خوش قسمتی سے اپریل کا شمارہ 4 تاریخ کو ہی مل گیا۔ جب ڈائجسٹ پر نظر پڑی تو دل کو ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔ ٹائٹل حسینہ کو دیکھتے ہی بے اختیار دل کو تھام لیا۔ گلابی ہونٹ، موٹی موٹی آنکھیں اور شرارتی زلفوں کی ایک حسین لٹ جو آنکھوں کے سامنے آرہی تھی، دل موہ کے لے گئی۔ ساتھ ہی ایک پریشان حال انسان کو دیکھا جو مسلسل بچے سے ہاتھ ہٹا کر سر پر رکھ کے نہ جانے کس پریشانی میں مبتلا تھا۔ نیچے ایک بزرگ آنکھوں پر چشمہ سجائے اپنے ہی حال کی بے بسی پر حکمت زدہ نظر آئے۔ اس کے بعد محفلِ خطوط کی جانب قدم بڑھائے اور اداریے کو غور سے پڑھا۔ پاکستان کی کرکٹ میں ناکامیوں کی داستان الگ ہی ہے اور سب بہ خوبی اسے جانتے ہیں۔ تفرقہ بازی میں الجھی قوم کا درد سینے میں لیے خطوط کا جائزہ لیا۔ لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کا اچھا تبصرہ تھا۔ سید اکبر شاہ ہم بھی آپ کے شہر اوگی آچکے ہیں بلکہ اس سے آگے ایک علاقہ ہے کروڑ، وہاں تک۔ آپ کا مزاحیہ انداز دل کو بہت بھایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح ہنستا اور مسکراتا رکھے، آمین۔ اوکاڑہ سے شوکت شہریار آپ کے تو کیا ہی کہنے۔ آپ سے ملاقات کا دل کرتا ہے کبھی کبھی۔ طاہرہ گلزار پشاور سے اپنی آن بان سے حاضر ہوگئیں۔ بزم کو میلہ لگ سا اسٹارٹ تھا آپ کے خط کا، پڑھ کے اچھا لگا۔ احسان سحر، بلقیس خان، ادریس احمد خان کے تبصرے پڑھے۔ بلقیس خان کا تبصرہ پڑھ کر دل میں دکھ کی لہر اٹھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے دکھ اور درد کو کم کرے، آمین۔ نادر سیال، کنڈیاں بھی آچکے ہیں اور بڑا مہمان نواز پایا ہے آپ کے علاقے کو۔ زویا اعجاز، ور پری زے خان کا بہت بہت شکریہ۔ انہوں نے میری آمد کو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ ہمایوں سعید مرشد کیوں محسوس ہو؟ آپ کو اپنا آپ۔ اب ہو جائے کہانیوں پر تبصرہ جیسا کہ سب کو انگارے کہانی کا انتظار تھا لیکن انگارے کہانی کی جگہ محی الدین نواب کی مسیحا کو پہلے صفحات پر موجود پایا۔ سیدھی اور سچی بات ہے کہ مسیحا کہانی بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ ایسا لگا جیسے دیوتا کو دوبارہ شروع کیا گیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ آج تک نہیں پڑھا کہ آسمانی فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لیے مسلمانوں کو قتل کریں اور پھر ایک لڑکی کی محبت میں جنگ ہوجانا بہت مضحکہ خیز بات لگی۔ کیا ادارہ رائٹرز سے محروم ہوگیا ہے یا ان کے پاس نئے موضوع پر لکھنے کے لیے کچھ نہیں۔ عشق پاک کہانی میں انتہائی ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاتل کو گرفتار کردیا گیا۔ خونی موتی، قتل کی تلاش نے ایک بکھری ہوئی فیملی کو اکٹھا کردیا اور شگفتہ نے اپنی بہن کے قاتل کو تلاش کرکے اس کی روح کو مطمئن کیا۔ تڑپتے پردے، جمیل کے کردار کو بہت اچھا اور خوش مزاج پایا۔ ہمیشہ کی طرح جمیل نے بھی اس مسئلے کو حل کیا اور کہانی کے آخر میں جمیل کی شادی کی خوش خبری بھی سنائی گئی۔ آوارہ گرد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بہت خوب صورت انداز میں کہانی کو آگے سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ کمیل دادا نے بڑی ہمت و بہادری اور حکمتِ عملی سے تمثیل شاہ کو بازیاب کروایا۔ کہانی کا نچوڑ بالکل مناسب انداز میں جارہا ہے۔ زندہ لاش نے کچھ خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ سچا جھوٹ، جمال دستی نے معاشرتی رویوں کی بالکل صحیح عکاسی کی اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ آج بھی پولیس میں کچھ افراد ڈیوٹی کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ تلاش، محبت اور حسد کے ملے جلے جذبات پر مبنی کہانی۔ آخر کار عائزہ کے کزن نے پوری محنت اور جانفشانی سے عائزہ کے قاتل کو تلاش کرلیا جو اس کے کمرے میں ہی رہتی تھی۔ حق زندگی، مریم کے خان نے ایک مجبور اور عام عورت جو کچھ کرنے کے قابل نہ تھی، اس کے حالاتِ زندگی بیان کیے مگر ایک شریف اور باعزت عورت جب اپنی عزت بچانے کی ٹھان لے تو وہ بڑے بڑے کام کرجاتی ہے۔ انتہائی حساس موضوع پر بہترین کہانی لکھی گئی۔ منظر امام کی کہانی بوجھ، مجھے لگتا ہے پہلے بھی شائع ہوچکی ہے۔

ناٹک کہانی بس ایک کہانی ہی تھی۔ سودا، کہانی میں کچھ خاص کیا کوئی عام بات بھی نظر نہ آئی۔ حسد، میمونہ عزیز نے تحریر کی۔ کہانی بس گزارہ تھی۔ دہری شخصیت بھی کچھ خاص اثر نہ جما سکی۔ سرورق کے دونوں رنگ امید پر پورے نہ اترے بلکہ بوریت زیادہ ہوئی۔ آخر میں گزارش ہے کہ ادارہ کو چاہیے کہ اپنے قارئین کو جھوٹے وعدوں کے دلاسے نہ دیا کرے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ آپ انگارے کہانی کا ذکر ہی نہ کرتے۔'' (اور یہ بھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ انگارے کیوں شائع نہ ہوسکی، یہ کہانی پھر سہی۔ آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اس کے لیے ہم ازحد شرمندہ ہیں اور معذرت کے خواستگار بھی)

کراچی سے پری زے خان کے انکشاف ''ٹائٹل تو ذاکر جی نے لگتا ہے بہت عجلت میں بنا ڈالا ہو۔ موٹے نقوش والی لڑکی شاید خود بھی اپنا کلوز اپ لیے جانے پر حیران و پریشان تھی اور سائز کا ولن پستول ہاتھ میں پکڑے دم بخود سا اس کے جاسوسی کے ٹائٹل پر ہونے کی وجہ سوچ رہا تھا جو کہ یقیناً میری ہی طرح اسے بھی کچھ نہیں آئی ہوگی۔ اسی حیرانی کے ساتھ محفل میں آئی تو عبدالجبار رومی کو پہلے نمبر پر پایا۔ سید اکبر شاہ، بہت ہمدرد قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں آپ۔ شوکت شہریار! تھینکس محفل میں ویلکم کرنے کے لیے اور ایسے خوش گوار جھٹکے میں اکثر دیتی رہتی ہوں کوئی نئی بات نہیں ہے میرے لیے۔ طاہرہ گلزار! آپ کے شکریے کا شکریہ۔ نور ریال! میں بے نظیر کی سیکریٹری ہوں یا دوہا کی، میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کوئی بھلا نہیں ہونے والا پھر بھی آپ کے ذوق و شوق اور تجسس سے پر اس سوال کی تک میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ سیف اللہ خان! میرا نام دیکھ کر حیرت کیوں ہوئی۔ کیا پری زے کا یہاں آنا منع ہے۔ صفدر معاویہ! کیا بات ہے آپ کی، تبصرہ خوب تھا۔ شمر یہ زویا اعجاز، بلقیس خان کا خط پڑھ کر تھی ہی دیر سکتے کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ بلقیس سلام ہے آپ کی ہمت اور صبر کو۔ خدا آپ کی مشکلیں آسان فرمائے۔ (آمین) ابتدائی صفحات پر نواب انکل کو پڑھا تفصیلی تبصرہ کرنے سے اس لیے قاصر ہوں کہ جب تک آخری قسط بھی نہ پڑھ لوں تبصرہ کرنے کا مزہ نہیں آئے گا۔ آوارہ گرد میں شہریار کے حالات چھوڑ کر ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہ تحریر کا تقاضا ہی سہی مگر مجھے شفیق شاہ کی داستان میں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے پلیز ڈاکٹر صاحب اب ماضی سے نکل آئیں اور ذرا آگے کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالیں۔ مختصر تحریروں میں جمال دتی کی اتفاقات سے بھرپور کہانی متاثر کرنے میں قطعی ناکام رہی۔ کاشف زبیر جلیل کے کارنامے کے ساتھ موجود تھے جو اس بار جلیل کا کم اور اس کے ابا جی کا زیادہ تھا۔ اب اس کے ابا مرحوم کے معاشقے کا انکشاف اس کی اماں کے لیے کتنا بھی پریشان کن ہو ہمارے لیے دلچسپی کا سامان بنا اور آخر میں تو پیارا معاملہ ہی الٹا ہوگیا۔ محمد فاروق انجم کی تحریر اچھی تھی۔ اپنی عزت اور حدود و قیود کا خیال نہ رکھنے والی لڑکیوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر۔ زندہ لاش میں بیکمن نے ریمنڈ کی قربانی کو رائگاں نہیں جانے دیا۔ ناٹک پڑھتے ہوئے پہلے تو الجھن کا شکار رہی اور اینڈ پڑھنے کے بعد بے اختیار شیرل میلوفی کو داد دینے پر مجبور ہوگئی جس نے کمال ہوشیاری سے رائے کو صاف بچا لیا۔ میری نذر رانی کی سودا سب سے بیسٹ تھی۔ سرورق کا دوسرا رنگ تو سوسو رہا۔ پھلا رنگ پڑھتے ہوئے چار منٹ سے بھائیوں اور ان کی اکلوتی بہن کی کہانی نے ذہن میں لمحہ بھر کی الجھن پیدا کی اور پھر ویلکم ٹو می کی اسٹوری یاد آگئی۔ ہوسکتا ہے یہ صرف میرا خیال ہو مگر بہرحال مجھے کافی مماثلت لگی اس اسٹوری میں اس فلم کی۔''

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی دلچسپ خبریں ''یہ نکتہ چینی نیوز ہے۔ جاسوسی کا نیا شمارہ یعنی اپریل 2015 منظر عام پر آگیا ہے اور تقریباً ہر بک اسٹال پر دستیاب ہے۔ اس کے ٹائٹل پر ایک لڑکی کا تربوز جتنا منہ اپنی تمام تر کرختگی کے ساتھ موجود ہے اور شاید ہم نے محترمہ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سخت بول دیا ہے اس لیے تو اس کا گن بردار بھائی ہماری طرف ہی بڑھ رہا ہے۔ چلیں اس معاملے کو پھر کسی فارغ وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ایوانِ نکتہ چینی کے چیئرمین کے طور پر لاہور سے تعلق رکھنے والے عبدالجبار رومی انصاری کو مقرر کیا گیا ہے جبکہ ڈپٹی چیئرمین کا عہدہ جام پور کے رہائشی عثمان راشد کو دیا گیا۔ واہ کینٹ سے تعلق رکھنے والی بلقیس خان نے نکتہ چینی نیوز کے اینکر اور نیوز کاسٹر پر براہ راست تنقید کی اور بے جا تنقید کا نشانہ بنایا۔ ساتھ ہی اپنی دکھ بھری کہانی بھی سنا ڈالی۔ ان کے دکھ بانٹتے ہوئے ہم نے مزید جوابی کارروائی سے پرہیز لازم سمجھا۔ ساتھ ہی دعا ہے کہ اللہ ان کے بھائیوں کو جنت الفردوس اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ اس شمارے کی ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ ہمایوں سعید کی محفل میں واپسی ہوئی ہے۔ ان کو میری اور نکتہ چینی نیوز کی ٹیم کی جانب سے ویلکم بیک۔ اور ساتھ ہی التجا کی کہ گاہے بگاہے محفل کا حصہ بنتے رہیں۔ یہاں ایک افسوس ناک خبر ہے کہ جاسوسی شمارے کے ٹائٹل ڈیزائنر جناب ذاکر حسین صاحب کے صاحب زادے محمد زاہد لاہور میں رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ اللہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ورثا کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آوارہ گرد میں شفیق شاہ کا سراغ مل گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق بیگم حبہ کے دستِ راست نے اپنی کارروائیاں تیز کرتے ہوئے نہ صرف شفیق شاہ کا سراغ لگایا بلکہ اس کو بازیاب کرانے کے ساتھ ساتھ دشمن کو بھاری جانی نقصان سے دوچار کیا۔ تبدیلی آچکی ہے۔ تبدیلی آچکی ہے۔ کی سچائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ممتاز مصنف سلیم فاروقی نے بھی اس بار انداز تحریر تبدیل کیا اور ہیرو کو سچائی و ایمان داری کا پیکر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اسٹوری میں ہیروئن بھی نہیں تھی۔ کوئی ہی بھی نہیں۔ غلام قادر صاحب نے جب دو پیار کرنے والوں کے درمیان فاصلے مٹاتے ہوئے ان کو ملایا تو ہمیں افسوس ہوا کہ مرکزی کرداروں کی شادی کی نوید سننے کی خاطر ہم نے ایک گھنٹا صرف کیا۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی بڑبڑاہٹ ''چشمہ لگائے ادھیڑ عمر شخص پروفیسر کی طرح ہی لگ رہا تھا مگر چہرے کے خدوخال بتا رہے تھے معاشرتی ادب و آداب سے عاری ہے یہ۔ اور پستول پکڑے مرد بھی اناڑی ہی لگ رہا تھا جبکہ اس سے بھی پیچھے برآمدے میں نظر دوڑائیں تو اچھل سا یہ بھی کسی خوف کی علامت لگ رہا تھا۔ خوبرو صنفِ نازک کا چہرہ تمام تر رعنائیاں لیے ہوئے تھا اور جاذبِ نظر آنے والی دوشیزہ بھی آنکھوں میں نمی لیے معاشرے کے منفی پہلو پر نوحہ کناں تھی۔ نکتہ چینی میں عثمان راشد، انجم فاروق، محسن علی اور ورقا آکاش مختصر مگر اچھے تبصرے لے کے حاضر ہونے اور سید اکبر شاہ جی یہاں تو ابھی کچھ میسر ہے مگر دیکھیں کب کس کی سے میں کتنا اثر ہے۔ شوکت شہریار اور احسان سحر کی برسات زدہ باتیں بھی اچھی لگیں۔ کہانیوں کا آغاز

قل ایکشن سیریز آوارہ گرد سے کیا، بیگم صاحبہ میں وعدہ کرتا ہوں لئیق شاہ کو جان کی بازی لگا کے حاصل کروں گا۔ اور پھر سہیل دیوانے اپنی ذہانت کے بل پر آتشیں اسلحے کے سائے میں لئیق شاہ کو رہا کروا کے زہرہ بانو کے پاس پہنچا دیا۔ اب زہرہ بانو کس امتحان میں پڑنے والی ہے؟ دیکھیں گے۔ کہاں وہ خوب صورت نازک اندام باتمیز لڑکی اور کہاں یہ بے ڈھنگے جاہل بھائی۔ آخران میں بھی تناؤ ختم ہوا اور فاصلے سمٹ کر ذیشان اور لائبہ کی شادی پر منتج ہوئے۔ غلام قادر کی فاصلے، خاموش محبت کی صورت اچھی کاوش تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی ادھوری خبر بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ کاشف زبیر کی گڑے مردے مسکان دے گئی۔ مجی الدین نواب کی مسیحا انوکھے رنگ کی تحریر ثابت ہوئی۔ مریم کے خان کی حقِ زندگی زبردست رہی۔ اب اس میں پھر کوئی بور کیوں ہو۔ لاش حرکت کر رہی تھی جیسے مردہ زندہ ہو رہا ہو۔ سلیم انور کی مختصر زندہ لاش بھی اچھی رہی۔ جمال دستی کی سچا جھوٹ اس دفعہ نمبر ون کہانی ٹھہری۔ منظر امام نے بوجھ میں اچھی چوٹ کی ہے سیاست دانوں کے حوالے سے اور آپ سب کیا سوچ رہے ہو اپنی زندگی کے حوالے سے۔''

بشیر احمد خان کی اٹک سے دعا'' ماہ اپریل کے جاسوسی ڈائجسٹ پر نظر پڑی تو دیکھا کہ اس دفعہ طبع زاد کہانیاں زیادہ تھیں اس لیے خرید لیا۔ کہانیاں بہت دلچسپ اور پُرلطف تھیں مگر ایسا لگتا ہے کہ منظر امام صاحب کی کہانی بوجھ پہلے بھی کہیں پڑھی تھی۔ براہ کرم طبع شدہ کہانیاں دوبارہ نہ شائع کریں، اچھا نہیں لگتا۔ آخر میں دعا ہے کہ خدا آپ کو آسندہ بھی طبع زاد کہانیاں زیادہ شائع کرنے کی توفیق دے آمین۔''

مظفر آباد، آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی داستان'' اپریل کا جاسوسی خلافِ توقع اس بار بہت جلد مل گیا۔ چند پریشانیوں کی وجہ سے کافی عرصہ محفل سے دور رہا۔ انسان دکھوں کا چلتا پھرتا نمونہ ہے۔ چند سانحات بہت بڑے ہوتے ہیں۔ جیسے اکتوبر 2005ء میں ہمارے ہاں زلزلہ آیا تو گاؤں میں 217 اموات ہوئیں جن میں 21 جنازے میری فیملی کے تھے۔ پانچ فروری کی صبح طلوع ہوئی مگر اس میں میری امی جان کی سانسیں شامل نہیں تھیں۔ میری امی اتنی کم عمر سے گزر آئی تھیں۔ ابھی ہم نے اپنی امی کی خدمت ہی نہیں کی تھی کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ ابھی اس دکھ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹھیک دس دن بعد نانی جان بھی ہمیں چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس پہنچ گئیں اور پھر دو مارچ کو میری خالہ جان بھی اس دنیا فانی سے کوچ کر گئیں۔ ایک مہینے کے اندر تین صدمے، کمر توڑ کر رکھ دی ان صدمات نے۔ بہرحال جیسے اللہ کی مرضی، بندہ عاجز ہے، کیا کر سکتا ہے۔ اللہ پاک میری امی جان، نانی ماں اور خالہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور جن کی مائیں زندہ ہیں اللہ انہیں عمر خضر عطا کرے، آمین۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا کرے، اس کی مصلحتیں دھری جانتے ہیں ہم اس کے عاجز بندے ہیں بس) ٹائٹل پر کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہ رہا، بس اتنا ہی کہوں گا کہ لاجواب تھا۔ نکتہ چینی میں عبدالجبار رومی نے مختصر مگر جامع تبصرہ کیا۔ سید اکبر شاہ کا تبصرہ پڑھ کر لگتا ہی نہیں کہ وہ نویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ الفاظ کا چناؤ بہترین تھا۔ طاہرہ گلزار اور احسان سحر نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ بلقیس خان کا تبصرہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہر بندہ دکھوں کی دکان لیے پھرتا ہے۔ اللہ آپ کو اس غم سے دکھ پر صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ زویا اعجاز بھی اچھا تبصرہ لے کر حاضر ہوئی ہیں۔ اس بار میرے دوستوں میں سے کوئی نہیں تھا، کمی محسوس ہوئی۔ آوارہ گرد میں ابھی تک زہرہ بانو کی داستانِ حیات جاری ہے۔ بعض اوقات رشتے داری سے تعلق داری زیادہ کام آتی ہے۔ زہرہ بانو کی داستان بھی کچھ اسی طرح کی ہے اور بڑی سبق آموز بھی ہے۔ یہ قسط بہترین رہی۔ غلام قادر نے اس بار بہت مایوس کیا۔ ماسوائے آخر دو چار لائنوں کے پوری اسٹوری صبح سات سے نو بجے پر لکھی گئی جو کچھ رنگ نہ جما سکی۔ ادھوری خبر، سلیم فاروقی نے پلاٹ تو اچھا بنایا تھا مگر اینڈ پر جا کر کہانی کا سارا مزہ خراب کر دیا۔ مسیحا کے حوالے سے کیا لکھوں، نواب صاحب کا نام پڑھ کر خوشی ہوئی تھی کہ شاہکار ناول پڑھنے کو ملے گا مگر پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔''

پاک پتن شریف سے جویریہ علی چشتی کی رائے'' 2000ء سے جاسوسی کی قاری ہوں مگر حاضر پہلی بار ہو رہی ہوں، امید ہے شرفِ باریابی بخشیں گے (یقیناً، خوش آمدید) اپریل کے جاسوسی کا ٹائٹل کافی بہتر تھا مگر رنگ بہت پھیکے پھیکے سے تھے اس طرف ضرور توجہ دیں۔ اس دفعہ جاسوسی کی جان محی الدین نواب کی مسیحا تھی، جو سیاست دانوں کے مکروہ چہروں سے نقاب اتار رہی تھی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ویل ڈن نواب صاحب۔ مریم کے خان کی حقِ زندگی بھی شہرِ قائد کے غاصبوں کی داستان تھی جو لوگوں سے زندہ رہنے کا حق چھین رہے ہیں اور ساتھ پارسائی کا دعویٰ بھی بہت ہے۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ شہرِ قائد کی روشنیاں لوٹا دے اور اسے امن کا گہوارہ بنا دے، نہ صرف کراچی بلکہ پورا پاکستان امن و سکون کا مسکن بنے تا کہ میری کوئی بہن بلقیس خان جیسے صدمے سے دوچار نہ ہو۔ دعا ہے کہ خداوند کریم داؤ مینٹ کی ہماری پیاری بہن بلقیس خان کو صبر عطا کرے اور ان کے دشمنوں کو جلد کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ سرورق کے رنگ از حد غیر متاثر کن تھے۔ آوارہ گرد ایک بوجھ ہے اس کو جلد از جلد ختم کریں اور جتنی جلدی ہو سکے انگارے شروع کر دیں عنایت ہوگی۔ (آپ کو پسند نہیں آ رہی، اس کا افسوس ہے مگر ہمارے بہت سے قارئین اس کو پسند کر رہے ہیں) خونی موتی، دہری شخصیت، نقش پا، سچا جھوٹ، وہ تمام خوب رہیں۔ اگر ہو سکے تو ابتدائی صفحات پر ہر ماہ انگریزی ناول ضرور شائع کیا کریں۔''

کراچی سے ادریس احمد خان کی پسندیدگی'' اپریل کا جاسوسی ڈائجسٹ آیا اور نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ شروع کیا۔ بات سب سے پہلے سرورق کی تو بہارت کا امین تھا۔ پہلی نکتہ چینی میں عبدالجبار رومی نظر آئے مبارک باد۔ ساتھ ہی فاروق انجم، طاہرہ گلزار، احسان سحر، زویا اعجاز، ہمایوں سعید سمیت پرانے دوستوں کی حاضری بھرپور تھی۔ اندر کے ابتدائی صفحات پر محی الدین نواب اپنی مخصوص تحریر کے ساتھ نمایاں تھے۔ نہایت محبت کے ساتھ عرض ہے کہ مہربانی فرما کر کسی نئے موضوع کو بھی ضابطۂ تحریر میں لائیں۔ ماورائی واقعات سے ماورا کچھ نیا پن ہونا چاہیے۔ نقشِ پا منیر شیرف نے بھی وزن سے بھرپور کی نشاندہی کر دی اور دماغ کی بہتر کارکردگی سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ خونی موتی بھی اچھی لگی۔ ادارے کے پرانے ساتھی آ رشت ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادے کے سانحۂ ارتحال پر نہایت افسوس کے ساتھ اظہارِ تعزیت۔ اللہ ان کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ پھر کاشف زبیر صاحب کی ہنستی مسکراتی تحریر گڑے مردے نے بہت مزہ دیا جس نے ٹانک کا کام دیا کہ ہنسی علاجِ غم ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی

آوارہ گرد کامیابی سے جاری ہے جس میں زہرہ بانو کی ذاتی کہانی جاری ہے۔ زندہ لاش میں جاسوس نے دماغی محنت کو بروئے کار لاتے ہوئے خطرناک دشمن کو بہ آسانی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ واقعی مجرم کتنا ہی چالاک اور پھرتیلا ہو، قانون کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا۔ بشرطیکہ سنجیدہ کوشش کی جائے۔ سچا جھوٹ نے بھی متاثر کیا۔ جس میں وقار نے جھوٹ پر جھوٹ بولا مگر تقدیر نے اس کے باوجود سرخرو کر دیا اور جوئے میں ہاری ہوئی رقم واپس مل گئی۔ تلاش میں عائزہ نے خطرناک ڈگر آزمائی نتیجتاً اپنی جان سے چلی گئی۔ زندگی ہی دل لگی میں موت کا سامان ہو گیا۔ رقابت میں دو افراد جیل پہنچ گئے اور ایک انسان زندگی کی بازی ہار گیا۔ حق زندگی میں سوسن نے انتہائی عقل مندی کا ثبوت دیا اور بنا گھبرائے انتہائی اقدام کر لیا کہ جو اس کی عزت کا لٹیرا بننے والا تھا دلیری سے کام لیتے ہوئے اس کا خاتمہ کر دیا۔ بوجھ بھی اچھی تھی اور یہ کہانی پہلے بھی پڑھی ہے واقعی اضافی بوجھ سے آج انسان اتنے مجبور ہو گئے ہیں کہ سراسر تکلیف دہ ہوتے ہوئے وہ اپنے کاندھوں کے بوجھ کو اتار پھینکنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ دہری شخصیت توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ پہلے آخری صفحوں کی سرورق کی کہانی، اور دوسری ادھوری کہانی بہت اچھی تھیں۔ پیسے کے لالچ میں پانچ آدمی اپنی جان سے چلے گئے اور ایک نیم پاگل ہو گیا۔ پیسا کسی کام نہیں آیا۔ مجموعی طور پر شمارہ دلچسپ اور بامقصد کہانیوں سے مزین تھا۔"

سینٹرل جیل میانوالی بیرک نمبر 17 سے سجاد خان آف موچھ کی عنایت "5 اپریل کو اپنا محبوب رسالہ ملا، شکر ہے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی خوابیدہ آنکھوں والی حسینہ کو دیکھا اس سے پہلے کہ ترچھی نظر کا شکار ہوتے ایک آدمی کو پستول لہراتے ہوئے دیکھا جو شاید ہمیں وارننگ دے رہا تھا اور انکل چنگیزی بھی ہمیں گھور رہے تھے تو ہم نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ انکل جی خوب صورت چہرے کے ساتھ پستول والا آدمی لازمی فٹ کرنا ہے کیا۔ خیر آگے چلتے ہیں۔ محفل میں اپنا نام نہ دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ محفل میں خط تو لکھا تھا لیکن شاید پوسٹ نہیں ہوا، کیا کریں مجبوری ہے۔ لیٹر کے ساتھ 5 سو کا نوٹ دے دیں تو جلدی پوسٹ ہو جاتا ہے۔ نہیں تو پولیس والوں کی وردی کی جیب میں وردی کے ساتھ دھل جاتا ہے۔ عبدالجبار رومی بھائی مبارکاں اور آپ نے مجھے ویلکم کیا بہت بہت شکریہ۔ بلقیس خان آپ کا بھی شکریہ۔ ہاں کچھ بھوت ناتوں سے مانتے ہیں۔ نادر سیال ہم آپ کے پڑوسی ہیں آپ نے ہمیں ویلکم نہیں کیا۔ شاید آپ کو ڈر ہے ہم آپ کے ووٹ نہ توڑ لیں۔ احسان سحر بھائی شاید آپ کی نظر بھی اپنے گرائیں پر نہیں پڑی، کوئی بات نہیں ہماری نظر آپ پر ضرور پڑتی ہے۔ ماریہ صاحبہ عمر جو بھی ہو تنقید ایسی میٹھی ہو کہ کسی کو برا نہ لگے۔ انکل ذاکر حسین خدا پاک آپ کے صاحب زادے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ کاش عبداللہ ہم آپ کو ویلکم کہتے ہیں۔ آوارہ گرد اچھی رہی۔ اس بار ادھوری خبر دلچسپ رہی ہے۔ مسیحا اچھی کہانی تھی باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔"

پاک پتن شریف سے خیام پیرزادہ کی فرمائش "آپ کے جاسوسی 4 اپریل کو ملا۔ ملاحت احمد فراز کے شعر، اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز سونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی کی تفسیر ہی نظر آئی۔ ساتھ ساتھ صنف وجاہت بھی شگفتگی کی تصویر لگی۔ خدا جانے ذاکر صاحب نے سرورق بنانے کا یہ عظیم بجٹ کہاں سے چرایا کہ ایک لڑکی بناوٹی ساتھ دو مرد، ہاتھ میں پستول تھما دیا لو جاسوسی کا ٹائٹل تیار ہے، اب اسے گھول کر پی لیں۔ نہ۔ نہی کی طرح خوب صورتی ہے نہ ندرت خیال۔ بلقیس خان کا شکوہ بالکل بجا کہ ذاکر صاحب کو احسان سحر، محسن علی طالب یا رومی انصاری جیسے سوہنے منڈے نہیں نظر آتے جو ٹائٹل پر کارٹون بنا ڈالتے ہیں۔ ایک ہی جست میں فہرست پر پہنچے، نظر ڈالی تو نواب صاحب اور مریم کے خان کے نام دیکھ کر طمانیت ہوئی۔ اگلی جست میں پاؤں تختہ داں کی بزم نکتہ چینی پہنچے جہاں عبدالجبار رومی تخت طاؤس پر جلوہ افروز تھے۔ آگے بڑھتے ہیں۔ مگر یہ کیا احقر کا نام خیام پیرزادہ ہے مگر خیام کو جس طرح جناح میں تبدیل کیا گیا، اسے دیکھ کر تو ہم انگشت بدنداں رہ گئے۔ (اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہیں آپ سے) محسن علی طالب، نادر سیال، ہمایوں سعید، عثمان راشد، ثوبیا اعجاز، فقراء، عبادت کاظمی، آکاش عبداللہ کیونکہ جیسے ستارے جاسوسی کی کہکشاں میں ضوفشاں تھے۔ بشریٰ افضل غیر حاضر تھیں۔ خدا انہیں صبر اور ان کی بہن کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ محی الدین نواب صاحب اس دفعہ مسیحائی کا عزم لے کر وارد ہوئے ہیں اور ان مکروہ کرداروں کا پردہ چاک کرتے نظر آتے ہیں جو اس قوم کے لیے ناسور بن گئے ہیں۔ پہلی قسط انتہائی جاندار رہی، آگے کیا ہوتا ہے تو پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ آخر میں ایک گزارش ہے کہ جاسوسی میں انعامی خط کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیں۔ انعام کے پیسے ضروری تو نہیں کہ رسالہ پورے سال کے لیے جاری کیا جائے بلکہ ایک ماہ کے لیے دیا جائے یہ نہ صرف قارئین کے لیے اعزاز کی بات ہوگی بلکہ خطوط میں بھی خوب صورتی آئے گی اور جاسوسی کے صفحات بڑھا دیں۔"

محمد وقاص خالد خانپور ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں "پانچ ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد ایک دفعہ پھر حاضر ہوں۔ ابا پوچ جاسوسی کو سلام، مصروفیت کی وجہ سے جاسوسی کا دیدار 10 تاریخ کو نصیب ہوا۔ ٹائٹل حسب روایت تھا۔ چیں نکتہ چینی کی محفل میں اعجاز ماری۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ تمام تبصرے ہی بہت اچھے تھے۔ افتخار رضوان اینڈ طاہر چودھری آج کل کدھر غائب ہیں پہلی ہی فہرست میں اپنی حاضری لگوائیں۔ ابتدائی صفحات پر نفسیات اور فطرت کی الجھی گتھیوں کو سلجھاتی ہوئی ڈاکٹر قائم ستائش اور ہمیشہ کی طرح ایک عمدہ کاوش، آخر تک کہانی میں سسپنس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سلسلے وار کہانیوں میں جواری کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ کہانی کا اختتام بڑی عجلت میں کیا گیا۔ بہرحال کچھ عرصہ ابھی کہانی مزید چل سکتی تھی۔ زندگی کی بازی ہارتے ہارتے آخرکار جواری جیت ہی گیا۔ امید ہے کہ جواری کی جگہ شروع ہونے والا نیا سلسلہ انگارے بھی ایک شاہکار ثابت ہوگا۔ دوسری سلسلے وار کہانی آوارہ گرد بھی ہمیشہ کی طرح بہترین۔ امید ہے کہ آنے والی اقساط میں کہانی اور بہتر ہو جائے گی۔ مختصر کہانیوں میں آصف ملک کی فی دشمن اچھی تھی۔"

جام پور سے عثمان راشد کی اطلاع اور خواہش دل "اس بار جاسوسی کی دید چار تاریخ کو نصیب ہوئی۔ بک اسٹال پر گئے اور جلدی سے جاسوسی لی۔ محفل خطوط میں آئے تو دوسرے نمبر پر اپنا خط پا کر دنگ رہ گیا۔ سب کچھ تو کٹ چکا تھا پھر بھی کوئی بات نہیں۔ خطوط پڑھے پر کسی نے ابھی تک لگتا ہے ہمیں اپنی رفاقت میں قبول نہیں کیا۔ کوئی ہمارے خط کے بارے میں کچھ بھی تذکرہ نہیں کرتا۔ خیر جلدی رفاقت بھی ہو جائے گی۔ اب ہم آئے کہانیوں پر

تو سب سے پہلے سرورق کی کہانیوں پر ٹوٹ پڑے۔ پہلی کہانی غلام قادر کی کچھ خاص نہیں صرف ٹھیک ہی۔ دوسری کہانی سلیم فاروقی کی کہ پڑھنے بہت مزہ آیا پر آخر میں سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سب کو مار ڈالا۔ اس کے بعد چھوٹی کہانیاں پڑھیں۔ ان میں بھی مزہ آیا۔ ابھی مسیحا پڑھ رہا ہوں۔ بڑا مزہ آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی گنتی شائع دیکھیں۔ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ چلو ہم بھی کسی خانے میں آ گئے۔ آخری بات آپ سے کہوں گا کہ اگلے ماہ میرے امتحان ہونے والے ہیں۔ اس وجہ سے خط نہیں لکھ پاؤں گا۔ آپ میرے لیے دعا ضرور کرنا۔ فرسٹ ایئر میں کالج میں تیسری پوزیشن تھی، اس دفعہ اول آنے کی خواہش ہے اور والدین کو خوش کرنے کی بھی۔''

میانوالی، کندیاں سے نادر سیال کی لفاظی ''اس بار پیارا محبوب جاسوسی 5 اپریل بروز اتوار کو مجھے خوش گوار حیرت کے ساتھ ملا کہ اتنی جلدی، یہ تو کمال ہو گیا۔ ٹائٹل گرل اس بار بہت دلکش، خوب صورت، گندمی رنگ، گول چہرہ، ریشمی بال، بڑی بڑی سرابیمہ سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، ترشے ہوئے ہونٹ، ابھرے ہوئے خدوخال 25 سے 30 کے درمیان اس خوش چہرہ کی عمر ہوگی۔ (ہمیں اندازہ نہیں) ساتھ میں بیٹھے شخص کا نشانہ کہیں اور ہے اور دیکھ کہیں اور رہا ہے۔ ساتھ کھڑے ڈاکٹر انکل مجھے بڑے پیار سے نظر بھر کے گھور رہے تھے۔ 20 اپریل کو میری 22 ویں سالگرہ ہے اور ناز کی بات ہے آپ سب دوست مجھے وش تو ضرور کرو گے لیکن مجھے صرف آپ دوستوں کی نیک دعائیں چاہئیں، میرے لیے یہ تحفہ بھی بہت ہے۔ دعا کرنا اللہ تعالیٰ مجھے اس قید سے رہائی دے۔ محفل دوستاں کی طرف قدم بڑھائے تو سب سے پہلے بڑی کرسی صدارت پر عبدالجبار رومی کو براجمان پایا، مبارکاں جناب۔ سید اکبر شاہ آپ اپنے بھائی کے ساتھ بتا کر رکھو پھر دیکھنا کیسے خط پوسٹ ہوتا ہے۔ طاہرہ گلزار جی دعا کرو کہ بلبل کے چہرے پر تیزاب پھینکنے والا پلان ناکام ہو گیا ورنہ بلبل کا چہرہ بیانمہ رہتا۔ بلقیس خان ہمیں آپ کے دونوں بھائیوں کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ آصف محمد صاحب: اتنے عرصے سے آپ غصہ دبائے ہوئے تھے کافی ہمت ہے آپ کی۔ رہی بات کہانیوں کی تو یہ آپ نے بجا فرمایا۔ ہمایوں سعید صاحب: آپ کی تو صرف گاڑی چھوٹ گئی لیکن مجھے تو کل پہلے جاسوسی کی خاطر مار کھانا پڑی تھی۔ تبصرہ پار کر دو تا آ کاش عبداللہ آپ کا خط پڑھ کر ہمیں حیرت اور خوشی ہوئی ویلکم۔ شوکت شہر یار اور دو میں احمد خان کے تبصرے اچھے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی جس میں سہیل دادا بیگم صاحبہ کی محبت کی خاطر جان کی بازی لگا کر دشمنوں کے منہ سے شیق شاہ کو چھین کر صرف بیگم صاحبہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کی خاطر بیگم ولا میں لے گیا۔ سہیل دادا کی پاک سچی محبت کو سلام۔ فاروق انجم کی تلاش پڑھی جو بہت اچھی اور سبق آموز تھی۔ محی الدین نواب کی تحریر مسیحا پڑھنے کو ملی۔ کاش اسی طرح اللہ پاک ہمارے وطن میں بھی اچھے نیک انسان بھیجے اور ہمارا ملک بھی خوش حال ہو۔''

سینٹرل جیل میانوالی سے فضل الرحمان دتہ خیل کی تعریف ''جاسوسی ڈائجسٹ میں میری پہلی کاوش ہے پڑھ تو میں کافی عرصے سے رہا ہوں۔ لیکن لکھنے کی ہمت اور جذبہ پہلی بار پیدا ہوا۔ ٹائٹل گرل اس بار بہت ہی پُرکشش اور حسین و جمیل تھی۔ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میرے دوست نادر سیال کی ہر ماہ آپ کی محفل میں تشریف آوری ہوتی ہے اس کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا۔ دوستوں کے تبصرے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور مجھے بھی چاہت تھی کہ میں بھی اپنے پیارے ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ میں انٹری دوں۔ (بہت اچھا کیا آپ نے) عبدالجبار رومی انصاری صاحب کو کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ سید اکبر شاہ اوکی! اب آپ کی صحت کیسی ہے۔ جب کے امتحانات تو شکر ہے گزر گئے امید ہے اب آپ کی صحت ٹھیک ہو جائے گی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی جو کہ بہت اچھی جا رہی ہے۔ میمونہ عزیز کی حسد پڑھی جو کہ بہت اچھی تحریر تھی۔ محی الدین نواب کی مسیحا پڑھی، بہت اچھی تھی۔ جو اللہ کے راستے پر آ جاتا ہے اس کی دنیا بدل جاتی ہے۔ باقی کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔''

چشمہ بیراج سے ساگر لکوکری کا تبصرہ ''ٹائٹل حسب معمول جاسوسی کی آن شان اور پہچان کے مطابق تھا۔ پچھلے مسلسل چھ ماہ سے محفل میں موجود خطوں میں کہانیوں پر تبصرہ یوں غائب ہو رہا ہے جیسے عورت کے سر سے عقل۔ بھئی تقریباً ایک دوسرے کے خطوں پر ہی تبصرہ کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ خط شامل کیا کریں جن میں کہانیوں پر تبصرہ زیادہ ہو۔ (بہت بہتر) مسیحا، معاشرے کے جراثیم نے ہمیشہ کی طرح خوب جراحی کی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ نقش پا اس سے بھی زیادہ اچھی تھی کیونکہ گھر کی کہانی تھی۔ گزرے عرصے میں جلیل کو مرحوم ابا کی جاسوسی کرتے دیکھ کر اچھا نہیں لگا۔ مگر اختتام پر کہانی نے وہ مزہ دیا کہ کیا بتاؤں۔ آوارہ گرد خوب چل رہی ہے۔ فاصلے، غلام قادر بڑی دیر بعد آئے مگر دیر سے آنے کا حق ادا کر دیا۔ ہر کردار مکمل اور سانس لیتا محسوس ہوا۔ قارئین اکثر شکوہ کرتے تھے کہ غلام قادر غائب ہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ اب قارئین آپ کو اور غلام قادر کو واپسی پر کتنا سراہتے ہیں۔ جب پرانے شماروں کا نئے شماروں سے تقابلی جائزہ کرتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ پہلے تو جاسوسی آسمان پر چمکتا چاند تھا۔ اب ٹمٹماتا ستارہ محسوس ہوتا ہے۔ پلیز ہم پر بھی رحم کریں اور پیارے جاسوسی پر بھی۔''

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی شمولیت ''جاسوسی کے ٹائٹل پر اس مرتبہ کلوز اپ میں نسوانی چہرہ جاذب نظر تھا۔ فہرست دیکھ کر نگاہ پھسلتے ہوئے نقش پا اور زندہ لاش پر جا کر رُک گئی۔ دونوں مختصر تحریریں دلچسپ تھیں۔ ہمارے عظمیٰ بھائی کی تحریر تلاش خوب صورت کاوش تھی۔ اختتام پُرتجسس تھا۔ حق زندگی شہر کے بھرے ماحول کے مناظر میں بہترین تحریر تھی۔ کہانی کا تانا بانا جدت پر مبنی تھا۔ ادھوری خبر بھی خوب تھی۔ آوارہ گرد ہنگامے لیے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ بوجوہ دلچسپ تھی۔ کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ (کہانیوں کی طرف توجہ مبذول کرنے کا شکریہ، جلد ہی آ دعاشن اور عظیم آدمی اقلیم علیم صاحب تک پہنچ جائیں گی۔''

اوکاڑہ سے شوکت شہر یار کی ناپسندیدگی ''اس مرتبہ 4 تاریخ کو ہی پرچہ مل گیا۔ سرورق کی حسینہ ترچھی نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور ایک ڈراؤنی صورت والا آدمی ہاتھ میں پسٹل لیے ڈرا رہا تھا۔ عبدالجبار رومی بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ سید اکبر شاہ اللہ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ نصیب

فرمائے۔ ویسے جتنے کیپسول اور گولیاں آپ کھا چکے ہیں اب تو کیپسول بھی ڈرتے ہوں گے کہ کہیں اکبر ہمیں کھا نہ لے۔ میانوالی سے احسان سحر کا فلسفیانہ تبصرہ بس گزارے لائق ہی رہا۔ بلقیس خان کے حالاتِ زندگی پڑھ کر افسوس ہوا۔ صفدر معاویہ اس مرتبہ بھی اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ زویا اعجاز کا تبصرہ اس مرتبہ روکھا پھیکا سا تھا شاید جلدی میں لکھا گیا ہے ورنہ ان کے تبصرے پر ہٹ ہوتے ہیں۔ سیف خان بھائی آپ کو پری زے کا تبصرہ دیکھ کر حیرت کیوں ہوئی؟ کہانیوں میں سب سے پہلے مسیحا پڑھی اور درمیان میں ہی چھوڑ دی۔ محی الدین نواب میرے فیورٹ رائٹر تھے مگر اب ان کی کہانیوں میں وہ جان نہیں رہی۔ نواب صاحب سے گزارش ہے کہ حقیقت پر مبنی آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی تحریر لکھیں۔ شکیب پاشا کارز اپنے بیٹے وزن کی وجہ سے قانون کے شکنجے میں آ گیا۔ خونی سوئی پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ سوئی ایک انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہو گئی ہے۔ گڑے مردے، کاشف زبیر کی ایک بہترین تحریر، جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ آوارہ گرد، حسبِ معمول اس مرتبہ بھی بہترین تھی۔ بیگم صاحبہ کے حالات آہستہ آہستہ قارئین کے علم میں آ رہے ہیں اور یہ کہانی بہت عروج پر جا رہی ہے۔ زندہ لاش، مس مرلی رسنا رینڈ نے اپنے ساتھی کے قتل کا بدلہ لیا اور ڈاکسن کو قانون کے حوالے کیا۔ سچا جھوٹ میں وقار اپنی بے وقوفی سے تمام تنخواہ ہار گیا۔ مگر اس کا بولا گیا جھوٹ ایک دوسرے انداز میں سچ ہو گیا اور شاید سونیا جیسی باوفا بیوی کی وجہ سے پریشانی سے چھٹکارا مل گیا۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی مصروفیت ''اپریل کا خوب صورت شمارہ 4 اپریل کو طاہر نیوز ایجنسی سے وصول کیا۔ سرورق کو ایک خوب صورت، خوب رو اور دلکش ماڈل سے سجایا گیا تھا ساتھ ایک پستول بدست اور ایک بوڑھا عمر بابا بھی موجود تھے۔ لاہور سے روحی بھائی بیسٹ تبصرے کے ساتھ موجود تھے مبارک ہو بھائی جان۔ احسان سحر بھائی کا بہترین اندازِ تحریر، بلقیس خان کے دکھ دکھی کر گئے۔ یہ تو قیامت تک سلسلہ چلے گا دکھ سکھ تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ادریس خان اور نادر سیال کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، ابھی تک بیگم صاحبہ کے بیٹے دلاور کی داستان چل رہی ہے جہاں مظالم کی پوری اسٹوری لکھی ہے۔ محی الدین نواب کی مسیحا کافی انٹرسٹنگ کہانی ہے۔ اگلے ماہ کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ سکندر علیم کی تفتیش، پولیس میں شیرف نے ذہانت سے قاتل پکڑ لیا۔ سلیم فاروقی کی ادھوری خبر میں برے کام کا برا نتیجہ ہی نکلا، کوئی بھی نہ بچ سکا۔ پیسے کے لالچ میں سب مارے گئے۔ باقی تمام کہانیاں بھی بہت ہی اعلیٰ تھیں۔ وقت کی کمی کے باعث ان پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔''

لودھراں سے محمد انعام کی حاضری ''اس دفعہ جاسوسی 7 اپریل کو ملا۔ جب جاسوسی گھر لے کر آئے تو کہانیوں کا اسٹارٹ آوارہ گرد سے کیا جو بہت زبردست جا رہی ہے۔ اس کے بعد پہلا رنگ پڑھا جو صرف گزارہ کر گیا۔ دوسرا رنگ ادھوری خبر بہت اچھا تھا۔ وینگ ڈکیتی کی کامیابی کے باوجود اکو کا باپ آڑے آ گیا۔ آخرکار ادھوری خبر اسے ناکامی کی طرف لے گئی۔ بوجھ میں منظر امام نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ قوم کے کندھوں پر باپ کے بعد بیٹا اور اس کے بعد پوتا ہی کیوں سوار ہیں۔ قوم نے ان کو اتار پھینکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ کاش ہمارے ملک میں مسیحا جیسا حکمران آ جائے۔ سچا جھوٹ، سچا جھوٹ ہی تھا۔ چٹ پٹی محفل میں تبصرے اچھے تھے۔ فروری میں جاسوسی کی محفل میں ہم نے پہلی بار شرکت کی تھی۔ نادر سیال اور کچھ اس جیسے دوستوں کو ہماری شرکت اچھی نہیں لگی۔''

اسلام آباد سے شکیل حسین کاظمی کا اندازِ سخن ''آج کل کے دور میں کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنا اور لوگوں کی رائے لینا بہت عام سی بات ہو گئی ہے، کیونکہ یہ جدت اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے رابطے میں ہے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ یا سوشل میڈیا۔ ہر کسی کو اپنی رائے دینے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا ہے اس لیے لوگ بے دھڑک وہ بات کہہ دیتے ہیں جو پہلے کہنے میں عار محسوس کرتے تھے۔ اسی سوشل میڈیا پر جاسوسی ڈائجسٹ کے پیج پر بے شمار قارئین اور کافی زیادہ تبصرہ نگاروں کی آرا دیکھنے کو ملیں جن میں ہمارے نامور تبصرہ نگار شامل ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا یہی کہنا تھا کہ ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ اپنے معیار کا حامل نہیں رہا۔ ان میں تو بہت سارے ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سرے سے یہ کہہ دیا کہ ہم مکمل بائیکاٹ کر چکے ہیں۔ ہم جاسوسی یا سسپنس نہیں خریدیں گے۔ اوپر سے جلتی پر تیل کا کام یہ ہوا کہ انگارے کا اعلان کر کے ادارے نے نواب صاحب کی مسیحا شائع کر دی۔ وجوہات کوئی بھی رہی ہوں نواب صاحب کی مارو کے متعلق قارئین کی آرا کو جانتے ہوئے آپ نے ایک اور طویل کہانی لکھوانے کا رسک لے لیا۔ امید ہے آپ کو خطوط سے اندازہ ہو جائے گا کہ تمام قارئین کتنے خوش ہیں، نہیں تو کسی دن ایک چکر فیس بک پر لگا کر دیکھ لیجیے گا۔ جیسے کہ ایک دفعہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں میرا اس ادارے سے تعلق تین نسلوں پر محیط ہے اور ہم سب قارئین اور تبصرہ نگاروں کو اس سے انسیت ہو گئی ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت دکھ کی بات ہے کہ اتنا شاندار اور منفرد پہچان رکھنے والا ادارہ بھی معیار کو ترجیح دینا چھوڑ دے اور اپنے قارئین کی پسند ناپسند کو بالکل خاطر میں نہ لائے۔ (اب کیسے ممکن ہے کہ ادارہ قارئین کی پسند کو مدنظر نہ رکھے۔۔۔ یہ قارئین کا پرچہ ہے اور انہی کے لیے پبلش کیا جاتا ہے۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر تھا۔ انشاء اللہ آپ جلد خوش خبری سنیں گے) میں بھی یہ تبصرہ صرف اسی لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو محض حالات کا علم ہو اور ہماری محبت بھی تمام ہو جائے۔ ہر چیز میں جدت آتی جا رہی ہے اس لیے ادارے کو پرانے مصنفین کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی مواقع فراہم کرنے چاہئیں اور کوئی نئی غلطی کرتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کی جائے، بجائے اس کے کہ اس کے فن اور محنت کا مذاق اڑایا جائے۔ ناقابلِ اشاعت ہونا عام سی بات ہے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ناقابلِ اشاعت ہے مگر ذاتیات پر تنقید کرنے کا حق کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔ (ہم ایسا بالکل نہیں کرتے ہیں۔ آپ بتائیں کس کے ساتھ یہ نارواوطیرہ اختیار کیا ہے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ جو بھی کہانی ناقابلِ اشاعت ہے تو لکھاری کو اس کی خامی سے آگاہ کریں۔ اور آئندہ کے لیے مفید نکات بھی بتائے جاتے ہیں۔ آپ کی یہ بات پڑھ کر ہمیں افسوس ہوا۔ میری اکثر نئے لکھنے والوں سے بات ہوتی ہے اور بڑی محبت اور اپنائیت سے بات کی جاتی ہے) باقی ڈائجسٹ پر تبصرہ کیا کروں؟ چٹ پٹی میں دوستوں کا شکرگزار ہوں جو مجھے یاد رکھتے ہیں، اور ان لوگوں کے لیے مزید کوشش کروں گا جو مجھے بھولے ہوئے ہیں۔ کہانیوں میں صرف آوارہ گرد اور کاشف زبیر صاحب کی گڑے مردے پڑھی، دونوں

بہت اچھی تھیں۔ اس کے بعد نواب صاحب کی مسیحا کا مطالعہ کیا جس کے نتیجے میں باقی ڈائجسٹ پڑھنے کا بھی دل نہیں کیا۔ یہ تبصرہ قابل اشاعت ٹھہرتا ہے یا نہیں یہ مجھے ملال نہیں ہوگا لیکن اتنا ضرور ہوگا کہ بہت سارے خاموش قارئین جو کہ تبصرہ نہیں لکھتے یا کسی وجہ سے آپ تک اپنی رائے نہیں پہنچا سکتے ان کی آواز ادارے تک پہنچ جائے۔ اور ادارہ اپنے قارئین کی کتنی قدر کرتا ہے یہ آنے والا وقت ثابت کر دے۔''

مانسہرہ سے سید اکبر شاہ کے گل بوٹے ''آخر کار مل ہی گیا جاسوسی۔ المیوز سے چہرے والی حسینہ کے ہونٹ ریلوے لائن کا منظر پیش کر رہے تھے بہرحال ان کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔ میاں روحی کو اچھلتے کودتے پایا۔ چند خوش نصیبوں اور غلط فہمیوں کو لیے شوکت شہریار بہترین تبصرہ کرتے نظر آئے۔ طاہرہ گلزار، پنگا از ناٹ چنگا۔ جبیس خان کے دل کی باتیں دل کو گئیں کہ کہاں کی دوستی ہے صفدر بھائی، وہ فقط کہہ نہ سکے ہمارے بارے میں۔ سیف اللہ خان ہمت کرے انسان تو کیا ممکن ہے ہر اک کام۔ ہمایوں سعید، بندے اچھے ہو مگر کام اچھے نہیں۔ محسن علی، مذاق اچھا کر لیتے ہو۔ احسان سحر، آپ کو بھی کیوں لگا کہ برسنا اور کنارک کربرساتھیوں پر یہ ندیاں یوں ہی بہانا۔ کہانیوں سے تین تین ہاتھ ہوئے۔ گرے مردے، کاشف زبیر کی مانند گز سنجالیں دے گئی۔ جلیل میں دوڑتا لہو محبت و شہرت کے امتزاج کا ہے۔ پڑھتے ہوئے چلنے کے ساتھ ساتھ آنتوں کی اچھل کود سے بھی محظوظ ہوئے۔ آوارہ گرد پڑھتے ہوئے دلیر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں طاقات جنت گوب گرتے پڑتے ممکن ہو جاتی ہے۔ جیلی دادا کی بہادری کے قصے پڑھتے ہوئے پیچھے سے تن گئے۔ سرورق کی پہلی کہانی بس نام کی تھی۔ دوڑتی دوڑتی خبر آئی تھی۔ لگتا یوں ہے جیسے گن پوائنٹ پر رکھ کر لکھوائی ہو تحریر۔ اکثر تحریروں کی طرح یہ بھی ہمارے کندھوں سے پانچ فٹ کی بلندی پر سے پرواز کر گئی۔ دوسرا رنگ قدرے بہتر تھا۔ لوکی والدہ سے محبت اچھی تھی۔ ادھوری خبر نے مروا دیا۔ میرے ہم نام دلن بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ کئی تحریروں میں سچا جھوٹ، نام پڑھ کر ایسا لگا جیسے سنجیدگی سے مذاق ہو رہا ہو۔ وقار نے سچا جھوٹ بول کر دامن بچایا، دلچسپ تحریر تھی۔ بوجھ، پڑھتے ہوئے حیرانی کے کنویں میں موجزن ہوئے۔ خود پر مسلط وباپ جان کے رموز یاد کرانے کا منفرد انداز تھا۔ مغرب سے برآمد مختلف پاروں میں چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے قتل یا مطلوبہ چیز تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں بخشش یا خونی موتی اور زندہ لاش بہترین اور دلچسپ رہیں۔ ابتدائی کہانی مسیحا کے بارے میں فقط اتنا کہ ایسا لگا جیسے کھانا معدے کے بجائے دل کی طرف رواں ہے۔''

کاشف عبید کاوش کی مدموزی بکرام سے خوشی ''بورڈ کے امتحان کا آخری پرچہ دے کر فوراً قریبی بک اسٹال کا رخ کیا۔ مارچ کے شمارے پر تبصرہ نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت امتحان کی تیاری میں الجھے ہوئے تھے۔ خیر اس ماہ محفل یاراں میں حاضر ہوئے۔ اپریل کے شمارے کا سرورق ذاکر حسین صاحب نے اچھا تیار کیا تھا۔ ان کے صاحب زادے کی موت کا سن کر کافی افسردہ ہوا۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ سرورق میں حسینہ کے لب کافی نمایاں تھے۔ پتا نہیں نیچے عینک والی شخصیت بوڑھی عورت تھی یا مرد۔ خدا را ضرور بتائیے اور اوپر پستول والا سوچ رہا تھا کہ اس بوڑھی شخصیت کو مار کے حسینہ سرورق کے ساتھ اڑن چھو ہو جاؤں گا۔ فہرست اچھی رہی۔ اداریہ قابل فکر تھا۔ پہلا خط عبدالمجید رومی صاحب کا تھا۔ جناب مجھے بھی سوسو کا پتا نہیں مگر بہت سے لوگوں سے سنتا آ رہا ہوں۔ عثمان راشد نے خط مختصر لکھا۔ سید اکبر شاہ صاحب ہم دونوں قریبی علاقوں کے ہیں۔ یعنی بکرام ہوگی تو پھر فاصلے کیسے؟ انجم فاروق ساحلی، وقا آ کاش، عبداللہ اور شوکت شہریار کا تبصرہ اچھا لگا۔ جبیس خان، ادریس احمد خان، سید عبادت کاظمی، نادر سیال، مہ جبیں، آصف محمود، محمد صفدر معاویہ، محسن علی طالب، زویا اعجاز، سیف اللہ خان اور محمد ہمایوں سعید کے تبصرے اچھے لگے..... میرا پیارا دوست محمد قاسم رحمان اس بار بھی غائب ہے۔ سرورق کا پہلا موتی غلام قادر صاحب نے بہت خوب صورت تحریر کیا۔ جواری ختم ہوئی، اچھا ہوا۔ جواری ہارنے والوں پر رسالے میں اب قلم اٹھنے کی بنا پر انگارے برسنے لگے۔ ہاہاہا۔ جلدی طاہر جاوید مغل صاحب کا سلسلہ شروع کر دیں۔ معروف رائٹر کی آوارہ گردی بڑے جوش میں داخل ہوگئی۔ کہانی اچھی جا رہی ہے۔ ابھی تک اتنی ہی پڑھ پایا ہوں۔ جیسے ہی خط پوسٹ ہوگا تو اور کہانیاں پڑھنے بیٹھ جاؤں گا۔ 27 مئی کو میری سالگرہ ہے اور میں 17 سال کا ہو جاؤں گا۔'' (مبارک ہو آپ کو)

واہ کینٹ سے آصف محمود کے انگارے ''اس بار ماہ اپریل کا جاسوسی ڈائجسٹ باکرے 19 تاریخ کو طالبعلق نیٹ ملا۔ وجہ بعد میں معلوم ہوئی کہ باکر موصوف پہلے 5/6 دن خود پڑھتے ہیں اس کے بعد مجھے دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب کا سرورق اس بار بھی دھیما رہا۔ سرورق کی ماہ پرہ سرورق پر چھائی رہی اور پستول بردار اور ادھوری خبر کے ایاجی پس منظر میں رہے۔ ذاکر صاحب کے صاحب زادے کے انتقال کی خبر سن کر دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے۔ آمین۔ پورے ماہنامہ میں انگارے کا وجود نہ دیکھ کر دماغ میں انگارے بھر گئے پھر بھی نکتہ چینی میں احتراز یہ کر دماغ میں بھرے انگارے کم ہوئے۔ (شکر ہے ورنہ ہم تو آپ کی ناراضی سے پریشان تھے) پہلے ہی صفحے پر محی الدین نواب صاحب کی ریوتا سے ماخذ کہانی مسیحا پر نظر پڑی اور دل و دماغ میں انگارے بھر گئے۔ نواب صاحب! خدا کے لیے دیوتا کے تراجم چھوڑ دیجیے۔ انداز تحریر تبدیل کیجیے تاکہ بوریت نہ ہو۔ ادھوری خبر سلیم فاروقی کی بس واجبی سی تحریر ہے کوئی نیا پن نہیں تھا۔ اسی طرح غلام قادر کی قاصفے بھی پھسپھسی تحریر تھی جس کا نہ مطلب نہ وقت صرف مطلب؟ گرے مردے، کاشف زبیر، امریکہ کے خان کی حق زندگی اور محمد فاروق انجم کی تلاش پھر بھی جاندار تحریریں تھیں۔ اس بار ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی کوئی خاص تاثر نہ دے سکی۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا جاسوسی پھیکا پھیکا سا لگا۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

مرحاگل، ڈیرہ اسماعیل خان۔ اللہ دتہ چشتی، کوٹ ختہ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ خالد محمود، شورکوٹ ضلع جھنگ۔ احسان سحر میانوالی۔ محمد اقبال، کراچی۔

انگارے کے مصنف کا صحیح نام ارسال کرنے والے قارئین کی فہرست اگلے شمارے میں شامل ہوگی۔

حصارِ دوراں

کاشف زبیر

زندگی کے کسی نہ کسی محاذ پر بساط بھر جنگ سے ہر شخص کو ہی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ بعض اوقات یہ جنگ لڑتے لڑتے وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے... اور جسم پیوند خاک... اور پھر وطن پرستی کا تمغہ کسی اور سینے پر سجا دیا جاتا ہے... کسی کسی کی جنگ شدید تر ہوتی ہے... ان کے پاس کوئی بڑا عہدہ نہیں ہوتا... مگر پھر بھی وہ حالت جنگ میں رہتی ہیں... ماضی سے جڑے ایک ایسے ہی واقعے کی سرگزشت... وقت گزرنے کے باوجود اس کی بازگشت ختم نہ ہو سکی... گواہ بن جانے والی سمندری اور زمینی فضائیں اس کی بازگشت سے گونجتی رہیں... اور اس المیے کا احساس دلاتی رہیں... جن کا خمیازہ نہ صرف فرد واحد بلکہ قوموں کو نیست و نابود کر گیا... کچھ صحیح کرنے کے چکر میں سب بگاڑ دینا کسی کے نزدیک شاندار کامیابی ہے... اس کامیابی کے حصول میں چاہے کتنا ہی لہو... پانی کی طرح بہا ہو... کوئی بڑی بات نہیں... ایسی ہی کہانی کے تانے بانے... جس کے حصارِ دوراں میں ایک دفعہ جکڑ جانے والے کو پھر فرار کا کوئی راستہ نہیں ملتا... تلاش و جستجو کی شب بیداریوں کا لہولہان کر دینے والا پُرتجسس سلسلہ...

بلند قدوقامت رکھنے والی کوتاہ طاقتوں کا گھناؤنا کھیل... پسپائی و شکست... سچ اور جھوٹ کی معرکہ آرائی...

یونیورسٹی کے سرسبز و دلکش لان میں پی ایچ ڈی کے چند طالب علم جمع تھے۔ ان میں سے ایک جرمن تھا، دوسرا جاپانی اور تیسرا امریکی تھا۔ یہ تینوں دھاتوں کی سائنس میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ جرمن پہلے ہی فزکس میں پی ایچ ڈی کر چکا تھا۔ ان تینوں کا شمار یونیورسٹی کے ذہین ترین طلبا میں ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو ان کے علم کے سامنے ان کے اساتذہ خود کو کم تر محسوس کرنے لگتے تھے۔ ان کے بارے میں پیش گوئی کی جاتی تھی کہ آنے والے دور میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں ان کا ہاتھ ضرور ہوگا۔ ان کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ یکایک دنیا کے سیاسی حالات بدلنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بدلتے حالات ان پر بھی اثر انداز ہوں گے کیونکہ وہ اس وقت کی تین سپر پاورز سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی امریکا، جاپان اور جرمنی۔

☆☆☆

جاپان کی چھوٹی سی بندرگاہ کوشیرو پر بڑے بحری جہاز لنگر انداز کرنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے سابق ڈسٹرائر ''یوکی آئیوا'' ساحل سے کچھ دور گہرے سمندر میں تھا۔ اس روز بندرگاہ پر سخت حفاظتی انتظامات تھے اور اسے ایک فوجی دستے نے گھیر رکھا تھا۔ صبح سورج نمودار ہوتے ہی پانچ درمیانی فوجی ٹرکوں پر مشتمل ایک کانوائے آکر بندرگاہ کی واحد برتھ پر رکا اور اس میں سوار مخصوص لباس والے فوجی نیچے اتر آئے۔ انہوں نے

دوسرے تمام افراد کو وہاں سے دور ہٹا دیا تھا۔ اس کے بعد ایک کرین ٹرکوں پر لدے ہوئے لکڑی کے کریٹ باری باری ایک درمیانے درجے کی جنگی کشتی کے عرشے پر منتقل کرنے لگی۔ یہ مضبوط لکڑی سے بنے ایسے کریٹ تھے جو چاروں طرف سے بند تھے۔ ان پر کوئی نشان بھی نہیں تھا، نہ کوئی نمبر اور نہ کچھ لکھا تھا۔ ان کریٹس کو مخصوص لباس والے فوجی رکھوا رہے تھے اور وہی انہیں باندھ رہے تھے۔ سمندر طوفانی تھا اور کھلے سمندر میں اگر کشتی زیادہ ڈولتی تو ان کریٹس کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ کچھ دور جاپانی بحریہ کے چند اعلیٰ افسران کے ساتھ سویلین حکام بھی تھے اور ان میں ایک شخص علیحدہ کھڑا تھا۔ ان کریٹس کو یہاں تک لانے میں اس شخص کا زیادہ ہاتھ تھا۔ جیسے ہی تمام کریٹس جن کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی، کشتی پر بار کیے گئے، کشتی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ مخصوص لباس والا فوجی دستہ اس کے ساتھ تھا۔ اب اعلیٰ فوجی اور سویلین حکام دوربین سے دیکھ رہے تھے۔ کشتی بحری جہاز یوکی آئیوا کے پاس پہنچی اور پھر کریٹس اس پر منتقل کیے جانے لگے۔

یوکی آئیوا پر کریٹ چڑھانے کا کام جنگی قیدیوں سے لیا جا رہا تھا۔ یہ خاصے وزنی کریٹ تھے اور چار جنگی قیدی مل کر ایک کریٹ جس طرح اٹھا رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ ہر کریٹ کا وزن کم سے کم دو سو کلوگرام ضرور ہے۔ دو گھنٹے کی سخت جدوجہد کے بعد سارے کریٹس بحری جہاز پر پہنچا دیے گئے۔ جب کریٹس مخصوص جگہ رکھ دیے گئے اور انہیں زنجیروں سے باندھ دیا گیا تو جاپانی فوجی جنگی قیدیوں کو جہاز کے عرشے کے کنارے پر لائے اور پھر ایک فوجی باری باری انہیں شوٹ کرنے لگا۔ شوٹ کرنے والا بھی مخصوص لباس میں تھا اور وہ جسے شوٹ کرتا، اسے لات مار کر سمندر میں گرا دیتا تھا۔ چند منٹ میں اس نے ان دو درجن قیدیوں کو شوٹ کر دیے۔ اب عرشے کو پانی سے دھویا جا رہا تھا۔ یہ کام ہوتے ہی بحری جہاز وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ساحل پر موجود حکام خوش ہو رہے تھے البتہ الگ تھلگ شخص خاموش تھا۔ اس کے تاثرات میں دبا دبا دکھ تھا۔ اس نے دھوپ کا چشمہ پہنا اور ایک طرف کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

سوا دو سال پہلے جاپانی حملے کا شکار ہونے والے پرل ہاربر نامی امریکی بحری اڈے پر اب بھی تعمیراتی کام جاری تھا۔ تعمیر کے ساتھ توسیع کا کام بھی ہو رہا تھا۔ اس نئے تعمیر ہونے والے ڈیک کے ساتھ ایک جدید آبدوز لنگر انداز تھی اور عملے کی بھاگ دوڑ سے لگ رہا تھا کہ جلد یہ سفر پر روانہ ہونے والی ہے۔ ڈیک پر اعلیٰ امریکی نیوی حکام کے ساتھ کچھ دیگر افراد بھی موجود تھے۔ ان میں ایک دبلا اور جوان شخص بھی تھا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سر پر فیلٹ ہیٹ تھا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے امریکی ایڈمرل سے پوچھا۔ ”یہ بوٹ اتنی تیز رفتار ہے کہ اپنا کام کر سکے گی؟“

ایڈمرل نے سر ہلایا۔ ”یہ امریکی نیوی میں شامل سب سے تیز رفتار آبدوز ہے۔ ممکنہ طور پر دنیا میں اس سے تیز رفتار آبدوز اور کوئی نہیں ہے۔“

”تم جانتے ہو اگر ہم نے یہ کام کر لیا تو کیا ہوگا؟“ سوال کرتے ہوئے ڈھیلے سوٹ والے کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

”ہاں۔“ ایڈمرل نے سر ہلایا۔ ”ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ جنگ اپنی مرضی سے ختم کر سکیں۔“

”صرف یہی نہیں، آنے والی ایک صدی تک تمام جنگیں امریکا کی مرضی سے شروع اور ختم ہوں گی۔“ جوان آدمی نے کہا اور مڑ کر چل پڑا۔ ایڈمرل حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہا تھا جس کا فوج اور جنگی حکمت عملی سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا، وہ ایک سائنس داں تھا مگر پیش گوئی کر رہا تھا کہ اس ایک مشن کی کامیابی کے بعد امریکا آنے والی ایک صدی تک کے لیے سپر پاور بن جائے گا۔ آبدوز سفر کے لیے تیار تھی۔ اشارہ ملتے ہی اس کے انجن حرکت میں آئے اور آبدوز دھیمی رفتار سے ڈیک سے باہر نکلنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ پرل ہاربر کی کھاڑی سے گزرتی ہوئی کھلے سمندر میں داخل ہو رہی تھی۔ گہرے پانی میں آتے ہی آبدوز نے غوطہ لگایا اور ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئی جس نے ٹھیک ڈھائی سال بعد دنیا کی تاریخ بدل دی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آبدوز کے اس سفر اور مشن کا امریکی دستاویزات میں کوئی ذکر نہیں تھا۔

جس وقت یوکی آئیوا نے جاپان سے اپنے سفر کا آغاز کیا، ٹھیک چوبیس گھنٹے پہلے سفر شروع کرنے والی ایک اور آبدوز انڈونیشیا کے بحیرۂ مولوکا سے اتنے ہی فاصلے پر تھی جتنے فاصلے پر یوکی آئیوا تھی مگر وہ ڈسٹرائر سے زیادہ تیز رفتاری سے اس طرف بڑھ رہی تھی۔ دونوں کے مشن الگ الگ تھے لیکن ان کی منزل ایک تھی لیکن صرف یوکی آئیوا اور امریکی آبدوز ہی نہیں ایک جرمن یو بوٹ کی منزل بھی بحیرۂ مولوکا تھی۔ جرمن یو بوٹ ایک ہفتہ پہلے بحر ہند میں داخل ہو چکی تھی اور اس وقت اتحادی جنگی جہازوں سے بچتے ہوئے انڈونیشیا کی طرف سفر کر رہی تھی۔ یو بوٹ کا یہ مشن اس حد

تک خفیہ تھا کہ بحیرۂ بالٹک سے روانگی کے وقت اس کے کپتان کو بھی منزل اور مشن کا علم نہیں تھا۔ اسے پانچ ٹاپ سیکرٹ لفافے دیے گئے تھے۔ یہ لفافے صرف تین اعلیٰ افسران کی موجودگی میں کھولے جا سکتے تھے اور ہر لفافے میں اگلے مرحلے تک کے لیے ہدایات موجود تھیں۔ پہلا لفافہ انہیں بحراوقیانوس میں پہنچ کر کھولنا تھا۔

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخری لفافہ انہیں بحیرۂ تیمور پہنچ کر کھولنا تھا اور جب یو بوٹ کے کپتان نے اپنے دو ماتحتوں کے سامنے یہ آخری لفافہ کھولا اور اس میں موجود ہدایات پڑھیں تو اس کا چہرہ شکنوں سے بھر گیا۔ اس نے کاغذ اپنے ماتحتوں کے سامنے رکھ دیا۔ ایک ماتحت نے پڑھا اور نفی میں سر ہلایا۔

''ہمارے پاس اسے رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔''

''لیکن ہمیں یہ کام کرنا ہوگا۔'' کپتان نے آہستہ سے کہا۔ ''حکم براہِ راست ڈیفنس منسٹری کی طرف سے آیا ہے تم اسے فیوہرر کا براہِ راست حکم سمجھ سکتے ہو۔''

ہٹلر کا نام آتے ہی ان کے چہرے لٹک گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ انہیں اپنی جان کی قیمت پر یہ مشن پورا کرنا تھا۔ وہ اس وقت بحیرۂ مولوکا سے چھ سو میل کی دوری پر تھے۔

☆☆☆

یوکی آئیوا بحیرۂ مولوکا میں داخل ہو چکا تھا اور چار طرف سے انڈونیشیا کے جزائر میں گھرا اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بحیرۂ مولوکا کے وسط میں ایک جرمن یو بوٹ اس کی منتظر ہوتی۔ جاپانی مطمئن تھے کیونکہ اس سمندر پر ان کی بحریہ کا مکمل قبضہ تھا۔ نزدیک ہی جزائر پر جاپانی فضائیہ کے طیارے بھی موجود تھے، کسی ہنگامی حالت میں مدد آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ انٹیلی جنس رپورٹ بھی اطمینان بخش تھی۔ اس کے مطابق اس خطے میں کوئی اتحادی جنگی جہاز یا آبدوز موجود نہیں تھی۔ بحیرۂ مولوکا میں داخل ہونے کے بارہ گھنٹے بعد جاپانی حکام کو یوکی آئیوا کی طرف سے ایک خفیہ پیغام ملا جس کے مطابق بحری جہاز نے اپنا مشن مکمل کر لیا تھا اور اس کے فوراً بعد یوکی آئیوا تارپیڈو کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب جاپانی فضائیہ کا ایک امدادی طیارہ اس مقام پر پہنچا تو وہاں سمندر پر سوائے چند تیرنے والی چیزوں اور لاشوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ جب تک جاپانی بحریہ کی کشتیاں وہاں پہنچیں، یہ سب بھی غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

یہ 27 ستمبر 2004ء کی ایک روشن صبح تھی۔ ایلی ناور بزنس سینٹر میں ایک کسی قدر دبی ہوئی اور غیر نمایاں بلڈنگ تھی۔ اس پر نہ شیشوں سے مینا کاری کی گئی تھی اور نہ ہی اس کا ڈیزائن نمایاں تر تھا۔ یہ ستر کی دہائی میں بننے والی ان عمارتوں میں سے تھی جن کی تعمیر میں خوب صورتی سے زیادہ مضبوطی کا خیال رکھا گیا تھا۔ اس وقت جوہانسبرگ نسلی تشدد کا شکار ایک خوفزدہ شہر تھا جہاں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایلی ناور کی واحد خاص بات اس کی پانچویں منزل پر جنوبی افریقہ گزٹ کا دفتر تھا۔ ایس اے گزٹ کے نام سے مشہور اس اخبار کا شمار ملک کے چند معروف اور سنجیدہ حلقوں میں پسند کیے جانے والے اخبارات میں ہوتا تھا۔ اخبار کی پالیسی آزادانہ تھی اس لیے نسلی امتیاز کے دور میں یہ حکومت کا ناپسندیدہ اخبار ہوتا تھا پھر وقت بدلا اور نسلی امتیاز مٹ گیا مگر حکومت کی ناپسندیدگی میں فرق نہیں آیا۔ دفتر چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا لیکن اصل چہل پہل دوپہر بارہ بجے کے بعد شروع ہوتی تھی جب اخبار کا عملہ آتا تھا۔

اخبار کا ہم نام ایس اے شا اپنی میز کے سامنے کرسی پر تقریباً ڈھیر تھا اور اسے بائیں آنکھ سے کم دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ساتھی رپورٹر میریا کا کہنا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت پر یہ بہت نمایاں تھا۔ بات یہ تھی کہ گزشتہ رات دفتر سے گھر جاتے ہوئے دو سیاہ فام لفنگوں نے عین اس وقت اسے گھیرا جب وہ کار سے اتر کر اپنے اپارٹمنٹ جا رہا تھا۔ مزاحمت پر اسے موبائل اور رقم سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ خاص طور سے بائیں آنکھ پر لگنے والی ضرب نے اسے رنگین کر دیا تھا۔ یہ استعارہ بھی میریا کی ایجاد تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ سیاہ آنکھ کے ڈیلے میں سرخی تھی اور آنکھ کے آس پاس جلد بینگنی ہو رہی تھی تو اسے رنگین ہی کہیں گے۔ دفتر آنے سے پہلے اس نے ڈاکٹر کو آنکھ دکھائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ سب ٹھیک ہے بس وہ دو تین دن آنکھ کی ٹکور کرتا رہے۔ وہ چھٹی کرتا نہیں تھا اور اس وقت کسی سے سامنا کرنے کا موڈ نہیں تھا اس لیے خاموشی سے اپنے کیبن میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوش رو اور متوسط جسامت کا شخص تھا۔ اس کے ہلکے بھورے بال اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

''اے شا......'' کسی نے چلا کر کہا تو اس نے کرسی ذرا پیچھے کر کے گردن باہر نکالی۔ ریسپشن پر بیٹھا لڑکا کسی خاتون سے بات کر رہا تھا۔ اس کی پشت اس کی جانب تھی اس لیے وہ صرف اتنا دیکھ سکا کہ خاتون نے سرخ اسکرٹ

اور اس پر سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسکرٹ میں اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں تھیں۔ لڑکے نے اسے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاتون سے کچھ کہا تو اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایس اے شا جلدی سے اندر ہو گیا۔ اس نے خاتون کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ اس وقت کسی خاتون کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر کچھ دیر بعد اس کے کیبن کے دروازے پر سرخ اسکرٹ نمودار ہوا تو مجبوراً اسے دیکھنا پڑا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ لڑکی کے نقوش مشرق بعید سے تعلق رکھتے تھے۔ گداز ہونٹوں کے اوپر مخصوص بناوٹ کی لیکن دلکش ناک اور کھنچی ہوئی آنکھیں جن کے لیے کمان کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی تھی۔ رنگت زرد کے بجائے گلابی اور بے داغ جلد بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے لائٹ گولڈن بال پونی ٹیل کی صورت میں باندھے ہوئے تھے۔ اس کے شانے سے ایک بیگ لٹک رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور ہاتھ بڑھا دیا۔

''ایس اے شا؟''

''یس۔'' اس نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ اتنی خوب صورت لڑکی کے سامنے اس صورت کے ساتھ آنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اس کی چوائس نہیں تھی۔ اس نے لڑکی کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔

''آشی ہیروکی، میں ٹوکیو ٹائمز میں صحافی ہوں۔''

''جاپان۔'' وہ حیران ہوا۔

''ہاں میں تم سے ملنے آئی ہوں۔''

''جاپان سے؟'' وہ مزید حیران ہوا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا میری شہرت جاپان تک پہنچ گئی ہے۔ تم یقیناً اس واقعے کی کوریج کرنے نہیں آئی ہو گی۔'' اس نے اپنی مضروب آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ آشی مسکرائی۔

''نہیں یہ واقعہ یقیناً تازہ ہے۔ میں تمہارا آرٹیکل پڑھ کر یہاں آئی ہوں۔''

''کون سا آرٹیکل؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے کیبن میں کسی دوسرے فرد کے بیٹھنے کی تو کیا کھڑے ہونے کی بھی گنجائش نہیں تھی اس لیے آشی دروازے پر ہی کھڑی تھی۔

''کانگو کا تاریخی فراڈ۔''

''اوہ اچھا...'' اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن یہاں تو اسے کچرا قرار دیا گیا ہے۔ میرے ایڈیٹر نے خبردار کیا ہے اگر آئندہ میں نے اس قسم کا کوئی آرٹیکل لکھا تو مجھے فائر کر دیا جائے گا۔''

''سب اسے کچرا قرار دیں گے۔'' آشی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جو لوگ حقیقت سے واقف ہیں، وہ اسے کچرا قرار نہیں دیں گے۔''

آشی بہترین انگلش بول رہی تھی۔ شا نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے اسے انٹرنیٹ پر شائع کر دیا۔''

''میں نے اسے نیٹ پر ہی پڑھا ہے اور اسی وجہ سے میں یہاں آئی ہوں۔''

''اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

آشی نے کن انکھیوں سے آس پاس دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ''یہاں نہیں، کسی اور جگہ بتاؤں گی۔''

شام کے چار بج رہے تھے۔ اس نے لنچ نہیں کیا تھا اور اب لنچ کا وقت بھی نہیں تھا۔ البتہ ایلی ٹاور کے نزدیک ایک کیفے میں سینڈوچز اور کافی مل سکتی تھی۔ اس نے اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''باہر چلتے ہیں۔''

آشی خوش ہو گئی۔ ''میں بھی یہی کہہ رہی ہوں، میں شکر گزار ہوں تم میرے لیے وقت نکال رہے ہو۔''

''شکریے کی ضرورت نہیں، اب میں بھی متجسس ہوں کہ اس آرٹیکل میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

دس منٹ بعد وہ کیفے کے بیرونی حصے میں موجود تھے۔ اس نے بڑا ایک سینڈوچز اور کافی کا آرڈر دیا۔ آشی نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا البتہ کافی کے لیے رضامند تھی۔ ویٹر کے جاتے ہی اس نے پوچھا۔ ''پہلے میں جاننا چاہوں گی تم نے یہ موضوع کیوں چنا؟''

اس نے اپنے بال سنوارے۔ ''اس کا جواب تو مشکل ہے دراصل میں ایک سیریز کر رہا ہوں افریقہ کے تاریخی فراڈز کے نام سے.... یہ بھی اسی سیریز کا ایک آرٹیکل ہے۔''

''میں جاننا چاہتی ہوں تم نے اسے کیوں اور کیسے چنا؟'' آشی نے زور دے کر سوال دہرایا۔

اس نے گہری سانس لی۔ ''دراصل میں نے اپنے پاپا سے اس بارے میں سنا تھا، مجھے اچھا لگا اور جب میں سیریز آرٹیکل لکھ رہا تھا تو اسے بھی شامل کر لیا۔''

''یعنی اس آرٹیکل میں جو معلومات ہیں، وہ دراصل تمہارے پاپا نے تمہیں دی ہیں؟''

''بالکل... کیونکہ وہ اس زمانے میں کانگو میں تھے اور انہوں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''تمہاری ذاتی معلومات کس حد تک ہیں؟''

''نہ ہونے کے برابر۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن آرٹیکل کا ایک ایک لفظ مصدقہ ہے۔''

''کیسے ... صرف تمہارے پاپا گواہ ہیں، کیا کوئی ثبوت بھی ہے۔''

''پاپا نے مجھے کچھ تصاویر دکھائی تھیں۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''دو دستاویزات بھی ہیں۔''

آشی نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم صحافی ہو، کیا تمہارے خیال میں وہ تصاویر اور دستاویزات کافی ہیں کہ ان کی بنیاد پر اتنا بڑا دعویٰ کیا جائے؟''

شا کا چہرہ سخت ہو گیا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے تصویروں اور دستاویزات سے زیادہ اپنے باپ پر بھروسا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ سو فیصد درست کہہ رہے ہیں۔''

''اوہ۔'' آشی نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے تمہارے پاپا کم سے کم پچھتر سال کے ہوں گے۔''

''ستتر۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''جب وہ کانگو میں تھے تو ان کی عمر بیس سال تھی۔ وہ ڈپلوما حاصل کر کے وہاں تربیت حاصل کر رہے تھے۔''

''اسی کان میں؟''

''نہیں، اس سے کچھ دور سونے کی ایک کان تھی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کان کا تو آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔''

''سنو میں تمہارے والد سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''مس آشی ہیروکی تم نے اب تک اپنے بارے میں بس اتنا بتایا کہ تمہارا تعلق جاپان سے ہے۔''

اس نے خاموشی سے اپنا بیگ کھولا اس میں سے اپنا پاسپورٹ، ڈرائیونگ لائسنس اور پریس کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ٹوکیو ٹائمز کی رپورٹر تھی۔ تینوں چیزوں پر اس کی تصویر نمایاں تھی۔ اس نے تینوں چیزوں کو غور سے دیکھا اور مطمئن ہو کر پوچھا۔ ''تم ڈیوٹی پر ہو؟''

''صحافی ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔'' آشی نے مبہم جواب دیا۔

''او کے، تم ڈیوٹی پر ہو تب بھی اس موضوع سے دلچسپی کی وجہ..... صحافی بے شک ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتے ہیں لیکن وہ کوئی کام بلاوجہ نہیں کرتے ہیں؟''

آشی نے اس بار پھر بیگ سے کچھ پرنٹ آؤٹ نکالے اور اس کے سامنے رکھ دیے۔ ویٹر سینڈوچز اور کافی لے آیا تھا۔ شا ان سے انصاف کرتے ہوئے پرنٹ آؤٹ دیکھنے لگا۔ یہ ٹوکیو ٹائمز میں شائع ہونے والے چند آرٹیکلز تھے جو آشی نے لکھے تھے۔ آرٹیکلز دوسری جنگِ عظیم میں جاپانی بحریہ کی طرف سے ایک خفیہ مشن کے بارے میں تھے۔ یوکی آئیوا نامی سب چیزر ڈسٹرائر ایک پُراسرار مشن پر روانہ ہوا اور وہ دو اپریل 1943 کے دن انڈونیشیا کے سمندر بحیرۂ مولوکا میں امریکی آبدوز کی طرف سے تارپیڈو کر دیا گیا۔ جاپانی بحریہ کے ریکارڈ میں اس بحری جہاز کے بارے میں صرف اتنا موجود تھا کہ وہ جنگی قیدی لینے انڈونیشیا گیا تھا اور وہاں اسے تارپیڈو کر دیا گیا۔ یوکی آئیوا کے ایک سو بارہ افراد کے عملے میں سے کوئی فرد زندہ بچ کر وطن واپس نہیں آیا اور نہ ہی جاپان نے جنگ کے بعد ان افراد کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے آرٹیکل میں پرل ہاربر ہوائی کے بحری اڈے سے ایک امریکی آبدوز کی روانگی کا قصہ تھا۔ یہ آبدوز یوکی آئیوا کی انڈونیشیا کی طرف روانگی سے ٹھیک ایک دن پہلے پرل ہاربر سے نکلی تھی اور اس کا مشن نامعلوم تھا۔ بعد میں امریکی بحریہ کے ریکارڈ کے مطابق آبدوز نے انڈونیشیا کی سمندری حدود میں جاپانی جنگی جہاز یوکی آئیوا کو نشانہ بنایا اور اس کے فوراً بعد وہ واپس پرل ہاربر آ گئی۔

تیسرا آرٹیکل کینیڈا میں یورینیم کی کان گریٹ بیئر جھیل کے بارے میں تھا۔ شمالی قطب کے پاس یہ جگہ سال میں سات آٹھ مہینے برف سے ڈھکی رہتی تھی۔ گریٹ بیئر جھیل میں کان کی دریافت بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی اور ایک کینیڈین فرم نے یہاں سے ریڈیم نکالنا شروع کیا، اس وقت ریڈیم دنیا کی قیمتی ترین دھات تھی۔ یورینیم کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی لیکن جب ایک جرمن سائنس داں اوٹو ہان نے دریافت کیا کہ یورینیم کے ایٹم توڑے جا سکتے ہیں تو یکایک یہ دھات اہمیت اختیار کر گئی۔ آرٹیکل کے مطابق امریکا نے مختلف اوقات میں گریٹ بیئر کی کان سے ہزاروں ٹن یورینیم کے آرڈرز دیے لیکن مین ہٹن پروجیکٹ کی تکمیل تک صرف دو سو بیس ٹن خام یورینیم فراہم کی جا سکی تھی۔

یہ آرٹیکل پڑھتے ہوئے شا تمام سینڈوچز صاف کر چکا تھا اور کافی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ویٹر سے دوسری کافی منگوائی اور آشی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب میں سمجھ گیا کہ تم جاپان سے یہاں کیوں آئی ہو۔''

آشی نے کہا۔ ''امریکیوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے 1942 میں بیلجین کانگو کی اس کان سے بارہ سو ٹن خام یورینیم منگوایا۔ کیونکہ کینیڈا سے انہیں جو یورینیم ملی تھی وہ واشنگٹن یونیورسٹی کے تجرباتی ری ایکٹر کو فیول دینے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ بم سازی کے لیے اس سے کہیں زیادہ مقدار میں یہ قیمتی دھات درکار تھی۔''

''سوال یہ ہے کہ امریکیوں نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟''

آشی نے کافی کا سپ لیا۔ ''کینیڈا کی کان کئی سالوں سے استعمال ہو رہی تھی وہاں کان کنی کے لیے اس وقت کے لحاظ سے جدید ترین مشینری اور آلات دستیاب تھے۔ تربیت یافتہ کان کن تھے۔ اس کے باوجود وہ کئی شپ منٹس کی صورت میں صرف دو سو بیس ٹن خام یورینیم دے سکی۔ اس کے مقابلے میں بلجیئن کانگو کی کان پسماندہ ترین علاقے میں تھی وہاں مشینری اور سہولتیں بھی دستیاب نہیں تھیں اور نہ ہی یورینیم نکالنے کے لیے تربیت یافتہ کان کن تھے۔ اس کے باوجود آرڈر ہونے کے چند مہینے کے اندر بارہ سو ٹن یورینیم نیو یارک کی بندرگاہ پر پہنچ گئی تھی۔''

اس نے غور سے آشی کو دیکھا۔ ''تمہارے خیال میں یہ ناممکن ہے کیا؟''

''اگر اس وقت امریکا کی جنگی مشینری اور صلاحیت دیکھی جائے تو یہ کام ناممکن نہیں تھا۔ اس کی فوج خود کان کا انتظام سنبھال کر مہینوں میں اس سے بھی زیادہ یورینیم مہیا کر سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کام امریکیوں نے نہیں کیا بلکہ پرائیویٹ فرم کے توسط سے یہ یورینیم حاصل کی۔ یہ پراسرار فرم اس ایک شپ منٹ کے بعد غائب ہو گئی اور پھر اس کا نام بھی کہیں سننے میں نہیں آیا۔ اس کے مقابلے میں کینیڈین کان خود کینیڈا کی حکومت نے سنبھال لی تھی اور وہاں سرکاری پیمانے پر کان کنی ہو رہی تھی۔ کان کنوں کی کمی پوری کرنے کے لیے وہاں صدیوں سے آباد قبائل کو بھرتی کیا گیا۔ وہ جدید دنیا سے قطعی ناآشنا تھے اور صرف مچھلی اور ریچھ کے شکار سے گزر بسر کرتے تھے۔ ان قبائلیوں کو بغیر حفاظتی لباس کے یورینیم کی کان کنی پر لگا دیا گیا اور وہ کپڑے کے تھیلوں میں خام یورینیم بھر کر کان سے باہر لاتے رہے۔ ان میں سے بیشتر بعد میں کینسر کا شکار ہو کر مر گئے۔''

''اس کے باوجود کینیڈا مین ہٹن پروجیکٹ کے لیے دو سو بیس ٹن سے زیادہ خام یورینیم فراہم نہیں کر سکا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امریکا کی استعداد کمزور تھی، وہ بہرحال کہیں سے بھی یورینیم حاصل کر سکتا تھا۔''

''لیکن کہاں سے؟'' آشی نے سوال کیا۔ ''مسئلہ یہ نہیں ہے کہ امریکیوں نے یورینیم کہیں اور سے حاصل کی تھی، مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس بارے میں جھوٹ کیوں بول رہے تھے؟''

''یہ بات طے شدہ ہے کہ بارہ سو ٹن کانگو یورینیم والی بات جھوٹ ہے۔ 1942 میں یہاں کان کنی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ 1946 میں بھی کان کنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس سے اگلے سال شروع ہوئی تھی اس کے لیے عملہ اور مشینری یورپ اور امریکا سے آئی تھی۔ کان کنی کا آغاز جس گروپ نے کیا اس میں میرے پاپا شامل تھے۔'' شا نے کہتے ہوئے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''سوری مجھے واپس جانا ہے۔ میرا ایڈیٹر جلے پاؤں کی بلی بنا ہوگا اور جب میں واپس جاؤں گا تو وہ یوں بن جائے گا جیسے مجھے جانتا ہی نہیں ہے۔''

آشی مسکرائی۔ ''دوبارہ کب ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''جانے کا دل کس کا چاہ رہا ہے۔'' شا نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے اپنا نمبر دے دو، اور تم کہاں ٹھہری ہو؟''

آشی نے اسے نمبر دیا اور ہوٹل کا پتا بتا دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد اس سے رابطہ کرے گا اور ایلی ٹاور کی طرف بڑھ گیا۔ آشی اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ ناواقف تھی کہ سڑک کے پار کھڑی ایک سیاہ شیشوں والی کار سے ایک کیمرا اس پر مرکوز ہے۔

☆☆☆

لینگلے میں امریکی سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں جان پال اپنے دفتر میں تھا جب ایک ماتحت نے لفافہ لا کر اس کے سامنے رکھا اور خاموشی سے چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ لفافے میں کیا ہے اس لیے اس نے کھولنے کی زحمت نہیں کی ویسے بھی لفافہ کسی اور کے لیے تھا۔ تقریباً چالیس سال کا اور طویل قامت جان پال سوچ میں گم تھا۔ شرٹ میں اس کا مضبوط جسم پھنسا ہوا لگ رہا تھا اور پستول کے ہولسٹر نے اسے مزید جکڑ لیا تھا مگر وہ اس کا عادی تھا۔ گزشتہ پندرہ سال سے وہ چوبیس میں سے بارہ گھنٹے اسی ہولسٹر کے ساتھ گزارتا تھا۔ ٹھیک پانچ بجے اس نے اٹھ کر کوٹ پہنا اور لفافہ کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور گھر کے بجائے واشنگٹن سے باہر روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل ایسٹن نامی چھوٹا شہر تھا۔ سوا گھنٹے بعد وہ اس کے نواحی علاقے میں پتھر اور لکڑی سے بنے اس دو منزلہ خوبصورت مکان کے سامنے رکا۔ ڈرائیو وے اور آگے لان میں خزاں کے پتے اُڑ رہے تھے اور موسم سرد ہو چلا تھا۔ وہ کار سے اتر کر دروازے پر آیا اور دستک دی دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور سامنے بہت بوڑھا شخص کھڑا تھا۔

''جان...!'' اس نے گرمجوشی سے کہا۔

''ہائے گرینڈ پا.....'' وہ کہتا ہوا اندر آ گیا۔ بوڑھا شخص پچانوے سالہ جان پال سینئر تھا۔ جان پال نے اپنا کوٹ اتارا اور بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ''میں آپ کے لیے کچھ لایا ہوں۔''

بوڑھا جان پال اس عالی شان مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ گزشتہ تیس سال سے یہاں رہ رہا تھا اور اپنی دیکھ بھال اس عمر میں بھی خود کر لیتا تھا۔ ایک ملازمہ آ کر اس کے لیے کھانا بنا جاتی تھی۔ اس کے علاوہ گھر کی صفائی اور دوسرے کام کر جاتی تھی مگر وہ بس چند گھنٹے رہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سارا وقت اکیلے ہی گزارتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ ٹھیک اور صحت مند تھا۔ اسے کوئی بیماری نہیں تھی اور وہ اپنے بہت سے کام بھی خود کر لیتا تھا۔ اس دنیا میں جان اس کا پوتا اس کا واحد خونی رشتے دار تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار اس سے ملنے آتا تھا لیکن اس کا یہ دورہ غیر متوقع تھا اس لیے بوڑھا جان پال جان گیا کہ وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ کچن میں بیٹھے تھے۔ جونیئر جان پال کافی پی رہا تھا اور سینئر جان پال اس کا لایا ہوا لفافہ کھول کر دیکھ رہا تھا۔ اس میں کچھ تصاویر اور کچھ پرنٹ شدہ کاغذات تھے۔ بوڑھا جان پال دیکھتا رہا اور اس کے ماتھے پر شکنیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ آخر میں اس نے وہ سب دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔

''تم مجھے یہ سب دکھانے لائے ہو؟'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

جونیئر جان پال نے سر ہلایا۔ ''ویسے یہ میری ذمے داری ہے لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو بھی دکھا دوں۔''

''تمہیں اپنی ذمے داری بہر صورت پوری کرنا ہو گی۔'' بوڑھے نے زور دے کر کہا۔ ''یہ راز ہر صورت راز رہنا چاہیے۔''

''میں سمجھتا ہوں گرینڈ پا..... لیکن یہ ہمیشہ چھپ نہیں رہے گا۔''

''مگر میری زندگی کی حد تک اسے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ میں کسی کی نظروں میں اپنی تضحیک برداشت نہیں کر سکتا۔ تم جانتے ہو ایسا ہوا تو میں کیا کروں گا؟''

جونیئر پال نے سر ہلایا۔ وہ جانتا تھا اس کا دادا یہ ذلت برداشت نہیں کرے گا۔ وہ گزشتہ ساٹھ سال سے معزز ترین امریکیوں کی فہرست میں شامل تھا۔ بہت سی جگہوں پر وہ پروٹوکول سے مستثنیٰ تھا۔ وہ کسی بھی سرکاری عہدیدار سے بغیر اپائنٹ منٹ ملاقات کر سکتا تھا۔ ہر اہم سرکاری تقریب میں اسے لازمی مدعو کیا جاتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ بہت کم تقریبات میں شریک ہوتا تھا۔ وہ اہم امور میں حکومت کا غیر سرکاری مشیر تھا اور اس نے یہ عزت بہت محنت سے حاصل کی تھی۔ آخری عمر میں وہ اسے گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مر جانا اس کے لیے آسان تھا۔ جونیئر پال نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''گرینڈ پا آپ فکر مت کریں یہ لوگ ناکام رہیں گے۔ اگر میں انہیں روک نہیں سکا تو انہیں صفحۂ ہستی سے نابود کر دوں گا... آپ جانتے ہیں میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

بوڑھے جان کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیسے یہ کام کرو گے، میرا نہیں خیال کہ اس میں حکومت یا کمپنی (سی آئی اے) شامل ہو گی۔''

''آپ جانتے ہیں میں اکیلا بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔'' جونیئر پال کا لہجہ یقین دلانے والا تھا۔ ''میں خود وہاں جا رہا ہوں۔''

اس بار بوڑھے جان نے سکون محسوس کیا، وہ جانتا تھا کہ اس کا پوتا دنیا کی طاقتور ترین مملکت کی طاقتور ترین ایجنسی میں ایک ایسے عہدے پر تھا..... جہاں وہ سب کر سکتا تھا۔

☆☆☆
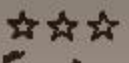
عمیر احمد اپنے چھوٹے سے گھر کے باغ میں پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے دو ہی مشاغل تھے۔ ایک باغبانی اور دوسرے کتابیں پڑھنا۔ ان کی اسٹڈی کی لائبریری میں کوئی دس ہزار کتابیں تھیں۔ ہر مہینے کوئی سو کے قریب رسائل اور کتابیں ان کے پاس آتی تھیں اور ان کی پنشن کا بیشتر حصہ اسی میں خرچ ہو جاتا تھا لیکن رقم مسئلہ نہیں تھی انہوں نے بہت کمایا اور بچایا بھی تھا۔ یہ خوب صورت گھر بھی انہوں نے اپنی کمائی سے بنایا تھا۔ ان کے چار بچے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی، سب شادی شدہ اور اپنے گھر کے تھے۔ گھر میں بس وہ اور ان کی بیوی رافعہ رہتے تھے۔ بیٹی اور بڑا بیٹا ظہیر احمد ڈربن میں رہتے تھے اس لیے ہفتے میں ایک بار لازمی آتے تھے۔ کبھی وہ بیٹی یا بیٹے سے ملنے چلے جاتے تھے۔ دوسرا بیٹا نذیر پریٹوریا میں سرکاری ملازم تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا نمیر تھا۔ بس وہی غیر شادی شدہ تھا اور اس کا ابھی شادی کا ارادہ بھی نہیں تھا۔

عمیر احمد کا تعلق جنوبی ایشیا سے تھا۔ ان کے والد

کاروباری تھے اور وہ بزنس کے لیے جنوبی افریقہ آئے تھے۔ یہاں انہوں نے کانوں میں سرمایہ لگایا اور چند سالوں میں آسودہ حال ہو گئے تھے تب انہوں نے بیوی بچوں کو بھی یہیں بلالیا، اس وقت برصغیر تقسیم کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ عمیر احمد نے اسکول کی تعلیم جنوبی افریقہ میں حاصل کی۔ ان کے دو بھائی اور تھے۔ وہ باپ کے ساتھ کاروبار میں لگے رہے لیکن عمیر احمد نے تعلیم کو ترجیح دی۔ کالج کی تعلیم مکمل کر کے وہ کچھ عرصے تربیت حاصل کرتے رہے۔ پھر انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور اپنے شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ساری عمر ملازمت کی تھی جبکہ ان کے بھائی کاروبار کرتے رہے۔ باپ کے بعد ان کی وراثت سے عمیر احمد کو بھی حصہ ملا لیکن انہوں نے کبھی کاروبار کا نہیں سوچا۔ وہ اپنی ملازمت اور اپنے کیریئر سے مطمئن تھے۔ اگر ان کے بھائی پُرتعیش زندگی بسر کرتے تھے تو وہ بھی ایک خوب صورت مکان میں پُرآسائش زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی بچوں کو سب دیا تھا۔ دو ہفتے پہلے انہوں نے اپنے باغ میں نیمن گراس لگائی تھی اور اس کے پودے خاصے بڑے ہو گئے تھے۔ وہ ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ اندر سے رافیہ کارڈلیس فون لیے نکلیں وہ کسی سے بات کر رہی تھیں اور لہجہ بتا رہا تھا کہ کوئی برخوردار ہے۔ وہ بیٹوں سے بہت محبت کرتی تھیں، بیٹی اگرچہ اکلوتی تھی مگر ان کی اتنی لاڈلی نہیں تھی اسے انہوں نے سخت گیر ماں بن کر پالا تھا اور ذرا بھی رعایت نہیں دی تھی جس کا عافیہ آج بھی شکوہ کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ امی کی ساری محبت بیٹوں کے لیے ہے اس کے برعکس عمیر احمد بیٹی کے دیوانے تھے۔ یوں گھر میں محبتوں کا توازن قائم تھا۔

"آپ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔" رافیہ نے عمیر احمد کی سوالیہ نظروں کا جواب دیا۔ "لیں بات کریں۔"

"السلام علیکم پاپا۔" سمیر کی آواز آئی۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں بیٹا تم کیسے ہو؟"

"پاپا میں شاید اس ویک اینڈ پر گھر آؤں۔"

"تو آجاؤ اس میں اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے پاپا۔" سمیر نے کہا اور پھر وجہ بتائی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ٹھیک ہے بیٹا تم آجاؤ پھر اس پر بات ہوتی ہے۔"

"پاپا کوئی مسئلہ ہے؟"

"ممکن ہے لیکن اس کا تعلق تمہارے آنے یا نہ آنے سے نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے پاپا، میں کل شام تک آجاؤں گا۔"

☆☆☆

آشی جوہانسبرگ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم تھی۔ وہ دو دن پہلے ہی یہاں پہنچی تھی۔ شا سے ملاقات کر کے وہ ہوٹل واپس آئی تو اس کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک سیاہ رنگ کی کار مسلسل اس کی ٹیکسی کے پیچھے تھی۔ وہ ہوٹل تک اس کے ساتھ آئی تھی۔ آشی نے اپنے کمرے میں آکر باہر ڈونٹ ڈسٹرب کا بورڈ لگا دیا اور فون آپریٹر سے کہا کہ اسے کوئی کال منتقل نہ کی جائے۔ پھر اس نے اپنا چھوٹا سا لیکن جدید ترین لیپ ٹاپ نکالا اور اسے ہوٹل کے وائی فائی سسٹم سے منسلک کیا۔ نیٹ پر آنے کے بعد اس نے ایک میسنجر آن کیا اور فوراً ہی اسے کال آن کا میسج آیا، اس نے میسج ریسیو کیا تو اسکرین پر ایک معمر جاپانی کی صورت سامنے آئی۔ اس نے محبت سے آشی کی طرف دیکھا۔ "میری بچی، میں تمہارے لیے فکرمند ہوں۔"

"میں ٹھیک ہوں گرینڈ پاپا۔" آشی نے کہا۔ وہ رین ہیروکی تھا اس کا نانا.... آشی کی پرورش اسی نے کی تھی۔ اس کی ماں اس وقت انتقال کر گئی تھی جب وہ صرف سات برس کی تھی۔ آشی کا باپ ایک مصروف بزنس مین تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود آشی کو وقت نہیں دے پاتا تھا اس لیے رین نے نواسی کو اس سے مانگ لیا تھا۔

رین شمالی جاپان میں رہتا تھا اور آشی کا باپ گورشی جو رین کا سگا بھتیجا تھا ٹوکیو میں رہتا تھا۔ سات سال کی عمر میں آشی نانا کے پاس شمالی جاپان آگئی۔ ہیروکی خاندان کا دھاتوں کا کاروبار تھا۔ کئی نسلوں سے وہ اس پیشے سے منسلک تھے۔ ایک زمانے میں وہ شاہی خاندان کے لیے دھات کی اشیا تیار کرتے تھے اور انہیں اسلحہ سازی کے ٹھیکے ملتے تھے پھر جاپان صنعتی دور میں داخل ہوا تو ہیروکی اس شعبے میں آگئے اور ملک کی پہلی جدید اسٹیل مل انہوں نے قائم کی تھی۔ رین ہیروکی اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس نے دھاتوں کی صفائی کے شعبے میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وہ امریکا سے پڑھ کر آیا اور اس نے اپنے خاندانی بزنس کو جدید خطوط پر قائم کیا۔ بہت کم عمری میں وہ جاپانی حکومت کا مشیر بن گیا تھا اور اس حیثیت میں اس نے اپنے ملک کے لیے بے شمار خدمات انجام دی تھیں۔

پھر خرابیِ صحت کی وجہ سے وہ ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہو گیا۔ اب بزنس اس کے بیٹے دیکھ رہے تھے اور وہ اپنے عالی شان گھر میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا۔ ایسے میں آشی کی آمد نے اسے جیسے جینے کا بہانہ فراہم کر دیا تھا، وہ اپنی نواسی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ آشی تیرہ برس اس کے پاس رہی۔ پھر وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے رین کے پاس سے چلی آئی۔ اس نے صحافت کا انتخاب کیا اگرچہ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ بزنس پڑھے اور اس کا ہاتھ بٹائے مگر آشی نے اپنا کیریئر خود منتخب کیا۔ آشی اپنے نانا سے باقاعدگی سے رابطہ رکھتی تھی۔ وہ ہر دوسرے مہینے چند دن کے لیے اس کے پاس جاتی تھی۔ آرام اور پُرسکون زندگی گزارنے سے رین ہیروکی کی صحت بہتر ہوئی تھی لیکن اس کے خیال میں اس کا اصل کریڈٹ آشی کو جاتا تھا۔

چند مہینے پہلے آشی دو دن کے لیے رین کے پاس گئی تو اسے کمزور دیکھ کر فکرمند ہو گئی۔ رین نے اس سے چھپانا چاہا لیکن جلد اس نے اعتراف کر لیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ برسوں پہلے ایک کام کے دوران اس کے جسم پر جو منفی اثرات پڑے تھے علاج سے ان کا اثر بہ ظاہر زائل ہوا تھا لیکن وہ اس کے دل پر اثر چھوڑ گئے تھے اور اب اس کا دل بتدریج کمزور ہو رہا تھا۔ آشی فکرمند ہو گئی۔ ”گرینڈ پا اس کا کوئی علاج ہوگا؟“

”نہیں اس کا کوئی علاج نہیں ہے، ڈاکٹرز کا کہنا ہے میں یا تو دل تبدیل کرا لوں یا پھر مصنوعی دل پر گزارا کروں اور یہ دونوں کام مجھ سے نہیں ہوں گے۔ میں اپنے اصل دل کے ساتھ زندہ رہنا اور مرنا چاہتا ہوں۔“

آشی رونے لگی مگر وہ نانا کے فیصلے سے متفق تھی۔ اس نے رین سے کہا۔ ”میں آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

”تمہاری جاب ہے۔“

”میں یہیں کام کر لوں گی ورنہ استعفا دے دوں گی۔“

”نہیں، ٹوکیو ٹائمز میں اتنی آسانی سے جاب نہیں ملتی ہے۔ تم کام کرتی رہو اور موقع ملے تو میرے پاس آ جانا۔ میں اس میں بھی خوش رہوں گا۔ یہاں رہ کر تم صرف دکھی ہو گی، میں چاہتا ہوں تم خوش رہو۔“

آشی نے رین کی بات مان لی لیکن اس نے ضد کر کے اپنا قیام ایک ہفتے تک بڑھا لیا۔ آشی کا خیال تھا کہ اس کے نانا کی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے چھپا نہیں ہے۔ لیکن ایک رات پرانی یادیں دہراتے ہوئے رین نے اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم راز بتایا۔ آشی حیران رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ”گرینڈ پا آپ نے اتنا اہم کام کیا اور کبھی بتایا تک نہیں ہے۔“

”میری بچی یہ میری زندگی کا ہی نہیں، میرے ملک کا راز بھی ہے پھر مجھے لگا میں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔۔۔ یہ میرے دل پر بوجھ کی طرح رہا ہے۔“

”یوکی آئیوا کی شپ منٹ کے ساتھ کیا ہوا؟“

آشی کے سوال پر رین نے گہری سانس لی۔ ”میں نہیں جانتا میری بچی، مجھے بس اتنا معلوم ہے جتنا ریکارڈ میں ہے بلکہ ریکارڈ میں یہ بھی نہیں ہے۔ جاپانی بحریہ کے ریکارڈ کے مطابق یوکی آئیوا جنگی قیدی لینے انڈونیشیا پہنچا تھا جہاں ایک امریکی آبدوز نے اسے تارپیڈو کر دیا۔“

”اور اصل حقیقت کیا تھی؟“

”اصل حقیقت یہ ہے کہ یوکی آئیوا کی طرف سے غرقابی سے کچھ پہلے ریڈیو پیغام آیا جس میں کہا گیا کہ مشن کامیاب رہا یعنی شپ منٹ جرمن یو بوٹ کے حوالے کر دی گئی تھی۔“

آشی صحافی تھی، اس کا تجسس بھڑک اٹھا۔ ”جرمن ریکارڈ کیا بتاتا ہے؟“

”یہی کہ ایسا کوئی مشن انڈونیشیا کی طرف نہیں بھیجا گیا تھا اور نہ ہی کوئی جرمن یو بوٹ اس خطے میں ڈوبی البتہ ایک یو بوٹ جو جرمنی سے ان ہی دنوں روانہ ہوئی تھی بحر اوقیانوس میں کسی حادثے کی وجہ سے ڈوب گئی۔ اس کے ڈوبنے کا مقام بھی واضح نہیں ہے۔“

”امریکی ریکارڈ میں ہو سکتا ہے؟“

رین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم نہیں جانتیں میری بچی میں نے ہر طرح سے اطمینان کیا۔ جنگ کے بعد تین سال میں چھپا رہا کیونکہ اگر میں پکڑا جاتا تو مجھ پر جنگی جرائم کا مقدمہ چلتا لیکن امریکی میرے بارے میں جانتے ہی نہیں تھے۔ ایک تو میرا مشن نہایت خفیہ تھا دوسرے جو لوگ اس مشن سے متعلق تھے، وہ سب مر گئے یا انہوں نے اپنی زبان بند رکھی۔ میرے ساتھ جو خاص فوجی دستہ تھا، وہ یوکی آئیوا پر گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈوب گیا۔ جن جگہوں پر میں نے کام کیا، وہاں ہم نے جنگی قیدیوں سے کام لیا اور کام مکمل ہونے کے بعد ان میں سے بچ جانے والوں کو شوٹ کر دیا یوں یہ راز ہمیشہ کے لیے راز ہو گیا۔“

”کبھی امریکیوں نے آپ سے بات کی؟“

”کبھی نہیں۔۔۔ بلکہ میں نے جب امریکا جا کر اس

بارے میں معلومات حاصل کیں تب بھی امریکیوں نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیوں معلومات چاہتا ہوں۔''

''آپ کی امریکی دستاویزات تک رسائی ہوئی؟''

''ہاں تیس سال بعد امریکا نے جنگِ عظیم کی دستاویزات عوام کے لیے کھول دی تھیں۔ ان دستاویزات کے مطابق پرل ہاربر سے ایک امریکی آبدوز جاپانی بحری جہازوں پر حملے کے لیے بحیرۂ موٹو کا آئی تھی اور اس نے یوکی آئیوا کو تارپیڈو کر دیا اور اس کے فوراً بعد یہ آبدوز واپس پرل ہاربر ہوائی چلی گئی تھی۔''

''امریکی آبدوز صرف یوکی آئیوا کے لیے آئی تھی؟''

رین سوچ میں پڑ گیا۔ ''شاید میں نے اس سوال کا جواب بھی تلاش کیا تھا مگر دستاویزات میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔''

''گرینڈ پا معاملہ بہت پُراسرار ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسا اسے پیش کیا جا رہا ہے، یہ ویسا نہیں ہے۔''

''یہ بات میں گزشتہ ساٹھ سال سے محسوس کر رہا ہوں۔'' رین نے گہری سانس لی۔ ''میں آج بھی نہیں جانتا کہ میں نے جو کام کیا، اس کا انجام کیا ہوا؟''

''گرینڈ پا آپ کو پتا نہیں تھا کہ جو کام آپ کر رہے ہیں، وہ کس لیے کیا جا رہا ہے؟''

''مجھے آخری دنوں میں پتا چلا جب میں اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ میں دو سال تک چین کے دور دراز علاقوں میں سرگرم رہا۔ اپنے گھر اور بیوی بچوں سے دور اپنے ملک کے لیے، اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی خطرے میں ڈالی، میرے کتنے ساتھی مر گئے۔ اس کام سے متعلق کتنے ہی چینی باشندوں اور جنگی قیدیوں کو صرف راز داری برقرار رکھنے کے لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔''

''گرینڈ پا آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

رین ہیروشی سوچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لی۔

''میری بچی میں دوستی میں مارا گیا۔ امریکا میں تعلیم کے دوران میں میری دوستی دو افراد سے ہوئی تھی، ایک امریکی تھا اور ایک جرمن۔ ہم تینوں تقریباً ایک عمر کے تھے اور پھر شعبہ بھی ایک تھا۔ جنگِ عظیم دوم کے آغاز سے پہلے میرا جرمن دوست واپس جرمنی چلا گیا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کی شمولیت سے امریکا میں موجود جاپانی باشندوں پر آفت آئی اور ہم سب کو قید کر دیا گیا اس موقع پر میرا امریکی دوست کام آیا اور اس نے کسی طرح مجھے رہائی دلا کر امریکا سے نکال دیا اور میں جاپان واپس آیا یہاں مجھے فوری طور پر سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا اور میں حکومت کا مشیر بن گیا۔ میری آمد کے چند ہفتے بعد ہی میرے جرمن دوست نے مجھ سے رابطہ کیا اور وہ مجھ سے ایک خاص چیز چاہتا تھا۔ اس کی فرمائش کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اس لیے مجھے حکومت نے حکم دیا کہ میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں۔ تم جانتی ہو اس نے مجھ سے کس چیز کی فرمائش کی تھی؟''

''نہیں گرینڈ پا؟''

''اس نے مجھ سے خاص یورینیم کی فرمائش کی تھی جسے عرفِ عام میں ییلو کیک کہتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے کے لیے یورینیم دو سو پینتیس اسی سے نکالا جاتا ہے۔ لیکن جاپان میں یہ دھات دستیاب نہیں تھی اس لیے میں نے چین کے ان علاقوں کا سروے کرایا جہاں اس دھات کے ذخائر مل سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دو مقام پر ذخائر ملے۔ یہ بہت بڑے نہیں تھے لیکن ان سے یورینیم مل سکتی تھی۔ میں نے ان مقامات پر کام شروع کرا دیا۔ میرے پاس تمام وسائل تھے۔ مزدوری کا کام قیدی چینی باشندوں سے لیا جاتا تھا۔ میں نے کام کے لیے خاص آلات اور طریقے ڈیزائن کیے جس سے خالص یورینیم مل سکے۔ جو اہم افراد کان کنی کے کام کی نگرانی کرتے تھے، ان کے لیے خاص لباس تیار کیے تاکہ وہ تابکاری سے محفوظ رہ سکیں۔ مگر عام چینی ایسے ہی کام کرتے تھے اور کوئی مزدور دو ہفتے سے زیادہ کام نہیں کر پاتا تھا اس کی حالت اتنی خراب ہو جاتی تھی کہ پھر اس سے کام لینا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ہم ایسے قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔

''کان سے جو دھات نکلتی تھی اس سے خالص یورینیم کا حصول میری ذمے داری تھی۔ میں نے دونوں کانوں کے مقام پر ایکسٹریکٹ پلانٹ بنائے اور کچی دھات کی صفائی وہیں کی جاتی تھی۔ دو سال کی شدید محنت کے بعد میں نے تین ٹن ییلو کیک حاصل کر لیا۔ یہ اتنی یورینیم تھی جس سے ایک سو چالیس کلو گرام خالص یورینیم دو سو پینتیس حاصل کی جا سکتی تھی اور اس سے ہیروشیما پر گرائے جانے والے تین ایٹم بم تیار ہو سکتے تھے۔''

''میرے خدا!!''

''یہ کام مکمل کر کے ہم نے چین کی کانیں بند کر دیں، ایکسٹریکٹ پلانٹ ختم کر دیے۔ ان کی تمام مشینری جاپان منتقل کر دی گئی اور وہاں کوئی نشان نہیں چھوڑا گیا۔ لیکن اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا کہ جرمن یورینیم کا کیا کریں گے۔ مجھے بتایا گیا کہ تمام یورینیم شمالی جاپان کی ایک چھوٹی بندرگاہ

تک پہنچائی ہے اور وہاں سے یہ ایک جاپانی بحری جہاز کی مدد سے روانہ کی جائے گی جو کھلے سمندر میں ایک جرمن یوبوٹ یہ کھیپ وصول کر کے جرمنی لے جائے گی۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ اگر یہ کھیپ جرمنی پہنچ گئی تو غالب طاقتیں جن میں جرمنی اور جاپان شامل تھے، یہ جنگ جیت جائیں گے۔ میں نے خود یوکی آئیوا پر کھیپ بار ہوتی دیکھی۔ میرا تربیت یافتہ خاص فوجی دستہ اس کھیپ کے ساتھ تھا وہی اسے ہینڈل کر سکتا تھا مگر مجھے نہیں معلوم کہ اس کھیپ کے ساتھ آگے کیا ہوا؟''

''گرینڈ پا یہ سب آپ پر بوجھ ہے۔'' آشی نے ہمدردی سے اپنے نانا کو دیکھا، وہ جانتی تھی رین ایک شریف اور پرامن شخص تھا۔ اس کی ذات سے کسی کو معمولی سی تکلیف بھی نہیں پہنچی تھی وہ سب سے محبت کرتا تھا۔ ایسے شخص کے لیے یہ ماضی تکلیف دہ ہی تھا۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا، جنگ کے زمانے میں اصول وقوانین بدل جاتے ہیں، اس میں آدمی کو وہ سب کرنا پڑتا ہے جس کے بارے میں عام زندگی میں آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ آشی کی بات پر رین ہیروکی نے گہری سانس لی۔

''نہیں میری بچی میرا اصل بوجھ اس سے کہیں بڑھ کر ہے میں اس بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔''

''کیسا بوجھ گرینڈ پا؟''

رین ہیروکی نے اپنی نواسی کی طرف دیکھا۔ ''میری بچی مجھے لگتا ہے ہیروشیما اور ناگاساکی میں مارے جانے والے لاکھوں انسانوں کا قاتل اصل میں، میں ہوں۔''

آشی دم بخود رہ گئی۔

☆☆☆

رین ہیروکی مضطرب تھا۔ ''نہیں میری بچی مجھے لگ رہا ہے تم نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے، کاش کہ میں تم سے یہ ذکر ہی نہ کرتا۔''

آشی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بارے میں تحقیق کرے گی۔ اس نے واپس آکر سب سے پہلے جاپانی وزارتِ دفاع سے رابطہ کیا۔ وہاں اسے وہی سب ملا جس کا ذکر رین نے کیا تھا۔ جاپانی بحریہ کے پاس اس سلسلے میں بہت محدود معلومات تھیں۔ یوکی آئیوا کے جانے حادثہ کے بارے میں بھی درست معلومات دستیاب نہیں تھیں اور بحیرہ مولوکا کے تقریباً پچیس مربع میل کے ایک ٹکڑے کو یوکی آئیوا کی آخری آرام گاہ قرار دیا گیا تھا۔ آشی نے جاپان کے بعد امریکی دستاویزات دیکھنے کے لیے واشنگٹن کا سفر کیا لیکن یہاں بھی اسے کچھ نہیں ملا تھا لیکن اس نے مین ہٹن پروجیکٹ اور امریکا کے ایٹمی پروگرام کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا۔ اس دوران میں اس نے کچھ آرٹیکل بھی لکھے جو ٹوکیو ٹائمز میں شائع ہوئے تھے۔ پھر اس کی نظر سے ایس اے شا کا مضمون گزرا تو وہ چونک گئی۔ یہ بہت اہم انکشاف تھا۔ امریکیوں کا دعویٰ تھا کہ مین ہٹن پروجیکٹ کے لیے یورینیم بیلجیئن کانگو کی کان سے حاصل کی گئی تھی جبکہ ایس اے شا کا دعویٰ تھا کہ 1946ء کے آخر تک اس کان سے یورینیم کی کان کنی کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔ پہلے آشی نے شا سے فون پر رابطہ کرنے کا سوچا لیکن پھر اس نے خود جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''گرینڈ پا میری شا سے ملاقات ہوئی ہے۔'' آشی نے نانا کی تشویش نظرانداز کر کے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ اس کا باپ اس کان کا آغاز کرنے والے گروپ میں شامل تھا اور 1946 تک اس کان کا آغاز نہیں ہوا تھا۔''

''کیا تم نے اس کے باپ سے ملاقات کی؟''

''نہیں ابھی تو شا سے ملاقات ہوئی ہے لیکن جلد میں اس کے باپ سے بھی ملوں گی۔ شا کا کہنا ہے اس کے باپ کے پاس ٹھوس ثبوت بھی ہیں کہ جنگِ عظیم سے پہلے اس کان سے یورینیم نہیں نکالی گئی تھی۔''

رین ہیروکی فکرمند نظر آرہا تھا۔ ''میری بچی سارے معاملات اسی طرف جارہے ہیں جس کا مجھے ہمیشہ خدشہ رہا ہے۔''

آشی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''گرینڈ پا ہم تاریخ بدل نہیں سکتے ہیں لیکن اصل تاریخ سامنے لاسکتے ہیں۔''

''ہاں میری بچی۔'' رین ہیروکی نے سرد آہ بھری۔ ''مگر یاد رکھو حقیقت بہت بدصورت ہوتی ہے۔''

''حقیقت کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اس کا سامنا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' آشی نے کہا پھر اس نے ہچکچا کر رین کو بتایا۔ ''گرینڈ پا مجھے لگ رہا ہے جب سے میں یہاں آئی ہوں اور خاص طور سے شا کے دفتر کال کی تب سے میری نگرانی ہو رہی ہے۔ ابھی میں شا سے مل کر واپس آرہی تھی تو ایک سیاہ کار میری ٹیکسی کے پیچھے لگی رہی تھی۔''

رین پھر فکرمند ہو گیا۔ ''آشی بہت محتاط رہو.... معاملہ امریکیوں کا ہے اور امریکی کرۂ ارض پر اس وقت سفاک ترین قوم ہیں۔ یہ ان لوگوں کو مٹانے میں تاخیر کے قائل نہیں ہیں جن سے انہیں خطرہ ہو۔''

"گرینڈ پا بات بہت پرانی ہو گئی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اب امریکی اس بارے میں اتنے حساس ہوں گے۔"

"میری بچی تم امریکیوں کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہو۔ میں برسوں امریکا میں رہا ہوں اور میں نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے خاص طور سے ان کے مقتدر طبقے کو.... یہ لوگ صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں باقی ہر چیز ان کے نزدیک اضافی ہے۔"

"او کے گرینڈ پا میں محتاط رہوں گی۔" آشی نے کہا اور میسینجر بند کر دیا پھر لیپ ٹاپ بند کر کے وہ واش روم کی طرف آگئی۔ باتھ لے کر اس نے روم سروس کو ڈنر کا آرڈر دیا تھا۔ اس نے لباس نہیں بدلا تھا اور ڈھیلے باتھ روب میں تھی۔ نصف گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر ویٹر ٹرالی سمیت موجود تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ ویٹر ٹرالی اندر لے آیا۔ آشی دروازہ بند کر رہی تھی کہ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ بروقت پیچھے ہٹ گئی۔ عقب سے حملہ کرنے والا چاقو بردار ویٹر جھونک میں دروازے سے ٹکرایا اس نے اتنی قوت سے وار کیا تھا کہ چاقو دروازے میں گھس گیا۔ اس نے چاقو نکالنے کی کوشش کی مگر وہ بہت بری طرح گڑ گیا تھا۔ آشی فون کی طرف بھاگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تھا کہ حملہ آور عقب سے اس پر آگرا۔ وہ بہت وزنی نہیں تھا لیکن بہرحال سخت جسم والا مرد تھا۔ آشی دب کر رہ گئی، وہ اس کے عقب میں تھا اور اس کے ہاتھ آشی کی گردن پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر وہ کامیاب رہا اور اس نے آشی کی گردن اپنے بازو میں جکڑ لی اور اس کا دم گھوٹنے لگا۔

آشی کا سانس رک رہا تھا اور وہ خود کو آزاد کرانے کے لیے زور لگا رہی تھی مگر جتنا زور لگا رہی تھی، حملہ آور کی گرفت اتنی ہی سخت ہو رہی تھی۔ آشی کی قوت بھی اسی کے خلاف استعمال ہو رہی تھی۔ اچانک اسے عقل آئی اور اس نے جدوجہد ترک کر کے کوئی چیز تلاش کرنا شروع کر دی۔ اس کے ڈھیلے ہونے سے حملہ آور سمجھا کہ وہ کامیاب رہا ہے اور ردِعمل میں اس کی گرفت بھی ہلکی ہوئی، اسی لمحے آشی کے ہاتھ فون آیا اور اس نے اٹھا کر حملہ آور کے سر پر دے مارا۔ یہ زیادہ وزنی نہیں تھا مگر سخت پلاسٹک کا تھا۔ ضرب کی تکلیف سے زیادہ حیرانی نے حملہ آور کو بدحواس کیا اور آشی اس کی گرفت سے نکل کر بستر سے نیچے جا گری۔ وہ سانس لے رہی تھی ساتھ ہی حملہ آور کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی وہ نیچے جھک کر دوبارہ اسے بستر پر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران میں آشی کو موقع ملا تو اس نے دائیں پاؤں کی ایڑی حملہ آور کے منہ پر ماری تھی۔ یہ چوٹ غیر متوقع اور سخت تھی، وہ پیچھے گیا اور کشش ثقل نے اسے کھینچا تھا کہ آشی نے دوسرا وار کیا اور وہ ناک آؤٹ ہو گیا۔ آشی نے اٹھتے ہوئے ٹرالی سے ماربل کی وزنی پلیٹ اٹھا کر اسے حملہ آور کے سر پر توڑ دیا۔ اس ضرب نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

آشی کا سانس بہت دیر تک رکا رہا تھا اور اس وقت بھی وہ بے قابو انداز میں سانس لے رہی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا، وہ صوفے پر گری اور کچھ دیر سانس لیتی رہی۔ جب حالت بہتر ہوئی تو اس نے فون اٹھایا اور ریسیور اس پر رکھا۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کو کال کرنے جا رہی تھی لیکن پھر اسے خیال آیا اور اس نے شا کا نمبر ملا لیا۔ کال ملتے ہی اس نے کہا۔ "پلیز میرے ہوٹل آؤ، میں ابھی مرتے مرتے بچی ہوں۔"

☆☆☆

شا نے دروازے پر دستک دی تو پہلے آشی نے کیٹ آئی سے باہر جھانکا اور پھر دروازہ کھولا۔ اس نے تیزی سے شا کو بازو سے پکڑ کر اندر کھینچا اور دروازہ دوبارہ لاک کر کے زنجیر بھی چڑھا دی۔ شا کمرے کے ابتر حلیے کے بجائے آشی کے ابتر حلیے کا جائزہ لے رہا تھا وہ بدستور باتھ روب میں تھی اور وہ بھی جگہ جگہ سے سرک گیا تھا۔ آشی کو پریشانی میں خیال نہیں رہا۔ شا کے دیکھنے پر اس نے جلدی سے اپنا باتھ روب ٹھیک کیا اور بولی۔ "میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ مجھے گھورتے رہو۔"

اس نے سرد آہ بھری اور حملہ آور کی طرف دیکھا۔ "ایسی منحوس صورتیں میں آئے دن دیکھتا رہتا ہوں۔ ہمارے پروفیشن میں اچھی صورت دیکھنے کو کہاں ملتی ہے، ویسے ہوا کیا تھا، تم نے فون پر صرف آنے کو کہا اور میں گھر کے بجائے یہاں آگیا۔"

آشی نے مناسب الفاظ میں اسے بتایا کہ ہوا کیا تھا۔ "مائی گاڈ میں نے سوچا بھی نہیں تھا ویٹر کے روپ میں حملہ آور نکلے گا۔"

"یہ کسی کو ٹھکانے لگانے کا سب سے مقبول اور فلمی طریقہ ہے۔" شا نے بے ہوش شخص کو چیک کیا۔ اس کے سر پر سوجن آگئی تھی۔ "حالانکہ عملی طور پر یہ بہت خطرناک ہے اس میں پکڑے جانے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں

جگہ جگہ کیمرے لگے ہیں۔ ویسے تم نے اس کے ساتھ صحیح سلوک کیا ہے۔“

”اس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔“ آشی نے اپنی مرمریں گردن معائنے کے لیے پیش کی۔ ”وہ تو میں کچھ سیلف ڈیفنس جانتی ہوں ورنہ اس کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔“

”یہ پولیس کیس ہے لیکن اس سے پہلے ہوٹل والوں سے بات کرنی ہوگی۔“ شا نے کہا اور فون اٹھا کر آپریٹر سے رابطہ کیا۔ ”یہاں روم نمبر تین سو بائیس میں واردات ہوئی ہے... ہاں ایک شخص نے جو ویٹر کی وردی میں ہے یہاں مقیم مس آشی ہیروکی کو قتل کرنے کی کوشش کی.... میری منیجر سے بات کراؤ۔“

پانچ منٹ میں منیجر ہوٹل کے سیکیورٹی انچارج کے ساتھ وہاں تھا۔ جب انہوں نے حملہ آور اور صورتِ حال کو دیکھا تو ان کے چہروں پر ہوائیں اڑنے لگیں۔ ان کی آمد سے پہلے آشی نے شا کے مشورے پر نبا س پہن لیا تھا۔ منیجر نے کہا۔ ”مس ہیروکی میں بہت معذرت خواہ ہوں، یہ پولیس کیس ہے اور پولیس اس سے معلوم کرلے گی کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی؟“

”کیا یہ ہوٹل کا ویٹر ہے؟“

منیجر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”قطعی نہیں، میں ہوٹل کے سو سے زائد ویٹرز کو چہرے سے پہچانتا ہوں، یہ ہرگز ان میں سے نہیں ہے۔“

”تب یہ ویٹرز کی وردی میں یہاں کیسے پہنچا۔ کسی نے اسے چیک کیوں نہیں کیا اور اس نے کھانے کی ٹرالی کیسے حاصل کی جس پر مس ہیروکی کا آرڈر کردہ ڈنر بھی ہے، مسٹر منیجر بات صرف اس کی نہیں ہے ہوٹل کے کچھ اور لوگ بھی اس سے ملے ہوئے ہیں۔“

اس پر منیجر اور سیکیورٹی انچارج حرکت میں آئے اور پولیس کی آمد سے پہلے معلوم ہو گیا کہ ڈنر لانے والا اصل ویٹر غائب تھا۔ کچن سے ٹرالی اسی نے ریسیو کی تھی مگر وہ حملہ آور کے حوالے کر دی اور خود باہر چلا گیا۔ کیمروں میں اس کی باہر جانے کی ویڈیو تھی۔ پولیس کے ساتھ پیرامیڈک بھی آئے تھے تب تک ہوٹل کا ڈاکٹر حملہ آور کو ہوش میں لے آیا۔ مگر ہوش میں آتے ہی اس نے اپنی زبان سختی سے بند کرلی۔ ایک پولیس انسپکٹر نے آشی اور شا کے بیانات لیے تھے۔ آشی نے حملے کی وجوہات سے قطعی لاعلمی ظاہر کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تفریح کے لیے یہاں آئی تھی۔ ممکن ہے حملہ آور ڈاکو ہو۔ حملہ آور انسپکٹر کے سوالات پر بھی خاموش تھا اس لیے وہ اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ پولیس اور ہوٹل والوں کے جاتے ہی شا نے کہا۔

”میرا خیال ہے تم یہاں محفوظ نہیں ہو۔“

”پھر کہاں محفوظ ہوں گی؟“

شا سوچ رہا تھا۔ ”تمہیں یقین ہے حملہ آور تمہیں قتل کرنے آیا تھا؟“

”بالکل، اس نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی اور تم نے دیکھا خنجر دروازے میں کتنا اندر تک گڑا ہوا تھا۔ اگر اس قوت سے یہ وار مجھے لگ جاتا تو کیا میں بچ سکتی تھی؟“

شا اس سے متفق ہو گیا۔ ”اس صورت میں خطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ایسا کرو تم میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں....؟“

”میرے گھر.... میرے پاس ایک اضافی بیڈ روم ہے۔“

آشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہاری یہاں آمد ڈھکی چھپی نہیں ہوگی جو لوگ یہ جان سکتے ہیں کہ میں نے ڈنر کا آرڈر کیا اور اتنی پلاننگ سے حرکت میں آسکتے ہیں، وہ یقیناً تمہارے بارے میں بھی جانتے ہوں گے اور وہاں بھی آسکتے ہیں۔“

شا اس کے تجزیے پر غور کرنے لگا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اس صورت میں تمہارا یہیں رہنا ٹھیک ہے۔“

”اگر تمہیں میری اتنی ہی فکر ہے تو یہیں رہ جاؤ۔“ آشی نے کہا۔ ”میں بھی مطمئن رہوں گی۔“

شا نے کمرے کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”یہاں تو ایک ہی بیڈ ہے، بہر حال میں صوفے پر سو جاؤں گا۔“

کچھ دیر بعد سیکیورٹی انچارج کی نگرانی میں انہیں ڈنر مہیا کیا گیا۔ شا نے اسے خبردار کیا تھا۔ ”ممکن ہے ہوٹل کا کوئی فرد اور بھی ان لوگوں سے ملا ہوا گر کسی نے تو آرڈر کا بتایا ہوگا۔“

”ہم تفتیش کر رہے ہیں اور سروس آپریٹر سے بھی بات کی ہے۔“

اگرچہ یہ سنگل روم تھا اور ہوٹل کے قواعد یہاں ایک سے زیادہ فرد کو رکنے کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن انتظامیہ نے شا کے رکنے پر اعتراض نہیں کیا۔ ڈنر کے بعد وہ کچھ دیر بات کرتے رہے۔ پہلی بار آشی نے شا کو اپنے نانا کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ ”اور تب تو اس معاملے

میں تمہاری ذاتی دلچسپی بھی ہے۔"

"بالکل میں اسی لیے یہاں تک آئی ہوں ورنہ یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ میں تو سیاست کے شعبے سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"یہ بھی سیاست کا ایک حصہ ہے بلکہ تم اسے اعلیٰ درجے کی سیاست قرار دے سکتی ہو۔" شا نے کہا۔ "مس آشی تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ اگر یہ درست ہے کہ اس حملے کے پیچھے امریکی ہیں تو..."

"امریکی مجھے روکنا چاہتے ہیں۔" آشی نے سر ہلا دیا۔ "کیونکہ میں کڑیوں سے کڑیاں ملا رہی ہوں۔"

"فرض کرو تم مطمئن ہو گئیں کہ بیجنگ کانگو کی کان جنگِ عظیم کے بعد کھولی گئی تھی تو پھر تم کیا کرو گی؟"

"یہ میں تمہیں بتاؤں گی... جب میں مطمئن ہو جاؤں گی۔" آشی نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"اس کے برعکس میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں تم پر پوری طرح سے اعتماد کر سکتی ہوں لیکن ابھی یہ ذکر قبل از وقت ہے، پہلے میں تمہارے پاپا سے مل کر اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہوں۔"

"تب کل بات کریں گے۔" شا نے کشن اٹھا کر صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ تمہیں مغربی اسٹائل میں سونے کی عادت تو نہیں ہے۔"

آشی نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "مغربی انداز میں؟"

"میرا مطلب ہے کم سے کم لباس میں یا پھر بنا لباس...؟"

آشی کا چہرہ مزید گلابی ہو گیا۔ "تم بدتمیز شخص ہو۔"

اس نے تسلیم کیا۔ "میرے تمام جاننے والے یہی کہتے ہیں، اس کا مطلب ہے تم مجھے جاننے لگی ہو۔"

آشی سوتے ہوئے آرام دہ پاجامے اور ٹی شرٹ پہنتی تھی۔ وہ کپڑے بدل کر آئی تو شا سو چکا تھا۔ اسے حیرت ہوئی، وہ اتنی جلدی سو گیا تھا۔ صبح شا نے اسے بلایا۔ "اٹھ جاؤ میں نے ناشتے کا کہہ دیا ہے۔"

آشی بال سمیٹتے ہوئے اٹھی نو بجنے والے تھے۔ عام طور سے وہ سات بجے اٹھ جاتی تھی لیکن شاید اعصابی کشیدگی کی وجہ سے وہ دیر تک سوتی رہی تھی۔ جب تک وہ شاور لے کر آئی ناشتا اور اخبارات دونوں آ چکے تھے۔ شا اخبارات دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ "کسی اخبار میں اس واقعے کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے پولیس رپورٹس میں بھی نہیں ہے۔"

آشی تیزی سے اس کے قریب آئی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم دیکھ لو اور ہاں ایک خاص خبر ہے۔" اس نے اخبار آشی کے سامنے کر دیا۔ خبر کے ساتھ تصویر تھی اور یہ اسی حملہ آور کی تھی۔ خبر کے مطابق اس نے لاک اپ میں اپنی پتلون کی بیلٹ سے خود کو پھانسی دے لی تھی۔ اس کی لاش موت کے فوراً بعد دریافت ہوئی تھی۔ آشی نے برہمی سے اخبار پٹخ دیا۔

"یہ خودکشی نہیں ہے، اسے قتل کیا گیا ہے۔ اس کی زبان بند کی گئی ہے۔"

"تم اسے چیلنج نہیں کر سکتیں۔" شا نے سکون سے کہا۔ "بات پولیس کی مانی جائے گی۔"

"مستو اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مل سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے جو ڈاکٹر جاری کرے گا، وہ نہیں جو پولیس بتائے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں لیکن میرا نہیں خیال اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ وہ دم گھٹنے سے مرا ہوگا اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی خودکشی کی کہانی سنائے گی۔"

آشی مایوس تھی۔ اس سے ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں شا بڑھ چڑھ کر کھا رہا تھا اور عملاً اس نے ناشتے کا صفایا کر دیا تھا۔ ایک آسودگی بھری ڈکار لے کر اس نے اپنے لیے دوبارہ چائے نکالی تو آشی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "لگتا نہیں ہے، تم اتنا کھاتے ہو؟"

"ہر بار اتنا نہیں کھاتا، صحافت نے عادتیں خراب کر دی ہیں۔ کبھی کبھی سارا دن کھائے پیے بغیر گزر جاتا ہے اور کبھی سارا دن ہی کھاتا رہتا ہوں۔ کبھی دو دو دن نہیں سوتا اور کبھی چوبیس گھنٹے بھی سوتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنا موبائل فون نکال کر کسی سے رابطہ کر کے اس سے مارے جانے والے حملہ آور کی پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کرنے کو کہا۔ وہ اخبار کا رپورٹر تھا۔ اس سے بات کر کے شا نے آشی کو بتایا۔ "ابھی تک پولیس کو بھی نہیں بتایا ہے کہ مرنے والا کس سلسلے میں گرفتار تھا۔"

آشی برہم ہو گئی۔ "اس سے ظاہر ہے کہ پولیس بھی ان لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔"

شا نے گہری سانس لی۔ "مس آشی معاملہ سنگین ہو چلا ہے، بہتر ہوگا کہ تم یہیں سے وی اینڈ کر کے اپنی راہ لو۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اس کیس سے ہاتھ اٹھا

لوں۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ اس نے خلوص سے کہا۔ ’’خود دنیا سے اٹھ جانے سے یہ بہتر ہی ہوگا۔‘‘

آشی نے اسے دیکھا۔ ’’کیا تم ڈر رہے ہو؟‘‘

’’میں ڈر رہا ہوں لیکن میرا مشورہ خوف کی وجہ سے نہیں ہے اور نہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔‘‘

’’تم چاہو تو میرا ساتھ چھوڑ سکتے ہو۔‘‘ آشی کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ ’’میں نہیں چاہتی کہ کوئی میری وجہ سے خطرے میں پڑے۔‘‘

’’میرا خیال ہے تم نے ناشتا کرلیا ہے۔‘‘ شا نے اس کی بات نظرانداز کر کے اپنا کوٹ پہنا۔ ’’میرا خیال ہے میں اپنے اخبار کے رپورٹر کو بریف کردوں تاکہ شام کے ایڈیشن میں اسٹوری چھپے پھر ہم چلتے ہیں۔‘‘

آشی نے سر ہلایا۔ ’’میں تیار ہو کر آتی ہوں۔‘‘

’’بہتر ہوگا یہاں سے چلو، اپنا سامان بھی ساتھ لے لو۔‘‘

جب تک شا نے اخبار کے رپورٹر کو اس بارے میں بتایا آشی تیار ہو کر آگئی تھی۔ اس نے جینز پر ڈھیلی سی شرٹ پہن رکھی تھی، سر پر رومال اور آنکھوں پر سن گلاس تھا۔ وہ اپنے عمومی حلیے سے خاصی مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا بیگ لے لیا تھا، لیپ ٹاپ بھی اسی میں تھا۔ وہ باہر آئے، پارکنگ میں شا کی موٹر بائیک کھڑی تھی۔ آشی خوش ہوگئی۔

’’تمہارے پاس بائیک ہے۔‘‘

’’تمہیں پسند ہے۔‘‘

’’ہاں ٹوکیو میں میں یہی استعمال کرتی ہوں، ٹریفک میں آنے جانے میں آسانی رہتی ہے۔‘‘

’’میں نے بھی اسی لیے رکھی ہے۔‘‘ شا نے کک مار کر اسٹارٹ کی۔ ’’آدمی میں پہنتا نہیں ہے لیکن تمہارے لیے ہیلمٹ لینا ہوگا۔ ورنہ ٹریفک پولیس روک لے گی۔‘‘

ایک شاپ سے آشی کے لیے ہیلمٹ لیا اور وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئے جہاں حملہ آور لایا گیا تھا اور رات اس نے خودکشی کرلی تھی۔ اسے گرفتار کرنے والا انسپکٹر رچرڈ جانز وہاں موجود تھا اور پریشان تھا۔ اس نے بتایا۔ ’’حملہ آور کا نام گریٹ کورنی تھا۔ وہ ملانو تھا، باپ افریقی اور ماں ساؤتھ ایشین تھی۔‘‘

’’پولیس کی تحویل میں اس نے خودکشی کیسے کی؟‘‘ آشی نے پوچھا۔

’’یہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں، اس سے بیلٹ کیوں نہیں لی گئی تھی۔‘‘ رچرڈ نے اپنے سر کے کم ہوتے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ’’پولیس ابھی اس بارے میں تفتیش کر رہی ہے۔‘‘

شا نے سوال کیا۔ ’’خیر یہ تو گیا اب یہ بتاؤ کہ ہوٹل کا جو ویٹر اس کا ساتھی تھا اور وہ غائب ہے، اسے پکڑنے کے لیے پولیس نے اب تک کیا کیا ہے؟‘‘

’’وہ اپنے گھر سے غائب ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔‘‘

’’ممکن ہے کچھ گھنٹے یا کچھ دن بعد اس کی لاش مل جائے۔‘‘

انسپکٹر نے شا کو غور سے دیکھا۔ ’’لگتا ہے تم نے خبریں بنانا شروع کردی ہیں۔‘‘

’’خبر ابھی تک تو نہیں آئی تھی لیکن اب پوری تفصیل کے ساتھ آئے گی۔‘‘

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’تم پولیس کی اجازت کے بغیر یہ خبر نہیں دو گے۔‘‘

’’پولیس خود اس معاملے میں فریق بن چکی ہے۔‘‘ شا نے بدمزگی سے کہا۔ ’’تم لوگوں نے ڈھنگ سے تفتیش نہیں کی اور قیدی کو خودکشی کا موقع فراہم کردیا اور ....‘‘

ادھوری بات پر انسپکٹر نے سوالیہ نظروں سے شا کو دیکھا۔ ’’تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟‘‘

’’یہی کہ مس ہیروکی کو جان بوجھ کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن پولیس نے مجرم سے صحیح پوچھ گچھ بھی نہیں کی، اس نے خودکشی کرلی اور دوسرا مجرم تاحال مفرور ہے۔‘‘

’’وہ جلد پکڑا جائے گا۔‘‘

’’دیکھتے ہیں۔‘‘ شا کھڑا ہوگیا۔

وہ باہر آئے۔ شا نے بائیک اسٹارٹ کی۔ آشی اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ ’’ہم کہاں جا رہے ہیں؟‘‘

’’میرے گھر۔‘‘ شا نے کہا۔ اس کی رہائش سوئٹو میں تھی۔ جنوبی افریقہ کا یہ سب سے بڑا شہر جوہانسبرگ کے ساتھ تھا۔ شا کا اپارٹمنٹ ایک خوب صورت رہائشی عمارت کے تیسرے فلور پر تھا۔ مگر شا نے لفٹ کے بجائے عقبی سیڑھیوں والا راستہ اختیار کیا اور تیسرے فلور پر آکر اس نے ہنگامی حالات والی سیڑھیاں استعمال کیں۔ اس طرف اس کے لاؤنج کی کھڑکی کھلتی تھی اور یہاں اس نے ایک خاص نظام بنا رکھا تھا۔ کھڑکی کے ایک حصے میں خانہ بنا کر اسے لاک سے بند کردیا تھا۔ اس نے چابی سے لاک کھولا اور پھر اندر ہاتھ ڈال کر کھڑکی کھول لی۔ وہ دونوں اندر آئے۔ آشی نے

سرگوشی میں پوچھا۔

"یہ کیا ہے، کیا تمہیں شک ہے یہاں بھی نگرانی کی جا رہی ہوگی؟"

"بالکل ..... وہ صرف تمہارے ہی نہیں میرے بارے میں بھی جانتے ہیں۔" شا نے جوابی سرگوشی کی اور اسے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کرکے باقی اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا مگر اندر کوئی نہیں تھا اگر تھا تو باہر ہی سے نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے الماری سے اپنا ریوالور اور اضافی راؤنڈز نکالے۔ آشی نے پوچھا۔

"تم نشانہ لے سکتے ہو؟"

"پچاس فٹ کے فاصلے سے کولڈ ڈرنک ٹن اُڑا سکتا ہوں۔" اس نے فخر سے کہا۔ "میں نے میرین کی تربیت لے رکھی ہے اور ریزرو فورس میں بھی رہ چکا ہوں۔"

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"یہ ریوالور لینے ..... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں سمجھی تم جیکبین کانگو کی کان کے بارے میں ثبوت لینے آئے ہو۔"

"وہ پاپا کے پاس ہیں، مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اپنے کام کی تمام چیزیں اپنے ذہن میں رکھتا ہوں۔ کیا تم کافی تیار کر سکتی ہو؟"

آشی نے کچن دیکھا اور کافی تیار کرنے لگی۔ شا اپنے کپڑے چھوٹے سے بیگ میں رکھ رہا تھا۔ آشی نے کافی کا مگ اسے تھمایا۔ "یہاں کی صفائی ستھرائی دیکھ کر لگ نہیں رہا کہ تم صحافی ہو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "مجھے گندگی اور بے ترتیبی پسند نہیں ہے۔"

"تمہارا خیال ہے ہمارے پیچھے امریکی ہیں؟"

"لازمی بات ہے، ورنہ اس بات سے اور کس کو تکلیف ہو سکتی ہے، وہی اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کارروائی کر سکتے ہیں۔ کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ جس طرح مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی وہ بڑی کمزور تھی۔ میں بچ سکتی تھی اور میں بچ گئی۔"

شا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"اگر امریکی میرے بارے میں اس حد تک جانتے ہیں تو وہ لازمی جانتے ہوں گے کہ میں سیلف ڈیفنس کی ماہر ہوں۔ اب مجھے یاد آرہا ہے، ویٹر نے عقب سے وار کرتے ہوئے بلاوجہ آواز نکالی تھی جس سے میں ہوشیار ہو گئی اور میں نے خود کو بچا لیا۔"

شا سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ہو سکتا ہے اس طرح وہ تمہیں ہوٹل سے نکالنا چاہتے ہوں۔ اب میں متفق ہوں یہ بڑی کمزور سی کوشش تھی۔ امریکی اس سے کہیں بہتر اور یقینی کوشش کے اہل ہیں۔ یہاں جنوبی افریقہ میں ان کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔"

"وہ جان گئے کہ میں یہاں ہوں اور تم سے ملنے آئی ہوں۔ اس صورت میں وہ جانتے ہوں گے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟"

"بالکل۔" شا نے چٹکی بجائی۔ "وہ جانتے ہیں تم جا کر میرے پاپا سے ملاقات کرو گی۔" یہ کہتے ہوئے اچانک شا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "میرے خدا پاپا خطرے میں ہیں۔"

آشی بھی چونک گئی۔ "یہ بات تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھی۔"

شا نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور کال کرنے لگا۔ کال ملتے ہی اس نے مضطرب انداز میں کہا۔ "پاپا سے بات کرائیں ..... جی پاپا میں بات کر رہا ہوں ..... پاپا حالات سنگین ہو گئے ہیں ..... جی ..... اسی معاملے میں امریکی خطرناک ہو رہے ہیں ..... آشی ہیروئی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اب مجھے آپ کی فکر ہے ..... پلیز پاپا میری آمد تک بہت احتیاط کریں اور اگر کوئی خطرہ محسوس کریں تو فوراً پولیس کو کال کر دیں ٹھیک ..... بائے۔"

اس نے موبائل رکھ کر کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔

"پاپا ٹھیک ہیں اب ہمیں نکلنا ہوگا۔"

"ایک منٹ ....." آشی نے کہا۔ "وہ ہمیں راستے میں روکیں گے، میرا خیال ہے اصل پلان یہی تھا مجھے ہوٹل سے نکالا جائے اور غیر محفوظ ہونے کا احساس دلایا جائے میں تمہیں کال کروں اور تم مجھے لے کر اپنے پاپا کے پاس جاؤ۔ ہمارے لیے ٹریپ راستے میں ہوگا۔"

"لیکن ہمیں جانا ہوگا۔" شا نے کہا اور ایک نقشہ نکالا۔ "ہمیں متبادل راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"

☆☆☆

جان پال ایک عام پرواز سے جنوبی افریقہ پہنچا تھا۔ وہ چاہتا تو ایجنسی کا کوئی جیٹ بھی استعمال کر سکتا تھا لیکن وہ اس معاملے کو ذاتی سطح پر دیکھ رہا تھا اس لیے اس نے ایجنسی

کے وسائل استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے دوسرے وسائل بھی کم نہیں تھے۔ ائرپورٹ پر کینی ولیم نامی شخص اس کا منتظر تھا۔ وہ افریقی آرمی کا سابق کرنل تھا۔ جان پال اس سے پہلے بھی کام لیتا تھا اور اس معاملے میں بھی اسے ہائر کر لیا تھا لیکن اس نے کینی کو بتا دیا تھا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے مگر کینی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، وہ پیسے کے لیے کام کرنے والا شخص تھا۔ وہ ائرپورٹ سے باہر آئے تو جان نے اس سے پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"سب توقع کے مطابق۔" کینی نے جواب دیا، وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

"دوسرے آدمی کا کیا ہوا؟" جان پال نے سرسری سے انداز میں پوچھا جیسے جواب اسے پہلے سے معلوم تھا۔

"وہی جو طے ہوا تھا۔" کینی نے بھی سرسری انداز میں جواب دیا۔ "اس کا جسم شاہ میں زیرِ تعمیر ایک ڈیم کی کنکریٹ میں دب چکا ہے جہاں سے وہ قیامت کے دن ہی دریافت ہوگا۔"

جان پال مسکرایا۔ "کرنل تم قیامت پر یقین رکھتے ہو؟"

"ہاں اور اس بات پر بھی کہ وہ دوسروں کے لیے ہوتی ہے۔" کینی نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"ابھی تک تو شا کے اپارٹمنٹ میں ہیں۔"

"وہیں چلو اب مجھے سب خود دیکھنا ہے۔"

کینی نے اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ کما نڈر وہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شا کے اپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ کینی نے واکی ٹاکی پر کسی سے رپورٹ لی اور پھر جان پال سے کہا۔ "وہ اندر ہیں لیکن نکلنے والے ہیں۔"

"دونوں کی پوری طرح نگرانی کرنی ہے۔ شا کے پاس موجود ثبوت حاصل کرنے ہیں۔" جان پال نے واضح کہا۔ "اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔"

کینی نے سر ہلایا۔ "میرے آدمی نے خود سنا ہے ثبوت شا کے باپ کے پاس ہیں۔"

چند منٹ بعد نگرانی کرنے والے نے مطلع کیا۔ "وہ نکل گئے ہیں۔ ہم پیچھے ہیں۔"

"احتیاط سے۔" کینی غرایا۔ "انہیں شک نہ ہو۔"

"ان کے پیچھے چلو۔" جان پال نے کہا۔ کینی کے آدمی نہ صرف شا اور آشی کا تعاقب کر رہے تھے بلکہ انہوں نے شا کے اپارٹمنٹ کو بگ کر دیا اور اس سے انہیں معلوم ہو گیا کہ ثبوت شا کے باپ کے پاس ہیں۔ کینی نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شا کا باپ کہاں رہتا ہے لیکن اسے صرف شہر کی حد تک پتہ چلا تھا اس لیے اب ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ شا کا تعاقب کر کے اس کے گھر تک پہنچیں۔

☆☆☆

سات گھنٹے کے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد شا نے بائیک اپنے باپ کے گھر کے سامنے نہیں روکی تھی۔ وہ دو گلی پیچھے رکا تھا۔ راستے میں انہوں نے ہر دو گھنٹے کے سفر کے بعد ایک گھنٹا کہیں رک کر آرام کیا تھا، اس کے باوجود خاص طور سے آشی کی حالت خراب تھی۔ اسے بائیک پر اتنے طویل سفر کی عادت نہیں تھی۔ بائیک رکتے ہی وہ نیچے اتر آئی۔ اس نے شا کو آگاہ کیا۔ "مجھے اس سواری سے اب کچھ کچھ نفرت ہو چلی ہے۔"

"میں تو عادی ہوں کئی بار نان اسٹاپ بھی یہاں آچکا ہوں۔" شا نے کہا۔ اس نے پہلے موبائل سے ایک کال کی اور پھر وہ پیدل روانہ ہوئے۔ یہاں پشت سے پشت ملے مکانات تھے۔ درمیان میں صرف ایک چھوٹی سی دیوار تھی جو دونوں مکانوں کے عقبی صحن جدا کرتی تھی۔ وہ پشت والے مکان میں داخل ہوئے۔ اس کا ڈرائیو وے اوپن تھا اور وہ چھوٹی سی گلی سے ہوتے عقبی صحن میں آئے۔ آشی فکرمند تھی۔ اس نے شا کو باز رکھنا چاہا کہ یہ ٹریس پاس ہوگا۔ اس نے آشی کو تسلی دی۔ "فکر مت کرو اس مکان کا مالک جاننے والا ہے۔ اگر اس نے دیکھ بھی لیا تو کچھ نہیں کہے گا۔"

مگر کسی نے دیکھا اور روکا نہیں۔ دیوار صرف چھ فٹ اونچی تھی۔ پہلے شا نے دوسری طرف جھانکا اور پھر اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف اتر کر اس نے آشی سے اس کا بیگ لیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر چڑھنے میں مدد دی۔ وہ دوسری طرف اتری تو وہ مکان کی طرف بڑھے۔ کچن کا دروازہ پیچھے کی طرف کھلتا تھا اور وہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں اندر آئے۔ رات نو بجے کچن خالی اور تاریک تھا لیکن لاؤنج میں روشنی تھی۔ آشی نے اس کے کان میں کہا۔ "یہاں کچھ زیادہ ہی خاموشی نہیں ہے۔"

شا بھی محسوس کر رہا تھا کہ واقعی وہاں کچھ زیادہ ہی خاموشی تھی۔ اس نے بڑھ کر لاؤنج میں جھانکا تو اسے ماں باپ صوفوں پر بیٹھے دکھائی دیے۔ اس نے سکون کا سانس لیا اور آشی کو اشارہ کرتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا تھا کہ رک گیا۔ وہاں تین افراد اور بھی تھے۔ دو کے ہاتھ خالی تھے لیکن تیسرے کے پاس سائلنسر لگا ہوا پستول تھا۔ شا کا ہاتھ اپنی

جیب کی طرف گیا تھا کہ پستول والے نے پستول کا رخ اس کی ماں کی طرف کر دیا اور کونے میں کھڑے جان پال نے کہا۔ ''نو نو... ایسا مت کرنا ورنہ نقصان ناقابلِ تلافی ہوگا۔''

شا کا ہاتھ رک گیا، کینی آگے آیا اور اس نے شا کا ریوالور نکال لیا۔ آشی اس کے پیچھے تھی۔ وہ نا وقت میں آئے۔ جان نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے موبائل کال کی مدد سے شا کے باپ کے گھر کا پتا چلا لیا تھا اور وہ سیدھے یہیں آئے تھے۔ جان نے اشارہ کیا۔ ''ٹھیک ہے سینٹ پیٹرز...''

شا اور آشی صوفے پر بیٹھ گئے۔ شا نے ماں باپ کی طرف دیکھا۔ ''آپ ٹھیک ہیں نا... یہ اندر کیسے آئے؟''

''جیسے تم آئے۔'' جان مسکرایا۔ ''یہاں آنا تو بہت آسان ثابت ہوا۔''

''تم امریکی ہو؟'' آشی نے جان کی طرف دیکھا۔

''ہاں...'' جان نے کہا اور شا کے باپ کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر شا وہ سب میرے حوالے کر دو۔''

''تم کس چیز کی بات کر رہے ہو؟'' وہ انجان بنا۔

''تمہارے پاس بینجمن کا گوئی یورینیم کی کان کی جو تصاویر اور ڈاکومنٹس ہیں، میں ان کی بات کر رہا ہوں۔'' جان پال کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''تاخیر مت کرو۔ اس سے تمہیں نقصان ہوگا۔''

سینئر شا کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کینی کی نگرانی میں اندر گیا اور مطلوبہ چیزیں لے آیا جو ایک لفافے میں تھیں۔ بینی نے لفافہ جان پال کے حوالے کیا اور اس نے کھول کر دیکھا، اس میں تصاویر کے ساتھ چھ دستاویزات بھی تھیں۔ جان پال نے سکون سے ان کا جائزہ لیا اور پھر مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر شا... اب ہم چلتے ہیں۔ ہمارے جانے کے بعد تم چاہو تو پولیس کو کال کر سکتے ہو۔ مس بیروکی ہمارے ساتھ جائے گی۔''

آشی اچھل پڑی۔ ''ہرگز نہیں...'' اس نے چلا کر کہا مگر کینی آگے آیا اور اس نے آشی کا بازو پکڑ لیا۔ وہ آشی کے مقابلے میں خاصا تنومند تھا۔ اس کے سامنے وہ گڑیا سی لگ رہی تھی لیکن اس نے جو حرکت کی، وہ کینی اور جان پال دونوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ اچانک آگے کی طرف جھکی، اس کے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکے اور اس کی ٹانگیں کینی کی ٹانگوں میں الجھیں جب اس نے قلابازی کھائی تو کینی گرنے سے بچنے کے لیے بے ساختہ آگے گیا۔ اس کا رخ پستول بردار کی طرف تھا، وہ شا کے پاس سے گزرا تو اس نے کینی کو مزید دھکا دیا اور وہ پستول بردار سے جا ٹکرایا۔ ٹھس کی آواز آئی اور کینی کی کراہ سنائی دی۔ جان پال اپنا پستول نکال رہا تھا کہ شا نے میز پر رکھی ایش ٹرے اٹھا کر اسے دے ماری۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا اور ایش ٹرے جان پال کے سر پر لگی۔ وہ چکرا کر پیچھے ہٹا اسی لمحے پولیس سائرن کی مدھم آواز سنائی دی۔ جان پال نے الٹی چھلانگ لگائی اور کھڑکی توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ جب تک شا کھڑکی تک آیا، وہ غائب ہو گیا تھا۔ بینی کا آدمی بھی بھاگ نکلا تھا۔ اس نے اپنے ہی باس کو شوٹ کر دیا تھا۔ البتہ بینی بے سدھ وہیں پڑا تھا۔ دو منٹ کے اندر پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔

بینی بچ گیا تھا، اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ شا اور اس کے ماں باپ نے ایک ہی بیان دیا کہ مسلح افراد اچانک ان کے گھر میں گھس آئے اور ان کا ارادہ ڈکیتی کا تھا لیکن اتفاق سے گولی چلنے سے ان کا اپنا ساتھی زخمی ہوا تو وہ بھاگ نکلے۔ شا نے مزید بیان دیا کہ وہ سوہو سے آیا تھا اور اس نے اپنے گھر کے اندر پراسرار لوگوں کی موجودگی محسوس کر کے پہلے پولیس کو کال کیا اور پھر اندر گیا۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی کہ وہ ڈاکوؤں کو بالکل نہیں جانتے۔ آشی بیروکی کو شا نے اپنی دوست اور مہمان ظاہر کیا تھا جو اس کے ساتھ آئی تھی۔ جب پولیس چلی گئی اور انہیں بات کرنے کا موقع ملا تو آشی نے شا سے کہا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو، پولیس کو اصل بات کیوں نہیں بتا رہے ہو؟''

''پولیس کو اصل بات بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر میں پولیس کو بتا دیتا تو اس سے یہ نقصان ہوتا کہ سی آئی اے والے دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہو جاتے۔''

آشی حیران ہوئی۔ ''یہ سی آئی اے والے تھے؟''

''سب نہیں صرف جان پال جو فرار ہو گیا۔ وہ سی آئی اے کا ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔''

''تم جانتے ہو؟''

''ہاں یہ ماضی میں جنوبی افریقہ میں تعینات رہا ہے اور بعض مواقع پر یہ منظرِ عام پر بھی آیا۔ زخمی ہونے والا شخص فوج کا سابق کرنل بینی ونیم ہے، یہ شخص شدید نسل پرست ہے اور اسی وجہ سے فوج سے فارغ کیا گیا۔ اس نے اپنے جیسے ایکس آرمی پرسن جمع کر کے ایک گینگ بنایا ہوا ہے اور کرائے کے فوجی کا کردار ادا کرتا ہے۔''

آشی نے غور کیا اور سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو،

اس صورت میں پولیس کو نہ بتانا ہی بہتر ہے۔ اب جان پال مطمئن ہوگا کہ اس نے اصل ثبوت حاصل کر لیے ہیں۔''

شانے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''ان کے امکین ہیں لیکن اصل چیز کی بات الگ ہوتی ہے۔''

اس سارے ہنگامے میں شا کی ماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ انہیں بیڈروم میں بھیج دیا تھا۔ شا کا باپ بھی ان کے پاس تھا۔ آشی اور شا لاؤنج میں تھے اور وہاں پھیلی بے ترتیبی کو درست کر رہے تھے۔ آشی نے کہا۔ ''میں تمہیں کچھ اور سمجھ رہی تھی۔''

ایش ٹرے کے ٹکڑے جمع کرتے ہوئے شا رک گیا۔

''کیا سمجھ رہی تھیں؟''

''سفید فام.... تمہارا رنگ اور نقوش بھی سفید فاموں جیسے ہیں۔ تمہارے ماں باپ کو دیکھ کر حقیقت کا پتا چلا۔''

وہ مسکرایا۔ ''اچھا.... میں ساؤتھ ایشین مسلم فیملی سے ہوں میرا پورا نام سمیر احمد شاہ ہے۔ یہ شاہ انگریزی والا نہیں ہے۔ ہم پٹھان ہیں اس لیے میرا رنگ اور نقوش بھی کسی حد تک سفید فاموں جیسے ہیں۔''

عمیر احمد بیڈروم سے باہر آئے اور سمیر کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

سمیر نے تفصیل سے باپ کو بتایا کہ یہ سب کیا تھا؟ عمیر ذہین تھے، وہ سمجھ گئے۔ ''ٹھیک ہے لیکن اب اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے ملے گا۔ میرے لیے تم لوگوں کی زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔''

''جی پاپا آپ نے لفافہ دے دیا، امید ہے وہ مطمئن ہوگا اور دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کرے گا اسی لیے میں نے پولیس کو ان کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس سے بات مزید بڑھتی۔''

''یہ لڑکی.... اب یہ کیا کرے گی؟''

''یہ اس کا مسئلہ ہے پاپا۔'' سمیر نے معقول جواب دیا۔ ''میں اسے آپ سے ملوانے لایا ہوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں اس سے صرف ایک صورت میں بات کروں گا اگر یہ میرے جوابات کا کہیں حوالہ نہیں دے گی۔''

سمیر نے آشی کو باپ کی شرط بتائی تو وہ چپ ہوگئی۔

''اس صورت میں میرا بات کرنے کا فائدہ؟''

''تم کو تسلی ہو جائے گی کہ امریکیوں نے واقعی یہاں سے یورینیم حاصل نہیں کیا تھا۔''

عمیر احمد اور رافیہ ڈنر کر چکے تھے۔ سمیر اور آشی کا بھی موڈ نہیں تھا اس لیے رافیہ نے چکن کارن سوپ بنا دیا اور وہ کچن کی میز پر آگئے۔ عمیر احمد اپنی کہانی سنانے لگے۔

☆☆☆

عمیر احمد ایک ٹیکنیکل کالج سے ڈپلوما کر کے ایک مائننگ کمپنی میں اپرنٹس شپ کر رہے تھے۔ اس کمپنی کے پروجیکٹ پورے افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہی دنوں کانگو سے کمپنی کو کچھ پروجیکٹس ملے تو اس کے لیے تربیت یافتہ عملہ جنوبی افریقہ سے بھیجا گیا۔ عملے میں عمیر احمد بھی شامل تھے۔ اتفاق سے سونے اور بعض دوسری دھاتوں کی یہ کان اس مشہور یورینیم کان سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہاں یورینیم تیس کی دہائی میں دریافت ہوگیا تھا لیکن بہ حیثیت دھات اس کی مانگ نہیں تھی ہاں یورینیم کی ایک ذیلی دھات ریڈیم کی بہت زیادہ مانگ تھی۔ مگر جب جرمن سائنس دانوں نے یورینیم کے ایٹم کے ٹوٹنے کی صلاحیت کا پتا چلایا تو یکایک یہ دنیا کی اہم ترین دھات بن گئی۔ عمیر احمد کے پاس انگلینڈ سے آنے والے کچھ سائنس جرنلز تھے جن میں یورینیم کے بارے میں اس وقت کے جدید ترین آرٹیکل تھے۔ بہ حیثیت میٹلرجسٹ انہیں بھی اس چیز سے دلچسپی تھی اس لیے جب 1946 کے آخر میں کانگو کی کان پر کام شروع ہوا اور عمیر احمد کی کمپنی سے جو عملہ لیا گیا، اس میں عمیر احمد بھی شامل تھے۔ انہوں نے بہ حیثیت سپر وائزر کان میں کھدائی کے آغاز کی نگرانی کی۔ البتہ مٹی اور دوسری دھات سے خام یورینیم کی علیحدگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے لیے عملہ اور خاص آلات اور لباس سب یورپ سے آئے تھے۔ عمیر احمد نے اس پروجیکٹ پر چھ مہینے کام کیا اور اس دوران میں کان ان کے سامنے سیٹ ہوئی اور وہاں سے یورینیم کی پیداوار یورپ اور امریکا جانے لگی۔ کنٹریکٹ ختم ہوا تو عمیر احمد واپس جنوبی افریقہ آگئے۔

☆☆☆

''یہ سب میرے سامنے ہوا۔'' عمیر احمد نے کہا۔

''جب میری ٹیم نے کام شروع کیا تو یورینیم کے ذخائر تقریباً دو سو فٹ کی گہرائی میں موجود تھے اور اس وقت تک وہاں سے ایک چھٹانک یورینیم بھی نہیں نکالی گئی تھی۔''

''امریکی جھوٹ بولتے ہیں کہ انہوں نے مین ہٹن پروجیکٹ کے لیے بیلجیئم کانگو سے یورینیم حاصل کی۔'' سمیر نے تائید کی اور آشی سے بولا۔ ''میرا خیال ہے اب تم مطمئن ہو۔''

''ہاں۔'' وہ بے دلی سے بولی۔ ''لیکن اس حقیقت کا کیا فائدہ جو میں سامنے نہ لا سکوں۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' عمیر احمد نے کہا۔

''ہاں ہمیں نقصان ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے آج فائدہ نہیں ہوگا لیکن یہ بات ریکارڈ میں تو آجائے گی۔''

''ریکارڈ میں صرف وہی چیز آتی ہے جس کا کوئی ثبوت ہو۔ ہمارے پاس اب کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تصاویر اور ڈاکومنٹس کے اسکین ہیں لیکن ان کا فائدہ نہیں ہے، یہ اصل کے متبادل نہیں ہو سکتے ہیں۔''

اتفاق سے عمیر احمد کے پاس جو تصاویر تھیں وہ صرف ایک بار پرنٹ ہوئی تھیں۔ یہ کل چھ تصاویر تھیں جن میں بیلجین کانگو کی یورینیم کان کا آغاز ہوتے دکھایا گیا تھا۔ آشی نے کہا۔ ''اس کان پر کام کرنے والے صرف آپ تو نہیں تھے اور بھی لوگ تھے اور کمپنی بھی تو تھی۔''

''اتفاق سے پاپا کے گروپ کے تمام لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ کمپنی چالیس سال پہلے بند ہو گئی تھی۔'' سمیر نے کہا۔ ''میں نے اس بارے میں مکمل تحقیق کی ہے۔''

آشی کی مایوسی بڑھ گئی۔ ''یعنی میرے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

دو گھنٹے کی گفتگو میں عمیر احمد کیس کا پس منظر جان گئے تھے۔ رافیہ انہیں سوپ دے کر سونے چلی گئی تھیں پھر کافی سمیر نے بنائی تھی۔ عمیر احمد نے آشی سے کہا۔ ''تم غلط سمت میں تحقیق کر رہی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں یوکی آئیوا پر تحقیق کرنی چاہیے۔'' وہ بولے۔ ''اس سارے معاملے کی اصل کلید یوکی آئیوا ہے۔''

''وہ انڈونیشیا کے بحیرۂ مولوکا میں کہیں ہزار فٹ کی گہرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔'' سمیر نے باپ کو یاد دلایا۔

''بے شک لیکن اصل چیز تو اسی میں تھی۔'' عمیر احمد نے آشی کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تمہارے گرینڈ پا کی فکر اسی بارے میں ہے ورنہ انہیں اس سے کیا کہ امریکیوں نے اپنے بم کے لیے یورینیم کہاں سے لی تھی؟''

آشی اور سمیر ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ واقعی اصل اہمیت تو یوکی آئیوا کی شپ منٹ کی تھی۔

☆☆☆

سمیر سنگاپور ائرپورٹ پر اترا تو موسم خراب تھا اور طوفانی قسم کی بارش جاری تھی مگر وہ ٹیکسی لے کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر اس نے برساتی لی۔ اس کے بغیر وہ ایک منٹ میں پانی میں شرابور ہو جاتا اور اس کا بیگ بھی واٹر پروف نہیں تھا۔ اس میں لیپ ٹاپ سمیت کئی ایسی چیزیں تھیں جنہیں پانی سے بچانا لازمی تھا۔ اس نے بیگ شانے سے لٹکا کر اسے سامنے پیٹ پر کر لیا اور اوپر سے برساتی پہن لی تھی۔ بندرگاہ پر اتر کر وہ لوگوں سے پوچھتا ہوا اس ڈاک پر آیا جہاں درمیانے درجے کے بحری جہاز لنگر انداز تھے۔ اسے ایکسپلور ایشیا کی تلاش تھی۔ بحری جہاز اسے ڈاک کے آخر میں لنگر انداز ملا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پر جانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا سیڑھی نہیں تھی اور جہاز سے بھی ایسی کوئی چیز نہیں لٹک رہی تھی جسے آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ اوپر سے ایک شخص نے جھانکا۔ وہ مقامی تھا پہلے اس نے مقامی زبان میں کچھ پوچھا جواب میں سمیر نے چلا کر کہا۔ ''انگلش۔''

''کون ہو تم؟'' اس بار اس نے انگریزی میں پوچھا۔

''ایس اے شاہ۔'' سمیر نے جواب دیا۔ ''میں اس جہاز کا ایک ممبر ہوں۔''

وہ شخص غائب ہو گیا اور ایک نشست بعد رسی کی سیڑھی نیچے گری۔ سمیر اس سے اوپر پہنچ گیا۔ بحری جہاز کا نچلا عرشہ ڈاک سے کوئی دس فٹ اوپر تھا۔ مقامی شخص نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''میں ایکسپلور ایشیا کا کپتان لی زون ہاؤ ہوں فرام سنگاپور۔''

''ایس اے شاہ فرام ساؤتھ افریقہ۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' کپتان لی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم بروقت آئے ورنہ ایک گھنٹے بعد روانگی ہے۔ اگر یہاں جہاز مس ہو جاتا تو تمہیں جکارتہ میں پارٹی جوائن کرنا پڑتی۔''

''مس ہیرو کی آچکی ہے؟''

''نہیں وہ جکارتہ سے آن بورڈ ہوگی۔'' کپتان لی نے کہا اور اسے نچلے فلور کے رہائشی حصے میں لایا یہاں ایک راہداری میں آمنے سامنے پانچ پانچ کیبن تھے اور یہ افسران کے لیے مخصوص تھے۔ کپتان لی نے ایک کمرے کا لاک کھولا۔ ''یہ تمہارے لیے مخصوص ہے مسٹر شاہ.... ایوری تھنگ از او کے لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو تو تم تھرڈ آفیسر کالارک شاؤز سے رجوع کرو گے۔''

کمرا خاصا پرتعیش تھا۔ آرام دہ ڈبل بیڈ جس پر ریشمی چادر بچھی تھی۔ فرش پر ڈارک گولڈن رنگ کا دبیز قالین تھا اور یہ دیواروں کے شیڈ سے مل رہا تھا۔ بیڈ کے سامنے بڑے سائز کا ایل ای ڈی ٹی وی لگا تھا اور نیچے ریک پر ملٹی میڈیا انٹرٹینمنٹ کا سامان نظر آرہا تھا۔ کمرا مکمل طور پر ایسی تھا اور باہر کے گرم اور نم موسم کے مقابلے میں یہاں خنکی اور خشکی تھی۔ ایک طرف چھوٹا فریج رکھا تھا اور اس سے مخالف سمت میں چھوٹے صوفے اور ایک میز بھی تھی۔ الماری چھوٹی لیکن سامان رکھنے کے لحاظ سے موزوں تھی۔ کپتان لی نے اسے مطلع کیا۔ ''آفیسرز میس اوپری عرشے پر ہے۔ وہاں ایک سے چار بجے تک لنچ ملتا ہے۔ جب کچھ کھانا پینا چاہو وہاں جاسکتے ہو۔''

ابھی صبح کے دس بج رہے تھے اور سمیر نے جہاز میں بہترین ناشتا کیا تھا اس لیے اس کا موڈ نہیں تھا۔ ''ایک بجنے میں وقت ہے۔''

''ہاں لیکن میں چاہتا ہوں کہ آفیسرز سے تمہارا تعارف کرادوں۔ مس ہیروکی نے تمہیں سیکنڈ ان کمانڈ قرار دیا ہے۔''

سمیر حیران ہوا۔ ''کس کی کمانڈ؟''

''آف کورس .. اس بحری جہاز کی.... ہم سب مس ہیروکی کے پے رول پر ہیں۔''

ایک مہینا پہلے جنوبی افریقہ سے روانگی کے وقت آشی نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے کال کرے گی اور ایک آفر دے گی اگر وہ مان گیا تو ان کی دوبارہ ملاقات ممکن ہو سکے گی۔ ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

اس وقت سمیر کا خیال تھا کہ وہ آشی کی پیشکش مسترد نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ اس نے سمیر کو بتایا نہیں تھا کہ وہ کیا آفر دے گی لیکن سمیر کو کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ان چند دنوں میں آشی کو بہت زیادہ جان گیا تھا۔ وہ کردار کی مضبوط اور دھن کی پکی تھی۔ اسے اپنے نانا سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ہر جاپانی کی طرح عزتِ نفس کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ جاپانیوں میں عزتِ نفس کے لیے جان دے دینا عام سی بات سمجھی جاتی تھی۔ خودکشی اس قوم کا محبوب مشغلہ ہے۔ مگر آشی کے جانے کے بعد جب اس نے باپ سے بات کی تو عمیر احمد نے اسے منع کیا۔ ''میرا مشورہ ہے اس معاملے میں مزید نہ پڑو اور نہ اس پر مزید لکھو۔''

''یہ فیصلہ تو میں نے پہلے ہی کر لیا تھا کیونکہ اب میرے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے اور آپ کو میں جھوٹا کہلوانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''پہلی بات کے بارے میں کیا سوچا؟''

''پاپا اگر آپ مجھے خوف زدہ کر کے پیچھے ہٹنے کو کہہ رہے ہیں تو آپ جانتے ہیں میں صحافی ہوں اور کبھی ڈر کر پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔''

''ٹھیک ہے لیکن میرے بچے یہ بھڑوں کا چھتا چھیڑنے والی بات ہوگی۔'' عمیر احمد بے چین ہو گئے۔ ''تم جانتے ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور تم ان لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔''

سمیر نے گہری سانس لی اور رسانیت سے بولا۔ ''پاپا میں لڑ نہیں رہا، میں صرف سچ بات کہہ رہا ہوں اور سچ کہنے والے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کی بات کو سچ ماننے والے کتنے ہیں۔ پاپا ہمیں تو تعلیم ہی سچ بولنے کی دی گئی ہے۔''

زندگی میں بہت کم مواقع ایسے آئے تھے جب عمیر احمد نے اولاد کے سامنے خود کو لاجواب محسوس کیا تھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلانے کے ساتھ ان کی اچھی تربیت بھی کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بچے اس طرح کی تربیت نہیں حاصل کر سکتے جو کسی اسلامی ملک میں رہتے ہوئے ملتی لیکن انہوں نے ممکن حد تک انہیں ان کے دین کے عقائد اور تعلیمات کے بارے میں بتایا تھا۔ عمیر احمد نے کہا۔ ''تب تم اس معاملے میں شامل رہو گے؟''

''لازمی نہیں ہے پاپا.... اگر مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے اور میں اپنے پیشے کے تقاضوں

آشی مزید تین دن اس کے ساتھ رکی تھی۔ سمیر نے اصرار کر کے اسے گھر پر روک لیا تھا اور ساتھ ہی اسے ڈھکے چھپے انداز میں بتا دیا تھا کہ وہ ایسا لباس پہننے سے گریز کرے جس میں جسم نمایاں ہو۔ اس کے ماں باپ قدامت پسند تھے۔ آشی اس کے گھر قیام کے دوران پینٹ اور شرٹ میں رہی تھی۔ سمیر نے اسے ڈربن گھمایا تھا، یہ اس کے بچپن کا شہر تھا اور وہ اس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ آشی کو سفاری بھی لے گیا۔ وہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے تھے۔ دونوں بے تکلف بھی تھے لیکن کئی بار ایسا ہوا وہ ایک دوسرے سے کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ آشی جاتے وقت اداس تھی اداس تو سمیر بھی تھا لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ آشی نے سمیر کو آفر دینے کے بعد کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے اگر تم نے انکار کیا تو پھر کبھی ہماری

کو پورا کر سکتا ہوں تو میں ضرور شامل ہوں گا۔"

آشی نے اس سے دو ہفتے پہلے رابطہ کیا۔ "سامی تم نے کہا تھا کہ تم نے میرین کی تربیت لی ہے؟"

"ہاں میں نے تربیت لی ہے۔"

"تم اسکوبا ڈائیونگ کر سکتے ہو؟"

"بالکل اس کے بغیر میرین کی تربیت کہاں مکمل ہوتی ہے۔"

"تب تم میرے ساتھ کام کر سکتے ہو۔" آشی بولی۔

"میں ایک ٹیم لے کر انڈونیشیا جا رہی ہوں جہاں یو کی آئیوا ڈوبا تھا۔ مجھے اسکوبا ڈائیورز کی ضرورت ہے۔"

"لیکن میں پروفیشنل اسکوبا ڈائیور نہیں ہوں۔" سمیر نے اسے یاد دلایا۔ "میرا پیشہ صحافت ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" آشی ملائمت سے بولی۔ "میں نے تمہیں صحافت کرنے سے منع نہیں کیا ہے لیکن میں محدود افراد کو لے جا رہی ہوں۔ میری کوشش ہے کہ اعتماد کے آدمیوں کو لے کر جاؤں، خاص طور سے وہ جو زیرِ آب یو کی آئیوا تک رسائی حاصل کریں گے۔"

سمیر اس کی بات سمجھ گیا۔ "دوسرے اسکوبا ڈائیورز بھی ہوں گے؟"

"ہاں ایک میں ہوں اور ایک اس بحری جہاز کا پرانا ملازم ہے جو میں نے ہائر کیا ہے۔"

سمیر نے اس سے کہا۔ "تم مجھے سوچنے کی مہلت دو گی؟"

"کیوں نہیں لیکن یہ خیال رکھنا مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" آشی نے آہستہ سے کہا۔ سمیر خوش ہو گیا۔

"تب مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

آشی کھل اٹھی۔ سمیر کے کانوں میں ایک چہکار سی گونجی۔ "تھینک یو سو مچ۔"

سمیر ہنسا۔ "شکریہ تو تم نے ادا کر دیا۔"

ایک ہفتہ بعد سمیر کو ای میل سے اس کا ائر ٹکٹ اور تفصیلات مل گئیں۔ آشی نے اخراجات کے لیے اس کے بینک اکاؤنٹ میں دس ہزار ڈالرز بھیجے تھے۔ حالانکہ اس نے منع کیا تھا لیکن آشی نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ اس نے کہا۔ "یہ بہ حیثیت اسکوبا ڈائیور تمہارا معاوضہ ہے۔ اتنا ہی دوسرے بھی لیتے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔" سمیر نے اسے یاد دلایا۔ "مدد کا معاوضہ نہیں لیا جاتا ہے۔"

"مدد تم میرے مشن میں کرو گے، اس کی کوئی ادائیگی نہیں ہو گی۔" آشی نے کہا۔ "پلیز اب تم بحث کرنے کے بجائے آنے کی تیاری کرو ابھی تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے تم اسکوبا ڈائیونگ کی مشق کر سکتے ہو۔"

سمیر نے یہی کیا۔ اس نے اخبار سے چھٹی لی اور ڈربن آ گیا یہاں اس نے اسکوبا ڈائیونگ کا سامان لیا اور خود سمندر میں جا کر اسکوبا ڈائیونگ کرنے لگا لیکن یہ عام اسکوبا ڈائیونگ تھی جس میں غوطہ خور سو فٹ سے زیادہ نیچے نہیں جاتا ہے کیونکہ اس سے زیادہ نیچے جانے کی صورت میں اس کے جسم پر دباؤ آنے سے خلیات میں نائٹروجن گیس شامل ہو جاتی ہے۔ یہ جسم پر پڑنے والے دباؤ کو لیول کرتی ہے۔ لیکن اگر غوطہ خور کو تیزی سے پانی سے باہر آنا پڑے تو یہی نائٹروجن خلیات کو پھاڑ دیتی ہے اور غوطہ خور مر بھی سکتا ہے۔ اس نے آشی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ان کے پاس ایسے اسکوبا ڈائیور سوٹ تھے جو ایک ہزار فٹ کی گہرائی میں بھی جسم کو دباؤ سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کا استعمال بھی آسانی سے سیکھا جا سکتا تھا خاص طور سے ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا جو پہلے سے اسکوبا ڈائیونگ جانتے ہوں۔

چھ دن کی مشق کے بعد اسے بھولا ہوا سبق یاد آ گیا تھا اور وہ جسمانی طور پر بھی بہترین حالت میں آ گیا تھا اب وہ اس مشن کے لیے مکمل طور پر تیار تھا۔ ساتویں دن وہ سنگاپور روانہ ہوا۔ ایشیا ایکسپلورر ایک ورین میرین ایکسپلورر کمپنی کی ملکیت تھا اور زیرِ آب تلاش اور سامان نکالنے کے لیے اس جہاز میں جدید ترین آلات نصب تھے۔ سمیر نہیں جانتا تھا کہ آشی نے بحری جہاز حاصل کرنے کے لیے کیا ادائیگی کی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ یہ ادائیگی لاکھوں ڈالرز میں تھی۔

اس کی آمد کے ایک گھنٹے بعد ہی بحری جہاز سنگاپور کی بندرگاہ سے نکل رہا تھا۔ جب دو بجے سمیر اوپر آفیسرز میس میں آیا تو ایکسپلورر ایشیا کھلے سمندر میں جکارتہ کی طرف رواں دواں تھا۔ کپتان لی نے اسے باقی اسٹاف سے متعارف کرا دیا تھا۔ سمیر نے اپنے لیے سینڈوچز اور کافی لی۔ سفر کے آغاز میں وہ ہلکا پھلکا کھانا چاہتا تھا تاکہ پیٹ کا مسئلہ نہ ہو۔ سب نے کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ سمیر کو خیال آیا۔

"شپ کا اسکوبا ڈائیور کون ہے۔"

"ارجن کمار فرام انڈیا۔" کپتان لی نے کونے میں بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کیا جو بیئر سے شغل کر رہا تھا۔ وہ واحد فرد تھا جس نے سمیر سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کلارک نے اسے آواز دی۔

”یہ ارجن تمہارا نیا ساتھی۔“

ارجن کمار بادل ناخواستہ اٹھ کر سمیر کے پاس آیا۔ اس نے ہاتھ ملایا تو ایسا لگا جیسے وہ اسے اپنی طاقت جتانا چاہ رہا ہو۔ اس کی گرفت میں سختی تھی لیکن جیسے ہی سمیر نے ہاتھ سخت کیا اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”شپ پر خوش آمدید۔“ الفاظ کے برعکس انداز استہزائیہ تھا۔ ”میرا خیال ہے تم اچھے اسکوبا ڈائیور ہوگے۔“

”ممکن ہے۔“ سمیر نے جواب دیا۔ اسے یہ شخص پہلی نظر میں اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ سیاہی مائل رنگت اور بڑھی ہوئی شیو والا پستہ قامت لیکن گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔ ہاتھ پاؤں بڑے اور کھردرے تھے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ اچھا ڈائیور تھا ورنہ اس جہاز پر نہ ہوتا۔ اس سے ہاتھ ملا کر وہ واپس چلا گیا۔ اس نے سمیر سے مزید گفتگو کی کوشش نہیں کی۔ سمیر نے بھی پروا نہیں کی اور دوسرے افسران سے گپ شپ کرتا رہا خاص طور سے اس نے زیر آب تلاش کے آلات استعمال کرنے والے ٹیکنیشین سے بات کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اصل مشن شروع ہونے سے پہلے ان آلات کے بارے میں جان لے۔ شپ پر ہونے کی وجہ سے سب ہی انگریزی جانتے تھے اس لیے سمیر کو کسی سے بات کرنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لنچ کے بعد وہ واپس اپنے کیبن میں آگیا۔ باہر اس وقت شدید دھوپ اور کاٹ دار گرمی تھی اس لیے کیبن کے اے سی ماحول میں ہی سکون مل سکتا تھا۔

سنگاپور سے جکارتہ تقریباً آٹھ سو میل کی دوری پر تھا۔ یہ پورا سمندر چھوٹے بڑے جزائر سے بھرا ہوا تھا اور یہاں جا بہ جا گہرائی اور شکل بدلتے ریف تھے۔ زیر آب آتش فشاں تھے اس لیے بحری جہاز کے عملے کو بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔ آشی نے اسے بتایا تھا کہ اس نے اپنا مشن خفیہ رکھا تھا اور ایکسپلور ایشیا کے عملے کو بھی علم نہیں تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا اور کیا کرنا تھا؟ سمیر نے محسوس کیا کہ کپتان لی اور دوسرے افسران متجسس تھے کہ ان کا مشن کیا تھا، انہیں صرف جکارتہ تک اپنی منزل کا علم تھا، اس سے آگے کہاں جانا تھا، وہ نہیں جانتے تھے۔ کپتان لی نے ایک بار سمیر سے پوچھا تو وہ بھی لاعلم بن گیا۔

”مجھے بھی نہیں معلوم ہے۔“

”سوری مجھے عجیب لگا اس لیے پوچھ لیا ورنہ عام طور سے ہمیں علم ہوتا ہے اور کمپنی بھی بغیر مکمل پلان کے شپ ہائر نہیں کرتی ہے۔“

”میرا خیال ہے یہ کمپنی اور مس ہیروکی کا معاملہ ہے۔“

”ہاں مسٹر شامیر! بھی یہی خیال ہے۔“ کپتان لی نے جلدی سے کہا۔ ”پلیز خیال مت کرنا میں نے ایسے ہی پوچھ لیا، مس ہیروکی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سمیر مسکرا دیا۔ اس نے محسوس کیا صرف کپتان لی ہی نہیں دوسرے افسران کو بھی تجسس تھا۔ ان کے تجسس سے بچنے کے لیے وہ زیادہ وقت زیر آب تلاش کے آلات چلانے والے ٹیکنیشین کے ساتھ گزارنے لگا۔ وہ ان سے ان آلات کے بارے میں سیکھ رہا تھا۔ ایکسپلور ایشیا کا عملہ تربیت یافتہ تھا اور انہوں نے کئی ڈوبے بحری جہاز تلاش کیے تھے ان میں دوسری جنگ عظیم میں ڈوب جانے والا دنیا کا سب سے بڑا جنگی بحری جہاز پرنس آف ویلز بھی تھا جسے ایک جاپانی خودکش پائلٹ نے طیارے سمیت اس کی چمنی میں کود کر تباہ کر دیا تھا۔ اس بحری جہاز کے ٹکڑے بحرالکاہل میں کئی ہزار فٹ کی گہرائی میں پڑے تھے۔ خصوصی آبدوز کی مدد سے اس سے بہت سارا سامان نکالا گیا تھا جو کئی ملین ڈالرز میں نیلام ہوا تھا۔ یہ آبدوز بھی ایکسپلور ایشیا پر موجود تھی۔ اس میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی، اسے پائلٹ کیا جا سکتا تھا اور بہ وقت ضرورت بحری جہاز سے آپریٹر اسے ریموٹ کنٹرول کر سکتا تھا۔ یہ دس ہزار فٹ کی گہرائی تک جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جہاز پر بہت گہرائی میں پہن کر جانے والے ڈائیونگ سوٹ بھی تھے۔ ان کی مدد سے ہزار فٹ کی گہرائی کا دباؤ بھی برداشت کیا جا سکتا تھا۔ سمیر ان کا استعمال سیکھنے لگا تاکہ اسے بعد میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

☆☆☆

جونیئر جان پال کا چہرہ تناؤ کا شکار تھا۔ وہ بوڑھے جان پال کے سامنے بیٹھا تھا۔ ”گرینڈ پا میں مجبور تھا کہ یہ اب خاموش بیٹھ جائیں گے۔“

بوڑھے پال نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم جاپانیوں کو نہیں جانتے ہو، یہ کرۂ ارض پر دشمن کی سب سے پکی قوم ہے جو سوچ لے وہ کر کے رہتی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا۔“

جان پال نے گہری سانس لی۔ ”رین ہیروکی کی نواسی آشی ہیروکی نے کورین تحقیقی بحری جہاز ایکسپلور ایشیا ہائر کر لیا ہے اور وہ سنگاپور سے روانہ ہو چکا ہے۔“

''اور میرا پوتا یہاں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔''

بوڑھے جان پال کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''تم نے اس معاملے میں مجھے مایوس کیا ہے۔''

''گرینڈ پا معاملہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلا ہے، دو گھنٹے بعد میری فلائٹ ہے اور میں خود اس معاملے کو ہینڈل کرنے جا رہا ہوں۔''

''پہلے بھی تم گئے تھے، کیا ہوا؟'' بوڑھے جان پال کا موڈ خراب رہا۔

''میں نے تصویریں اور دوسرے دستاویزی ثبوت ان لوگوں سے حاصل کر لیے ہیں، اب ان کے پاس دنیا کو دکھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''لیکن اگر انہوں نے یوکی آئیوا تک رسائی حاصل کر لی تو....'' بوڑھے جان پال کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ ''تم جانتے ہو یہ ملک اور پروجیکٹ سے زیادہ میری ساکھ کا معاملہ ہے۔''

''گرینڈ پا یہ صرف آپ کا نہیں، میرا معاملہ بھی ہے۔'' جان پال نے کہا۔ ''میں نے سوچ لیا ہے اس بار ان کے ساتھ رعایت نہیں کروں گا۔''

بوڑھے جان پال کا موڈ بہتر ہوا۔ ''تم کچھ بھی کرو یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ میں عمر کے اس آخری حصے میں بے سکون ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔''

جان پال کھڑا ہو گیا۔ ''گرینڈ پا میرا آپ سے وعدہ ہے آپ بے سکون نہیں رہیں گے۔''

دو گھنٹے بعد وہ ایشیا کی طرف جانے والے ائر لائنز جیٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی منزل جکارتہ تھی۔

☆☆☆
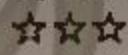
کشتیاں سپلائی ایکسپلورر ایشیا پر بار کر رہی تھیں۔ اس میں تازہ سبزیاں، پھل، منرل واٹر اور دوسری ضروری چیزیں تھیں جن کی اس بحری سفر میں ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن اب تک آشی نہیں آئی تھی۔ سمیر کی ذمے داری نہیں تھی لیکن وہ اشیا کی منتقلی کی نگرانی کر رہا تھا۔ جہاز کا عملہ سامان نیچے اسٹور میں لے جا رہا تھا۔ بحری جہاز جکارتہ کی بندرگاہ سے باہر کھلے سمندر میں رکا تھا کیونکہ اسے صرف سپلائی لینی تھی اس لیے بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ یہاں صرف بارہ گھنٹے کے لیے رکے تھے اگلی صبح پانچ بجے انہیں روانہ ہو جانا تھا۔ سپلائی دے کر دونوں کشتیاں واپس چلی گئیں۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی۔ سمیر عرشے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب تک آشی کیوں نہیں آئی، اتنے میں ایک چھوٹی اسپیڈ بوٹ آ کر جہاز کے ساتھ لگی اور رسی کی سیڑھی سے آشی اوپر آئی، سمیر خوش ہو گیا۔ ''شکر ہے تم آ گئیں ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ تم کسی مشکل میں پڑ گئی ہو۔''

آشی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے شارٹس اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، اس کے شانے پر ایک بیگ تھا اور ایک سوٹ کیس کشتی سے اوپر بھیجا گیا پھر بوٹ واپس چلی گئی۔ آشی نے سر ہلایا۔ ''میں مشکل میں پڑ گئی تھی۔''

سمیر نے اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور وہ نیچے والے فلور کی طرف بڑھے۔ ''کیسی مشکل؟''

''مقامی حکومت نے سمندر میں زیرِ آب تلاش کا اجازت نامہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ دو دن سے اسی مسئلے میں الجھی ہوئی تھی بڑی مشکل سے اجازت نامہ ملا ہے لیکن یہ صرف ایک ہفتے کے لیے ہے۔''

سمیر فکرمند ہو گیا۔ ''صرف ایک ہفتے کے لیے.... یہ تو بہت کم وقت ہے۔ کیا خیال ہے امریکیوں نے کوئی ڈور ہلائی ہے؟''

''میرا نہیں خیال ہے۔ اس صورت میں اجازت مشکل سے ملتی۔ یہ مقامی چکر ہے .... یہاں بعض سیاسی اور مذہبی معاملات آپس میں مل گئے ہیں اور اب مقامی لوگ غیر ملکیوں کی آمد کی مخالفت کرتے ہیں۔''

''ایسا تو ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔''

''میں نے بڑی مشکل سے مقامی حکام کو سمجھایا کہ ہم یہاں تفریح کرنے نہیں بلکہ زیرِ آب سمندری تحقیق کے لیے آئے ہیں۔''

وہ آشی کے کیبن میں آ گئے۔ آشی نے بیگ اتار کر رکھا اور فریج سے اپنے لیے بیئر کا ٹن نکالا۔ اس نے سمیر کو بھی آفر کی لیکن اس نے کولڈ ڈرنک لی۔ وہ بیئر نہیں پیتا تھا۔ ''تم نے یوکی آئیوا کا ذکر تو نہیں کیا؟''

''ہرگز نہیں، ورنہ شاید اجازت نہ ملتی....''

''تب ہم یوکی آئیوا کی تلاش کیسے کریں گے؟''

''اس کے لیے میں نے اس سارے سمندری علاقے میں تحقیق کی اجازت لی ہے جہاں یوکی آئیوا کے پائے جانے کا امکان ہے۔''

''تمہارا عملہ بہت متجسس ہے کہ ہمارا مشن کیا ہے؟''

''مجھے معلوم ہے کیونکہ یہ مشن رولز کے خلاف ہے۔ بحری جہاز کے عملے کو پہلے سے اس بارے میں علم ہونا چاہیے

لیکن میں نے زیادہ ادائیگی کر کے فرم سے اپنی شرط منوا لی۔"

"ان لوگوں کو کب بتانا ہوگا؟"

"جب ہم بحیرۂ مولوکا پہنچ جائیں گے۔ فی الحال میں کپتان لی کو منزل کے بارے میں بتاؤں گی۔"

سمیر مسکرایا۔ "تم نے مجھے سیکنڈ ان کمان قرار دے کر ان لوگوں کی نظر میں خاص بنا دیا ہے۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے؟"

"برائی تو نہیں ہے لیکن تم جانتی ہو صحافی ہوں، دوسروں کو روشنی میں لاتا ہوں خود مجھے روشنی میں آنا پسند نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں مجھے معلوم ہے تم اس مشن پر نہیں آنا چاہتے تھے۔"

سمیر اس کے انداز سے پریشان ہوا۔ "پھر تم جانتی ہو گی کہ میں کیوں آیا ہوں۔"

آشی کا چہرہ سرخ ہوا۔ اس نے سر ہلایا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کی کیفیت جانتے اور سمجھتے تھے اس کے باوجود کھل کر بات نہیں کر پا رہے تھے۔ کیونکہ آشی نے مزید کچھ نہیں کہا اس لیے سمیر نے بھی موضوع بدل دیا۔ "شپ کا اسکوبا ڈائیور ارجن کمار خشک قسم کا آدمی ہے جب سے میں آیا ہوں وہ بس دو تین بار مجھ سے ملا ہے۔"

"میں اس سے اب تک نہیں ملی ہوں۔"

"اسکوبا ڈائیورز ٹیم کو ایک دوسرے کے بارے میں بہتر علم ہونا چاہیے اور ان میں اچھی ذہنی ہم آہنگی ہونی چاہیے، یہ ڈیزاب کام آتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" آشی نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور کپڑے نکال کر بستر پر پھیلانے لگی۔ وہ اچھا خاصا وارڈ روب لے آئی تھی۔ "لیکن اصل کام ہمیں کرنا ہے۔"

"یہاں ڈیپ ڈائیونگ کے لیے سوٹ ہیں لیکن ابھی تک ان کی آزمائش نہیں کی ہے۔"

"وہ بھی وہیں ہو گی ہمارے پاس وقت نہیں ہے کہ کہیں اور رک کر آزمائش کریں۔" آشی نے کہا اور الماری کھول کر کپڑے اور سامان رکھنے لگی۔

"آشی میں اب تک نہیں سمجھ کہ تمہارا مشن کیا ہے؟"

وہ پلٹ کر اس کی طرف آئی۔ "تم واقعی نہیں سمجھے ہو؟"

"اتنا تو میں جانتا ہوں کہ تم یوکی آئیوا اس شپ منٹ کے لیے تلاش کر رہی ہو جو اس پر تھی لیکن اگر وہ یوکی آئیوا پر ہو یا نہ ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اسی سے تو فرق پڑتا ہے۔" آشی نے کہا اور دوبارہ پلٹ کر الماری میں کپڑے لگانے لگی۔ سمیر نے گہرا سانس لیا۔ آشی نے واضح جواب نہیں دیا تھا۔ سمیر کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، تم کام کرو۔"

وہ جانے لگا تو آشی پھر پلٹ کر آئی اور اس بار اس کے بہت قریب آ کر اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "سمیر پلیز مجھ پر اعتماد کرو۔"

"اعتماد نہ ہوتا تو میں یہاں تک کیوں آتا۔" سمیر مسکرایا اور اس کے پاس سے ہو کر باہر نکل آیا اور اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ ایک گھنٹے بعد آشی نے دروازے پر دستک دی۔ سمیر ٹی وی دیکھ رہا تھا، جہاز پر جدید ترین سیٹلائیٹ ٹی وی میسر تھا جس میں ہزار سے زیادہ چینل تھے۔ اجازت پر آشی اندر آئی۔

"ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے، مجھے بھوک لگی ہے۔"

"چلتے ہیں۔" سمیر اٹھ گیا۔ "شکر ہے آج جہاز رکا ہے ورنہ ڈولتے ہوئے کھانا پڑتا ہے۔"

وہ میس میں آئے تو تقریباً سب جمع تھے۔ کپتان لی نے آشی کا سب سے تعارف کرایا۔ دوسروں نے گرم جوشی سے آشی کا خیر مقدم کیا تھا البتہ ارجن کمار پہلے کی طرح خاموش تھا، اس نے صرف آشی سے ہاتھ ملانے کی زحمت کی تھی۔ اس کا رویہ ایسا تھا جیسے اسے آشی کی زیادہ پروا نہ ہو مگر سمیر نے محسوس کیا کہ وہ اسے چپکے سے دیکھ بھی رہا تھا اور جب وہ آشی کو دیکھتا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ جاتی تھی۔ اس کا انداز سمیر کو پسند نہیں آیا۔ جب ارجن آشی کو اس طرح دیکھتا اسے غصہ آتا تھا۔ ڈنر سب نے ساتھ کیا تھا اور اس کے بعد آشی نے کپتان لی کو اپنے کیبن میں طلب کر لیا تھا۔ یقیناً وہ اسے ایکسپلورر ایشیا کی منزل کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی۔ تاکہ کپتان لی صبح روانگی کی تیاری کر سکے۔

صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ آشی تھی۔ "نو بجنے والے ہیں ناشتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اچھا خیال ہے۔" سمیر نے کہا اور وہ میس کی طرف بڑھ گئے۔ جہاز حرکت میں آتے ہی پورا عملہ متحرک ہو گیا تھا

اور سب اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ جہاز کا رخ فی الحال مشرق کی طرف تھا۔

تین ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے ایکسپلورایشیا یہ سفر تقریباً ساڑھے تین دن میں طے کر کے بحیرۂ مولوکا میں اس مقام پر پہنچ جاتا جہاں یوکی آئیوا زیرِ آب اپنے عملے اور ایک مکمل شپ منٹ سمیت محوِ خواب تھا۔ ان تین دنوں میں آشی اور سمیر ڈیپ اسکوبا ڈائیونگ کے سوٹ کا استعمال سیکھ سکتے تھے۔ یہ پریشر سوٹ تھے خاص میٹریل کی کئی تہیں تھیں جن میں گیس بھری ہوتی تھی، آدمی کو اس قابل بناتی تھیں کہ وہ ہزار فٹ کی گہرائی میں پڑنے والے ناقابلِ برداشت دباؤ کو بھی برداشت کر سکے۔ یہ سوٹ بہت مہنگے اور جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے تیار کیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ زیرِ آب جانے کے لیے مخصوص آکسیجن ٹینک اور سر پر پہننے والے ہیلمٹ تھے۔ یہ ان اسکوبا ڈائیونگ سوٹ سے بالکل مختلف تھا جو اب تک سمیر اور آشی استعمال کرتے آئے تھے۔ ان کے ساتھ کئی آلات تھے جو زیرِ آب لے جانا ضروری تھے۔

ارجن کمار انہیں سوٹس کے بارے میں بریفنگ دے رہا تھا۔ پہلی بار جب آشی نے سوٹ پہننے کے لیے اپنا لباس اتارا اور صرف زیر جاموں میں آ گئی تو ارجن کمار نے اسے خاص انداز میں دیکھا اور بولا۔ ''میڈم یو آر سو بیوٹی فل۔''

سمیر کی توقع کے خلاف آشی نے کہا۔ ''تھینک یو مسٹر کمار۔''

سمیر کو اچھا نہیں لگا۔ اس مشق سے واپسی پر اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ راستے میں آشی اس سے بات کرتی رہی لیکن اس نے بہت کم باتوں کا جواب دیا اور اپنے کیبن کے پاس اس کی طرف دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور آشی اندر آ گئی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''کیا بات ہے تمہارا موڈ کیوں آف ہے۔''

''نہیں تو۔'' سمیر نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

''نہیں آف ہے، میں نے محسوس کیا ہے جب سے میں نے ڈائیونگ سوٹ پہنا تم اسی موڈ میں ہو۔''

سمیر نے گہری سانس لی۔ ''جب تم جانتی ہو تو پوچھ کیوں رہی ہو۔''

آشی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا تمہیں میرا کمار کے سامنے سوٹ پہننا برا لگا؟''

''نہیں اس نے جس طرح تمہیں دیکھا، مجھے وہ اچھا نہیں لگا۔''

''کم آن سامی..... ہم ساتھی ہیں۔''

''تم اسے ساتھی سمجھ رہی ہو لیکن اس نے تمہیں صرف عورت سمجھا۔'' سمیر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''بہرحال یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے اور اس میں تمہاری مرضی چلے گی۔''

وہ اس کے پاس آ کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

''سامی ہم دوست ہیں۔''

سمیر نے گہری سانس لی۔ ''سوری میرا خیال ہے، میں نے تمہیں بھی ڈسٹرب کر دیا ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ تمہارا تعلق ایک مختلف معاشرے سے ہے اور وہاں یہ سب معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔''

آشی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں جانتی ہوں تم مسلمان عورتوں کے بارے حساس ہوتے ہو۔ ان کا بنا لباس کے یا کم لباس کے مردوں کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے ہو۔''

''صرف اپنی عورتوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دوسری عورتوں کے لیے بھی یہی رویہ ہے۔ کوئی عورت بنا لباس یا کم لباس کے ہمارے سامنے آئے یہ بھی پسند نہیں ہے۔''

آشی کو حیرت ہوئی۔ ''دوسری عورتیں بھی تمہارا مطلب ہے جو مسلم نہیں ہوتی ہیں؟''

سمیر نے تسلیم کیا۔ ''ہمارے مذہب میں مردوں کو بھی منع کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کو نہ دیکھیں مگر ہم اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔''

''میں تو سمجھتی تھی کہ صرف عورتوں کو منع کیا گیا ہے۔''

''تم ہمارا عمل دیکھتی ہو حالانکہ اصل تعلیمات اس کے برعکس ہیں۔''

آشی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''بس یہی وجہ ہے تمہارا موڈ خراب ہونے کی...''

سمیر ہچکچایا پھر اس نے کہہ دیا۔ ''نہیں اس کی ایک وجہ اور تھی، مجھے ذاتی طور پر بھی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کوئی تمہیں اس طرح دیکھے مجھے پسند نہیں ہے۔''

آشی چپ رہی پھر اس نے بات پلٹ دی۔ ''مستو، اس قسم کی تیراکی کے لیے ہمیں جسمانی طور پر مکمل فٹ ہونا چاہیے۔ کل شپ کا ڈاکٹر ہمیں چیک کرے گا۔''

ایکسپلورایشیا پر ایک ڈاکٹر اور ایک چھوٹا سا کلینک بھی تھا جس میں ابتدائی اور ہنگامی طبی امداد کے تمام لوازمات تھے۔ ایک چھوٹی سی لیب بھی تھی جس میں نارمل ٹیسٹ کیے جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر سوحرتو کا تعلق انڈونیشیا سے تھا اور وہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے پہلے آشی کا چیک اپ کیا اور اس میں دو

گھٹنے لگے تھے پھر اس نے سمیر کا معائنہ کیا۔ اس نے سمیر کا بلڈ اور یورین سیمپل بھی لیے۔ ساتھ ہی اس نے کئی وٹامن اور جسمانی کارکردگی بڑھانے کے لیے ٹانک بھی دیے۔ رات تک اس نے رپورٹ بھی دے دی تھی۔ آشی اور سمیر دونوں جسمانی لحاظ سے مکمل فٹ تھے اور ڈیپ ڈائیونگ میں کوئی مشکل حائل نہیں تھی۔ جہاز پر آنے کے بعد سمیر نے معمول بنا لیا تھا، وہ روز دو سے تین گھنٹے جم میں گزارتا تھا۔ وہ اپنی جسمانی حالت بہتر سے بہترین بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آشی آنے کے بعد اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ اگلے دن جب وہ اسکوبا ڈائیونگ سوٹ کی مشق کے لیے پہنچے تو آشی نے پہلے ہی سرفنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ گلے سے لے کر پنڈلی تک پورا جسم ڈھک رہا تھا۔ ارجن کمار نے اعتراض کیا۔

''اس پر آپ ڈائیو سوٹ کیسے پہنیں گی۔''

''پہن لوں گی یہ میرا مسئلہ ہے۔'' آشی نے سرد لہجے میں کہا تو سمیر خوش ہو گیا۔ اسی کی خاطر آشی اس طرح سے سرفنگ سوٹ پہن کر آئی تھی اور یقیناً سوٹ پر سوٹ پہننا آسان نہیں تھا۔ آشی اسے خود سے بھی نہیں پہن سکتی تھی کم سے کم دو لوگ پہناتے تھے۔ آشی کو مشکل پیش آئی تھی لیکن اس نے اسی پر سوٹ پہن لیا۔ کیونکہ سوٹ کے ساتھ کئی آلات بھی لگے ہوئے تھے اس لیے ان سب کا استعمال اور ان کے بارے میں احتیاطیں جاننا ضروری تھا۔ اس میں جگہ جگہ والو لگے تھے۔ ارجن کمار نے انہیں اس سوٹ کی ایک خاص بات سے آگاہ کیا۔ اس نے آشی کے سوٹ میں ایک طرف کی چھوٹی سی زپ کھولی اور اس میں موجود ڈوری کھینچی فوراً ہی آشی کے شانوں سے دو ائر بیگ نکل کر پھول گئے۔ ان کا سائز ایک فٹ قطر سے زیادہ تھا۔ ارجن کمار نے کہا۔

''کسی ہنگامی صورتِ حال میں یہ تیزی سے اوپر آنے کا واحد طریقہ ہے خاص طور سے جب آکسیجن کی کمی واقع ہو۔''

سمیر اور آشی نے اس کا طریقہ کار ذہن نشین کر لیا۔

☆☆☆

جس وقت ایکسپلورر ایشیا جکارتہ سے روانہ ہوا، عین اس وقت بحیرۂ تیمور کے ساتھ آسٹریلیا کی ایک ساحلی کھاڑی سے ایک چھوٹی لیکن کچھ عجیب ساخت کی کشتی شمال مشرق کی طرف محوِ سفر تھی۔ یہ چاروں طرف سے سیدھی اور تکونی فولادی چادروں سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس پر نیلگوں رنگ تھا اس وجہ سے یہ نیلے سمندر کے پس منظر میں مشکل سے نظر آتی۔ اس کی لمبائی تقریباً چالیس فٹ اور چوڑائی بیس فٹ کے قریب تھی۔ کشتی ہر طرف سے مکمل طور پر بند تھی اور پانی کی سطح سے اس کی اونچائی مشکل سے دس فٹ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت یہ آبدوز کی طرح زیرِ آب بھی سفر کر سکتی تھی۔ یقیناً کشتی کا بڑا حصہ زیرِ آب تھا۔ اس کا اوپری حصہ کسی بڑے جنگی طیارے کے کاک پٹ جیسا تھا اس میں تین اطراف میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ البتہ ان شیشوں میں چمک نہیں تھی بلکہ یہ ڈل سرمئی رنگ کے تھے۔ یہ کشتی کا کنٹرول روم تھا اور اس میں دو افراد کے ساتھ جان پال بھی موجود تھا۔ کشتی کی طرح اس کا کنٹرول پینل بھی نہایت جدید اور زیادہ تر ڈیجیٹل آلات سے لیس تھا۔ سامنے کئی طرح کی اسکرینز تھیں جن پر آس پاس کے مناظر ویڈیو اور گراف کی صورت میں آ رہے تھے۔

ایک بڑی اسکرین پر ایشیا کا مفصل نقشہ نظر آ رہا تھا اور جکارتہ کے پاس ایک سرخ نقطہ بلنک کر رہا تھا۔ اسکرین کے سامنے بیٹھے آپریٹر نے جان پال سے کہا۔ ''سر وہ روانہ ہو چکے ہیں۔''

کافی کا مگ تھامے جان پال نے سر ہلایا۔ ''ہم ان سے کتنے فاصلے پر ہیں؟''

آپریٹر نے اپنے سامنے کی بورڈ پر چند بٹن دبائے اور فوراً ہی اسکرین پر دونوں جہازوں کا فاصلہ آنے لگا۔ یہ بارہ سو بیس ناٹیکل میل تھا۔ یہ کشتی مغربی ممالک کے مفادات کا تحفظ کرنے والی ایک نجی ملیشیا کی ملکیت تھی۔

یہ جدید کشتی نہ صرف ریڈار اور تلاش کرنے والے دوسرے آلات سے لیس تھی بلکہ بہ وقتِ ضرورت یہ بڑے سے بڑے بحری جہاز کو ڈبونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جان پال کے ساتھ گیلی تھا۔ کشتی کا کل عملہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ صرف دو افراد اس جدید جنگی کشتی کو مکمل طور پر کنٹرول کر سکتے تھے کیونکہ اس کے تمام کام خودکار انداز میں ہوتے تھے۔ آٹھ گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی اور دوسرے دو افراد کشتی چلاتے۔ سطح پر یہ عام انجن سے چلتی تھی لیکن زیرِ آب جانے کی صورت میں ایک الیکٹرک موٹر اسے چلاتی تھی جسے چلنے کے لیے ایک بیٹری تھی۔ سطح پر سفر کے دوران ایک ڈائنمو بیٹری چارج کرتا رہتا تھا۔ زیرِ آب جانے کی صورت میں یہ بیس ناٹ کی رفتار تقریباً ایک گھنٹے مسلسل سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی جبکہ سطح پر اس کا طاقتور ڈیزل انجن اسے پینتیس ناٹ کی رفتار دے سکتا تھا۔ یہ ایکسپلورر ایشیا کی رفتار

سے زیادہ رفتار تھی۔ جان نے کشتی کے کپتان جیف اسکاٹ سے پوچھا۔

''کشتی میں کتنا ایندھن ہے اور اس کے ساتھ یہ کتنا فاصلہ طے کر سکتی ہے؟''

''اس وقت اس میں گنجائش کا اٹھانوے فیصد چار ہزار نو سو گیلن ڈیزل ہے اور اس کے ساتھ یہ تقریباً پانچ ہزار ناٹیکل میل کا سفر کر سکتی ہے۔'' کپتان جیف نے جواب دیا۔ وہ آسٹریلین نیوی کا ریٹائرڈ تھا۔ صرف وہی نہیں اس کشتی کے باقی تین افراد تربیت یافتہ نیوی سیلر تھے اور کسی نہ کسی مغربی ملک کی بحریہ سے تعلق رکھ چکے تھے۔ جان نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور کاک پٹ سے نکل کر پیچھے اپنے رہائشی حصے میں آ گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے تھے جن میں بس ایک بستر اور ایک سائیڈ دراز کی گنجائش تھی۔ سامان رکھنے کی جگہ بیڈ کے نیچے تھی۔ سی آئی اے اس کشتی کی ملک ملیشیا سے کام لیتی رہی تھی لیکن یہ جان پال کا نجی مشن تھا اس لیے اس نے کمپنی کو ادائیگی کر کے کشتی حاصل کی تھی۔ اس وقت وہ کمپنی کا ماسٹر تھا اور عملہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کا پابند تھا۔

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کیا ہوا تھا جان پال اتنا نہیں جانتا تھا کیونکہ اس کے دادا نے بھی اسے مکمل کر نہیں بتایا تھا۔ بوڑھا جان پال مین ہٹن پروجیکٹ میں یورینیم کی افزودگی کے شعبے کا انچارج تھا۔ اس کا کام شعبے کو خالص یورینیم دو سو پینتیس فراہم کرنا تھا جس میں اعشاریہ سات فیصد تک کارآمد یورینیم دو سو پینتیس ہو۔ جان پال اتنا جانتا تھا کہ یو کی آئیوا سے ایک یورینیم شپ منٹ جاپان سے چلی تھی اور اسے انڈونیشیا کے سمندر بحیرۂ مولوکا میں ایک جرمن یو بوٹ کو یہ کھیپ دینا تھی مگر یو کی آئیوا کا مشن ناکام رہا اور امریکی آبدوز نے اسے تارپیڈو کر دیا۔ جان پال نہیں جانتا تھا کہ شپ منٹ ڈوبے یو کی آئیوا کے ڈھانچے میں موجود تھی یا نہیں لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ آشی اور سمیر نامی ان صحافیوں کو کسی صورت زیر آب موجود یو کی آئیوا تک نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔ وہ یہی عزم لے کر آیا تھا۔

☆☆☆

روانگی سے بیاسی گھنٹے بعد وہ بحیرۂ مولوکا کے سمندر میں موجود تھے۔ رات ہو چکی تھی اس لیے تلاش کا کام اگلی صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ ایکسپلوریشن کا زیر آب تحقیق کا حصہ عقبی عرشے پر تھا جہاں تمام آلات نصب تھے یا رکھے تھے اور ایک چھوٹے سے فولادی کیبن میں ان آلات کو استعمال اور نگرانی کرنے والے آپریٹر بیٹھتے تھے۔ یہاں جدید ترین کمپیوٹرائزڈ آلات اور اسکرینز لگی تھیں۔ ایسے سینسرز تھے جو زیر آب موجود چیزوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ آلات کے تینوں آپریٹر یورپ سے تعلق رکھتے تھے۔ بحیرۂ مولوکا پہنچتے ہی انہوں نے اپنے آلات کی جانچ شروع کر دی تھی تاکہ جب اگلی صبح کام کا آغاز ہو تو ہر آلہ پوری طرح ٹھیک ہو۔ آشی اور سمیر نے شام کے وقت دو گھنٹے ان کے ساتھ گزارے تھے، وہ آلات کا استعمال سمجھ رہے تھے۔ رات ڈنر کے موقع پر تقریباً سب ہی آفیسر میس میں موجود تھے۔ کیونکہ آشی نے مشن کا اعلان کر دیا تھا اس لیے اب اس پر بات ہو رہی تھی۔ کپتان ٹی نے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق دوسری جنگ عظیم میں صرف بحیرۂ مولوکا میں پچاس کے قریب بحری جہاز، کشتیاں اور آبدوزیں غرق حالت میں موجود تھیں۔ ان کا اسٹرکچر بھی موجود ہوگا۔''

کلارک نے کہا۔ ''اتنے ملبے میں سے اپنے مطلب کا شپ تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''میں جانتی ہوں اور یہ بھی کہ ہمارے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت ہے۔ لیکن مجھے امید ہے آپ لوگوں کے بہترین تعاون کی مدد سے یہ مشن کامیاب رہے گا۔ کامیابی کی صورت میں تمام عملے کو اسپیشل بونس ملے گا۔''

یہ سن کر سب خوش نظر آنے لگے۔ ڈنر کے بعد وہ باہر عرشے پر آئے تو سمیر نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا۔ ''مجھے لگ رہا ہے یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں کوشش کروں گی۔'' آشی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں۔''

''تلاش کا آغاز کیسے ہوگا؟''

''سب سے پہلے ہم زیر آب موجود بڑے فولادی ڈھانچے کو میگنیٹ کی مدد سے تلاش کریں گے۔ اس کے بعد جائزہ لیا جائے گا کہ ملنے والا ڈھانچا یو کی آئیوا کا ہے یا نہیں۔''

''پچیس مربع میل۔'' سمیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یقیناً یہ تلاش آسان نہیں ہوگی۔''

''میں نے زیر آب تلاش کے بارے میں جو سنا ہے یہ واقعی آسان نہیں ہے۔ بعض اوقات کسی خاص بحری جہاز یا کشتی کو تلاش کرنے میں برسوں بیت جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ٹائی ٹینک ہے جس کے ڈوبنے کے مقام کے بارے میں جانتے ہوئے بھی اس کا ڈھانچا تلاش کرنے

میں پونی صدی کا عرصہ لگ گیا تھا۔"

"شاید اس لیے بھی کہ وہ چودہ ہزار فٹ کی گہرائی میں پڑا ہے اور وہاں تک پہنچنا ہی آسان کام نہیں تھا لیکن یہاں سمندر کی گہرائی زیادہ نہیں ہے۔ کنٹرول روم میں اسکرین پر میں نے گراف نقشہ دیکھا ہے اس سمندر میں... سب سے گہرا مقام بھی پندرہ سو فٹ سے زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس کے باوجود پچیس مربع میل بہت بڑی جگہ ہے۔"

"میں چانس لوں گی۔" آشی نے کہا۔ "اگر ناکام رہی تو دوبارہ اجازت حاصل کروں گی۔"

"اگر امریکی دباؤ آیا تو مشکل ہے کہ دوبارہ اجازت ملے۔" سمیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ ہم اسے پہلا اور آخری موقع سمجھتے ہوئے کوشش کریں۔ ایک بات اور ہے اگر امریکی ابھی تک بے خبر ہیں تو اس کے بعد وہ جان جائیں گے اور پھر وہ عملی طور پر حرکت میں آجائیں گے جیسا کہ جنوبی افریقہ میں ہوا۔"

"مجھے بھی یہی خدشہ ہے۔"

سمیر نے پہلی بار پوچھا۔ "اس مہم کے اخراجات کون ادا کر رہا ہے؟"

"آف کورس.... میرے گرینڈ پا.... وہ ملین ڈالرز مین ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے تم آنے والے وقت میں ملین ڈالرز لیڈی ہوگی؟"

"میں نے اس بارے میں نہیں سوچا.... گرینڈ پا کے بعد ان کا بزنس اور اثاثے ان کے بیٹوں یعنی میرے ماموؤں کو ملیں گے۔ مجھے وہ ملے گا جو میرے پاپا میرے لیے چھوڑ کر جائیں گے۔ مگر میں اپنی جاب اور لائف اسٹائل سے خوش ہوں۔"

"میرا خیال ہے اب ہمیں آرام کرنا چاہیے کیونکہ کل سے بہت زیادہ مصروفیت ہوگی اور اس میں آرام کرنے کا موقع کم ملے گا۔" سمیر نے تجویز دی حالانکہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ آشی سے الگ ہو کر اپنے کیبن میں جائے۔ آشی نے سر ہلایا اور وہ اپنے کیبنوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح سمیر چھ بجے اٹھ گیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اس لیے وہ فجر کی نماز پڑھ کر باہر آیا۔ جہاز کا عملہ اپنے کاموں میں لگ گیا تھا اور میس میں ناشتا تیار ہو رہا تھا۔ سمیر ناشتا کر رہا تھا کہ آشی بھی آگئی۔ اس نے سمیر سے کہا۔ "جلدی کرو کچھ دیر میں تلاش کا کام شروع ہو جائے گا۔"

سمیر ناشتا کر کے باہر عرشے پر نکل آیا۔ صبح کے وقت ہوا خوشگوار اور تیز تھی لیکن آسمان صاف تھا۔ آشی ناشتا کر کے آئی تو وہ عقبی عرشے پر آگئے۔ سورج نکلتے ہی ایکسپلورر ایشیا حرکت میں آگیا تھا۔ اب بحری جہاز زیرآب تلاش کے تینوں کورین ماہروں کی نگرانی میں حرکت کر رہا تھا۔ ان کا براہ راست کپتان ژی سے رابطہ تھا اور وہ اسے بتا رہے تھے کہ جہاز کتنی رفتار سے اور کس سمت میں چلے۔ آشی اور سمیر کنٹرول روم میں تھے۔ ایک اسکرین پر زیرآب سطح کا مقناطیسی نقشہ بن رہا تھا اور مختلف رنگوں سے چیزیں واضح ہو رہی تھیں۔ میگنٹ مشین کے ماہر سام نے بتایا کہ سفید رنگ عمومی سطح کو ظاہر کرتا ہے جبکہ سبز رنگ ایسی اشیا کو جو مقناطیس سے متاثر نہیں ہوتی ہیں اور سرخ رنگ ان جگہوں کی نشان دہی کرتا ہے جہاں کوئی دھاتی اور مقناطیس سے متاثر ہونے والی چیز ہو۔ اسکرین پر سرخ دھبے بہت کم تھے اور جو تھے وہ سام کے مطابق زیرآب مونگے کی چٹانیں تھیں۔ اس نے بتایا۔

"مونگے کی چٹانوں میں فولاد بھی شامل ہوتا ہے اس لیے مقناطیس ان سے متاثر ہوتا ہے۔"

"تب ہم کیسے شناخت کریں گے کہ نظر آنے والی کوئی بڑی چیز مونگے کی چٹان ہے یا کوئی ڈوبا ہوا بحری جہاز؟" آشی نے سوال کیا۔

"اول تو یہ سب چھوٹی چٹانیں ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ان کا سائز چند میٹرز سے زیادہ نہیں ہے۔" سام نے اسکرین پر نظر آنے والے سرخ دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر کوئی بڑا دھبا نظر آیا تو ہم ایک چھوٹا میگنٹ زیرآب بھیج کر اسے براہ راست چیک کر سکتے ہیں۔"

"چھوٹا میگنٹ کیسے بھیجو گے؟" سمیر نے پوچھا۔

"اسے ایک روبوٹ میں لگا کر بھیجا جا سکتا ہے اور اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو واٹر کی مدد سے بھی لٹکایا جا سکتا ہے۔"

سام نے انہیں عرشے پر موجود چھوٹا میگنٹ دکھایا۔ یہ ایک میٹر قطر کے سائز کی ازن عشتری نما مشین تھی۔ تلاش کرنے والا بڑا میگنٹ پانچ سو میٹرز کے فاصلے سے کسی دو میٹرز قطر کی فولادی چیز کو تلاش کر سکتا تھا۔ یوکی آئیو اس سے کہیں بڑا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت احتیاط سے سمندر کا سروے کر رہا تھا۔ وہ مخصوص حصے میں ایکسپلورر ایشیا کو تقریباً دو ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے چلوا رہا تھا اور پانچ میل کے بعد جہاز پانچ سو گز کے فاصلے سے واپس آتا تھا۔ اس طرح زیرآب موجود کسی چیز کے میگنٹ سے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ آشی کسی قدر مضطرب تھی اس نے سام سے پوچھا۔ "اگر وہ

چیز بہت موٹی مٹی کی تہ تلے دب چکی ہو تب بھی پتا چل جائے گا۔"

"بے شک وہ پچیس میٹر موٹی ریت تلے جا چکی ہو۔ تب بھی یہ میگنٹ اسے تلاش کرلے گا۔" سام نے یقین سے کہا۔ "ہاں اگر ریت تیس میٹرز موٹی ہو جائے تو میگنٹ دھوکا کھا سکتا ہے کیونکہ ریت میں بھی خاصی مقدار میں لوہا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ریف کا علاقہ ہے یہاں اتنی زیادہ مٹی کی موجودگی ممکن نہیں ہے زیر آب زیادہ سے زیادہ دس میٹرز مٹی جمع ہو سکتی ہے۔ وہ بھی گڑھے والی جگہوں پر۔"

وہ پُرامید ہو گئے مگر یہ دن رائگاں گیا۔ انہوں نے پچیس مربع میل رقبے میں سے تقریباً سولہ فیصد سروے کرلیا تھا اور اب تک انہیں کوئی غیر معمولی جگہ کی چیز نہیں ملی تھی۔ آشی کے پاس جاپانی بحریہ کی شائع کردہ کیٹلاگ تھی جس میں جنگ عظیم سے پہلے جاپان میں بننے والے ہر جنگی جہاز کی تصاویر اور ڈیزائن تھے۔ اس میں یوکی آئیو بھی شامل تھا۔ بارہ گھنٹے بعد ایکسپلورایشیا کا لنگر گرا دیا گیا۔ اس سارے دن میں جہاز نے کل چار چکر لگائے تھے اور تقریباً بیس بحری میل کا سفر کیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے واپس آئے تو آشی مایوس تھی۔ اس نے سمیر سے کہا۔ "یہ تو کچھ نہیں ہوا۔"

"تم نے خود بتایا تھا کہ بعض اوقات زیر آب کوئی چیز تلاش کرنے میں سالوں لگ جاتے ہیں اس لیے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن ہمارے پاس وقت محدود ہے۔"

اگلے دن آشی اور سمیر صبح سویرے تیار ہو کر عقبی عرشے پر پہنچ گئے تھے۔ وہاں ارجن موجود تھا۔ آشی کنٹرول روم میں چلی گئی اور سمیر، ارجن کے پاس آگیا جو ڈائیونگ سوٹس اور آلات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ سمیر ایک سوٹ اٹھا کر اسے چیک کرنے لگا۔ ارجن نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تم مسلم ہو؟"

سمیر چونکا کیونکہ یہاں سب اسے شا کہتے تھے اور آشی اسے سامی کہتی تھی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"بس پتا چل گیا ویسے تم اس بات کو چھپا کیوں رہے ہو؟"

سمیر کو غصہ آنے لگا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ تمہاری غلط فہمی ہے اور مجھے چھپانے یا کسی کو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں سمجھا شاید تم نے کوئی ضرورت محسوس کی ہو۔" ارجن کمار کا لہجہ مذاق اڑانے والا ہو گیا۔ "آج کل بہت سے مسلمان بتانا پسند نہیں کرتے ہیں کہ وہ اصل میں مسلمان ہیں۔"

"میں نے آج تک ایسا کوئی مسلمان نہیں دیکھا جو اپنی شناخت چھپاتا ہو۔" سمیر نے کہا۔ "میرا خیال ہے اس ٹاپک پر کافی گفتگو ہو چکی ہے اب ہمیں کچھ پیشہ ورانہ ٹاپکس پر بات کرنی چاہیے۔"

"حالانکہ یہ تمہارا پیشہ نہیں ہے۔" ارجن کے لہجے میں استہزا بڑھ گیا۔ "تم قلم چلانے والے صحافی ہو اور اس وقت غلط جگہ پر ہو....."

سمیر بے قابو ہو کر کچھ سخت کہنے جا رہا تھا کہ آشی نے کیبن سے جھانکا۔ "سامی! اِدھر آؤ جلدی...."

سمیر کنٹرول روم میں آیا، اس وقت سام اور آشی اسکرین پر جھکے ہوئے نظر آنے والے بڑے سے سرخ دھبے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر سام نے جھپٹ کر انٹرکام اٹھایا اور جہاز روکنے کا حکم دیا۔

☆☆☆

ایکسپلورایشیا سے پانچ میل کی دوری پر موجود جان پال کی انوکھی ساخت کی کشتی ساکت کھڑی تھی۔ البتہ اس کے اندر کاک پٹ میں سرگرمی جاری تھی۔ جان پال اسکرین پر جگمگاتے سرخ دھبے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کپتان جیف سے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"جہاز رک رہا ہے اور شاید وہ لنگر بھی گرائے گا۔" کپتان جیف نے جواب دیا اور کنٹرول پینل کے کچھ بٹن چھیڑنے لگا۔ "اگر یہ رک رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے، کچھ ملا ہے۔"

"اسنارکل اوپر کرو۔"

جان پال نے حکم دیا تو کپتان جیف نے ایک بٹن دبایا۔ کشتی میں آبدوز کی طرح اسنارکل دوربین لگی تھی۔ چھت کے ایک خانے سے نکل کر یہ پانچ میٹرز کی بلندی تک جا سکتی تھی۔ اتنی بلندی سے پانچ میل دور کی چیز بھی صاف دکھائی دے سکتی تھی بشرطیکہ موسم صاف ہوتا اور اس وقت آسمان بالکل شفاف اور دھوپ بہت تیز تھی۔ کشتی کی دوربین ڈیجیٹل تھی اور ایک بڑی اسکرین پر ایکسپلورایشیا دکھائی دینے لگا۔ کپتان جیف نے منظر کو زوم کیا اور بحری جہاز یوں دکھائی دینے لگا جیسے بس چند سو فٹ کے فاصلے پر ہو۔ اس پر چلتے پھرتے عملے کے افراد بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ دوربین اس کے عقبی عرشے پر مرکوز ہوئی جہاں زیر آب تلاش کے آلات اور کنٹرول روم تھا۔ مگر

وہاں کوئی سرگرمی نہیں تھی۔ اس دوران میں ایکسپلورر ایشیا۔ لنگر گرنے لگا اور اس کی موٹی زنجیر تیزی سے پانی میں جا رہی تھی۔ کپتان جیف نے کہا۔

''یہ رک گئے ہیں، اب کیا حکم ہے؟''

''فی الحال کوئی نہیں۔'' جان پال نے کہا۔ وہ کپتان کے پیچھے کھڑا تھا اور اس کی نظر اسکرین پر مرکوز تھی۔ معاً کنٹرول روم کا دروازہ کھلا اور سمیر کے ساتھ آشی باہر آئی۔ انہیں دیکھ کر جان پال کا چہرہ تن گیا۔ کپتان جیف متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ اسے ابھی کشتی کے مہلک ہتھیار استعمال کرنے کا حکم دے گا۔

☆☆☆

آشی نے اشتیاق سے پوچھا۔ ''یہ بڑا بحری جہاز ہو سکتا ہے۔''

''چیک کرنا پڑے گا۔'' سام نے کہا۔ ''دراصل ایک خاص سائز کے بعد میگنٹ ہر فولادی چیز کو اسی سائز کا دکھاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سمیر نے پوچھا۔

''یہ میگنٹ تیس فٹ لمبی اور تقریباً پچاس ٹن وزنی فولاد سے بنی کشتی کو بھی اتنا ہی بڑا دکھائے گا جتنا کہ یوکی آئیوا کو دکھائے گا۔ یہ اس سینسر کی خامی ہے ایک خاص حد کے بعد یہ سائز واضح نہیں کرتا ہے۔''

وہ سمجھ گئے آشی نے پوچھا۔ ''پھر کس طرح پتا چلے گا کہ یہ یوکی آئیوا ہے یا نہیں۔''

''یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔'' روزالی نے کہا وہ ہی روبوٹ استعمال کرنے کا ماہر تھا۔ سمیر اور آشی اس کے ساتھ کنٹرول روم سے باہر ایک طرف لگی کرین تک آئے۔ وہاں دو عدد ہی روبوٹ رکھے تھے۔ روزالی نے ایک ہی روبوٹ آن کیا اور اسے کرین سے منسلک کرنے لگا۔ یہ تقریباً چار فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا کچھوے سے مشابہ روبوٹ تھا۔ چند تاروں کی مدد سے یہ کنٹرول روم سے مدہوا تھا اور وہیں سے اسے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ کرین نے تقریباً ڈھائی سو کلوگرام وزنی روبوٹ کو سمندر میں اتارا۔ وہ واپس کنٹرول روم میں آئے۔ روزالی روبوٹ کو کنٹرول کرنے لگا، وہ زیر آب جا چکا تھا اور تیزی سے اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں میگنٹ نے سرخ دھبا دکھایا تھا۔ آشی نے کہا۔ ''یہاں گہرائی صرف دو سو فٹ ہے جبکہ یوکی آئیوا ہزار فٹ کی گہرائی میں ڈوبا تھا۔''

سام نے کہا۔ ''یہ سارا آتش فشانی خطہ ہے اور یہاں زمین اونچی نیچی ہوتی رہتی ہے۔ ویسے بھی زیر آب تبدیلیاں زیادہ تیزی سے آتی ہیں۔''

''ابھی سب سامنے آجائے گا۔'' روزالی نے کہا، وہ روبوٹ کنٹرول کر رہا تھا۔ روبوٹ میں کیمروں کے علاوہ بھی کئی آلات لگے ہوئے تھے۔ اس میں حرارت دکھانے والا سینسر بھی تھا۔ بیٹری کی مدد سے چلنے والا روبوٹ زیر آب دس ناٹ کی رفتار سے بھی سفر کر سکتا تھا۔ بالآخر وہ اس جگہ پہنچا جہاں ایک چھوٹا سا ٹیلا تہ سے ابھرا ہوا تھا لیکن اس پر بھی ریت جمی تھی۔ روزالی نے نیچے کے اوپری حصے پر روبوٹ میں نصب بلور کی مدد سے پانی کی دھار ماری تو وہاں سے مٹی اڑ گئی۔ ماحول دھندلا گیا اور وہ ریت بیٹھنے کا انتظار کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد جب ریت بیٹھی تو ان کے چہرے لٹک گئے، یہ کسی چھوٹی کشتی کا اوپری حصہ تھا۔ ریلنگ ٹوٹ گئی تھی اور صرف عرشہ تھا۔ وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے ڈوبے ہوئے بہت طویل وقت گزر چکا ہے۔ ممکن ہے یہ یوکی آئیوا کے بعد بھی ڈوبی ہو لیکن یہ یوکی آئیوا نہیں تھا۔

مزید اطمینان کے لیے روزالی نے بلور کا استعمال کیا اور مزید آدھے گھنٹے بعد تصدیق ہو گئی کہ یہ چھوٹی کشتی تھی اور شاید ماہی گیروں کی کشتی تھی۔ روزالی نے روبوٹ واپس بلا لیا اور اسے کرین کی مدد سے واپس عرشے پر لے آیا۔ یہ ایک اور مایوس کن دن تھا۔ البتہ شام کو آشی اور سمیر نے ارجن کے ساتھ ان کر یہاں اسکیپ ڈائیو کی مشق کی تھی۔ چھ بجے ایکسپلورر ایشیا لنگر انداز ہو گیا۔ مشق شام کے بعد کی تھی اس لیے نیچے زیادہ روشنی نہیں تھی اور وہ زیر آب مناظر سے محظوظ نہیں ہو سکے تھے۔ آخری حصے میں مکمل اندھیرا تھا اور انہیں سوٹ میں لگی روشنیاں آن کرنا پڑی تھیں۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور وہ آرام سے ٹھیک ہو کر واپس آ گئے۔ آشی زیادہ خوش تھی کیونکہ اس نے حال ہی میں اسکوبا ڈائیونگ سیکھی تھی۔ اس بار آشی سرفنگ سوٹ کے بجائے ڈھیلا پاجامہ اور ٹی شرٹ پہن کر آئی تھی، اس پر ڈائیونگ سوٹ آسانی سے پہن لیا گیا تھا۔

ڈائیونگ سوٹ ائر ٹائٹ تھا لیکن ہاتھوں اور پیروں پر سمندری پانی کے اثرات تھے اور باقی جسم پیک رہنے کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس لیے سوٹ اتار کر وہ سیدھے اپنے کیبن میں آئے۔ سمیر نہا کر نکلا تو آشی اس کے کیبن میں آ گئی۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ''اس ایکسرسائز نے بھوک جگا دی ہے اینڈ کر دو کافی اور سینڈوچز

منگوالو۔''

سمیر نے میس میں آرڈر کیا۔ ''مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ زیر آب تیراکی آسان کام نہیں ہے۔''

آشی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''دوسرا دن بھی ضائع گیا۔''

''نہیں ہم نے ڈائیو کی مشق کی اور یہ اچھا ہوا۔ میرا تو مشورہ ہے تم تلاش کا کام ان تینوں پر چھوڑ دو وہ اپنے کام میں ماہر ہیں اور ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اس لیے اب جہاز کہیں رکے تو ہم کنٹرول روم میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ڈائیو کی مشق کریں گے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' آشی نے کہا اور ہاتھ اٹھا کر اپنے بال جوڑے کی صورت میں لانے لگی۔ اس کی شرٹ کسی قدر تنگ تھی اور یہ بڑا دلکش پوز تھا۔ سمیر دیکھتا رہ گیا۔ آشی نے اس کی نگاہیں محسوس کر لی تھیں۔ اس نے شوبا کر ہاتھ نیچے کیے اور شکوہ کیا۔ ''اب میں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟''

''لگتی ہو۔''

''تب تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟''

سمیر سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں بتانا چاہتا ہوں لیکن شاید اس حد تک بتا نہیں سکتا جتنا بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ ڈر بھی ہے کہ تم میری بات پر یقین نہیں کرو گی۔''

آشی اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ ''سامی مجھے تمہاری ہر بات کا یقین ہے۔''

سمیر کے بازو بے اختیار اس کی کمر پر آئے لیکن اس سے پہلے بات آگے بڑھتی، دروازے پر دستک ہوئی۔ میس سے کافی اور سینڈوچز آئے تھے۔ دونوں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ بات وہیں رہ گئی اور اب انہیں بات کرتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی اس لیے دونوں کافی اور سینڈوچز سے دل بہلانے لگے۔ پھر وہ آج کے ڈائیونگ تجربے پر بات کرنے لگے۔ سمیر نے کہا۔ ''آج گہرائی زیادہ نہیں تھی اس لیے شاید ہمیں مشکل پیش نہیں آئی۔''

''نہیں یہ گہرائی بھی خاصی ہوتی ہے کیونکہ نارمل ڈائیور ستر یا سوفٹ سے زیادہ نیچے نہیں جا سکتے ہیں۔''

سمیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آئندہ ڈائیوز میں تم مت جاؤ۔''

''کیوں؟'' آشی نے پوچھا۔

''زیر آب خطرہ ہوتا ہے اور اس میں تو زیادہ ہی خطرہ ہوتا ہے۔'' سمیر نے کہا۔ ''تم اوپر رہ کر بھی مدد کر سکتی ہو۔''

''یہی بات میں تمہارے بارے میں کہہ سکتی ہوں۔''

مگر سمیر سنجیدہ تھا۔ اس نے آشی کو قائل کر لیا کہ وہ پانی میں نہیں جائے گی صرف وہ اور ارجن جایا کریں گے۔ آشی نے حال ہی میں ڈائیونگ سیکھی تھی جبکہ سمیر نے اس کی باقاعدہ تربیت لی تھی اور پھر وہ مرد تھا اس میں قوت برداشت زیادہ تھی۔ بات ایک بار پھر اسی طرف جا رہی تھی کہ اس بار کپتان لی کی طرف سے مداخلت ہوئی۔ اس نے انٹرکام کر کے آشی کو اوپر کپتان برج پر بلوایا تھا، وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ آشی کے جانے کے بعد سمیر بستر پر چت لیٹ گیا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آشی کا رد عمل حوصلہ افزا تھا لیکن معاملہ ابھی تک اقرار کی اس حد تک نہیں پہنچا تھا، جب دل بے قرار کو مکمل قرار اور یقین حاصل ہو جائے۔ آشی ڈنر کے لیے میس نہیں آئی تھی، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ واپسی میں سمیر نے اس کے دروازے پر بہت ہلکی سی دستک دی اور جواب نہ ملنے پر اپنے کیبن میں آ گیا۔

آنے والے دو دن بھی ضائع گئے تھے۔ بیکسپور ایشیا صبح سے شام تک بحیرۂ مولوکا کا سمندر کھنگالتا رہا۔ اس دوران میں تین بار انہیں مختلف ڈوبے ہوئے بحری جہاز ملے لیکن بالآخر وہ یوکی آئیوا سے مختلف جہاز نکلے تھے۔ چار دن ختم ہو چکے تھے اور اب ان کے پاس صرف تین دن بچے تھے۔ اس رات آشی صحیح معنوں میں مایوس نظر آنے لگی۔ سمیر نے اسے تسلی دی۔ ''تم نے ہی کہا تھا کہ اس بار ناکام رہیں تو دوبارہ آؤ گی۔''

آشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مشکل ہے گرینڈ پا نے اس کی بھی بہت مشکل سے اجازت دی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں اس چکر میں پڑوں۔''

''دیکھا جائے تو وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن تم ماننے والی کہاں ہو۔''

''اب میں ناکام واپس گئی تو گرینڈ پا دوبارہ اجازت نہیں دیں گے۔''

''ابھی ہمارے پاس تین دن ہیں۔''

''تین دن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں صرف یوکی آئیوا تلاش کرنا ہے بلکہ اس پر موجود شپ منٹ کے ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق بھی کرنی ہے۔''

سمیر کو خیال آیا۔ ''سنو شپ منٹ میں خطرناک

یورینیم ہے اس کے نزدیک بغیر حفاظتی انتظامات کے جانا بھی ٹھیک نہیں ہوگا تب ہم تصدیق کیسے کریں گے؟''

آشی اپنے کمرے میں گئی اور واپسی میں اس کے پاس ایک آلہ تھا، یہ تقریباً آٹھ انچ لمبا اور چار انچ چوڑا تھا۔ اس کا اوپری حصہ اسکرین پر مشتمل تھا۔ آشی نے بتایا۔ ''یہ ریڈی ایشن کاؤنٹر ہے اور زیرِ آب بھی کام کرتا ہے بلکہ یہ اصل میں زیرِ آب کام کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اب میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ یہ کیسے کام کرتا ہے۔'' آشی نے ایک چھوٹے سے سلینڈر سے ریڈیم کا چینی کے دانے جتنا ایک ٹکڑا نکال کر کیبن کے کونے میں رکھا۔ ''یہ خالص ریڈیم ہے اگر یہ بہت دیر ہمارے جسم کے پاس رہے تو نقصان کرسکتا ہے لیکن کچھ دیر رکھنے سے نقصان نہیں ہوگا۔''

آشی نے کہتے ہوئے آلہ آن کیا اور فوراً ہی اس کی اسکرین پر ایک سبز دھبا نظر آنے لگا۔ آلے کا رخ ریڈیم کے ٹکڑے کی طرف کیا تو دھبا اسکرین کے اوپری سرے پر آگیا۔ اسکرین کے نچلے حصے میں نیم دائروں کی صورت میں سرخ رنگ کی لہریں تھیں جو بتدریج مدھم ہورہی تھیں۔ جب آشی ٹکڑے کے طرف بڑھی تو یہ لہریں گہرے رنگ کی ہونے لگیں اور ٹکڑے کے بالکل قریب جانے پر ساری لہریں ایک جیسے سرخ رنگ کی ہوکر غائب ہوگئیں۔ سمیر نے سوالیہ نظر سے آشی کو دیکھا، اس نے وضاحت کی۔ ''یہ لہریں بتاتی ہیں کہ آپ کو کس حد تک خطرہ ہے اگر ساری لہریں غائب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہوگا آپ شدید تابکاری کی زد میں ہیں۔''

''اچھی چیز ہے اور آسان بھی ہے۔'' سمیر نے اس سے کاؤنٹر لے کر چیک کیا۔ ''یہ بس ایک ہی ہے؟''

''نہیں میرے پاس ایسے تین پیس ہیں۔'' آشی نے اس سے واپس لے لیا۔ ''دو استعمال کے لیے اور ایک اضافی ہے۔''

آشی نے ریڈیم کا ٹکڑا واپس سلینڈر میں ڈال دیا۔ اس کے جانے کے بعد سمیر نے اس روز کے نوٹس اتارے تھے۔ وہ ہر روز کی روداد نوٹس کی صورت میں اتارتا تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ یہ نوٹس کبھی کام نہیں آئیں گے۔ مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو سر میں درد تھا اور اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آشی حسبِ معمول پہلے تیار ہوکر آگئی۔ اس وقت سمیر بستر میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''اٹھے نہیں ابھی تک......''

''ہاں اٹھتا ہوں۔'' سمیر اٹھ بیٹھا۔ آشی نے اس کا چہرہ دیکھا تو فکرمند ہوکر آگے آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''تمہیں حرارت ہے۔''

''سر میں بھی درد ہو رہا ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''تم آرام کرو، میں ڈاکٹر کو بھیجتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' سمیر نے منع کیا مگر آشی نے اسے لیٹنے پر مجبور کردیا۔ سمیر کا خیال تھا کہ وہ ڈاکٹر کو بھیج دے گی لیکن وہ خود بھی چلی آئی۔ ڈاکٹر سوتر نے اسے چیک کیا اور بولا۔

''خاص بات نہیں ہے۔ ہلکا سا فیور ہے۔'' اس نے ایک چھوٹی سی شیشی میں دو گولیاں ڈال کر دیں۔ ''یہ ناشتا کرکے لے لینا، ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

آشی جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے خود اسے ناشتا کرایا اور پھر گولیاں دیں۔ اس دوران میں ایکسپلور ایشیا حرکت میں آچکا تھا۔ کورین ٹیکنیشین صبح چھ بجے اپنا کام شروع کردیتے تھے۔ سمیر نے آشی کو جانے پر مجبور کیا۔ ''میں اب ٹھیک ہوں، تم جاؤ تمہاری وہاں موجودگی ضروری ہے۔''

آشی بھی یہ بات سمجھتی تھی اس لیے وہ بادلِ ناخواستہ کھڑی ہوگئی اور پھر اچانک وہ سمیر پر جھکی۔ ایک نرم، گرم اور گداز سا لمس سمیر کے ہونٹوں پر آیا اور پھر آشی بادِ صبا کے جھونکے کی طرح کیبن سے نکل گئی۔ سمیر مسکرانے لگا۔ ہونٹوں پر آیا لمس باقی تھا۔ وہ اپنی تکلیف بھول گیا تھا اور پھر اسی لمس کو محسوس کرتے کرتے وہ سو گیا تھا۔ اچانک ہی ایکسپلور ایشیا کو جھٹکا لگا تو سمیر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاز رک گیا تھا شاید لنگر گرایا گیا تھا اور یہ جھٹکا اسی کا آیا تھا۔ دوا کے اثر سے اسے اپنا جسم ہلکا محسوس ہو رہا تھا مگر درد کی کیفیت ابھی باقی تھی۔ وہ کچھ دیر لیٹا رہا پھر اٹھا تو اسے ہلکا سا چکر آیا تھا مگر جلد اس نے خود کو سنبھال لیا اس نے لباس تبدیل کیا اور باہر آیا۔ عقبی عرشے پر بھاگ دوڑ ہو رہی تھی اور روزالی کی روبوٹ سمندر میں اتارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ آشی کنٹرول روم میں تھی۔ سمیر، روزالی کے پاس آیا۔

''کچھ ملا ہے؟''

''بالکل اسی لیے تو اسے نیچے بھیج رہا ہوں۔'' روزالی نے کی روبوٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ''اس بار چھ سوفٹ کی گہرائی میں کوئی بڑی چیز ملی ہے۔''

روزالی نے کرین سے کی روبوٹ سمندر میں اتار دیا اور پھر کنٹرول روم میں آیا۔ سمیر اس کے ساتھ تھا۔ آشی

اسے دیکھ کر چونکی اور آہستہ سے بولی۔ ''تم کیوں آئے ہو، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں اب۔'' سمیر نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ ''کیا ملا ہے؟''

''بڑی مچھلی ہے۔'' سام نے کہا۔

''کاش یہ یوکی آئیوا ہو۔'' آشی، روزالی کی طرف آئی جس کے سامنے تین اسکرینز پر روبوٹ کے کیمروں کی ویڈیو آرہی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے اور سورج بڑی حد تک اوپر آچکا تھا اس لیے سمندر کی گہرائیوں تک روشنی جارہی تھی۔ نیچے کا منظر کسی حد تک واضح تھا۔ یہاں ریت تھی اور اس میں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے روبوٹ نیچے جارہا تھا، ریت میں ایک ابھرا ہوا نشان واضح ہورہا تھا۔ میگنٹ اس کی ہی نشان دہی کر رہا تھا۔ نیچے کا سائز خاصا بڑا تھا، یہ کم سے کم بھی تین سو فٹ لمبا اور تقریباً ساٹھ ستر فٹ چوڑا تھا۔ آشی نے یوکی آئیوا کی تصاویر اور خاکوں کا پرنٹ آؤٹ پاس رکھا تھا، اس نے موازنہ کیا۔ یوکی آئیوا کے درمیانی حصے میں تین دھواں خارج کرنے والی چمنیاں تھیں جو عرشے سے تقریباً تیس فٹ اونچی تھیں۔ سی روبوٹ نزدیک ہوا تو ٹیلے میں الگ سے تین ابھار نظر آنے لگے۔ آشی نے جوش سے کہا۔

''یہی ہے... یہ یوکی آئیوا ہے۔''

''اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔'' سمیر نے آہستہ سے کہا۔

''یوکی آئیوا میں یہ تین چمنیاں پچاس پچاس فٹ کے فاصلے سے تھیں۔ روزالی کیا تم بتاسکتے ہو کہ ان نظر آنے والے ابھاروں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔''

روزالی نے اپنے کمپیوٹر پر کیلکولیشن کی اور بولا۔ ''تقریباً پچاس فٹ۔''

''میں نے ٹھیک کہا نا؟'' آشی نے سمیر کو دیکھا۔ اس دوران میں سی روبوٹ ابھاروں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ روزالی نے آشی کے حکم پر درمیان والے ابھار پر بلورا استعمال کیا۔ مٹی اڑی اور تقریباً بیس منٹ بعد یہ چیز نمایاں ہوگئی۔ یہ سچ مچ کسی جہاز کی چمنی تھی۔ مٹی کی تہ چند فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اگلے دو گھنٹے میں سی روبوٹ نے تینوں چمنیوں سے مٹی صاف کردیا تھا۔ شروع سے مٹی پڑنے سے چمنیاں اندر سے بھی بھر گئی تھیں۔ روزالی نے کہا۔ ''جب چمنیوں پر اتنی مٹی ہے تو عرشے پر یقیناً اس سے کہیں زیادہ موٹی تہ ہوگی۔''

''یہ کیسے طے ہوگا کہ یہ یوکی آئیوا ہی ہے؟'' سمیر نے سوال کیا۔

سی روبوٹ اب گھوم کر چمنیوں کا جائزہ لے رہا تھا اور پھر درمیانی چمنی پر جاپان کے پرچم کا سرخ دائرہ نمودار ہوا۔ سام نے کہا۔ ''یہ سو فیصد جاپانی شپ ہے۔''

آشی نے کہا۔ ''دوسرا سی روبوٹ بھی اتارو، دونوں کی مدد سے عقبی عرشے کا حصہ صاف کرو۔''

روزالی، آشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ ان کا تیسرا ساتھی آئیرو اب روبوٹ سنبھال رہا تھا۔ اس نے عقبی عرشے پر بلورا کا استعمال شروع کردیا۔ بلورا کی مشین بجلی زیادہ استعمال کرتی تھی اور پہلے ہی روبوٹ کی بیٹری ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لیے اسے اب جہاز سے پاور دی جانے لگی۔ دس منٹ میں دوسرا سی روبوٹ بھی نیچے پہنچ گیا اور دونوں نے مل کر ایک گھنٹے میں عقبی عرشے سے ریت بڑی حد تک صاف کردی تھی۔ روزالی نے اپنا روبوٹ گرد آلود پانی میں گھما دیا۔ اس کے طاقتور کیمروں سے عرشے پر بکھرا ہوا سامان صاف نظر آنے لگا تھا۔ بڑے اور چھوٹے سائز کے ڈرم اور دوسرے سامان کے درمیان ایک چھوٹی توپ بھی شامل تھی۔ اس کا نیچے کا پیندا ٹوٹ گیا تھا اور وہ ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ آشی نے اشارہ کیا۔ ''یوکی آئیوا پر ایسی ایک توپ موجود ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، یہ یوکی آئیوا ہی ہے۔''

چند لمحے بعد تصدیق ہوگئی جب کیمرے نے عقبی عرشے کی دیوار دکھائی جو اوپری عرشے کے نیچے تھی۔ اس پر جاپانی میں یوکی آئیوا لکھا ہوا تھا۔ آشی نے سمیر کی طرف دیکھا۔ ''میں اور ارجن نیچے جارہے ہیں۔''

''میری طبیعت ٹھیک ہے، میں جاسکتا ہوں۔'' سمیر نے کہا اور باہر نکل آیا۔ آشی اس کے پیچھے آئی تھی۔

''تمہاری طبیعت مکمل ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں گہرائی چھ سو فٹ ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' سمیر نے یقین دلایا۔ ''اگر میں کوئی گڑبڑ محسوس کروں گا تو فوراً اوپر آجاؤں گا۔''

آشی نے بادل ناخواستہ اجازت دی تھی لیکن وہ فکر مند رہی تھی۔ اس نے سمیر کو ڈائیونگ سوٹ پہننے میں مدد دی تھی۔ ارجن پہلے ہی تیار ہوگیا تھا۔ اس نے سمیر سے کہا۔ ''میں نے تارپیڈو ساتھ رکھا ہے تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔''

بجلی سے چلنے والا یہ چھوٹا سا تارپیڈو انہیں تیز رفتاری سے تہ میں اور تہ سے اوپر لے جاسکتا تھا۔ ان کا وقت اور

جسمانی قوت تھی۔ پہلے سمیر گیا، اس کے کودنے سے پہلے آشی نے آہستہ سے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

سمیر نے سر ہلایا اور سیڑھی سے اتر کر پانی میں آ گیا۔ اس کے بعد ارجن کو آنا تھا، کوئی نہیں دیکھ سکا کہ نیچے اترنے سے پہلے اس نے اپنے سوٹ کے ساتھ لگے ایک چھوٹے سے آلے کا بٹن دبایا تھا۔ بہ ظاہر یہ دا ئونگ رہا تھا۔

☆☆☆

جان پال کی کشتی ایکسپلورر ایشیا سے دو میل کے فاصلے پر تھی۔ جان کے پاس ایک ٹیب نما آلہ تھا اور وہ اس کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا سفید نقطہ سبز اسکرین پر حرکت کر رہا تھا۔ کشتی تقریباً زیرِ آب تھی اور اس کا صرف کاک پٹ والا حصہ پانی سے باہر تھا۔ وہ کئی گھنٹے سے ایکسپلورر ایشیا کی نگرانی کر رہے تھے۔ اچانک سفید نقطہ سرخ ہو گیا اور جان پال حرکت میں آ گیا اس نے غڑ سے ہوتے ہوئے کیتی سے کہا۔ ''تیاری کرو ہمیں ڈائیو کرنی ہے۔'' پھر اس نے کپتان جیف کو حکم دیا۔ ''زیرِ آب تیس میٹرز کی گہرائی میں شپ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر آ جاؤ۔''

کپتان جیف حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔ کشتی نے غوطہ لگایا اور تیزی سے زیرِ آب آ کر ایکسپلورر ایشیا کی طرف جانے لگی۔ اس دوران میں جان اور کیتی پچھلے حصے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں آ کر ڈیپ ڈائیونگ سوٹ پہن رہے تھے۔ سوٹ پہن کر انہوں نے ہیلمٹ سروں پر لگائے۔ ان کے پاس کئی طرح کے آلات اور زیرِ آب فائر ہونے والے ایرو شوٹر تھے۔ تیار ہو کر وہ ایک چیمبر میں آئے۔ اس دوران میں کشتی مقررہ جگہ پہنچ کر رک گئی تھی۔ جان نے کپتان جیف سے کہا۔ ''ہم تیار ہیں پانی کھول دو۔''

انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا فوراً ہی چیمبر میں پانی بھرنے لگا۔ اب وہ سلنڈر سے سانس لے رہے تھے۔ جان اور کیتی کے پاس دو دو سلنڈر تھے جو دو گھنٹے کے لیے کافی تھے۔ پانی بھرتے ہی کیتی نے ایک طرف لگا ہوا دروازہ کھولا اور وہ باہر سمندر میں نکل آئے۔ کیتی کے پاس تارپیڈو تھا۔ اس نے وہ چلایا اور جان نے اس کی بیلٹ پکڑ لی تھی۔ دونوں تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔

☆☆☆

سمیر نے آکسیجن کھول لی اور زیرِ آب آ گیا۔ اس کے پاس ریڈی ایشن گائیگر تھا۔ ایک منٹ بعد ارجن بھی آ گیا، اس نے نیچے آ کر تارپیڈو چلایا۔ سمیر نے اس کی بیلٹ تھام لی۔ وہ دونوں تارپیڈو کے سہارے تیزی سے نیچے جانے لگے۔ سمیر کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی وقت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور پانی کا دباؤ بھی بتا رہی تھی۔ تارپیڈو انہیں دس فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے لے جا رہا تھا اور ایک منٹ میں وہ تہ کے پاس پہنچ چکے تھے یہاں دباؤ شدید تھا اور سمیر کو پہلی بار ہلکی سی بے چینی محسوس ہوئی تھی مگر یہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اوپر جانے پر مجبور ہو جاتا۔ ایک ہی روبوٹ اوپر جا چکا تھا دوسرا موجود تھا۔ انہوں نے ہی روبوٹ کے سامنے آ کر اوپر والوں کو بتایا کہ وہ نیچے پہنچ گئے ہیں۔ یہاں گہرائی پانچ سو اسی فٹ تھی اور بحری جہاز کا عرشہ مزید تیس فٹ نیچے تھا۔ بلور سے اڑائی جانے والی ریت اب نیچے بیٹھ چکی تھی اور منظر کسی قدر شفاف تھا۔ دوپہر کے دو بجے سورج اوپر تھا اس لیے اس کی روشنی یہاں تہ تک پہنچ رہی تھی۔ ارجن نے تارپیڈو بند کر دیا اور وہ خود تیرتے ہوئے عرشے کی طرف بڑھے تھے۔

ارجن نے تارپیڈو عرشے پر رکھ دیا اور اسے اشارے سے آگے جا کر گائیگر کی مدد سے یورینیم تلاش کرنے کو کہا۔ عرشے پر ملبا بکھرا ہوا تھا۔ اس میں ڈرم، ڈبے، ٹینکیں، فوجیوں کے فولادی ہیلمٹ اور اسی طرح کی بے شمار اشیا تھیں۔ عرشے کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ بھی تارپیڈو سے ہونے والی تباہی کا نشانہ بنا تھا۔ یہاں عرشے کا ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا اور اس کے اندر تاریک خلا تھا۔ آشی نے سمیر کو تصاویر میں ٹھیک اس جگہ کی نشان دہی کی تھی جہاں شپ منٹ کی پیٹیاں رکھی گئی تھیں۔ اس کے مطابق یلو کیک یورینیم سیسے کے بنے بکس میں بند تھی لیکن وزن کم رکھنے کے لیے سیسے کی دیوار زیادہ موٹی نہیں تھی اور اس وجہ سے تابکاری باہر تک آ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی ان پیٹیوں کو سنبھالنے والا فوجی دستہ خاص لباس پہنے ہوئے تھا۔ جو عام لوگ اس کے پاس آتے انہیں لازماً تابکاری کا سامنا کرنا پڑتا۔ گائیگر سمیر کے پاس تھا اس لیے ارجن نے اسے آگے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

سمیر آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں گائیگر کی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ مگر ابھی تک اسکرین پر کوئی دھبا نمودار ہوا نہیں تھا۔ اسکرین ہلکے ہرے رنگ میں تھی۔ سمیر حیران ہوا تھا۔ گائیگر نے اس کے سامنے تقریباً دس فٹ کی دوری سے معمولی سے ریڈیم کے ٹکڑے کی تابکاری ظاہر کر دی تھی لیکن یہاں دو ہزار ٹن سے زیادہ یورینیم موجود تھی اور گائیگر پر ہلکا سا بھی اشارہ نہیں تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ پورے حقیقی عرشے کا چکر لگا لیا مگر نہ تو اسے تابکاری ملی اور نہ ہی وہاں

لکڑی کی وہ پیٹیاں تھیں جو جاپان سے یوکی آئیوا پر لادی گئی تھیں۔ انہیں فولادی زنجیروں سے باندھا گیا تھا لیکن وہاں کہیں زنجیریں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ سمیر پلٹ کر ہی روبوٹ کے کیمرے کی طرف آیا اور اس نے زیرِ آب کام کرنے والے پیڈ پر مخصوص پین سے لکھا۔ ”یہاں کہیں وہ پیٹیاں نہیں ہیں۔“

جب آشی نے یوکی آئیوا کی تلاش کا بتایا تھا تو اس وقت یورینیم کا ذکر نہیں کیا تھا مگر جب باقاعدہ تلاش شروع ہوئی تو اس نے کپتان لی اور ٹیکنیشین عملے اور ارجن کو بتا دیا تھا کیونکہ ان سب کو تلاش میں براہِ راست حصہ لینا تھا۔ کپتان لی پریشان ہوگیا اس نے آشی سے کہا کہ قانون کے لحاظ سے اسے کوئی بھی تاب کار مادہ جہاز پر لانے اور رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ آشی نے اسے اطمینان دلایا کہ اول تاب کار مادہ بحری جہاز پر نہیں لایا جائے گا دوسرے کوئی اس کے قریب نہیں جائے گا صرف آلات کی مدد سے اس کا پتا چلایا جائے گا کہ وہ ڈوبے یوکی آئیوا میں موجود ہے یا نہیں۔ روبوٹ میں ایک چھوٹی سی اسکرین لگی تھی۔ اوپر روبوٹ کے کنٹرول پینل پر کی بورڈ سے کچھ لکھا جاتا تو وہ اس اسکرین پر آجاتا تھا۔ اوپر سے آشی نے اس پر لکھا۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے شپ منٹ وہاں موجود ہونی چاہیے۔“

”میرے ہیلمٹ میں لگے کیمرے نے پورے عرشے کی ریکارڈنگ کی ہے۔“

اسی اثنا میں ارجن نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ عرشے کے نیچے موجود خلا کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ سمیر نے پیڈ پر لکھا۔ ”میں اس خلا میں جاکر چیک کرتا ہوں۔“

”نہیں رک جاؤ....“ آشی نے کہا مگر سمیر مڑ چکا تھا۔ ارجن دیکھ رہا تھا مگر اس نے سمیر کو بتایا نہیں وہ تیرتا ہوا خلا تک گیا اور اپنے سوٹ پر لگی روشنیاں آن کرکے اندر داخل ہوگیا۔ یہ یوکی آئیوا کا اندرونی حصہ تھا۔ یہاں بھی بہت زیادہ ریت داخل ہوئی تھی بلور نے ریت اڑائی تو ایک حصہ الگ ہونے سے خلا نمودار ہوا تھا۔ سمیر احتیاط سے کام لے رہا تھا کیونکہ یہاں جگہ محدود تھی اور اس کے سوٹ میں بے شمار تاریں اور نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے پاس بھی دو آکسیجن سلینڈر تھے گھڑی کے مطابق اسے نیچے آئے ہوئے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا اور ابھی وہ مزید ڈیڑھ گھنٹا نیچے رہ سکتا تھا یعنی اس کے پاس خاصا وقت تھا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا ہال تھا اور پھر دو راہداریاں تھیں۔

وہ ایک راہداری کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی نظر گائیگر کی اسکرین پر مرکوز تھی اچانک اسے لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے آیا ہے۔ وہ مڑا تھا کہ کوئی چیز اس کے سوٹ کو چیرتی ہوئی اس کی پسلی میں گھس گئی۔

☆☆☆

آشی نے تیزی سے کی بورڈ پر لکھا۔ ”نہیں رک جاؤ...“

مگر سمیر مڑ کر جا چکا تھا۔ وہ یوکی آئیوا کے عرشے میں ہونے والے سوراخ میں داخل ہونے والا تھا کہ اچانک ہی روبوٹ کے کیمروں نے کام چھوڑ دیا۔ تینوں اسکرینز تاریک ہوگئیں۔ آشی نے اضطراب سے کہا۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ روزالی اپنے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ یہ روبوٹ ایک جوائے اسٹک کی مدد سے قابو کیا جاتا تھا اور اس کے کچھ فنکشن کمپیوٹرائز تھے۔ مگر اس وقت کوئی چیز کام نہیں کررہی تھی۔ روزالی نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے ڈیٹا کیبل کٹ گئی ہے۔“

”تار کیسے کٹ گئی؟“ آشی نے پوچھا۔

روزالی نے شانے اچکائے۔ ”کیا کہہ سکتے ہیں، سمندر میں بے شمار چیزیں ہوتی ہیں۔“

”دوسرا روبوٹ نیچے بھیجو۔“ آشی نے کہا۔

روزالی اس کے ساتھ باہر آیا۔ وہ کرین کی مدد سے پہلے ہی روبوٹ کو اوپر کھینچنے لگا۔ کرین میں ایک جیک بھی لگا تھا جو ری لپیٹ کر ہی روبوٹ کو واپس کھینچ سکتا تھا۔ آشی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ نیچے کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ وہ سمیر کو یوکی آئیوا کے خلا میں جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اس کی بات سنے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دوسرا روبوٹ سیکنڈوں میں نیچے چلا جائے اور وہ نیچے کے احوال سے آگاہ ہوسکے۔ اسے رہ رہ کر سمیر کا خیال آرہا تھا۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ سمیر اس کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے اور آشی کے دل میں اس کا کیا مقام تھا۔ وہ عرشے کے کنارے پر تھی اور نیچے سمندر میں دیکھ رہی تھی۔ اچانک پانی کی سطح پر حرکت ہوئی کوئی نیچے سے اوپر آرہا تھا۔ آشی نے نظر جما کر دیکھا وہ ایک ہی فرد تھا۔ آشی کی بے چینی بڑھ گئی۔ یہ آمد غیر متوقع تھی کیونکہ ابھی کام نامکمل تھا اور دونوں کو ساتھ ہی آنا تھا۔ تارپیڈو لیے ہوئے آنے والا سطح پر نمودار ہوا۔ آشی کا دل اچھلا تھا اسے لگا کہ آنے والا سمیر ہے مگر جب اس نے

ہینسٹ سر سے بتایا تو آشی کا دل واپس ڈوب گیا۔ وہ ارجن تھا۔ اس نے چلا کر پوچھا۔

''سمیر کہاں ہے؟''

ارجن کچھ بدحواس تھا۔ اس نے آشی کی بات کا جواب نہیں دیا ایسا لگا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ اس نے تارپیڈو وہیں چھوڑا اور خود سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ اس نے اپنا بائیں شانے سے نیچے بازو دائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ اس کے اوپر آتے ہی آشی نے پھر پوچھا۔ ''سمیر کہاں ہے؟''

ارجن نے چونک کر اسے دیکھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم .... نیچے کچھ لوگ اور ہیں، انہوں نے مجھ پر حملہ کیا۔'' ارجن نے کہتے ہوئے بازو سے ہاتھ ہٹایا تو وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ آشی یہ سن کر بے قرار ہو گئی۔

''کون لوگ ہیں .... کتنے ہیں؟''

ارجن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں جانتا، شاید دو تین تھے انہوں نے آتے ہی ی روبوٹ کی تار کاٹ دی اور مجھ پر چاقو سے حملہ کیا، میں تارپیڈو لے کر بھاگا۔ اسی وجہ سے بچ گیا ورنہ نہ جانے میرا کیا حال ہوتا؟''

آشی کا فکر سے برا حال ہو گیا، اس نے چلا کر کہا۔ ''تم بزدل .... سمیر کو نیچے چھوڑ کر بھاگ آئے۔''

ارجن نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تو کیا میں بھی مرتا۔''

''تم تارپیڈو لے آئے ہو اب وہ جلدی اوپر نہیں آسکے گا۔''

''اگر ان لوگوں سے بچ گیا۔'' ارجن کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ ''میرے بازو پر چاقو کا نشان دیکھ رہی ہو، وہ قتل کے ارادے سے آئے تھے۔''

چند منٹ میں سب کو معلوم ہو گیا تھا۔ اس دوران میں روزالی پہلا ی روبوٹ اوپر کھینچ چکا تھا اسے رسے سے الگ کر کے اس نے تیزی سے دوسرا ی روبوٹ کرین سے منسلک کیا اور اسے پانی میں اتارنے لگا۔ کپتان لی وہاں آ گیا، اس نے مسلح حملہ آوروں کا سن کر فوری طور پر جہاز پر موجود اسلحہ نکالنے کا حکم دیا اور ارجن سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ڈاکٹر سوستر بھی آ گیا، وہ ارجن کا زخم دیکھ رہا تھا، اس نے تشویش سے کہا۔ ''کم سے کم دو انچ گہرا کٹ ہے اسے کلینک میں دیکھنا ہوگا۔''

ذرا دیر میں سیلرز کے پاس شاٹ گنز نظر آنے لگی تھیں اور ایمپنور ایشیا کے چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ کپتان لی آشی کے ساتھ کنٹرول روم میں آ گیا۔ اس نے آشی سے کہا۔ ''مس بیروکی میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا نہیں سمجھ سکے؟''

''یہ کہ پہلے ہمیں اپنے مشن کا علم نہیں تھا پھر تم نے بتایا کہ ہمیں ایک ڈوبے جنگی جہاز کو تلاش کرنا اور پھر پتا چلا کہ اس پر بھاری مقدار میں یورینیم موجود تھی۔ اب یہ معاملہ سامنے آیا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو مسٹر کپتان؟'' آشی کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''یقیناً کچھ لوگ اور بھی ہیں جو اس شپ تک پہنچنا چاہتے ہیں اور انہوں نے ہی ڈائیورز پر حملہ کیا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں ان کو نہیں جانتی۔'' آشی نے جواب دیا۔ ''ابھی سمیر نیچے ہے اور تم سوالات کے بجائے اس کی فکر کرو۔''

روزالی دوسرا ی روبوٹ نیچے لے جا رہا تھا۔ کپتان لی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کروں۔ یہ سنگین معاملہ ہے۔ انڈونیشیا کے حکام کو بھی مطلع کرنا ہوگا۔''

''تم رپورٹ کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، میں سمیر کی سلامتی کے لیے فکرمند ہوں۔'' آشی نے کہا اور اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی جس پر اب یوکی آئیوا نظر آنے لگا تھا۔ کپتان لی سر ہلاتا ہوا کنٹرول روم سے نکل گیا۔ روزالی نے احتیاطاً پہلے روبوٹ کو چاروں طرف گھما کر دیکھا مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ حملہ کرنے والے جا چکے تھے۔ اب روبوٹ عرشے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ روزالی کوشش کر رہا تھا کہ پورا عرشہ اور آس پاس کا سارا منظر اسکرین پر واضح ہو۔ وہ سمیر کو تلاش کر رہے تھے مگر وہ باہر نظر نہیں آیا تھا۔ آشی پریشان ہو گئی۔ ''وہ اب تک خلا میں ہے۔''

''روبوٹ خلا میں نہیں جا سکتا۔'' روزالی نے کہا اور اسے خلا کے پاس لے آیا۔ اس کے سامنے لگی سرچ لائٹس روشن کر لی تھیں مگر جہاں تک روشنی جا رہی تھی، خلا میں بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آشی کو لگا اس کے اندر کچھ پگھل رہا تھا وہ اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ اچانک خلا میں ایک ڈائیور نمودار ہوا مگر وہ حرکت نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ بے جان انداز میں تیر رہا تھا۔ آشی کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ وہ بس چند لمحے

کے لیے سامنے آیا اور دوبارہ تاریکی میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

سمیر کو لگا، اس کے پہلو میں آگ بھر گئی ہے۔ اس نے بے اختیار ہاتھ چلایا تو وہ چاقو کا وار کرنے والے کے آکسیجن سلینڈر کے پائپ پر گیا اور اس نے پوری قوت سے پائپ کھینچ لیا۔ یہ مضبوط ربر کا پائپ تھا مگر سمیر نے ساری طاقت استعمال کی تھی۔ اس وقت اسے یہی ایک چیز سوجھی تھی جس سے وہ اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ ورنہ حملہ آور چاقو سے مسلح تھا۔ سمیر کے گھومنے کی وجہ سے وار پوری قوت سے نہیں لگا تھا۔ مگر وہ دوسرا وار کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ پائپ اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ گیا اور حملہ آور بوکھلا گیا۔ اس نے اکھڑا پائپ دوبارہ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ دوبارہ نہیں لگ سکتا تھا۔ یہاں دباؤ زیادہ تھا اور سلینڈر سے گیس تیزی سے خارج ہو رہی تھی۔ سمیر پیچھے ہٹا اس نے اپنے زخم پر ہاتھ رکھ لیا۔ کیونکہ اسے محسوس ہوا تھا کہ یہاں شدید دباؤ کی وجہ سے پانی سوٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ اسے جلد از جلد اوپر جانا تھا مگر اسی لمحے ایک اور ڈائیور خلا میں آیا، اس کے ہاتھ میں ایرو شوٹر تھا۔ اس نے سمیر کو دیکھتے ہی ایرو شوٹر اس کی طرف کر کے فائر کیا مگر دوسرے کی بدقسمتی وہ اپنا پائپ جوڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں درمیان میں آ گیا اور تیر اس کے جسم میں گھس گیا۔ سمیر نے جلدی سے اپنے سوٹ کے ساتھ لگی روشنیاں بند کیں اور پیچھے ہٹنے لگا۔ آنے والا ابھی دس گز کے فاصلے پر تھا اور جب تک اس نے اپنے سوٹ کی روشنیاں آن کیں، سمیر ایک راہداری میں داخل ہو گیا تھا۔ روشنیاں بتا رہی تھیں کہ حملہ آور راہداری کی طرف آ رہا ہے۔ وہ یقیناً اسے مارنے کے درپے تھا۔

سمیر اپنا زخم دبائے ایک ہاتھ سے ہر ممکن تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ ایک کمرے میں داخل ہوا دوسرا حملہ آور جو جان پال تھا راہداری تک پہنچ گیا۔ اس نے ایرو شوٹر پر لگی تیز روشنی والی ٹارچ آن کر لی تھی اور سمیر کو تلاش کر رہا تھا۔ مگر وہ اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ چند لمحے وہ اسی راہداری کے سرے پر کھڑا سن گن لیتا رہا پھر دوسری راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ کونے میں دبکے سمیر نے روشنی ختم ہونے پر سکون کا سانس لیا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا کیونکہ جان پال نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے آگے نکل کر اپنے سوٹ اور ایرو شوٹر کی روشنیاں بجھا دی تھیں اور واپس آ کر کچھ دیر بعد اچانک ایرو شوٹر کی ٹارچ آن کی۔ مگر راہداری بدستور خالی تھی۔ سمیر جو اپنی جگہ سے آگے آنے والا تھا رک گیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے آگے نہیں نکلا ورنہ آنے والے کی نظروں میں آ جاتا اور اس کے بعد بچنا مشکل تھا کیونکہ یہاں سے آگے راستہ بند لگ رہا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔ وہ اپنا زخم دبائے ہوئے تھا اور اس کی کوشش تھی کہ پانی اندر نہ جانے پائے۔

☆☆☆

آشی کی بری حالت تھی ضبط کے باوجود اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اچانک وہ کھڑی ہو گئی۔ ''میں نیچے جاؤں گی۔''

سام اور روزانی نے مخالفت کی۔ ''یہ بہت خطرناک ہوگا۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ نیچے کیا ہوا ہے نہ جانے وہ کون لوگ ہیں اور ممکن ہے وہ اب بھی وہاں موجود ہوں۔''

''شاید سمیر زندہ ہو، اسے مدد کی ضرورت ہو۔'' آشی نے ایک موہوم سی امید کے ساتھ کہا اور باہر نکل آئی۔ سام اور روزانی اس کے ساتھ آئے۔ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جب آشی نے ڈائیونگ سوٹ اٹھا کر پہننا شروع کیا تو وہ سمجھ گئے کہ آشی نہیں مانے گی۔ وہ دونوں اسے سوٹ پہنانے لگے۔ سوٹ پہنانے کے بعد روزانی اس کے ساتھ نیچے سطح سمندر تک آیا جہاں تارپیڈو موجود تھا۔ روزانی نے اسے تارپیڈو کے فنکشن سمجھائے اور پھر ایک چھوٹا بٹن دبانے سے کھلنے والا چاقو اسے تھما دیا۔ ''شاید یہ تمہارے کام آئے۔''

آشی نے چاقو جیب میں رکھ لیا اور پانی میں اتر کر ہیلمٹ سر پر فٹ کر لیا۔ پھر اس نے ایک آکسیجن سلینڈر کا وال کھولا اور تارپیڈو پکڑ کر اسے آن کیا۔ اس کا رخ نیچے کی طرف کیا تو وہ تیزی سے تہ کی طرف جانے لگی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، وہ ایک امید لے کر نیچے جا رہی تھی۔ اب تہ میں روشنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کیونکہ سورج تقریباً پینتالیس درجے زاویے پر جھک گیا تھا۔ اس لیے اس کی شعاعیں اب گہرائی تک نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔ تین سو فٹ کے بعد روشنی نیلگوں ہو گئی تھی اور اس سے نیچے یہ بتدریج گہرے رنگ میں بدل رہی تھی۔ لیکن نیچے موجود روبوٹ کی روشنیاں اس کی رہنمائی کر رہی تھیں مگر ابھی وہ کچھ دور تھی کہ اچانک ہی روبوٹ کی تمام روشنیاں بند ہو گئیں۔ اب وہاں اندھیرا تھا۔

☆☆☆

جان پال کا غصے سے برا حال تھا کیونکہ کینی مر چکا تھا۔

اس کی لاش تاریک خلا میں تیر رہی تھی۔ وہ سمیر کی تلاش میں دوسری راہداری میں داخل ہوا۔ وہ ہر قیمت پر اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ سمیر کے مرنے سے آشی کا مشن ختم ہو جاتا اور وہ اسے بعد میں بھی ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ پہلے سمیر کا قتل اس کا مشن تھا مگر کیلی کے مرنے کے بعد اس میں ذاتی انتقام بھی شامل ہو گیا۔ وہ دوسری راہداری میں خاصا آگے تک گیا۔ یہ جہاز کے کئی حصوں کو ملا رہی تھی اور یہاں سیڑھیاں بھی تھیں جو اوپر نیچے کے فلورز پر جا رہی تھیں۔ یہاں ہر طرف سامان تھا اور مرنے والوں کی ہڈیاں موجود تھیں۔ ان کا گوشت کب کا ختم ہو گیا تھا اور اب تو ہڈیاں بھی بکھر گئی تھیں۔ کئی موڑ مڑنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔ سمیر یہاں نہیں آیا تھا۔ ورنہ وہ مل جاتا اور وہ اتنا اندر آ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ذرا سی غلطی سے وہ پھنس جاتا تو مارا جاتا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے پہلی راہداری کو پوری طرح چیک نہ کر کے غلطی کی تھی۔

وہ واپس آیا اور اسے باہر نکلنے میں ذرا دشواری پیش آئی تھی۔ ایک جگہ وہ غلط مڑ گیا لیکن اس مڑنے کا فائدہ ہوا تھا۔ وہ جہاز کی درمیانی چمنی کے پاس نکلا اور اسے چمنی میں بڑا سا سوراخ نظر آیا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا چمنی اوپر تک صاف تھی۔ بلور استعمال کرنے سے جمی ہوئی ریت نیچے آ گری تھی اور اب راستہ بن گیا تھا۔ چمنی کا قطر چھ فٹ سے زیادہ تھا اور وہ آرام سے اس کے راستے باہر جا سکتا تھا۔ وہ سوراخ سے چمنی میں داخل ہوا اور اوپر جانے لگا۔ اس نے اپنا تارپیڈو یوں آتے ہوئے اسے کچھ فاصلے پر ایک جھاڑی میں چھپا دیا تھا۔ وہاں سے وہ اور کیلی خود تیرتے ہوئے آگے آئے تھے۔ کیلی نے پہلے چاقو سے ہی روبوٹ کی ڈیٹا تار کاٹ دی اور پھر وہ عرشے کے خلا کی طرف بڑھا، اسے سمیر کا کام تمام کرنا تھا اور جان پال اوپر نگرانی کر رہا تھا۔ ارجن نے انہیں دیکھتے ہی تارپیڈو سنبھالا کر اوپر کا رخ کیا تھا۔ ہی روبوٹ کو ناکارہ کرنے کے بعد وہ بے فکر تھے۔

مگر چند منٹ بعد جان پال کو احساس ہوا کہ کیلی اب تک واپس نہیں آیا ہے، اسے فکر ہوئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سمیر بھی تربیت یافتہ سابق میرین تھا۔ جان خود خلا کی طرف بڑھا، اس نے ایروشوٹر سنبھال لیا۔ یہ زیرِ آب تقریباً پچاس فٹ کی دوری تک بہترین کام کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے آٹھ انچ کے فولادی تیر کی طاقت کم ہو جاتی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے سمیر اور کیلی نظر آئے۔ سمیر کے سوٹ کی تمام روشنیاں آن تھیں اور کیلی کے سوٹ کی آف تھیں۔

مگر کیلی سمیر سے ذرا دور دیوانہ وار کچھ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جان نے بلبلوں کے درمیان دیکھ لیا کہ کیلی کے آکسیجن ٹینک کا پائپ الگ ہو گیا تھا اور وہ اسے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمیر اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ جان نے ایروشوٹر اس کی طرف کیا اور فائر کر دیا۔ ایک جھٹکے سے تیر سمیر کی طرف لپکا مگر قضا کیلی کی آئی تھی، وہ پائپ جوڑنے کی کوشش میں تیر کے سامنے آ گیا اور وہ اس کی پشت میں اتر گیا۔ کیلی کو جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گیا۔

جان چمنی کے اوپری حصے میں پہنچا، اس نے باہر جھانکا وہاں تاریکی تھی مگر دوسرے ہی روبوٹ کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ اس کا رخ عرشے کے خلا کی طرف تھا۔ یعنی اس کے کیمرے جان کو نہیں دیکھ سکتے تھے وہ باہر نکل آیا۔ اس نے وقت دیکھا۔ پونا گھنٹا ہو چکا تھا اور اب اس کے پاس سوا گھنٹے کا وقت تھا اس دوران میں اسے اپنا مشن پورا کر کے واپس جانا تھا۔ وہ تاریکی میں گھوم کر ہی روبوٹ کی طرف جانے لگا۔ اوپر روشنی تھی اور اسے ایکسپلورر ایشیا کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بار تیرتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا تو اسے ایک غوطہ خور نیچے آتا دکھائی دیا۔ جان پال پہلے حیران ہوا کیونکہ ارجن کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ آنے والا کون ہو سکتا ہے، وہ تیزی سے ہی روبوٹ تک پہنچا اور اس نے اس کی ڈیٹا تار کاٹ دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی روشنیاں بھی بجھ گئی تھیں۔

☆☆☆
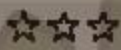
سمیر اب تک پہلی راہداری میں تھا۔ تقریباً پونے گھنٹے کا وقت گزر چکا تھا۔ بقا کی جدوجہد اور اعصابی کشیدگی کی وجہ سے اس نے تیزی سے آکسیجن خرچ کی تھی اور اب پہلے ٹینک میں صرف دس فیصد آکسیجن رہ گئی تھی جو مشکل سے چھ منٹ کے لیے کافی تھی لیکن اسے فکر نہیں تھی کیونکہ ابھی دوسرا ٹینک باقی تھا۔ اصل مسئلہ اس کے زخم اور ڈائیونگ سوٹ کے کٹ کا تھا۔ جب تک وہ یہاں سے نکل کر ایک خاص بلندی تک نہ پہنچ جاتا، اسے ہر صورت سوٹ میں پانی داخل ہونے سے روکنا تھا۔ سمیر نے محسوس کیا کہ وہ اس سے زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا...... اسے باہر نکل کر اوپر جانا ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ارجن کے ساتھ کیا گزری تھی لیکن اگر وہ ٹھیک ہوتا یا بچ ہوتا تو اب تک اس کی مدد کو آ چکا ہوتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ بھی گڑبڑ ہوئی تھی۔ یہاں کم سے کم دو حملہ آور تھے اور عین ممکن تھا، ان کی تعداد اس سے

زیادہ ہوتی۔

سمیر کو ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ حملہ آور کون ہو سکتے تھے، اسے یقین تھا کہ وہ امریکی تھے البتہ یہ نہیں معلوم تھا کہ جان پال خود ان میں شامل تھا۔ وہ راہداری میں واپس ہال کی طرف جانے لگا۔ تاریکی کی وجہ سے اسے بہت احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا کہ وہ یا اس کے سوٹ کی کوئی چیز کسی دوسری چیز سے نہ الجھے۔ گھڑی کے مطابق اسے نیچے آئے ہوئے پچاس منٹ ہونے والے تھے اور اسے عرشے کے خلا سے باہر روشنی نظر آ رہی تھی مگر یہ مصنوعی روشنی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب تک سورج کی روشنی یہاں تک آنا بند ہو چکی ہو گی اور یہ سی روبوٹ کی روشنی ہے۔ وہ تیرتا ہوا خلا کے پاس پہنچا اور اس نے احتیاط سے باہر جھانکا۔ اسے سی روبوٹ کے اوپر ایک شخص دکھائی دیا، وہ کچھ کر رہا تھا اور اسی لمحے سی روبوٹ کی روشنیاں بند ہو گئیں۔ سمیر کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ وہی شخص تھا جس نے اس پر ایروشوٹر سے فائر کیا تھا اور پھر اسے تلاش کر رہا تھا۔ کیونکہ روشنیاں بجھ گئی تھیں اس لیے وہ بے خوف ہو کر خلا سے باہر نکل آیا۔ دوسرا شخص تاریکی میں تھا مگر اوپر روشنی تھی اور سمیر نے ایک غوطہ خور کو نیچے آتے دیکھا۔ اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ پہلے اسے لگا کہ وہ ارجن ہے جو شاید اس دوران میں اوپر جا کر واپس نیچے آ رہا تھا تا کہ اس کی مدد کر سکے لیکن پھر اس نے جسمانی ساخت سے پہچان لیا، وہ آشی تھی۔

سمیر پریشان ہو گیا۔ تاریکی میں ایروشوٹر سمیت حملہ آور چھپا ہوا تھا اور آشی بے خبری میں اس کا شکار بننے والی تھی۔ چند لمحے میں سمیر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اوپر جا کر اسے روکنے کی کوشش کرے گا۔ مگر اسی لمحے اسے جھٹکا لگا۔ آکسیجن سلینڈر خالی ہو گیا تھا اور وہ مزید سانس نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے ٹٹول کر دوسرے سلینڈر کا وال کھولا اور وہ منتظر تھا کہ اس سے حیات بخش آکسیجن نکل کر اس کا سانس بحال کرے لیکن سلینڈر سے آکسیجن نہیں آئی تھی، اس نے مضطرب ہو کر دوبارہ وال آف اور آن کیا مگر نتیجہ حسب سابق رہا۔ اس نے سلینڈر کے اوپر لگا ہوا وال چیک کیا وہ بھی کھلا ہوا تھا پھر سلینڈر سے آکسیجن کیوں نہیں آ رہی تھی؟ اس نے سلینڈر ہلایا، پائپ چیک کیا مگر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ صورت حال اچانک سنگین ہو گئی تھی اور سمیر کا دم گھٹنے لگا تھا۔ چند لمحے جاتے تھے کہ آکسیجن کی محرومی اسے زندگی سے محروم کر دیتی۔

☆☆☆

آشی نیچے آتے آتے رک گئی اس نے تارپیڈو کا بٹن دبا کر اسے روک دیا۔ وہ اس وقت یہ سے کوئی سوفٹ اوپر تھی اس کے آس پاس بھی تاریکی چھانے لگی تھی اور نیچے تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا جس نے دوسرے سی روبوٹ کو بھی ناکارہ بنا دیا تھا۔ اس نے تارپیڈو کا رخ بدلا اور اب عرشے کے بجائے یوکی آئیوا کے وسطی تاریک حصے میں جانے لگی۔ ذرا دیر بعد وہ بھی تاریکی میں تھی اور اندازے سے یوکی آئیوا کے عقبی عرشے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اندازے سے عقبی عرشے کی طرف تیر رہی تھی۔ اچانک اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور اس نے ٹٹول کر دیکھا یہ سی روبوٹ تھا۔ گویا وہ یوکی آئیوا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اسی لمحے اوپر روشنی ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سی روبوٹ کے اوپر ایک شخص تھا اس کے ہاتھ میں ایروشوٹر تھا اور اس پر لگی تیز ٹارچ روشن تھی مگر اس کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ وہ منتظر تھا کہ آشی نیچے آئے تو وہ اسے نشانہ بنائے۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ آشی بہت تیزی سے نیچے آ گئی تھی اور وہ اس کے عین پیروں تلے سی روبوٹ کے نیچے تھی۔ وہ ایروشوٹر کی ٹارچ گھما کر آشی کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے سی روبوٹ کے بالکل نیچے آ گئی۔ مگر وہ یہاں بھی محفوظ نہیں تھی کیونکہ وہ نیچے بھی حملہ آور اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے سوچا اور تارپیڈو آن کرتے ہوئے تیزی سے یوکی آئیوا کے عرشے کے خلا کی طرف بڑھی۔ تارپیڈو کے ساتھ اس کے آگے کی روشنی بھی آن ہو گئی تھی اور عرشے کا خلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بہت خطرناک کام تھا کیونکہ عرشے کا فرش پھٹا ہوا تھا اور اس کی نوکیں نکلی ہوئی تھیں اگر وہ ان نوکوں سے ٹکرا جاتی یا کوئی پائپ الجھ جاتا تو وہ اسے نقصان بھی پہنچا سکتا تھا اور پھنس جانے کے بعد وہ ایروشوٹر کا آسان شکار بن جاتی لیکن اس نے چانس لیا تھا۔ وہ خلا کے پاس تھی کہ ایک تیر اس کے نزدیک سے گزر کر عرشے پر لگا۔ اگلے لمحے وہ خلا میں داخل ہو رہی تھی۔

☆☆☆

جان پال نے چالاکی سے کام لیا تھا، اس نے اس وقت ایروشوٹر کی ٹارچ آن کی جب اس کے اندازے کے مطابق آشی اس روبوٹ سے ..... نیچے آ چکی تھی، یہ تو اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ..... آشی نے تارپیڈو بند کر دیا تھا اور از خود تیر کر تاریک حصے میں آ گئی تھی۔ مگر وہ اس کے اندازے سے زیادہ تیز ثابت ہوئی تھی۔ جان ٹارچ گھما کر اسے تلاش کر رہا تھا اچانک اسے سی روبوٹ کے نیچے روشنی اور حرکت کا احساس ہوا اس نے مڑ کر دیکھا اور جب

تک وہ تیر کر سائڈ پر ہوتا اور آشی اسے نظر آتی وہ خلا کے پاس پہنچ گئی تھی۔ جان نے عجلت میں تیر فائر کیا مگر نشانہ خطا گیا اور آشی خلا میں داخل ہوگئی۔ وہ بچ گئی تھی۔ جان نے اپنے سوٹ کی روشنیاں آن کیں اور تیرتا ہوا خلا کی طرف بڑھا... وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوا اس کے دونوں شکار ایک ہی جگہ جمع ہوگئے تھے۔ مگر خلا کے پاس پہنچ کر وہ رکا اور پھر واپس آکر اس نے سی روبوٹ کی رسی کاٹی اب وہ صرف ایک پتلی سی تار کے سہارے لٹک رہا تھا جو اس تک کرنٹ لاتی تھی۔

رسی کٹ جانے کے بعد سی روبوٹ اس تار کے بل پر تھا۔ جان نے اسے نیچے دھکیلا۔ تار تن گیا مگر ٹوٹا نہیں۔ جان تار نہیں کاٹ سکتا تھا ورنہ کرنٹ ہونے کی صورت میں پہلے اسے جھٹکا لگتا اس لیے وہ تار کھینچ کر توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے امید تھی تار اوپر کہیں سے ٹوٹے گا۔ نیچے ٹوٹنے کا خطرہ تھا مگر وہ اتنا رسک لینے کے لیے تیار تھا۔ کئی بار دھکا دینے پر سی روبوٹ رفتہ رفتہ عرشے کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ تار تن رہا تھا اور بالآخر وہ جھٹکے سے ٹوٹا اور کہیں اوپر ٹوٹا اس لیے اگر اس میں کرنٹ تھا بھی تو جان بال بال اس سے بچ گیا۔ اب سی روبوٹ اپنے وزن کی وجہ سے نیچے جا رہا تھا اور جان اسے قابو میں رکھتے ہوئے عرشے کے خلا کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لیے اسے بے پناہ جدوجہد کرنا پڑی تھی لیکن بالآخر وہ سی روبوٹ کو خلا تک لانے میں کامیاب ہوا اور اسے اس طرح خلا میں پھنسا دیا کہ اب کوئی فرد نہ تو اس سے باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر جا سکتا تھا۔ اپنے کام کو مزید پکا کرنے کے لیے اس نے سی روبوٹ کی رسی کاٹ کر اس سے عرشے کی ریلنگ سے سی روبوٹ کو باندھ دیا۔ اب کوئی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا جب تک رسی کو نہ کاٹا جاتا۔ پھر وہ تیرتا ہوا اور سیاٹی چمنی کی طرف بڑھا جس سے وہ باہر آیا تھا۔

☆☆☆

سمیر کے ذہن پر تاریکی چھا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا موت بس کچھ ہی دور رہ گئی تھی۔ اس کے ذہن کے ساتھ دل بھی ڈوب رہا تھا۔ پھیپھڑے سانس کے لیے مچل رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ اپنے معبود حقیقی کو پکارا۔ ''اللہ اگر میرا وقت آگیا ہے تو میں تیری رضا میں راضی ہوں لیکن اگر میری زندگی ہے تو مجھے کوئی راستہ دکھا۔''

ابھی دعا پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اللہ نے اسے راستہ دکھا دیا۔ وہ پلٹا اور اندازے سے خلا میں داخل ہوا۔ اس وقت بھی اس نے روشنی کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا کیونکہ دشمن بہت قریب تھا اور وہ لازمی روشنی دیکھ لیتا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے سمیر نے اپنے دونوں آکسیجن ٹینک الگ کر دیے۔ پھر اس نے سوٹ کی روشنیاں آن کیں اور آگے بڑھا۔ وہ آس پاس دیکھ رہا تھا مگر اسے مطلوبہ چیز نظر نہیں آئی تھی۔ یہ ہال بہت بڑا تھا اور یہاں بے شمار اشیا پانی میں تیر رہی تھیں ان میں اپنی مطلوبہ چیز تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ آکسیجن کی کمی ہر گزرتے لمحے شدید ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اب تاریکی بار بار اس کے ذہن پر حملہ کر رہی تھی۔ ایک بار وہ غشی میں ڈوبا تو اسے لگا کہ وہ پھر نہیں ابھر سکے گا لیکن پھر وہ چونکا اور اس نے راستہ دکھانے والے کو پکارا۔

''جب راستہ دکھایا ہے تو منزل تک بھی پہنچا دے۔''

اس بار بھی دعا ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ اسے مطلوبہ چیز نظر آگئی اور وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے کیتی کی لاش پکڑ کر اسے پلٹا اور اس کے ریزرو آکسیجن سلنڈر کا وال بند کر کے اس پر لگا پائپ الگ کر کے اس پر اپنے ہیلمٹ کا پائپ لگایا پھر اس نے سلنڈر کا وال کھولا اور آخر میں پائپ کا وال کھولتے ہی حیات بخش آکسیجن پھیپھڑوں تک پہنچی تو وہ جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔ دیوانہ وار کئی گہرے سانس لے کر اس نے اپنے حواس بحال کیے اور پھر سلنڈر کیتی کی پشت سے اتار کر اسے اپنی پشت پر باندھا۔ خالص آکسیجن نے اس کی توانائی بحال کر دی تھی۔ جب تک وہ اس چکر میں رہا اپنے زخم اور پھٹ جانے والے سوٹ سے بھی غافل رہا تھا اب اسے احساس ہوا کہ پانی سوٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ صرف ایک انچ کا سوراخ تھا اور جس جگہ تھا وہاں سوٹ سختی سے جلد سے چپکا ہوا تھا اگر یہی سوراخ کسی ڈھیلی جگہ ہوتا تو پانی اندر گھس کر سوٹ ناکارہ کر چکا ہوتا اور وہ جسم پر پڑنے والے دباؤ سے مر جاتا۔

اچانک ہال کے سوراخ والے حصے میں تیز روشنی ہوئی اس نے پلٹ کر دیکھا کوئی تارپیڈو سمیت اندر آیا تھا مگر اس نے اندر آتے ہی تارپیڈو بند کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی روشنی بھی بجھ گئی تھی۔ سمیر کا دل دھڑک اٹھا۔ کون ہو سکتا تھا۔ تارپیڈو آشی کے پاس تھا مگر ایرو شور والا اسے نشانہ بنا کر تارپیڈو حاصل کر سکتا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ سمیر نے تارپیڈو کی روشنی دیکھتے ہی اپنے سوٹ کی روشنیاں بجھا دی تھیں۔ پھر وہ سست روی سے اس طرف بڑھا جہاں اس کے اندازے کے مطابق تارپیڈو والا

موجود تھا۔ تاریکی میں حرکت کی وجہ سے مختلف چیزیں اس سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہر بار وہ چونک جاتا اور پھر ٹٹول کر دیکھتا تھا۔ ایک بار اس نے ملبا ہٹایا تو اسے عرشے کے سوراخ سے باہر روشنی دکھائی دی۔ یہ کسی روبوٹ کی روشنی نہیں تھی بلکہ کسی ڈائیور کے سوٹ کی روشنی تھی۔ وہ سوراخ کی طرف بڑھا تھا مگر اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے کوئی چیز آ کر بہت قوت سے سوراخ سے ٹکرائی اور وہ تقریباً بند ہو گیا۔ سمیر نے اس چیز کو ٹٹولا تو وہ کسی روبوٹ ثابت ہوا تھا۔ سوراخ میں بہت نہیں جگہ باقی تھی جس سے باہر کی ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ سمیر مضطرب ہو گیا۔ باہر موجود فرد باہر آنے کے اس واحد راستے کو بند کر رہا تھا۔ اگر یہ بند ہو جاتا تو وہ یہیں پھنس جاتا دوسرا فرد یقیناً آشی تھی اور باہر موجود فرد ایروشوز والا حملہ آور تھا۔ سمیر نے زور لگایا مگر یہ روبوٹ وزنی تھا اور وہ آڑے ترچھے سوراخ میں پھنسا ہوا تھا۔ سمیر کو علم نہیں تھا کہ جان پال نے باہر رسی بھی باندھ دی تھی اور اب اسے ہٹایا جانا ممکن نہیں تھا۔ سمیر ایک ہاتھ سے زور لگا رہا تھا کہ اچانک اسے آشی کا خیال آیا۔ وہ یہاں تھی اور دونوں مل کر کوشش کرتے تو راستہ کھولا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے لباس کی روشنیاں آن کر لیں۔ فوراً ہی نیچے سے اس کا ردِعمل ہوا اور آشی جو اس سے چند گز کی دوری پر تھی اور اسے کوشش کرتا دیکھ رہی تھی، اس نے بھی اپنے لباس کی روشنیاں آن کر لیں اور اس کی طرف بڑھی۔ نزدیک آ کر اس نے سمیر کو دیکھا تو مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اس سے لپٹ گئی... پھر اس نے سمیر کا ہاتھ اپنی پسلی پر دیکھا تو اشارے سے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے؟"

سمیر نے ایک لمحے کو ہاتھ ہٹا کر زخم دکھایا اور پھر ہاتھ رکھ لیا۔ آشی فکر مند ہو گئی تھی۔ سمیر نے لکھنے والے پیڈ پر لکھا۔ "ایک حملہ آور باہر ہے اس نے راستہ بند کر دیا ہے ارجن پتا نہیں کہاں گیا؟"

"وہ اوپر ہے اس کے بازو پر چاقو لگا تھا مگر وہ تارپیڈو سے کر بھاگ نکلا۔"

"اب ہم کیسے نکلیں؟ اسے ہٹانا ہوگا۔" سمیر نے لکھا اور پھر دونوں مل کر اس روبوٹ کو خلا سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے مگر جلد انہیں لگا وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تب آشی نے لکھا۔

"ہمیں کوئی اور راستہ تلاش کرنا ہوگا۔"

سمیر کے پاس پچاس منٹ کی آکسیجن تھی جبکہ آشی کے پاس ایک گھنٹا اور چالیس منٹ کی آکسیجن تھی۔ اچانک اسے خیال آیا، اس نے لکھا۔ "میرا دوسرا آکسیجن سلینڈر خالی نکلا۔"

آشی چونکی۔ "یہ ذمے داری ارجن کی ہے کہ وہ نیچے آنے سے پہلے ہر سلینڈر کو چیک کرے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ بھی ان لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ ورنہ ان کو کیسے پتا چلا کہ ہم زیرِ آب آئے ہیں۔" سمیر نے لکھا۔ "مجھے یقین ہے اس کے پیچھے امریکی ہیں۔"

اب آشی کو خیال آیا۔ "یہاں شپ منٹ ہے؟"

"نہ تو یورینیم ہے اور نہ وہ لکڑی کے بکس اور نہ ہی گائیگر نے یورینیم کی نشان دہی کی۔"

"وہ جتنی یورینیم تھی گائیگر کو سو فٹ سے زیادہ دوری سے اس کی نشان دہی کر دینی چاہیے تھی۔"

"اس کا مطلب ہے یورینیم کی شپ منٹ یو کی آئیوا پر نہیں تھی اسے یہاں سے لے جایا گیا تھا۔" سمیر نے کہا۔

"ممکن ہے یو کی آئیوا نے جرمن یو بوٹ کو شپ منٹ دے دی ہو لیکن وہ کہیں بعد میں اتحادیوں کا نشانہ بن کر ڈوب گئی ہو۔"

"یورینیم کو جہنم میں ڈالو یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔"

"اس ہال سے دو راستے نکل رہے ہیں، ایک آگے سے بند ہے اور دوسرا میں نے چیک نہیں کیا۔"

"آؤ اسے چیک کرتے ہیں۔" آشی نے کہا اور سمیر اسے لے کر دوسری راہداری کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

جان پال نے چمنی میں داخل ہونے سے پہلے اپنی آکسیجن کا حساب کیا اس کے پاس چالیس منٹ کی آکسیجن تھی، وہ اپنا ایک سلینڈر استعمال کر چکا تھا اور اب دوسرا سلینڈر استعمال میں تھا۔ اس نے عرشے والا خلا بند کر دیا تھا اور اس راستے سے وہ دونوں باہر نہیں آ سکتے تھے۔ اس کا امکان تھا کہ وہ وہیں مر جائیں گے۔ مگر اس کا امکان بھی تھا کہ وہ چمنی والا راستہ تلاش کر لیں اور یہاں سے نکل جائیں۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ انہیں حقیقت کا علم ہو گیا تھا اور وہ بچ کر نکل جاتے تو اس کے دادا کا راز راز نہ رہتا۔ اس کا مشن ناکام ہو جاتا اور اس کے بعد وہ ان دونوں کو قتل کر کے بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ان دونوں کو یہیں روکنا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر چمنی میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنا خالی ہو جانے والا سلینڈر اتار دیا تھا یوں وزن کم ہونے سے وہ زیادہ آسانی

سے حرکت کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے لباس کی روشنیاں بند کر کے ایروشوٹر کی ٹارچ آن کر لی اور اس کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔

چمنی سے اندر آ کر اس نے سوچا کہ اسے کس طرف جانا تھا۔ چمنی میں ہونے والا سوراخ دوسرے فلور پر تھا اور اسے نیچے جانا تھا۔ وہ سیڑھیوں پر سے تیرتا ہوا نیچے آنے لگا۔ مگر وہ کچھ ہی نیچے آیا تھا کہ اسے ایک راہداری میں روشنی محسوس ہوئی اور وہ رک گیا۔ یہ وہی راہداری تھی جو عرشے کے نیچے والے ہال میں نکلتی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی ٹارچ بجھا دی اور تاریکی میں تیرتا ہوا اس راہداری کی طرف بڑھنے لگا جس سے روشنی آ رہی تھی۔ یقیناً یہ روشنی سمیر اور آشی کے سوٹ کی تھی۔ جان پال مسکرانے لگا انہوں نے نہ صرف اس کی رہنمائی کر دی تھی بلکہ اب اس کا کام بھی آسان ہو گیا تھا۔ اسے انتظار کرنا تھا جیسے ہی وہ نمودار ہوتے وہ انہیں ایروشوٹر کا نشانہ بناتا اور یہاں سے نکل جاتا۔ اس کے بعد یوکی آئیوا اور ان کی لاشیں دریافت بھی ہو جاتیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا راز راز رہتا۔ یہی دو فرد تھے جو اس راز کو پوری طرح جان گئے تھے۔

☆☆☆

سمیر اور آشی آگے بڑھ رہے تھے۔ سمیر نے اپنے سوٹ کی روشنیاں بجھا دی تھیں کیونکہ آشی کے سوٹ کی روشنیاں کافی تھیں۔ اس کی نظر راہداری کے آخر میں نظر آنے والے تاریک خلا پر مرکوز تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے دوسری طرف روشنی ہوئی ہو۔ روشنی واضح تھی مگر چند سیکنڈ رہی اور پھر بجھ گئی۔ سمیر نے عجلت میں آشی کو روکا اور نوٹ پیڈ پر لکھ کر دکھایا۔ ''آگے کوئی ہے اس نے روشنی کی تھی پھر بجھا دی تم بھی روشنی بند کر دو ہمیں واپس ہال میں جانا ہوگا۔''

آشی نے تحریر پڑھتے ہی روشنی بجھا دی اور وہ واپس ہال کی طرف جانے لگی۔ تاریکی میں انہیں ٹٹول کر آگے جانا پڑ رہا تھا۔ وہ ہال تک پہنچے تھے کہ راہداری کے دوسرے سرے سے روشنی نظر آنے لگی۔ حملہ آور اب روشنی کر کے انہیں تلاش کرنے آ رہا تھا۔ سمیر نے آڑ میں ہوتے ہوئے روشنی کی اور آشی سے لکھ کر کہا۔ ''ہمیں الگ ہونا ہوگا تب ہی ہم اس سے بچ سکتے ہیں۔ ایک ساتھ رہ کر نظروں میں آنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ مجھے اس کا مقابلہ کرنا ہوگا لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

جواب میں آشی نے چاقو نکال کر اسے تھما دیا۔ سمیر نے لکھا۔ ''سنو تم .... اوپر چلی جاؤ میں سوراخ کی طرف جاتا ہوں۔ وہاں میں اسے متوجہ کر کے اپنی طرف بلاؤں گا تمہارے پاس موقع ہوگا۔ تم اسی راہداری سے جانا اور دیکھنا باہر نکلنے کا راستہ کس طرف ہے؟''

آشی نے نفی میں سر ہلایا۔ سمیر نے لکھا۔ ''پلیز بحث مت کرو وقت نہیں ہے جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔''

سمیر نے لکھتے ہی سوٹ کی روشنیاں بجھا دیں اور آشی سے جدا ہو کر عرشے کے بند ہو جانے والے سوراخ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آشی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا یا نہیں۔ سمیر نے چاقو جیب میں رکھا اور اندازے سے عرشے کے سوراخ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ہال کے آخری حصے میں پہنچا تھا کہ حملہ آور راہداری سے نمودار ہوا۔ سمیر نے اپنے سوٹ کی روشنیاں ایک لمحے کے لیے آن کیں اور فوراً ہی بند کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے چھت کی طرف گیا۔ یہاں تھرموکول جیسی چیزیں تیر رہی تھیں۔ وہ ان میں شامل ہو گیا اسے امید تھی کہ اسے یہاں دیکھنا آسان نہیں ہوگا اگر حملہ آور دھوکا کھا گیا تو اس پر حملہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ سمیر کی گھڑی کے مطابق اس کے پاس ابھی چالیس منٹ کی آکسیجن تھی۔ اسے لازمی اس دوران میں یہاں سے نکل جانا تھا۔ حملہ آور نے روشنی دیکھ لی تھی اور وہ تیزی سے آگے آ رہا تھا۔

سمیر کی خواہش تھی کہ آشی یہاں سے نکل جائے۔ وہ بچ سکتی تھی اور اوپر سے مدد بھی لا سکتی تھی۔ سمیر ٹارچ کی روشنی سے بچنے کے لیے چیزوں کی آڑ لے رہا تھا۔ حملہ آور نزدیک آ گیا تھا۔ سمیر اب زخم نہیں دبا سکتا تھا اس نے اسے تقدیر پر چھوڑا اگر اس کے نصیب میں زندگی ہوئی تو وہ دباؤ سے بھی نہیں مرے گا اور موت آئی ہوگی تو وہ ویسے ہی مر جائے گا۔ اس نے چاقو نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا مگر اس کا بٹن نہیں کھولا تھا۔ وہ چیزوں کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا اور غیر محسوس انداز میں حملہ آور کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے ایروشوٹر پر لگی ٹارچ گھما رہا تھا غالباً اسے بھی خدشہ تھا کہ اس پر عقب سے حملہ نہ ہو۔

سمیر اب اس کے قریب تھا اور اس کی کوشش تھی کہ تیزی سے حرکت نہ کرے جس سے وہ ہوشیار ہو جائے۔ ساتھ ہی سمیر اس کے عقب میں آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بار بار گھوم رہا تھا۔ ایک بار اس نے اچانک ٹارچ کا رخ اوپر بھی کیا مگر اتفاق سے سمیر اس کے سر کے عین عقب میں تھا اگر وہ ذرا سا گھومتا تو اسے دیکھ لیتا اور ایروشوٹر کا رخ بھی سمیر کی طرف ہوتا اسے صرف ٹریگر دبانا پڑتا۔ اس نے

ٹارچ نیچے کی اور پھر واپس راہداری کی طرف جانے لگا۔ اب سمیر کے لیے موقع تھا، وہ تیزی سے اس کے پیچھے آیا لیکن اس سے پہلے وہ وار کرتا، اچانک حملہ آور پلٹا۔

☆☆☆

جان محسوس کر رہا تھا کہ اس کا واسطہ بہت چالاک لوگوں سے پڑا ہے۔ اس نے انہیں کمزور اور ناتجربے کار سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ اس کے پاس وقت کم ہوتا جا رہا تھا اور اب آکسیجن صرف تیس منٹ کی رہ گئی تھی۔ اتنی آکسیجن کے ساتھ واپس جانا مشکل لگ رہا تھا لیکن یہ مسئلہ نہیں، ایک بار وہ انہیں ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ ان کے آکسیجن ٹینک بھی حاصل کر سکتا تھا۔

وہ راہداری سے ہوتا ہوا ہال میں نمودار ہوا تو ایک لمحے کو آخری سرے پر اسے روشنی دکھائی دی جو فوراً بجھ گئی۔ کئی بار اسے شبہ ہوا کہ وہ اس کا شکار ہے لیکن روشنی مرکوز کرنے پر وہ کوئی چیز ثابت ہوتی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا تھا، روشنی کی جھلک دکھا کر اسے یہاں بلایا گیا تھا اور اب وہ لوگ یقیناً راہداری والے راستے سے فرار کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پلٹا اور تیزی سے راہداری کی طرف جانے لگا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ بروقت پلٹا۔ سمیر عین اس کے عقب میں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے تھا اور اس میں چاقو دبا ہوا تھا۔ جان نے وہ تھام لیا اور ایروشوٹر اس کی طرف کرنا چاہا لیکن سمیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں میں جدوجہد ہو رہی تھی۔ یہ فنا و بقا کی جنگ تھی جو ہارتا وہ زندگی ہار جاتا اس لیے دونوں پوری کوشش کر رہے تھے۔

دونوں پیر چلا کر ایک دوسرے کو ضرب پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر پانی میں سلوموشن میں چلتی لاتوں سے کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تھا، خطرہ چاقو اور ایروشوٹر سے تھا۔ سمیر محسوس کر رہا تھا کہ اپنے زخم کی وجہ سے وہ کمزور پڑ رہا تھا اور اگر اسی طرح زور آزمائی ہوتی رہی تو وہ شکست کھا جائے گا۔ یہ بات جان نے بھی محسوس کر لی البتہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سمیر زخمی ہے۔ سمیر کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا اچانک اس نے ایروشوٹر والا ہاتھ چھوڑ دیا اور جان سے لپٹ گیا۔ اب جان کا ایروشوٹر والا ہاتھ اس کے عقب میں تھا اور اسے ایک فٹ سے زیادہ طویل ایروشوٹر گھما کر استعمال کرنے میں یقیناً دشواری پیش آتی اس کے باوجود وہ کوشش کر رہا تھا عین اسی لمحے سمیر نے اس کے پائپ کا وال بند کر دیا... اور ساتھ ہی ایروشوٹر والے ہاتھ کا بازو اپنے جسم سے دبا لیا۔

آکسیجن کی سپلائی رکی تو جان بدحواس ہو گیا۔ اس نے ایروشوٹر استعمال کرنے کی کوشش تیز کی مگر یہ آسان نہیں تھا پھر بھی اس نے ٹریگر دبا دیا سمیر کو جھٹکا لگا مگر اس نے گرفت نرم نہیں کی تھی۔ جان اب آکسیجن کے لیے تڑپ رہا تھا۔ جدوجہد کے دوران ویسے ہی سانس تیز چل رہا تھا۔ وہ بار بار ایروشوٹر کا ٹریگر دبا رہا تھا اس امید میں کہ کوئی نہ کوئی تیر سمیر کے جسم میں اتر جائے گا۔ مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا اس نے سمیر کا چاقو والا ہاتھ چھوڑا اور اپنے پائپ کا وال کھولنے کی کوشش کی اسی لمحے سمیر نے ہاتھ اوپر لاتے ہوئے چاقو سے ربر کا پائپ ہی کاٹ دیا۔ جان نے تڑپ کر اسے دھکیلا تو وہ اس سے الگ ہو گیا۔ جان کے سلنڈر کی گیس تیزی سے ضائع ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اب بچنا محال ہے۔ اس نے دانت پیس کر ایروشوٹر سمیر کی طرف کیا... چند فٹ کے فاصلے پر نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جان نے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

سمیر نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر کچھ نہیں ہوا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو حملہ آور دیوانہ وار ایروشوٹر کا ٹریگر دبا رہا تھا لیکن اب اس میں کوئی تیر... باقی نہیں رہا تھا۔ سمیر نے قلابازی کھائی اور تیزی سے اوپر چلا گیا۔ وہ راہداری کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ آکسیجن پریشر سے نہیں آ رہی ہے اور اس کا پریشر ہر گزرتے لمحے کم ہو رہا تھا اس نے پائپ چیک کیا تو پتا چلا ایروشوٹر کے تیر نے اس میں سوراخ کر دیا تھا اور اس کے راستے گیس تیزی سے خارج ہو رہی تھی۔ راہداری کے سرے تک جاتے جاتے گیس نہ ہونے کے برابر رہ گئی اور اب پائپ میں پانی آنے لگا تھا اگر پانی اس کے ہیلمٹ میں بھر جاتا تو اس کا بچنا محال تھا۔ اس نے ہیلمٹ کے ساتھ لگا ہوا وال بند کر دیا مگر اب بھی بچنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ آکسیجن کی کمی سے اس کے ذہن پر پھر تاریکی کا حملہ ہونے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جانا تھا اور دوسرا راستہ کس طرف تھا جہاں سے حمزہ اور اندر آیا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس رک گیا۔ اس نے راستہ دیکھنے کے لیے روشنیاں آن کر لی تھیں مگر اب اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سیڑھیوں کی ریلنگ تھام کر اوپر جا رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

آشی، سمیر سے الگ ہوئی تھی لیکن اس کا اوپر جانے کا ارادہ نہیں تھا جیسے ہی حملہ آور ہال میں آیا، وہ خاموشی سے راہداری میں داخل ہوگئی اور تیزی سے سیڑھیوں تک آئی یہاں آکر اس نے اپنے سوٹ کی روشنیاں آن کرلی تھیں کیونکہ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی اور اسے راستہ تلاش کرنا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اوپری فلور پر آئی یہاں کچھ دیر چکرانے کے بعد اسے چمنی والا راستہ دکھائی دیا اور وہ چمنی سے نکل کر باہر آگئی۔ نیچے تاریکی گہری ہو چکی تھی مگر اوپر روشنی تھی۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ اوپر جا کر مدد لائے مگر پھر اس کا دل نہیں مانا اور وہ واپس آگئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ہال میں کیا ہوا تھا۔ سمیر زخمی تھا اور اس کے پاس صرف چاقو تھا جبکہ اس کا دشمن ایروشوٹر سے مسلح اور بالکل ٹھیک تھا۔ آشی کو رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ سمیر نے کیسے اس کا مقابلہ کیا ہوگا اگر اسے کچھ ہوا تو......؟ یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا کر تیزی سے نیچے آئی اور پھر رک گئی۔ اسے سیڑھیوں کے پاس ایک آدمی نظر آیا، وہ بے جان سے انداز میں تیر رہا تھا۔ آشی دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے پاس آگئی اور اسے سیدھا کیا تو اس کی چیخ نکل گئی، وہ سمیر تھا۔ اس نے بے تابی سے اسے ٹٹولا مگر اس کی سانس رکی ہوئی تھی۔ اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے آشی نے اس کا معائنہ کیا تو فوراً ہی اسے سمیر کے آکسیجن پائپ کا کٹ نظر آگیا۔ اس کا سلینڈر خالی ہوگیا تھا۔ آشی نے جلدی سے اپنے ہیلمٹ سے لگا پائپ الگ کیا اور اسے سمیر کے ہیلمٹ سے منسلک کردیا اب اس میں آکسیجن جا رہی تھی مگر وہ سانس نہیں لے رہا تھا۔ آشی نے اس کے سینے پر مکے مارے۔ ہر بار وہ مُکا مار کر دل ہی دل میں التجا کرتی تھی۔

"سامی سانس لو... سامی پلیز سانس لو۔"

ہر مکے پر جب سمیر کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آتا تو آشی کے اندر امید دم توڑتی جاتی تھی۔ پانی کے اندر مکے میں ویسے ہی زور نہیں تھا۔ لیکن پھر ایک مکے پر سمیر کھانسا اور اور سانس لینے لگا۔ آشی خوش ہوگئی۔ اگرچہ ایک منٹ میں اس کی سانس بھی رک رہی تھی۔ سمیر نے آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھا پھر وہ سمجھ گیا کہ آشی نے اسے کیسے بچایا ہے۔ اس نے چند گہرے سانس لیے اور پائپ نکال کر آشی کو دیا۔ اس نے پائپ لگا کر سانس لی اور اشارے سے اسے بتایا کہ اس نے راستہ تلاش کرلیا ہے۔

آشی اسے لے کر آگے بڑھی۔ وہ چمنی کے راستے باہر نکلے اور باری باری پائپ لگا کر سانس لیتے رہے۔ جیسے جیسے وہ اوپر جارہے تھے، روشنی بڑھ رہی تھی۔ وہ سطح سے باہر نکلے تو انڈونیشیا کی پولیس کا ایک ہیلی کاپٹر اور ایک میری ٹائم سیکیورٹی کا شپ جو اسی علاقے میں گشت کر رہا تھا، آچکا تھا۔ کپتان لی اور اس کے ساتھی عرشے پر ان کے منتظر تھے۔ جیسے ہی وہ پانی سے نکلے ان کے چہرے کھل اٹھے۔ انہیں جلدی سے اوپر جہاز کے کلینک پہنچایا گیا جہاں ارجن موجود تھا۔ انہیں دیکھ کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ سمیر نے طنز کیا۔ "مجھے زندہ دیکھ کر حیران ہورہے ہو حالانکہ تم نے میرا دوسرا آکسیجن ٹینک خالی رکھا تھا۔"

"یہ بھی ان لوگوں سے ملا ہوا تھا۔" آشی نے سرد لہجے میں کہا۔ "خیر پولیس اس سے خود پوچھ لے گی۔"

ارجن کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، اس نے دم سادھ لیا تھا۔ اگلے دن انڈونیشیا کے حکام نے یوکی آئیوا کے ڈھانچے تک رسائی حاصل کرکے وہاں موجود جان پال اور کینی کی لاشیں حاصل کرلی تھیں۔ کینی، جان پال کے ہاتھوں سے مارا گیا تھا اور جان پال کی موت دم گھٹنے سے ہوئی تھی۔ اسی دن امریکی حکام بھی معاملے میں شامل ہوگئے اور بالآخر تصفیہ اس پر ہوا کہ جان پال اور کینی کی لاشیں متعلقہ ملکوں کے حوالے کردی جائیں گی۔ امریکی آشی اور سمیر سے کوئی تعرض نہیں کریں گے ویسے بھی ان کے خلاف کوئی چارج نہیں تھا۔ ارجن کے خلاف بھی پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا نہیں تھا۔ اس پر آکسیجن سلینڈر چیک نہ کرنے پر غفلت کا الزام تھا۔ لیکن اس پر ایکسپلور ایشیا کی مالک کورین کمپنی ہی اس کے خلاف کارروائی کرسکتی تھی۔ یوکی آئیوا سے یورینیم نہیں ملی تھی۔ سمیر کو ڈاکٹر سوتر نے ابتدائی طبی امداد دے دی تھی۔ چاقو چار انچ تک اندر گھسا تھا مگر خوش قسمتی سے اس نے کسی اہم عضو یا شریان کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ احتیاطاً جکارتہ کے ایک اسپتال میں بھی اس کا معائنہ ہوا تھا۔ وہ اور آشی پولیس ہیلی کاپٹر میں نزدیکی زمین تک پہنچے اور پھر ایک چارٹرڈ طیارے نے انہیں جکارتہ پہنچا دیا تھا۔

سمیر اسپتال میں تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا آپریشن ہوا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو آشی اس کے بیڈ کے ساتھ سر لگائے سو رہی تھی وہ ساری رات یونہی سوتی رہی تھی۔ سمیر نے آہستہ سے اس کے ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرا تو وہ جاگ گئی اور خمار آلود نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت چمک رہی تھی اور اس چمک نے سمیر کو مجبور کردیا کہ وہ اعتراف میں پہل کرے۔ اس نے آشی کا ہاتھ تھام لیا۔

"آشی میں چاہتا ہوں ہر صبح جب میری آنکھ کھلے تو تم

میرے پاس ہو، میرے پہلو میں۔"

آشی نے آگے بڑھ کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا اور گنگنائی۔ "میں بھی یہی چاہتی ہوں سامی۔"

سمیر کے ہاتھ بے اختیار اس کے گرد حمائل ہو گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا مشن کامیاب ہوا ہے یا ناکام لیکن وہ ناکام نہیں رہا تھا، اس نے اپنی محبت پالی تھی۔

☆☆☆

بوڑھا جان پال ساکت بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے تابوت میں اس کے پوتے کی لاش تھی۔ ایک دن پہلے اسے بتایا گیا تھا کہ جان پال کی لاش آ رہی ہے۔ وہ ایک مشن کے دوران میں مارا گیا تھا اور یہ بات خفیہ رکھی گئی تھی۔ بوڑھا جان پال جانتا تھا کہ اس کے پوتے نے کس مشن میں جان دی تھی۔ وہ یقیناً ناکام رہا تھا اسی لیے جان سے گزر گیا۔ جان پال کی لاش تیاری کے مراحل سے گزر کر تدفین کے لیے تیار تھی۔ کچھ دیر بعد اسے اس کی آخری آرام گاہ لے جایا جاتا۔ وہ تابوت والے کمرے میں اکیلا تھا۔ تدفین میں آنے والے اور کیئر ٹیکر عملہ دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ جان پال سوچ رہا تھا کہ کیا ہوا ہوگا؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اچانک اس کی ملازمہ اندر آئی اور اس نے کارڈلیس اسے تھمایا اور آہستہ سے بولی۔

"جاپان سے کوئی رین ہیروکی ہے۔ وہ آپ سے تعزیت کرنا چاہتا ہے۔"

رین ہیروکی کا نام سن کر وہ حرکت میں آیا، اس نے کارڈلیس اور ملازمہ کو دیکھا۔ وہ اشارہ سمجھ کر خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔ جان پال نے ریسیور کان سے لگایا اور آہستہ سے بولا۔ "تم کامیاب رہے۔"

"کامیابی ناکامی کا جو پیمانہ تمہارا ہے، وہ میرا نہیں ہے۔" رین ہیروکی نے جواب دیا۔ "مجھے تمہارے پوتے کا افسوس ہے۔"

"تم حقیقت جان گئے ہو؟"

"شبہ مجھے پہلے ہی تھا لیکن اب تصدیق ہو گئی۔ تم نے مجھے اور میری قوم کو دھوکا دیا۔ تم جرمن ہونے کے باوجود امریکیوں سے مل گئے اور ان کے ایٹمی پروگرام کے لیے کام کرنے لگے۔ تم نے دھوکے سے ہم جاپانیوں سے یورینیم منگوائی کیونکہ تم جان گئے تھے، میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ تم ایک طرف اپنی قوم کو ایٹم بم کا دھوکا دیتے رہے اور دوسری طرف جاپانیوں کو دھوکا دیا۔ تمہاری مدد سے امریکیوں نے اپنے پروجیکٹ کے لیے یورینیم حاصل کی۔ میں نہیں جانتا کہ امریکیوں نے یورینیم یوکی آئیوا سے کیسے حاصل کی مگر جاپان سے بھیجی جانے والی یورینیم امریکا کے پاس پہنچ گئی۔ جیسے ہی یورینیم پہنچی تم بھی جرمنی سے فرار ہو کر امریکا پہنچ گئے۔"

"اسے درست کر لو۔" بوڑھے جان پال نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں یورینیم کی جاپان سے روانگی سے پہلے امریکا پہنچ گیا تھا۔"

"یورینیم کیسے امریکا پہنچی؟"

"جرمن یو بوٹ تباہ کر دی گئی تھی اور امریکا نے اپنی ایک آبدوز کو جرمن یو بوٹ کی شکل دی۔ اس پر سارا عملہ جرمنوں جیسا تھا وہ جرمن زبان بول رہے تھے اس لیے جاپانی دھوکا کھا گئے اور یورینیم ان کے حوالے کر دی۔"

"اس کے بعد انہوں نے یوکی آئیوا کو تارپیڈو کر دیا۔" رین ہیروکی نے تلخی سے کہا۔ "بچ جانے والے ہر فرد کو مار دیا گیا تاکہ یہ راز راز رہے۔"

"اب تم جان گئے ہو، تمہارا کیا ارادہ ہے؟" جان پال نے کہا۔ "ویسے مجھے اب بھی یقین ہے تم اس راز کو منظرِ عام پر نہیں لاؤ گے۔"

"اس یقین کی وجہ؟"

"یوکی آئیوا سے آنے والی پیٹیوں سے صرف ایک ٹن یورینیم نکلی باقی پیٹیوں میں کچھ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ باقی انیس ٹن یورینیم کہاں گئی۔ مجھے یقین ہے باقی یورینیم تم نے چھپائی ہوگی۔ ہمیں جو ملی اس سے صرف ایک ایٹم بم بن سکا تھا اور وہ ہیروشیما کے حصے میں آیا باقی بم پلوٹونیم سے بنانے پڑے تھے۔ یہی وجہ تھی ہمارا پروجیکٹ تاخیر سے مکمل ہوا۔ رین ہیروکی اپنی قوم کی تباہی کا سامان تم نے خود مہیا کیا تھا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اس تباہی نے اس بے مقصد جنگ کو ختم کر دیا جو میرے ملک کے نوجوانوں کو کھا رہی تھی۔ ہم دوبارہ اٹھے اور آج جاپان پھر سے ایک طاقت ہے۔ جلد وہ وقت آئے گا جب جاپان اپنی پالیسی تبدیل کرے گا اور ہم جنگی قوت بھی بنیں گے تب وہ یورینیم ہمارے کام آئے گی جو میں نے چھپالی تھی۔ وہ اب جاپان کا ایک مقدس راز ہے جس سے دنیا آنے والے وقتوں میں واقف ہوگی۔" رین ہیروکی نے کہا اور کال کاٹ دی۔ جان پال نے سکون کا طویل سانس لیا۔ بے شک اس نے اپنا واحد وارث بھی گنوا دیا تھا لیکن اب وہ عزت سے مر سکتا تھا اور وہ جانتا تھا، موت اب اس سے زیادہ دور نہیں ہے۔

اس واردات کی سراغرسی جس میں جرم سے مجرم تک سب عیاں تھا

کامیاب منصوبہ بندی کے بعد بھی کئی مراحل درپیش ہوتے ہیں... جو ان مرحلہ وار گتھیوں سے بہ آسانی نکل جائے وہی کامیاب منصوبہ ساز گردانا جاتا ہے... اس نے ہر طرف نظر رکھی تھی... مگر ایک معمولی غلطی اسے لے ڈوبی...

ثبوت

سلیم انور
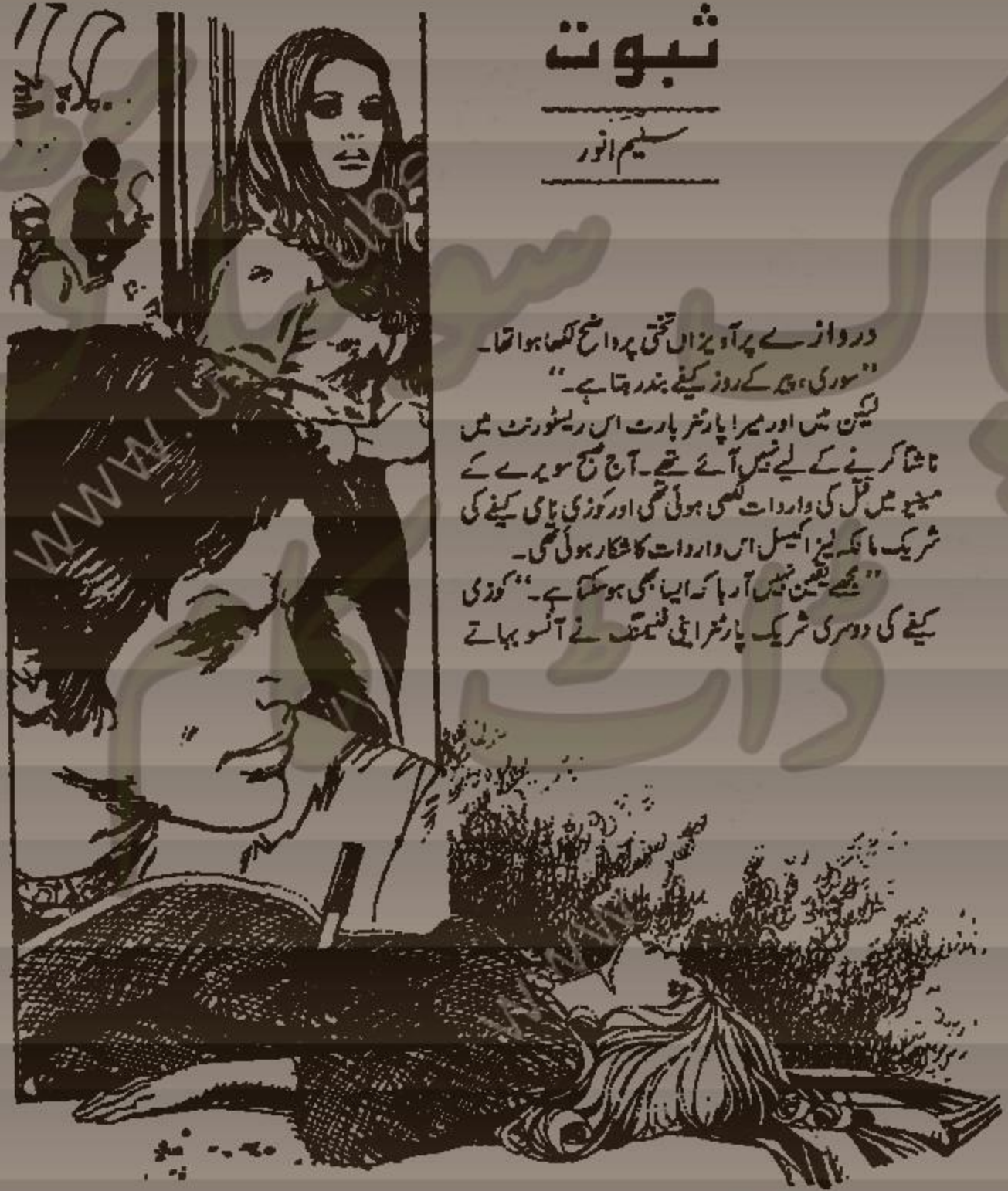
دروازے پر آویزاں تختی پر واضح لکھا ہوا تھا۔

''سوری، پیر کے روز کیفے بند رہتا ہے۔''

لیکن میں اور میرا پارٹنر بارٹ اس ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ آج صبح سویرے کے میمو میں قتل کی واردات لکھی ہوئی تھی اور کوزی نامی کیفے کی شریک مالکہ لیز اکیسل اس واردات کا شکار ہوئی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔'' کوزی کیفے کی دوسری شریک پارٹنر اینی فنمتھ نے آنسو بہاتے

ہوئے کہا۔ ''آج ہمارے کیفے میں تعطیل ہوتی ہے لیکن ہمیں اپنے بزنس کے سلسلے میں ایک میٹنگ کے لیے یہاں صبح سویرے آنا تھا لیکن اب...'' اس نے اس لاش سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا جو ریسٹورنٹ کے کچن کے فرش پر پڑی دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا تم اس چاقو کو پہچانتی ہو جس سے تمہاری پارٹنر کو قتل کیا گیا ہے؟'' میرے ساتھی ہارٹ نے پوچھا۔

''میں اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی لیکن ہاں ریک میں رکھے ہوئے چاقوؤں میں سے ایک غائب ہے۔ جو چاقو لیزا کے وجود میں اترا ہوا ہے اس کا دستہ بالکل دیگر چاقوؤں کی طرح ہے۔''

اتنے میں ایک باوردی پولیس مین نے کمرے کے دروازے سے جھانکا اور بولا۔ ''کوئی شخص باہر کھڑا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ یہاں کا بزنس منیجر ہے۔''

''اوہ!'' اینی فلیمنگ تقریباً چیخ پڑی۔ ''وہ ہاروے ہوگا۔ ہاروے اسٹارک! خدا کا شکر ہے کہ وہ یہاں آگیا۔''

ہم باوردی پولیس مین کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ایریا کی طرف چل پڑے۔

''ہاروے!'' اینی فلیمنگ نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''بے چاری لیزا! وہ مرچکی ہے۔''

''میں نے سن لیا ہے۔'' اس دراز قامت شخص نے کہا۔ ساتھ ہی ایک رومال کی مدد سے اپنے بارش میں بھیگے ہوئے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے خشک کرنے لگا۔ ''پولیس مین نے مجھے بتایا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ کاش میں جلدی یہاں آجاتا۔ لیکن اس بارش کے باعث ٹریفک کی روانی بے حد متاثر ہوئی ہے۔ میں بھی اسی وجہ سے لیٹ ہوگیا۔''

''تو آج صبح کی میٹنگ میں تمہیں بھی شریک ہونا تھا؟'' میں نے اس دراز قامت اسٹارک سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اسٹارک نے جواب دیا پھر اینی کی جانب گھوم گیا۔ ''کیا چوری کی کوئی علامات تو نہیں ہیں، اینی؟''

''نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی چیز غائب ہے۔''

میں نے اپنی دستی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ ''میڈم، ہمیں یہاں آئے ہوئے دس منٹ ہوچکے ہیں۔'' میں نے اینی سے کہا۔ ''تم کس وقت یہاں پہنچی تھیں؟''

''آٹھ بج کر کچھ منٹ پر۔ لیزا کی کار پارکنگ میں موجود تھی۔ جب وہ مجھے دفتر میں نظر نہیں آئی تو میں کچن میں چلی گئی اور... اوہ! ایسی حرکت بھلا کون کرسکتا ہے؟''

''بالکل یہی سوال میں خود بھی اپنے آپ سے کررہا تھا۔'' اسٹارک نے کہا۔ ''اور میرے ذہن میں جس فرد واحد کا خیال آرہا ہے، وہ مارٹن پارکر ہے۔''

یہ نام سنتے ہی اینی فلیمنگ کے حلق سے ایک کراہ سی نکل گئی اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' پھر وہ ہارٹ اور میری طرف گھوم گئی۔ ''مارٹن پارکر ہمارے باورچیوں میں سے ایک ہے... ایک تھا۔ لیزا نے کل اسے نوکری سے برخاست کردیا تھا۔''

''کیوں؟'' ہارٹ نے تیزی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ کھانوں کے آرڈرز میں گڑبڑ کردیتا تھا۔ وہ کسی گاہک کے آرڈر کو کسی دوسرے گاہک کے آرڈر کے ساتھ گڈمڈ کردیتا تھا۔ وہ ایسا کئی مرتبہ کرچکا تھا۔'' اسٹارک نے بتایا۔

اینی نے اثبات میں سرہلادیا اور بولی۔ ''ہاں اور جب لیزا نے اسے ملازمت سے برخاست کردیا تو وہ خوفناک حد تک غصے میں آگیا تھا۔ وہ اسے بہت برا بھلا کہتا رہا اور دھمکی دی تھی کہ وہ اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہے۔''

''کیا تمہارے پاس اس کا پتا موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً، ہم اپنے دفتر میں تمام ملازمین کا ریکارڈ پاس رکھتے ہیں۔''

''میں پتا لے کر آتا ہوں۔'' اسٹارک نے کہا۔

میں اور ہارٹ اس کے ساتھ چل پڑے۔

''اگر یہ حرکت مارٹن پارکر کی ہے تو مجھے امید ہے کہ تم لوگ اسے گرفت میں لے لوگے۔'' ریسٹورنٹ کے منیجر اسٹارک نے تیزی سے مارٹن کا پتا ایک کاغذ پر لکھتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تم لوگ اس کی انگلیوں کے نشانات بھی حاصل کرلو اور ان نشانات کو چاقو پر موجود نشانات سے میچ کرنے میں کامیاب ہوجاؤ۔'' پھر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ''بے شک اس بات سے یہ کچھ زیادہ ثابت نہیں ہوسکتا کیونکہ یہاں کام کرنے کے دوران میں وہ ہر روز اس چاقو کو استعمال کرتا رہا ہوگا اور چاقو پر اس کی انگلیوں کے نشانات واضح طور پر ثبت ہوں گے۔''

میں نے اسٹارک سے وہ پتا لے لیا اور ہارٹ کے ہمراہ باہر گیلی سڑک پر نکل آیا۔

مارٹن پارکر کی رہائش دو میل کے فاصلے پر ایک بے کیف سے اپارٹمنٹ کمپلیکس میں تھی۔

اس کے دروازے پر پہنچ کر ہارٹ نے دستک دی۔ ایک منٹ گزر گیا۔ کسی نے جواب نہیں دیا پھر ایک منٹ اور

گزر گیا۔

’’اب کیا کریں، یمی؟‘‘ اس نے مجھ سے پوچھا۔

’’دوبارہ دستک دو۔‘‘ میں نے کہا۔

بارٹ نے دستک دینے کے ارادے سے ابھی ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

دروازہ گٹھے ہوئے جسم کے ایک ادھیڑ عمر شخص نے کھولا تھا۔ بارٹ اور میں نے اپنے اپنے شناختی بیج اس کے سامنے لہرائے وہ چبھتی نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔

’’کیا تم مارٹن پارکر ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘

’’برا تو نہیں مانو گے اگر ہم اندر آجائیں اور تم سے کچھ سوالات پوچھ لیں؟‘‘

’’کس بارے میں؟‘‘

میں اس پر نظریں جماتے ہوئے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ’’لیزا کیسل کو چاقو گھونپ کر ہلاک کردیا گیا ہے۔‘‘

مارٹن پارکر نے اس خبر پر پلکیں تک نہیں جھپکائیں البتہ اس کا جبڑا تن گیا۔ اس نے ہمیں اندر مدعو کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

’’مقتولہ نے کل تمہیں ملازمت سے برخاست کردیا تھا۔ یہ بات درست ہے نا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

اس ادھیڑ عمر شخص نے شانے اچکا دیے۔ ’’ہاں لیکن مجھے ایک اور بہتر ملازمت کی آفر آئی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں میرا آج انٹرویو ہے اور کچھ دیر بعد مجھے وہیں جانا ہے۔‘‘

’’آج صبح کی بات ہو رہی ہے تو یہ بھی بتا دو کہ صبح سات اور آٹھ بجے کے درمیان تم کہاں تھے؟‘‘ میرے ساتھی بارٹ نے پوچھا۔

’’یہیں پر تھا۔‘‘

’’کیا کر رہے تھے؟‘‘

’’اخبار پڑھ رہا تھا اور کافی پی رہا تھا۔‘‘

’’کیا کوئی اس بات کی تصدیق کرسکتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’میں یہاں تنہا رہتا ہوں۔‘‘

’’لیزا کے قتل میں جو چاقو استعمال کیا گیا ہے، اس پر ہر جگہ تمہاری انگلیوں کے نشانات پائے جاسکتے ہیں۔‘‘

’’اور نہیں بھی پائے جاسکتے۔‘‘

’’ہم تمہیں گھسیٹ کر پولیس ہیڈکوارٹر بھی لے جاسکتے ہیں۔‘‘

''ہاں۔'' مارٹن پارکر نے غراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم لے جاسکتے ہو لیکن پھر تمہیں لیزا کی پارٹنر ایلی فلیمنگ اور میجر ہاروے اسٹارک کو بھی گھسیٹ کر لانا چاہیے۔ ایلی اور لیزا میں اکثر تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ لیزا اسے پرانے طرز پر برقرار رکھنا چاہتی تھی جبکہ ایلی کیفے میں تبدیلی لانا چاہتی تھی۔ اسے جدید فیشن کے مطابق ڈھالنا چاہتی تھی۔''

''اور میجر ہاروے اسٹارک؟''

''وہ بھی تبدیلی لانے کا حامی تھا اس لیے لیزا اور اسٹارک کے درمیان بھی نہیں بنی۔''

☆☆☆

''میرا خیال ہے ہمیں مارٹن پارکر کو گھسیٹ کر لے آنا چاہیے تھا۔'' میرے ساتھی بارٹ نے کار میں بیٹھتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ''اور ایلی فلیمنگ اور ہاروے اسٹارک کو بھی لے آنا چاہیے۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''ان سب کاموں کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے، بارٹ۔'' میں نے کہا۔ ''فی الوقت تو کوئی چیز مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔ میرے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔''

''کس بارے میں؟'' بارٹ نے پوچھا۔

''آلۂ قتل کے بارے میں ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اس چاقو کے بارے میں جس سے لیزا کو قتل کیا گیا ہے؟'' بارٹ نے کہا۔ ''ہوں... ان تینوں کو علم تھا کہ وہ چاقو کہاں رکھا رہتا تھا اور ان تینوں میں سے کوئی بھی اسے استعمال کرسکتا تھا۔ یہ بات تو میں بھی سمجھ رہا ہوں۔''

''بالکل درست۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ بات چاقو کی نہیں بلکہ چاقو سے متعلق ہے۔ کسی نے اس چاقو کے بارے میں کوئی بات کہی تھی۔ کوئی ایسی بات...''

اور پھر مجھے وہ بات یاد آگئی۔

''ہاں...'' میں نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''مجھے یاد آگیا، بارٹ۔ اب میں جان گیا کہ یہ واردات کس نے کی ہے اور قاتل کون ہے!''

بارٹ آنکھیں پھاڑے میری صورت تکنے لگا۔

''کون ہے؟''

''ہاروے اسٹارک۔''

''وہ کیسے؟''

''اس نے کہا تھا کہ ہمیں چاقو پر مارٹن پارکر کی انگلیوں کے نشانات مل سکتے ہیں۔ پھر اس نے کہا تھا کہ اگر ہمیں چاقو پر اس کی انگلیوں کے نشانات مل بھی جاتے تب بھی یہ بات زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہوگی کیونکہ مارٹن پارکر اپنے کام کے دوران میں روزانہ ہی اس چاقو کو استعمال کرتا رہا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ قاتل وہی ہے؟'' بارٹ نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اسے یہ کیسے پتا چلا کہ آلۂ قتل چاقو ہے؟ اور مزید اہم بات یہ کہ اسے کیسے پتا چلا کہ یہ کچن کے چاقوؤں میں سے ہی ایک ہے جس سے قتل کیا گیا ہے؟ یہ بات تو ہم میں سے کسی نے اسے نہیں بتائی تھی اور نہ ہی ایلی فلیمنگ نے اس سے یہ بات کہی تھی۔ ہم میں سے کسی نے بھی چاقو کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور ہاروے اسٹارک نے تو کچن میں قدم ہی نہیں رکھا تھا جہاں لیزا کیسل کی لاش پڑی ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے لاش دیکھی تھی۔ ہم نے اس سے ڈائننگ ایریا میں ملاقات کی تھی۔''

''ہاں، یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔'' بارٹ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''آلۂ قتل کے بارے میں اتنی وضاحت سے جو کچھ اسٹارک نے بیان کیا تھا، وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا تھا کہ اگر اس چاقو کو استعمال کرنے والا وہ خود ہی ہو! تم نے زبردست بات سوچی ہے، مِکی۔''

ہم نے تلاشی کا وارنٹ جاری کرایا اور جب ہم نے ہاروے اسٹارک کے کوٹ پر لیزا کیسل کے خون کا دھبا تلاش کرلیا تو اس نے اعترافِ جرم کرلیا۔

اس نے بتایا کہ وہ میٹنگ کے لیے ریسٹورنٹ جلدی پہنچ گیا تھا۔ اس وقت لیزا کیسل کچن میں موجود تھی۔ ان کے درمیان اس بات پر بحث چھڑ گئی کہ اسٹارک کیفے میں تبدیلی لانے کے لیے زور دے رہا ہے۔ جب اسٹارک اپنی ضد پر اڑا رہا تو لیزا کیسل نے کاروبار میں لگا ہوا اپنا سرمایہ واپس لینے کی دھمکی دے دی۔ اس دھمکی پر ہاروے اسٹارک اشتعال میں آگیا اور اس نے کچھ دور کاؤنٹر پر رکھا ہوا چاقو لپک کر اٹھایا اور لیزا کے گھونپ دیا۔ پھر وہ وہاں سے نکل گیا۔ بعد میں وہ دوبارہ کیفے واپس آگیا اور یہ ظاہر کیا جیسے وہ طے شدہ میٹنگ میں شرکت کے لیے اسی وقت وہاں پہنچا ہے۔ بس اس سے یہ چوک ہوگئی کہ وہ باتوں باتوں میں آلۂ قتل بیان کرگیا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی یہ غلطی اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے گی۔

ادھوری خوشی

جمال دستی

کچھ لوگ اپنی خوشیوں کے لیے دوسروں کی ہنسی چھین لیتے ہیں... وہ بھی ماہر تھا اس کام میں، ہونے والا ہر قتل نظروں کے سامنے تھا... مگر قاتل کا کہیں نام و نشان نہ تھا... اس کی حاضر دماغی نے ہر قتل کو ایک حادثاتی روپ دے دیا تھا...

سنسنی اور تجسس بڑھاتی ایک الجھی تحریر...... ہر کردار ایک کہانی تھا

''اسٹین، اٹھ جاؤ۔'' مشا نے اپنے شوہر کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے کروٹ بدلی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے گہری نیند سو رہا تھا جبکہ مشا اس کے برابر میں بستر پر بیٹھی ای میلز دیکھنے کے علاوہ فہرستیں تیار کررہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے اسٹاف کو بھی ہدایات جاری کررہی تھی۔ میری بھی خواہش تھی کہ اسٹین کی

طرح گہری نیند سو سکوں لیکن میرے دماغ میں بہت سی باتیں گھوم رہی تھیں اور میں ان کاموں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو مجھے نمٹانا تھے اور اب یہ پریشان کن ای میل آگئی تھی۔

''خدا کے واسطے ازابیلا۔'' اسٹین نے کہا۔ ''ابھی صبح کے تین بجے ہیں۔ ایسی کیا مصیبت آگئی ہے؟''

''بُری خبر ہے۔ کسی نے ایسٹربنی کو مار دیا ہے۔''

''کارل۔'' اسٹین جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''نہیں، میں کارل کی بات نہیں کر رہی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اس وقت برمودا میں ہے۔'' میں نے اپنا آئی پیڈ اسٹین کو دیتے ہوئے کہا۔ ''سانتا کی ای میل پڑھو۔''

''کسی نے فروشی کا روپ دھارنے والے شخص کو زہر دے دیا۔'' اسٹین نے بہ آواز بلند پڑھا پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ کون شخص تھا جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا؟''

اسٹین کبھی بھی سانتا کا بہت بڑا پرستار نہیں رہا۔ میں نے گہری سانس لی اور ٹیبلٹ کا بٹن دباتے ہوئے بولی۔ ''پڑھو۔''

''اچھا اچھا، پڑھ رہا ہوں۔'' وہ نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلے کسی نے فروشی ڈیل کو زہر دیا پھر میرے ہم شکل کو حادثے سے دوچار ہونا پڑا، اور اب کسی نے ایسٹربنی کا روپ دھارنے والے پر حملہ کر دیا۔ اس سال نیوجرسی میرے لیے بہت خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ اس لیے مجھے تو معاف ہی رکھوانا بیلا۔ ممکن ہے کہ اگلے کرسمس پر آجاؤں۔''

یہ ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ سانتا اس طرح ہمارے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اگر وہ کرسمس کے موقع پر موجود نہ ہوا تو سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ میں دیکھنے میں ایک عام سی درمیانی عمر کی عورت لگتی تھی لیکن درحقیقت نیوجرسی میں ہونے والے تمام کھیل تماشوں کی ڈائریکٹر تھی۔ بدمزاج لوگ محبت میں گرفتار ہونے کے بعد دل کا راز کہنے میرے پاس آتے تھے اور میں انہیں محبت میں کامیابی کے گر بتایا کرتی تھی۔ ایسٹر کے موقع پر کارل بچوں میں انڈے تقسیم کرتا۔ وہ بھی میرے دفتر سے ہی دیے جاتے تھے۔ اب کرسمس میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے اور ہمارا بزنس عروج پر تھا کہ عین موقع پر سانتا پیچھے ہٹ گیا۔

''اسٹین! ہم سانتا کو نیوجرسی سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے ورنہ بچے مایوس ہو جائیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' اسٹین نے کہا۔ ''اس کی بات میں بھی وزن ہے، اگر کوئی شخص ان لوگوں کو مار رہا ہے جو اس موقع پر مختلف سوانگ اختیار کرتے ہیں تو سانتا اپنے آپ کو کس طرح محفوظ سمجھ سکتا ہے لیکن ایسٹربنی کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ تو دسمبر کا مہینا ہے۔''

میں نے وہ لنک کلک کیا جو سانتا نے اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا تھا۔ یہ اخبار میں شائع ہونے والا ایک مضمون تھا۔

''ایک مقامی کتابوں کی دکان میں گزشتہ شب کاسٹیوم پارٹی ہوئی۔ ان کے کسی ملازم نے سوچا ہوگا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں تھوڑا بہت ہنگامہ رہے گا۔''

''لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ مردہ خانے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔'' اسٹین نے کہا۔

''یہ کوئی مذاق نہیں ہے اسٹین۔'' میں نے اس کے پیٹ میں کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں سانتا کا ارادہ بدلنے کے لیے کوئی طریقہ سوچنا ہوگا۔ ہم اپنے بچوں کا کرسمس خراب نہیں کر سکتے۔''

''تم کیا کر لو گی؟ جانتی ہو وہ شخص کتنا ضدی ہے۔ وہ ابھی تک ہر سال وہی پرانا سرخ سوٹ پہن لیتا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے گا جو اکیسویں صدی کے مطابق ہو۔''

''میں اس وقت سانتا کے کپڑوں پر بات نہیں کر رہی۔ ہمیں اس مسئلے پر توجہ دینا چاہیے۔'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں قاتل کا پتا لگانا چاہیے۔ اگر وہ سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تو یقیناً سانتا نیوجرسی میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھے گا۔''

قاتل کا پتا۔'' اسٹین نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تینوں قتل ایک ہی شخص نے کیے ہیں اور اگر وہ ایک ہی شخص ہے تب بھی تم اسے کیسے پکڑو گی؟''

''اسٹین! کیا تمہیں واقعی میری صلاحیتوں پر شبہ ہے۔ میری انگلیوں میں جادو ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہارے دماغ میں پتھر بھرے ہوئے ہیں۔ شب بخیر ازابیلا۔''

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر دفتر پہنچی۔ سب سے پہلے تو مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ سانتا کو ان قتل کے بارے میں کیسے پتا چلا جبکہ میں ان سے لاعلم تھی۔ یقیناً اس کے جاسوس ہر جگہ موجود ہوں گے لیکن میں بھی خبر کی

تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں نے اپنی میز پر پڑی پولیس فائلوں کی نقول اور ان وارداتوں کے بارے میں شائع ہونے والے اخباری مضامین کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میں نے فراشی کا بہروپ دھارنے والے کولن برین کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کا قتل نہیں ہوا بلکہ اس کی موت دل کا دورہ پڑنے کے سبب واقع ہوئی تھی۔ برین، سمرسٹ کاؤنٹی میں واقع ایک مال میں دو ملازمتیں کرتا تھا۔ ویسے تو وہ کتابوں کی دکان چلاتا تھا لیکن گزشتہ چند سالوں سے اس نے چھٹیوں کے موقع پر فراشی کا بہروپ بھی بھرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مال کے مختلف حصوں میں گھوم پھر کر بچوں کو تفریح بہم پہنچاتا۔ اسے اختتام ہفتہ سینے میں تکلیف محسوس ہوئی اور وہاں پر موجود بچے اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔

میڈیکل ایگزامنر کے مطابق اسے ایک نامعلوم قسم کا زہر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے دل کا دورہ پڑا۔ گویا سائنا کا کہنا درست ہے۔ یہ ایک قتل ہی تھا۔ پولیس مقتول کے خاندان کے افراد کو مشتبہ سمجھ کر ان سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس کی آخری رسومات آدھ گھنٹے پہلے ادا کی جا چکی تھیں۔

دوسرا مقتول مل بیرگمنٹن، موریس کاؤنٹی کی گلیوں میں پھیرا لگا کر سالویشن آرمی کے لیے چندہ جمع کرتا تھا۔ تین روز قبل وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ جس کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا اور نہ ہی کسی پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ کسی شرابی ڈرائیور نے اسے اپنی گاڑی سے ٹکر ماری ہو گی۔ اسے ایک شرمناک واقعہ ہی کہا جا سکتا ہے اور اب آخری قتل ایسٹر بنی کا تھا جسے گزشتہ شب گولی مار دی گئی۔ اس کیس کی تفصیلات صبح کے اخبارات اور ٹی وی کی خبروں میں نمایاں طور پر دی گئیں۔ مقتول کا اصل نام مائیکل ایلن میبوری تھا۔ عمر ستائیس سال اور وہ یونین کاؤنٹی میں اپنی کمپنی کی پارٹی میں شریک تھا۔ وہ پارکنگ گیراج میں مردہ پایا گیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ قاتل کوئی ایسا شخص ہے جسے وہ پہلے سے جانتا تھا کیونکہ اس کی کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔ پولیس کسی ایسے شخص پر شبہ کر رہی تھی جس سے اس کی دشمنی چل رہی ہو۔ خاص کر اس کی سابق بیوی اور ساتھ کام کرنے والے افراد جو پارٹی میں موجود تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ میبوری بھی ایک کتابوں کی دکان پر کام کرتا تھا لیکن یہ کمپنی اس سے مختلف تھی جہاں فراشی ملازم تھا۔

یہ تینوں قتل ریاست کے شمالی حصے میں واقع تین مختلف کاؤنٹیز میں چند روز کے وقفے سے ہوئے۔ ہر قتل کی

الگ الگ تحقیقات ہوئی اور اس بارے میں متعلقہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی پولیس والے اس امکان پر غور کر رہے تھے... کہ ان تینوں واقعات کے درمیان کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہی قرین قیاس تھا کیونکہ تینوں قتل مختلف طریقے سے کیے گئے تھے اور مقتولین کے درمیان کوئی ظاہری تعلق نہیں تھا لیکن سامنتا کی سوچ اس سے مختلف تھی اور اس کا خیال تھا کہ ان تینوں اموات میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔

ڈنگ کی آواز پر میں نے اپنا سیل فون اٹھایا۔ میرے لیے ایک پیغام تھا۔ ''میں اس وقت مال پر ہوں۔ کیا ہر بچے کو سامنتا سے ملنے سے پہلے ہی ایک ایک کینڈی دے دوں یا اس کے بعد؟''

یہ پیغام میرے اسٹاف کے سب سے نئے ممبر کی جانب سے تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''تم وہی کرو جو یہ بچے تم سے کہیں۔''

''اگر میں نے بچوں کو پہلے کینڈی دے دی تو وہ بہت خوش ہوں گے۔'' اس نے چند سیکنڈ بعد مجھے جواب دیا۔ ''لیکن پھر سامنتا کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔''

''لعنت ہے۔'' میں نے دل میں کہا۔ ''آج تک مجھے کوئی ایسا ملازم نہیں ملا تھا جسے اتنا زیادہ بتانا پڑتا ہو۔'' ''تم وہی کرو جو وہ تم سے کہیں۔'' میں نے دوبارہ لکھا۔ ''اور اگر وہ کچھ نہیں کہتے تو تم خود ہی کوئی فیصلہ کر لو۔''

میں نے چند لمحے اس کے اگلے پیغام کا انتظار کیا لیکن جب اس نے تیسری بار پیغام نہیں بھیجا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور دوبارہ اپنے کام پر متوجہ ہو گئی۔

پولیس ایک اہم نکتے کو نظرانداز کر رہی تھی کہ تینوں کیسوں میں انہی لوگوں کو نشانہ بنایا گیا جو دل موہ لینے والوں کا روپ دھارتے تھے۔ میں نے فون اٹھایا اور اپنی سیکیورٹی ٹیم کے سربراہ کا نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ہونے پر میں نے کہا۔

''کائل! میں ازابیلا بول رہی ہوں۔ کیا حال ہی میں یہاں کسی ہیٹ گروپ کی کوئی حرکت دیکھنے میں آئی ہے؟''

''میں نے کوئی غیر معمولی حرکت نہیں دیکھی۔ البتہ سامنتا کے خلاف ایک دو مظاہرے ضرور ہوئے۔ وہ سامنتا کو جھوٹا ثابت کر رہے تھے۔''

''کسی نے فراسٹی یا ایسٹر بنی کے خلاف کچھ کہا؟''

''نہیں، گزشتہ موسم بہار کے بعد سے اب تک بنی کا مسئلہ نہیں ہوا، جب کچھ لوگوں نے اس پر رنگین پلاسٹک کے انڈے پھینکے تھے۔ تمہیں تو وہ قصہ یاد ہوگا؟''

''میں وہ کیسے بھول سکتی ہوں۔'' میں نے اپنی کرسی گھما کر کھڑکی کی جانب چہرہ کر لیا۔

''مقامی پولیس نے وہ کیس ہینڈل کیا تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کوئی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔'' کائل نے کہا۔ ''اور نہ ہی میں نے کبھی کسی فراسٹی مخالف گروپ کے بارے میں سنا۔ کیا کوئی مسئلہ ہے باس؟''

میں نے اسے قتل کی تین وارداتوں اور ان کی تحقیقات کے بارے میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''پولیس والوں کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے میری بات سننے کے بعد کہا۔ ''قاتل عام طور پر مقتول کے قریبی لوگ ہوتے ہیں اور ان میں سرفہرست ان کی بیوی یا محبوبہ ہو سکتی ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ان تینوں مقتولین کے ساتھ ایسا معاملہ نظر نہیں آتا۔ یہ تینوں تہواروں کے موقع پر سوانگ بھرنے والوں میں سے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے مقامی گروپوں کے ان ارکان کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں کی جو سامنتا اور بنی سے نفرت کرتے ہیں، ممکن ہے کہ ان دونوں گروپوں میں کوئی ایسا شخص ہو۔''

''شکریہ۔''

''اس کے علاوہ میں اپنے تمام ملازمین کو غیر معمولی طور پر محتاط رہنے کا پیغام بھیج دوں گا۔'' اس نے کہا۔

''اور...''

''ہاں بولو، رک کیوں گئے؟''

''ابھی کمپنی کے پاس ایک راکٹ ہے جس میں ڈائنامائٹ اور گوند بھرا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تمہاری تحقیقات میں کارآمد ثابت ہو۔''

''میں تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں کہ ان سے مزید کوئی چیز نہ خریدی جائے۔ ان کی زیادہ تر اشیا ناکارہ ہوتی ہیں۔''

ایک گھنٹے بعد میں اپنے دفتر سے اٹھی اور ڈولی کے پب پہنچ گئی۔ ابھی میں دروازے پر ہی تھی کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے کائل بول رہا تھا۔ ''باس! تمہارا خیال درست تھا۔ دو مقامی افراد سامنتا اور ایسٹر بنی مخالف گروپ کے ممبر ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں تفصیلات تمہیں ای میل کر دی ہیں۔''

مجھے یہ بات پہلے سے معلوم تھی تاہم میں نے اس کا

شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔
''کوئی بات نہیں، اگر تمہیں مزید مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔''

''تم میری فکر مت کرو۔''

میں نے ہال میں داخل ہو کر وہاں کا جائزہ لیا اور سوچنے لگی کہ کولن برین کے بارے میں کس سے بات کروں۔ میں بار کی طرف چل دی اور ایک سیاہ بالوں والی عورت کے برابر میں خالی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ وہ سرتاپا سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی۔ میں نے بارٹینڈر کو بیئر کا آرڈر دیا۔ جب وہ میرا گلاس بھرنے لگا تو میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ شاید ان لوگوں میں سے کوئی نظر آ جائے جن کی مجھے تلاش تھی لیکن وہاں ایسا کوئی شخص نہیں تھا۔

''کتنی شرمناک بات ہے۔'' میں نے برابر میں بیٹھی عورت سے کہا۔

اس نے اپنا سر اٹھایا اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم کولن برین کو جانتی تھیں۔ میں تمہیں پہچان نہیں پائی۔''

''بہت زیادہ نہیں۔ میں نے اسے کتابوں کی دکان پر دیکھا تھا۔''

''اچھا تو تم کتابیں پڑھتی ہو۔ کولن اپنے گاہکوں سے بہت محبت کرتا تھا۔''

''نہیں، میں اسے فراسٹی کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ میں کبھی کبھی اپنے بچوں کو اس شاپنگ میں لے جاتی تھی، وہ اس سے محبت کرتے تھے۔''

میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا کیونکہ نیوجرسی کے تمام بچوں کو اپنی اولاد سمجھتی تھی اور وہ سب فراسٹی سے محبت کرتے تھے۔

''ہاں، یہ اس کا دوسرا کام تھا۔ وہ بچوں کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔''

میں نے اپنا گلاس اٹھا کر بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا کبھی کسی نے اسے فراسٹی بننے سے روکا۔ کیونکہ ایسے مواقع پر بہت سے جعلی گنڈا لنے آ جاتے ہیں۔''

''نہیں، جہاں تک میں جانتی ہوں ایسا کچھ نہیں تھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''ہر شخص اس سے محبت کرتا تھا۔''

میں نے دل میں سوچا کہ اگر سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے تو پھر اسے زہر کس نے دیا۔ میں نے اس عورت کو مزید کریدنے کی خاطر کہا۔ ''اس کی موت کے بعد کولن کا خاندان تو بکھر گیا ہوگا۔ معاف کرنا، میں تو یہ پوچھنا بھول ہی گئی، کیا تم بھی اس کی فیملی سے ہو؟''

''نہیں، صرف دوست۔ ہم سب اس کے دوست ہیں۔'' اس نے بار میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان میں سے زیادہ تر بیئر پی رہے یا آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

''کولن کے خاندان کے لوگ بھی یہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بار کے عقبی حصے میں بیٹھے ہوئے ایک گروپ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سب قہقہے لگا رہے، شراب نوشی کر رہے اور گانے گا رہے تھے۔ میں نے بار میں داخل ہوتے وقت انہیں ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی۔ البتہ اب میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ آئرش لوگ اسی طرح سوگ مناتے تھے لیکن برین کوئی بوڑھا شخص نہیں تھا جس نے کوئی بھرپور زندگی گزاری ہو بلکہ وہ تو جوانی میں ہی مارا گیا۔ بہرحال لوگ مختلف طریقوں سے سوگ مناتے ہیں۔

میرے پرس میں ان دو افراد کی تصویریں تھیں جن کی نشاندہی کاٹل نے کی تھی۔ ان میں سے ایک ہوپر اور دوسری لورین تھی۔ ان دونوں کا تعلق سانتا اور فراسٹی سے نفرت کرنے والے گروپوں سے تھا۔ میں نے کوئی قباحت محسوس نہیں کی کہ یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو یہ تصویریں دکھا کر ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں۔ میں نے ابتدا اپنے برابر میں بیٹھی ہوئی عورت سے کی اور پھر باری باری وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو وہ تصویریں دکھائیں لیکن کوئی بھی ہوپر یا لورین کو نہیں پہچان سکا۔

مجھے تھوڑی سی مایوسی ضرور ہوئی لیکن میں حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھی چنانچہ میں نے مقتولین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ بار سے باہر نکلی اور تھوڑی دیر بعد ہی ایک خوب صورت سفید عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ یہ سالویشن آرمی کا مرکز تھا اور سانتا کا روپ دھارنے والا شخص رضا کارانہ طور پر ان کے لیے چندہ جمع کر رہا تھا۔ میں عمارت میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں چاروں طرف رنگین گفٹ بیگز پھیلے ہوئے تھے۔ ان سب میں کتابیں، کھلونے اور دیگر تحائف بھرے ہوئے تھے۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟'' ایک نوجوان خوب صورت عورت مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھی۔

''میرا نام ازابیلا ہے۔ تمہارے رضاکار کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں اس کے نام پر کچھ عطیہ دینا چاہتی ہوں۔''

''تمہاری بڑی مہربانی، بہت بہت شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے ایک چھوٹے سے دفتر میں لے گئی اور بولی۔ ''مسٹر ہیرنگٹن بہت ہی اچھے آدمی تھے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس پر یقین نہیں آتا۔''

اس نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں بولی۔ ''کیا پولیس قاتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوسکی؟'' مجھے معلوم تھا کہ ابھی تک پولیس کچھ معلوم نہیں کرسکی۔ لیکن دیکھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کیا کہتی ہے۔

''نہیں۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''ان کا خیال ہے کہ وہ کوئی شرابی ڈرائیور تھا۔''

''اس کے گھر والوں کا کیا ردعمل ہے؟''

''کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ ان کا بیٹا نہیں چاہتا تھا کہ مسٹر ہیرنگٹن اس سال بھی ہمارے لیے عطیات جمع کریں۔ اس کا خیال تھا کہ اس سردی میں سڑک پر گھنٹی بجا کر لوگوں سے چندہ مانگنا مسٹر ہیرنگٹن کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پینسٹھ سال کے تھے اور ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے لیکن انہیں سانتا بننا اور لوگوں کی مدد کے لیے چندہ جمع کرنا اچھا لگتا تھا۔ خاص طور پر بچوں سے وہ بہت محبت کرتے اور ان کے لیے تحفے خریدتے تھے۔ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے کم از کم دو درجن تھیلے انہوں نے دیے تھے۔''

''میں نے سنا ہے کہ کچھ لوگ سانتا کلاز کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ سانتا بے حرمتی کا مرتکب ہے، کیا تم سمجھتی ہو کہ ان میں سے کوئی ایک اس کا ذمے دار ہوسکتا ہے؟''

اس کی نیلی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بولی۔ ''اس سے پہلے ہمیں اس قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں ہماری تنظیم سے اختلافات ہوسکتے ہیں لیکن ایک شخص کو صرف اس لیے گاڑی سے ٹکر مار دینا کہ اس نے سانتا جیسا لباس پہن رکھا تھا، بہت بڑا ظلم ہے۔ کاش یہ سچ نہ ہو۔''

میں نے اپنا فون اٹھایا اور اس کا بٹن دبا دیا۔ ان متنفر لوگوں میں سے ایک کی تصویر اسکرین پر نمودار ہوئی۔ میں نے وہ تصویر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اس شخص کو پہچانتی ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے دوسری تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس عورت کے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''نہیں، میں اسے نہیں جانتی۔'' پھر وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کون ہو؟''

میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''ایک فکرمند شہری۔'' میں نے میز پر پچاس ڈالر رکھے اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں وہاں سے چلی آئی۔

ہلکی ہلکی برف میرے بالوں کو گیلا کررہی تھی۔ میں نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے سوچا کہ اگر متنفر لوگ ان وارداتوں میں ملوث ہیں تو انہیں پکڑنا آسان نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ مجھے کائل کو ان کے گھروں کی نگرانی کے لیے کہنا پڑے، ممکن ہے...

''ڈنگ۔'' ایک بار پھر موبائل پر اسٹیو کا پیغام موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔ ''مجھے بیس منٹ میں ایک کھلونوں کی دکان پر پہنچنا ہے لیکن میں ٹریفک میں پھنس گیا ہوں۔ اب کیا کروں؟''

میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچنے لگی کہ مجھے اس احمق شخص کی ڈیوٹی اہم مقامات پر نہیں لگانا چاہیے تھی جو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے بھی میرا دماغ خراب کرتا رہتا ہے۔ میں نے جھلاہٹ کے عالم میں جواب دیا۔

''اسٹور والوں کو فون کرکے بتا دو کہ تمہیں وہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہوسکتی ہے اور جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کرو۔''

اس کے بعد میں کتابوں کی اس دکان پر پہنچی جہاں اینڈریو کا روپ دھارنے والا شخص کام کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے ایک ملازم کی موت کی وجہ سے وہ دکان بند ہوگی لیکن کرسمس میں صرف دو ہفتے باقی تھے اور خراب معاشی حالات کے سبب کوئی بھی اپنا نقصان کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے منیجر نے دکان کھولنا ضروری سمجھا۔

میں نے فرنٹ ڈور سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دکان میں خوب چہل پہل تھی۔ خریداروں کے علاوہ مجھے وہاں کئی رپورٹرز بھی نظر آئے جو بظاہر پانچ بجے والی خبروں کی تیاری کررہے تھے۔ میں دکان کے اندر چلی گئی اور بلا مقصد ادھر ادھر چکر لگاتی رہی پھر میں بچوں والے حصے میں گئی اور وہاں سے کئی کتابیں اٹھا کر بیرونی دروازے کے قریب ادائیگی کے لیے کاؤنٹر پر آگئی۔

''مجھے امید ہے کہ تمہیں مطلوبہ کتابیں مل گئی ہوں

گی؟" کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی نے پوچھا۔ وہ پچیس سال کی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔

"ہاں، میں..." میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ برابر والے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے کچھ پوچھنے کے لیے اس لڑکی ماریا کو اپنی جانب متوجہ کرلیا تھا۔ وہ اس سے فارغ ہوکر بولی۔ "معاف کرنا، تم کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"میں حیران ہوں کہ ان حالات میں بھی تم نے اسٹور کھولا ہوا ہے۔"

"ہاں، ایسا لگتا ہے کہ سب لوگ اس پر حیران ہورہے ہیں۔" اس نے باہر کھڑی نیوز وین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سب بالکل ٹھیک ہیں۔ اپنے ایک ساتھی کی موت کا صدمہ ضرور ہوا ہے۔ مائیکل ایک اچھا شخص تھا۔ میں تصور نہیں کرسکتی کہ اس کے ساتھ کس نے یہ سلوک کیا؟"

"ماریا۔" برابر والے کلرک نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ "میں نے ایک کتاب کی دو دفعہ انٹری کردی اور اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے بل میں سے کیسے نکالوں؟"

ماریا اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ "یہ شخص بھی تقریباً آرتھر جیسا ہے۔ معاف کرنا، میں ذرا اس کی بات سن لوں۔"

اس سے بات کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر مجھ سے معذرت کرتے ہوئے بولی۔ "یہ دراصل ابھی نیا ہے اور اسے ہمارے یہاں کا طریقۂ کار سمجھنے میں وقت پیش آرہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔ "میرے پاس بھی ایسا ایک آدمی ہے۔"

ماریا نے میری خریدی ہوئی کتابیں چیک کیں اور بولی۔ "ہمارے یہاں پچھلے سال ایک ایسا شخص تھا جو ہمیشہ غلطیاں کرکے ان پر پردہ ڈالنے کے لیے جھوٹ بولتا رہتا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی جب مائیکل نے اسے چلتا کیا۔"

"مائیکل۔" میں اس کی جانب جھکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "تمہارا مطلب ہے وہ شخص جو مارا گیا۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ ہمارا اسسٹنٹ منیجر تھا۔ یہ گزشتہ سال کی بات ہے۔ ہمارا منیجر چھٹی پر تھا اور اس کی جگہ مائیکل انچارج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آرتھر نے ہمارے ایک مستقل گاہک کے آرڈر میں غلطی کی اور حسب عادت گاہک پر الزام ڈال دیا، کیا تم اس پر یقین

کھلاڑی

کرکٹ کے کھلاڑی نے ڈاکٹر سے کہا۔ "میں ایک عجیب مرض میں مبتلا ہوں۔ ہر وقت سر چکراتا رہتا ہے، نہ مجھ سے رنز بنتے ہیں اور نہ مجھ سے باؤلنگ کی جاتی ہے۔ فیلڈنگ کرتے وقت میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ کیچ کے وقت بال نظر نہیں آتی۔ بتائیے ڈاکٹر صاحب میں کیا کروں؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تمہارے مرض کا ایک ہی علاج ہے۔ کرکٹ کھیلنا چھوڑ دو۔"

"ناممکن!" کھلاڑی بولا۔ "مجھے تو اب قومی ٹیم میں شامل کیا جاچکا ہے۔"

کرسکتی ہو؟"

"واؤ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کرسمس سے ایک ہفتے پہلے کسی کو ملازمت سے نکال دینا اسے مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اور وہ اشتعال میں آکر قتل جیسا بھیانک جرم بھی کرسکتا تھا لیکن نہیں، یہ واقعہ ایک سال پہلے پیش آیا تھا اور میں اس کا تعلق ان وارداتوں سے نہیں جوڑ سکتی تھی۔ مجھے اپنی توجہ متنفر گروپ کے ارکان پر رکھنی چاہیے۔

میں نے ماریا کو ان لوگوں کی تصویریں دکھانے کے لیے اپنا موبائل آن کیا۔ عین اسی وقت ایک عورت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ ایک بے بی ٹرالی کو دھکیل رہی تھی۔ پھر مجھے باہر سے نعروں کا شور سنائی دیا۔ یہ خوشی کے نہیں بلکہ نفرت کے گیت تھے۔ "ہے ہے، ہو ہو ہو۔ سانتا کلاز کو جانا ہوگا۔ ہوپ ہوپ... ہو ہو۔ ایسٹر بنی کو جانا ہوگا۔"

ماریا کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کاؤنٹر پر سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور بولی۔ "کاش میں جان سکتی۔"

میں نے باہر نکلنے میں بہت تیزی دکھائی کیونکہ میں ان لوگوں کو براہ راست دیکھنا چاہتی تھی۔ پانچ افراد دکان کے باہر دائرے کی شکل میں مارچ کررہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پلے کارڈز تھے جن پر مختلف نعرے لکھے ہوئے تھے جبکہ ایک کے ہاتھ میں سانتا اور ایسٹر بنی کی تصاویر تھیں جن کے چہروں پر سرخ رنگ سے کراس بنایا گیا تھا۔ یہ سب

کچھ بہت خوفناک تھا۔ اسے دیکھ کر میری ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ ٹی وی رپورٹران کی فلم بنا رہے تھے۔ مظاہرین میں سے ایک انٹرویو دیتے ہوئے دعویٰ کر رہا تھا کہ جن اسٹورز میں ساحنا موجود ہے، وہ گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور مائیکل ایلین میلوری بھی اسی لیے مارا گیا کہ اس نے حضرت عیسیٰ کا روپ دھار رکھا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسی بات کیسے کہہ سکتا تھا اور یہ لوگ اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے اس قتل سے کیوں کر فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ میں اتنی بدحواس ہو گئی تھی کہ پہلی نظر میں اس شخص کو نہ پہچان سکی۔ وہ نفرت کرنے والے لوگوں کے گروپ کا ایک ممبر کارل ہوپر تھا جس کے بارے میں کارل مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے دوسرے مظاہرین کے چہرے غور سے دیکھنا شروع کیے اور مجھے ان میں لورین بھی نظر آ گئی جو اس گروپ کی ایک اہم رکن تھی۔ وہ دیکھنے میں ہی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے اس سمیت دوسرے مظاہرین کی بھی کئی تصویریں اتاریں اور ماریا سے دوبارہ بات کرنے کے لیے دکان کے اندر چلی گئی۔

''ہائے۔'' میں نے کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کیا کچھ بھول گئی تھیں؟''

''یوں ہی سمجھ لو۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنا موبائل فون اس کے ہاتھ پر رکھا اور آرتھر کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔''

''اور اس عورت کے بارے میں کیا کہو گی؟''

ماریا نے تصویر کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہوئی۔ میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''تم اس عورت کو پہچانتی ہو؟''

''عورت کو نہیں بلکہ اس مرد کو۔'' اس نے لورین کے عقب میں کھڑے ہوئے ایک بدوضع شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جیک آرتھر۔ یہی وہ قابلِ نفرت شخص ہے جسے گزشتہ برس ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔'' پھر وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ''سوری، مجھے اس بدزبانی کے لیے معاف کر دینا لیکن تمہارے پاس اس کی تصویر کہاں سے آئی؟''

''وہ دکان کے باہر موجود ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا وہ بھی مظاہرین میں شامل ہے؟'' ماریا نے پوچھا۔

''وہ مظاہرین میں شامل نہیں لیکن تماشا دیکھنے والوں میں ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس کی شکل جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن یہ یاد نہیں آ رہا کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

''اسے واقعی یہ معلوم نہیں کہ کس طرح انسانوں کی طرح سوگ کیا جاتا ہے۔ دراصل اس نے چند ہفتے پہلے اس اسٹور میں کام کرنے والے کسی شخص سے سفارش کے لیے کہا تھا حالانکہ اسے جاننے والا کوئی بھی شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کتنا گھٹیا شخص ہے۔''

میں نے متجسس انداز میں پوچھا۔ ''کیسی سفارش؟''

''ہمارے ایک ملازم نے کچھ عرصے قبل سمرسٹ کاؤنٹی میں کتابوں کی دکان کھولی تھی۔ آرتھر کو وہاں ملازمت حاصل کرنے کے لیے کسی کی سفارش درکار تھی چنانچہ اس نے کسی دوسرے ملازم سے کہا کہ وہ کسی سے کہہ کر اس کی سفارش کروا دے۔ اس نے جس شخص کا حوالہ دیا تھا اس نے اس کے بارے میں منفی ریمارکس دے دیے۔''

''کیا میں اس شخص کا نام جان سکتی ہوں؟''

''کولن برین۔''

''اوہ میرے خدا۔'' میں نے دل میں کہا۔

''یہ واقعی افسوسناک ہے۔'' ماریا بولی۔ ''کولن کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی۔ میں اس کی تدفین میں شرکت کرنا چاہ رہی تھی لیکن مصروفیت کی وجہ سے نہ جا سکی۔''

تب مجھے یاد آیا کہ میں نے آرتھر کو پہلے کہاں دیکھا تھا جب دوسرے لوگ پب میں کولن برین کا سوگ منا رہے تھے تو یہ اپنے موبائل فون کے ذریعے پیغامات بھیج رہا تھا۔

ایسٹر بنی کا روپ دھارنے والے مائیکل ایلین میلوری نے ایک سال قبل آرتھر کو اس بک اسٹور سے نکال دیا تھا اور اب اس کا پرانا ساتھی کولن برین جو فراسٹی کا روپ دھارے ہوئے تھا، اس کے بارے میں ماریا نے بتایا کہ اس نے آرتھر کی سفارش کرنے کے بجائے منفی ریمارکس دے دیے تھے تو کیا ان دونوں کا قاتل آرتھر ہی ہے پھر میں نے تیسرے مقتول بل ہیرنگٹن کی تصویر ماریا کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک سوال اور... کیا تم اسے پہچانتی ہو؟''

اس نے پہلے تصویر اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کے بعد اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''بالکل پہچانتی ہوں۔ یہ بل ہے۔ ہمارا ایک بہترین گاہک، ہم اس کے لیے خصوصی آرڈر پر کتابیں منگواتے ہیں اور وہ انہیں وقت پر لے جاتا ہے لیکن ہم نے اسے پچھلے چند روز سے نہیں دیکھا۔''

پھر وہ اپنی شہادت کی انگلی کاؤنٹر پر بجاتے ہوئے بولی۔ ''اس تصویر کو دیکھ کر مجھے خیال آ رہا ہے کہ اس کا بھی

آرتھر سے کوئی تعلق ہے۔"

مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا لہٰذا دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ "مجھے تفصیل بتاؤ۔"

"یہ وہی آخری گاہک تھا جس کے آرڈر میں آرتھر نے غلطی کی تھی اور پھر اپنی عادت کے مطابق بل کو ہی مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کی اور مائیکل نے اسے نوکری سے فارغ کر دیا۔"

واؤ، گویا سامنتا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ان تینوں وارداتوں کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے لیکن اس طرح نہیں جیسا کہ میں توقع کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مقتولین کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کیونکہ وہ مختلف روپ اختیار کرتے تھے اور کچھ لوگوں کی نظر میں یہ مقدس شخصیات کی توہین تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ تینوں مقتولین اس وجہ سے نہیں مارے گئے تھے بلکہ اس کا محرک انتقامی جذبہ تھا۔ سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ اب ہمیں صرف پولیس کو اطلاع دینا تھی تاکہ وہ آرتھر کو گرفتار کر سکے لیکن میں چاہ رہی تھی کہ اس معاملے میں میرا نام نہ آئے۔

"بل ہیرنگٹن ابھی کتابیں لینے نہیں آئے گا۔" میں نے ماریا سے کہا۔ "وہ اس ہفتے کے شروع میں مر چکا ہے۔"

"او نہیں، یہ تو بہت برا ہوا۔"

"اسے کسی نے گاڑی سے ٹکر مار کر ہلاک کر دیا اور غالباً تم بھی جانتی ہو کہ یہ کس نے کیا ہے۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ کام آرتھر کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا، اس کے لیے قابل نفرت کا لفظ زیادہ مناسب رہے گا۔"

"میں تم سے اتفاق کرتی ہوں۔" میں نے کاؤنٹر کے پیچھے رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں چاہیے کہ پولیس کو فون کر کے کولن برین، بل ہیرنگٹن اور مائیکل ایلین موری کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو جو تم جانتی ہو۔ میں شرطیہ کہتی ہوں کہ انہیں یہ بالکل بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ ان تینوں کا تعلق اسی بک اسٹور سے ہے اور ان کا دشمن بھی ایک ہی ہے۔ تم پولیس کو بتا دو کہ آرتھر اس وقت یہاں موجود ہے۔ میں باہر جا رہی ہوں اور کوشش کروں گی کہ پولیس کے آنے سے پہلے وہ یہاں سے نہ جانے پائے۔"

"شکریہ مادام۔ میں ابھی فون کرتی ہوں۔"

میں تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔ مظاہرین ابھی تک اسٹور کے سامنے مارچ کر رہے تھے جبکہ والدین اپنے بچوں کو بچانے کے لیے انہیں لے کر اسٹور کے اندر آ رہے تھے۔ اسی دوران مخالف گروپ نے بھی مظاہرین کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ اسکول کے کچھ لڑکوں نے ماحول کی تلخی کم کرنے کے لیے خوشی کے گیت گانا شروع کر دیے۔ برف باری اب بھی ہو رہی تھی اور یہ سارا منظر ایک سرکس کے مانند لگ رہا تھا جسے ٹی وی کے کیمرامین بڑی مستعدی سے قلم بند کر رہے تھے۔ پس منظر میں جیک آرتھر اپنے چہرے پر خبیث مسکراہٹ سجائے کھڑا ہوا تھا۔ ماریہ نے ٹھیک ہی کہا تھا وہ واقعی ایک گھٹیا شخص تھا۔

ڈنگ موبائل کی گھنٹی بجی اور میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ بعض اوقات تو مجھے موبائل سے شدید نفرت ہونے لگتی لیکن مجبوری ہے کیونکہ آج کے دور میں اس کے بغیر گزارہ بھی ممکن نہیں۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ اسٹیو کا پیغام تھا۔ "تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اس کام میں بہت مزہ آ رہا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یہ موقع دیا۔"

"بہت خوب۔" اسٹیو نے اب پینترا بدل لیا تھا۔ "پہلے وہ چاہتا تھا کہ میں ہاتھ پکڑ کر اس کی راہ نمائی کروں اور اب اس کی خواہش ہے کہ میں اسے پسند کرنے لگوں۔"

اس کا دوسرا پیغام ہے۔ "مجھے امید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کرو گی لیکن تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں ذاتی طور پر تمہاری کتنی قدر کرتا ہوں اور یہ بات میں بالکل غیر جانبدار ہو کر کہہ رہا ہوں۔"

"میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔" میں نے جھلا کر جواب دیا اور سوچنے لگی کہ وہ اپنا کام کرنے کے بجائے ان فضول پیغامات سے وقت کیوں ضائع کر رہا ہے۔

عین اسی وقت ایک پولیس کار وہاں پہنچ گئی۔ اس کی چھت پر لگی ہوئی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں اور اس کا سائرن پوری آواز میں چنگھاڑ رہا تھا۔ پیدل چلنے والوں نے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا جبکہ لڑکے اسے دیکھ کر اونچی آواز میں گانے لگے۔ پولیس کار کے آنے کے باوجود مظاہرین پرعزم دکھائی دے رہے تھے اور انہوں نے نعرے بازی جاری رکھی۔ اسی طرح ان کے مخالفین بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگاتے رہے۔ ٹی وی کے کیمرامینوں کے لیے یہ ایک قابل دید منظر تھا اور وہ محسوس کر رہے تھے جیسے کرسمس وقت سے پہلے آ گیا ہو۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اس ہنگامہ آرائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں آرتھر یہاں سے کھسک نہ جائے اور میرا خدشہ

درست ثابت ہوا۔

میں نے دیکھا کہ پولیس کار کا سائرن سنتے ہی ماریا اسٹور سے باہر آگئی۔ وہ جیک آرتھر کو گھور رہی تھی۔ جیسے ہی ان دونوں کی نظریں ملیں آرتھر نے ایک جانب دوڑنا شروع کردیا۔ میں زور سے چلائی۔ ''نہیں۔'' پھر میں اور ماریا اس کے پیچھے دوڑنے لگیں لیکن وہ بہت تیز بھاگ رہا تھا اور ہمارے لیے اس تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اچانک ہی وہ لڑکھڑایا اور اپنی بائیں ٹانگ کو پکڑتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہاں کوئی پھسلن نہیں تھی پھر وہ کیسے گر پڑا۔

پھر میں نے ایک اور کراہتی ہوئی آواز سنی۔ میں اسے اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ اسٹیو تھا۔ میں اس کی طرف بھاگی جبکہ ماریا، آرتھر کے پاس کھڑی ہوگئی تاکہ وہ وہاں سے فرار نہ ہوسکے۔ اسی دوران دو پولیس آفیسرز بھی اس کی جانب لپکے۔

''اسٹیو! تم ٹھیک تو ہو؟''

''میں ایسا ہی سمجھتا ہوں باس۔''

میں نے اس کا دستانے والا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے۔ اس کشمکش کے دوران اس کی ٹوپی کہیں گر گئی تھی۔ ویسے وہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو اور تم نے مجھے کیسے تلاش کرلیا؟''

''میری ڈیوٹی سامنے والے اسٹور پر ہے۔'' اس نے پارکنگ لاٹ کے دوسری طرف واقع ایک بڑے اسٹور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت کھانے کا وقفہ ہے۔ میں باہر آیا اور تمہیں اس آدمی کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تو میں نے سوچا کہ شاید تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو۔''

''یہ کیسی مدد تھی کہ اسے ٹانگ مار کر گرایا اور خود اس کے نیچے دب گئے۔''

''میرے پاس مسٹر کائل جیسی کوئی ترکیب نہیں۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''آپ وہی کام کرسکتے ہیں جس میں آپ کو مہارت حاصل ہو۔''

''واقعی تم نے اپنی مہارت خوب دکھائی۔'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھی دوستی کا آغاز ہے۔''

رات تین بجے میں اپنے بستر پر بیٹھی آئی پیڈ پر خبریں پڑھ رہی تھی۔ آرتھر نے پولیس کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کہ کس طرح اس نے کولن برین، بل ہیرنگٹن اور مائیکل اینن میلوری کو ٹھکانے لگایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ شخص ان لوگوں کی وجہ سے گزشتہ ایک سال سے بیکار تھا اور اس بے روزگاری میں اس کی اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔

میڈیا نے حسب معمول آرتھر کی گرفتاری کو خوب اچھالا اور قتل کا محرک جاننے کے باوجود زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا رہا کہ تینوں مقتولین نے مرتے وقت فراسٹی، سانتا اور ایسٹر بنی کا روپ دھار رکھا تھا۔ شاید خبر کو یہ اینگل دینا ان کی مجبوری تھی۔ اگر سیدھے سبھاؤ بتا دیا جاتا کہ ان مقتولین سے آرتھر کی دشمنی کی وجہ کیا تھی تو اس خبر میں کوئی چٹ پٹا پن باقی نہ رہتا۔

گو کہ میری خواہش تھی کہ یہ سب نہ ہو لیکن اس نوعیت کی پبلسٹی ہمارے کاروبار کے لیے فائدہ مند تھی۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اس پورے واقعے میں کہیں بھی میرا نام نہیں آیا۔ البتہ تحقیقات کے سلسلے میں جہاں کہیں میری ضرورت محسوس ہوئی میں نے پس پردہ رہ کر پولیس سے بھرپور تعاون کیا۔ دوسرے روز ہی مجھے سانتا کی جانب سے ای میل موصول ہوئی۔ اس میں لکھا تھا۔

''تم نے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اصل مجرم کو پکڑوانے میں مدد کی۔ اب میں نیوجرسی آنے کے لیے تیار ہوں تاکہ تمہارے شہر کے بچوں کو اس سال مایوسی نہ ہو۔ بہت جلد تم سے ملاقات ہوگی۔ سانتا۔''

میں نے اسٹین کو سوتے سے اٹھا کر خوش خبری سنائی۔ ''سانتا آرہا ہے۔ وہ نیوجرسی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ ہم نے اسے بلالیا۔''

اسٹین اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ہم سے تمہاری کیا مراد ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی۔''

''اب تو تمہیں میری صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''تم واقعی بہت ذہین ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سوگیا اور میں سوچنے لگی کہ کیا اسٹین کے نزدیک اس کارنامے کی کوئی اہمیت نہیں تھی یا روایتی شوہروں کی طرح اسے بھی میری کامیابی ہضم نہ ہوسکی۔ شاید ادھوری خوشی اسے ہی کہتے ہیں۔

فیصلہ

بابر نعیم

بعض فیصلے زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں... خوشگوار اور ناخوشگوار... اس نے بھی بہت محتاط پسندی اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے بازی کھیلی... وہ ایک ویران جزیرے پر تنہا تھی اور تین بدمعاشوں کے خطرناک حصار میں مقید ہو چکی تھی مگر اس کا ذہن تیزی سے سوچوں کا سفر طے کر رہا تھا... اسے اپنی آزادی ہر صورت حاصل کرنی تھی...

عقل مند عورت کی ذہانت اور حکمت عملی کا دلچسپ مظاہرہ

میرے تینوں بن بلائے مہمان انتہائی تنگ مزاج اور حسِ مزاح سے عاری تھے اور اس کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ یہ تینوں میرے ساتھ ایک کاٹیج میں موجود تھے جو شمالی مین لیک کے وسط میں ایک جزیرے پر واقع تھا۔ انہیں یہاں آئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور تبھی سے آسمان ابر آلود تھا اور مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ میں نہیں سمجھتی کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اتنے درخت دیکھے ہوں جتنے کہ اس جزیرے پر تھے۔ میرے یہ تینوں ساتھی

نیویارک یا نیوجرسی سے آئے تھے لیکن انہوں نے اس بارے میں مزید کچھ بتانے سے گریز کیا البتہ وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ اس جزیرے میں بجلی نہیں تھی جس کا مطلب ہے کہ وہ ٹیلی وژن، لیپ ٹاپ اور سب سے بڑھ کر سیل فون کے سگنل سے محروم ہو گئے تھے جبکہ میرے پاس تو لینڈ لائن بھی نہیں تھا۔

اس کاٹیج میں انہیں موم بتیوں، مٹی کے تیل کے لیمپ، پروپین سے چلنے والے ریفریجریٹر، لکڑی سے جلنے والے چولہے، چند کتابوں اور ایک پرانے ریڈیو سیٹ کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ انہیں یہ بھی توقع نہیں تھی کہ ان کی میزبانی کے لیے میں یہاں موجود ہوں گی۔ ان میں سب سے کم عمر شخص ٹونی، تانبے جیسی رنگت اور سیاہ بالوں والا خاصا بدتمیز واقع ہوا تھا۔ اس نے گزشتہ شب مجھ سے گندہ مذاق کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آج صبح جب میں نے ان تینوں کو دودھ، چائے یا جوس کے بجائے صرف دلیا دیا تو وہ مذاق کرنا بھول گئے۔

ان تینوں میں عمر رسیدہ شخص کا نام انجیلو تھا۔ اس کا جسم بھاری اور بال سفید تھے اور وہ بقیہ دونوں کا باس تھا کیونکہ جیکی اور ٹونی اس کی ہر بات مانتے تھے۔ میں نے چند منٹوں میں ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تھے اور بات بات پر انجیلو کی طرف ہی دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے ناشتا ختم کیا تو میں نے ان کی گندی پلیٹیں اٹھائیں اور انہیں دھونے کے لیے کچن میں چلی گئی جو پانچ قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے پانی گرم کرنے کے لیے چولہے پر کیتلی رکھی اور ان تینوں کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس لیے میرے پلے کچھ نہ پڑا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں کہ مجھے جان سے مارنے کے لیے مناسب وقت کیا ہو سکتا ہے۔

یہ قصہ اس وقت شروع ہوا جب دو دن قبل میں اپنے کاٹیج کے چھوٹے سے پورچ میں بیٹھی امتحانی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ میں اس معاملے میں بہت سخت واقع ہوئی ہوں اور کبھی کمپیوٹر پر نمبر نہیں دیتی بلکہ ہمیشہ طالب علموں کے جوابات کے پرنٹ آؤٹ کا مطالبہ کرتی ہوں تاکہ ان پر سرخ قلم سے نمبر دے سکوں۔ وہ دوپہر کا وقت تھا جب میں نے ایک چھوٹے ہوائی جہاز کی آواز سنی۔ اس علاقے میں عام طور پر کوئی طیارہ پرواز نہیں کرتا۔ اس لیے میرا حیران ہونا ایک فطری سی بات تھی۔ میرا تجسس اس وقت بڑھ گیا جب میں نے اس جہاز کو نیچے آتے اور ایک بڑی کھائی کے اوپر سے گزرتے دیکھا پھر وہ واپس آیا اور پائلٹ نے بڑی مہارت سے اسے جھیل کے پانی کی ہموار سطح پر اتار لیا۔ یہ ایک زرد رنگ کا تیرنے والا طیارہ تھا پھر اس نے گودی کی طرف بڑھنا شروع کیا جو جزیرے تک آتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ طیارہ یا اس میں سوار مسافر جزیرے کی سیر کے لیے آئے تھے۔

میں نے اپنے کاغذات اور پین نیچے رکھے اور پورچ سے باہر آگئی۔ اب میرا رخ گودی کی جانب تھا۔ میں نے دیکھا کہ پائلٹ بڑی مہارت سے جہاز کو گودی کے آخری سرے تک لے آیا اور اس کے ساتھ ہی جہاز کے پنکھے کی رفتار بھی سست ہو گئی۔ جہاز کا دروازہ کھلنے کے بعد یکے بعد دیگرے دو آدمی باہر آئے اور انہوں نے تیسرے آدمی کو جہاز سے نکلنے میں مدد دی جو ان کے مقابلے میں بھاری بھرکم اور عمر رسیدہ تھا پھر دروازہ بند ہوا، جہاز کے انجن نے رفتار پکڑی اور گودی سے روانہ ہو گیا۔ میں اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ جہاز سے یہ تینوں ہی برآمد ہوئے تھے اور ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ان میں سے ایک آدمی میری جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے لگا جیسے کوئی خطرہ میرے سر پر منڈلا رہا ہے۔ کہیں میں کسی مشکل میں تو پڑنے والی نہیں ہوں۔

پہلا شخص ٹونی میرے قریب آکر رک گیا۔ اس نے ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو بہت زیادہ تنہا محسوس کیا اور سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے آپ کو اس شخص کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں۔ وہ ایک گرم دن تھا اور کبھی کبھار ہوا کا کوئی جھونکا آجاتا۔ میں نے خاکی نیکر اور بغیر آستین کا ٹاپ پہن رکھا تھا۔ میں ہمیشہ ایسا لباس پہنتی ہوں جو آرام دہ ہو اور کیونکہ میرے جسم کا اوپری حصہ بہت متناسب ہے اس لیے اس طرح کا لباس مجھ پر جچتا ہے تاہم اس وقت مجھے ٹونی کا اس طرح دیکھنا اچھا نہیں لگا۔

"ہائے!" اس نے میرے جسم کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا تم راستہ بھٹک گئے ہو یا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" میں نے بے رخی سے کہا۔

اس نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا اور اپنے دوسرے جوان ساتھی کی طرف دیکھنے لگا جس کا نام مجھے بعد میں معلوم

ہوا۔ وہ جیکی تھا۔ دونوں نے سیاہ جوتے، سیاہ پتلونیں، سفید قمیص اور نیلے رنگ کے بلیزر پہن رکھے تھے۔

''نہیں بھئی۔'' ٹونی نے کہا۔ ''ہم راستہ نہیں بھولے بلکہ ہمیں اپنی سواری کا انتظار ہے۔''

میں نے اپنی آواز میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہاری سواری ابھی ابھی یہاں سے گئی ہے۔''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ بولا۔ ''وہ جہاز ہمیں صرف یہاں تک لے کر آیا تھا۔ اب ہم ایک کشتی کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، جو ہمیں اپنی منزل تک لے جائے۔''

''کیا تم اپنا سامان جہاز پر ہی بھول آئے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ شخص جس کا نام جیکی تھا جلدی سے بولا۔ ''تم بہت زیادہ سوالات کرتی ہو۔ لگتا ہے کہ تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

اس کا رویہ دیکھ کر میرے بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی، تبھی ان کا تیسرا عمر رسیدہ ساتھی آگے بڑھا اور جیکی کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔ میرے ساتھیوں کو بدتہذیبی سے بات نہیں کرنا چاہیے۔''

اب ٹونی کے بولنے کی باری تھی۔ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس طرح یہاں آنے پر افسوس ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور نہ ہی ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہاں کوئی رہ رہا ہے۔''

''یہاں کوئی نہیں رہتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ جگہ میرے والدین کی ملکیت ہے اور میں یہاں چند دن قیام کرنے آئی ہوں۔''

''کس لیے؟'' جیکی نے پوچھا۔

''تاکہ کسی مداخلت کے بغیر اور سکون سے امتحانی کاپیاں چیک کر سکوں۔''

ٹونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹیچر ہو؟''

''ہاں، تم ایسا کہہ سکتے ہو۔''

''یقیناً کوئی نہ کوئی طالب علم تم پر مرتا ہوگا۔'' وہ چور نظروں سے میرے جسم کو گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے فوراً ہی دونوں بازو اپنے سینے پر رکھ لیے اور بولی۔ ''تمہاری کشتی کب تک آجائے گی؟''

ٹونی نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''دو سے تین گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بدتہذیبی ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کیا خیال ہے اگر ہم تمہارے گھر......''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کاٹیج۔''

''ٹھیک ہے۔ کاٹیج ہی سہی، ہم تمہارے کاٹیج میں جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمیں تمہاری کچھ چیزیں استعمال کرنا پڑیں لیکن ہم ان کا خیال رکھیں گے۔''

بوڑھا شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ٹونی کے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم تمہارے وقت اور میزبانی کا معاوضہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔ ٹونی نے اپنا اور ساتھیوں کا تعارف کروانا شروع کر دیا لیکن میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ٹونی نے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے مس؟''

''میرا نام ڈورلنڈا ہے۔'' میں نے کہا۔

یہ سن کر وہ تینوں زور زور سے قہقہے لگانے لگے جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔ میرے دل میں ان کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات اُبھرنے لگے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو ان تینوں کو دھکے مار کر جزیرے سے نکال دیتی۔

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے کاٹیج تک آگئے اور اس کا اس طرح معائنہ کرنے لگے جیسے وہ اسے خریدنے آئے ہوں۔ میں نے انہیں پورا کاٹیج دکھا دیا جو فرنٹ پورچ، لیونگ روم، کچن اور دو چھوٹے بیڈ روم پر مشتمل تھا۔ میں نے اپنے زیر استعمال کمرے میں رکھے ہوئے بیگ میں سے ایک قمیص نکال کر پہن لی تاکہ اپنے جسم کو ٹونی کی گندی نظروں سے محفوظ رکھ سکوں۔ میں نے بیگ کی زپ بند کر کے اسے کمرے میں بنی ہوئی چھوٹی الماری میں رکھ دیا اور پھر اپنے مہمانوں کے پاس لیونگ روم میں آگئی۔

ٹونی نے اِدھر اُدھر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''بیت الخلا کہاں ہے؟''

میں نے کچن کی کھڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں، دروازے کے ساتھ ایک کنواں بنی ہوئی ہے۔''

جیکی نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟ اب ہمیں رفع حاجت کے لیے کھلی جگہ پر جانا ہوگا؟''

''اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔'' میں نے اپنی آواز میں نرمی لاتے ہوئے کہا۔ ''اس جزیرے پر یہی ایک واحد جگہ ہے جہاں تمہیں ٹائلٹ پیپر مل سکتے ہیں۔''

ٹونی نے کندھے اچکائے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم تو ویسے بھی چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ کسی نہ کسی طرح گزارا کرلیں گے۔ تمہارے پاس پینے کے لیے

کچھ ہے؟ میرا مطلب ہے بیئر وغیرہ؟''

میرے ریفریجریٹر میں بیئر کی تین بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ان کی قربانی دینے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے فریج سے وہ بوتلیں نکالیں اور ایک ایک کرکے ان تینوں کی جانب اچھال دیں۔ وہ انہیں کھولنے میں لگ گئے تو میں چپکے سے باہر چلی آئی۔

''بے وقوف۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں امتحانی کاپیاں باہر پڑی ہوئی لکڑی کی میز پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ اگر تیز ہوا چل رہی ہوتی تو ان میں سے کچھ کاغذات اڑ بھی سکتے تھے۔ میں نے انہیں سمیٹا اور انہیں حفاظت سے رکھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگی پھر میں نے انہیں کاؤچ کے نیچے رکھ دیا جس نے پورچ کا بہت بڑا حصہ گھیر رکھا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر میں نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ ٹونی اور جینی باہر آئے اور کاؤچ پر ڈھیر ہوگئے۔ انجیلو نے پورچ میں پڑی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک سنبھال لی۔

میں اپنے کمرے میں جانا چاہ رہی تھی کہ ٹونی نے مجھے آواز دے کر کہا۔ ''جب تک ہم یہاں ہیں، تم ہمارے پاس ہی رہو۔''

''مجھے بہت سے کام کرنا ہیں۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

ٹونی نے دانت نکال دیے اور اس طرح پہلو بدلا کہ مجھے اس کی بیلٹ میں لٹکا ہوا پستول نظر آجائے۔

''میں نے تم سے درخواست نہیں کی۔'' وہ طنز آمیز انداز میں بولا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''تم یہاں اکیلی کیا کررہی ہو؟''

''یہ جگہ میرے دادا کی ملکیت تھی جو انہوں نے ترکے میں میرے والدین کے لیے چھوڑی۔ ہماری فیملی کا کوئی شخص بھی یہاں نہیں آتا لیکن مجھے یہاں تنہا رہنا اچھا لگتا ہے اور میں کسی کی مداخلت کے بغیر اپنا بہت سا کام نمٹا سکتی ہوں۔''

ٹونی نے ایک بار پھر دانت نکال دیے اور بولا۔ ''شاید کبھی تمہارا واسطہ ہم جیسے مداخلت کرنے والوں سے نہیں پڑا ہوگا۔''

''تمہارا اندازہ صحیح ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔

میرے تینوں مہمان بیئر سے شغل کرتے رہے اور میں نے وقت گزاری کے لیے ایک کتاب اٹھالی جسے میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ جب شام کے سائے بڑھنے لگے تو جینی نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مصیبت ہے۔ رابنسن اب تک کیوں نہیں آیا؟''

ٹونی نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''رابنسن کو ایک بجے تک آجانا چاہیے تھا اور اب پانچ بج رہے ہیں۔ نہ جانے وہ کہاں رہ گیا؟''

انجیلو نے کہا۔ ''اسے آنے میں دیر بھی ہوسکتی ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' ٹونی نے کہا۔ ''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اب کیا کیا جائے؟''

انجیلو بولا۔ ''میں نہیں جانتا۔ تم ٹیلی فون بھی استعمال نہیں کرسکتے کیونکہ یہاں سیل فون کام نہیں کرے گا پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''لیکن اسے آنے میں دیر ہوگئی ہے۔''

''تم مجھے صرف وہ بات بتاؤ جو میں نہیں جانتا۔'' انجیلو نے کہا۔

ٹونی بولا۔ ''انجیلو! میں صرف یہ کہہ رہا ہوں .....''

''خدا کے واسطے خاموش ہوجاؤ۔'' انجیلو نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا دماغ خراب مت کرو۔''

اس گفتگو کے دوران جینی بالکل خاموش رہا لیکن جیسے جیسے اندھیرا پھیلتا گیا، میں ان تینوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار دیکھنے لگی۔ ٹونی کچھ زیادہ ہی ناراض نظر آرہا تھا۔ وہ ہر دس منٹ بعد گھڑی دیکھتا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا جبکہ جینی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی بائیں ٹانگ زمین پر مارتا جیسے اچھلنے کی کوشش کررہا ہو جبکہ انجیلو مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح نظر آرہا تھا اور خاموش بیٹھا کسی سوچ میں مستغرق تھا۔

میں نے اپنی نظریں کتاب پر جمائی ہوئی تھیں لیکن جب دن کا اجالا ختم ہوگیا اور مجھے پڑھنے میں مشکل ہونے لگی تو میں نے کتاب بند کرکے اپنی ران پر رکھی اور بولی۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں کسی مشکل صورت حال کا سامنا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' ٹونی نے کہا۔

''بہت جلد اندھیرا پھیلنے والا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری کشتی آنے والی ہے لہٰذا اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

جینی بولا۔ ''کیا تم ہمیں یہاں سے بھگانا چاہتی ہو۔ تم یہی سوچ رہی ہو نا؟''

''میں سوچ رہی ہوں کہ تم تینوں وقت کیوں ضائع کررہے ہو۔ تمہیں خود ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

جیکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگا لیکن انجیلو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''رک جاؤ۔'' پھر اس نے اپنی سرد آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مس! اس زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ کیا تم ہمارے لیے کھانا اور سونے کے لیے جگہ فراہم کرسکتی ہو؟ یہ میرا وعدہ ہے کہ ہم مناسب وقت پر اس کا ازالہ کردیں گے۔''

میں نے ان تینوں کو باری باری دیکھا اور بولی۔ ''تم لوگ مجھے عام انسانوں سے مختلف لگتے ہو اور یہ میں تمہاری تعریف نہیں کررہی۔''

انجیلو نے غصے سے کہا۔ ''مس!''

میں اس ایک لفظ میں چھپی ہوئی دھمکی کو سمجھ سکتی تھی لہٰذا خاموشی سے اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔ ٹونی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ شاید وہ مجھ پر پوری طرح نظر رکھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے لیمپ اور لکڑی کا چولھا جلایا اور وہ کچن میں رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے کافی زندہ دل معلوم ہوتی ہو۔''

میں نے لکڑی کا ایک اور ٹکڑا اٹھایا اور اسے چولھے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوں۔''

کھانے میں بکرونی، پنیر اور سادہ پانی تھا۔ میں نے تو برائے نام ہی کھایا لیکن وہ تینوں سب کچھ صاف کرگئے۔ میں نے خالی پلیٹیں اٹھائیں اور انہیں دھونے لگی۔ ان میں سے کسی نے بھی میرا ہاتھ بٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس پر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ باہر پورچ میں آگئے۔ اب انہیں بیئر کی طلب ہورہی تھی لیکن میرے پاس وہی تین بوتلیں تھیں جو وہ پہلے ہی حلق میں انڈیل چکے تھے۔ اب ان کے لیے مزید بیئر کہاں سے لاتی۔ وہ چپ چاپ بیٹھے سوچوں میں گم دکھائی دے رہے تھے۔ کافی دیر گزر گئی تو میں نے کہا۔

''میں بہت تھک چکی ہوں اور سونا چاہ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اپنے لیے سونے کی جگہ کا انتخاب کرلینا چاہیے۔''

انجیلو نے اپنے لیے بہترین بستر اور بہترین کمرے کا انتخاب کیا جہاں میرا بیگ اور دوسرا سامان رکھا ہوا تھا۔ ٹونی نے دوسرا بہترین کمرا چن لیا اور جیکی لیونگ روم میں پڑی ہوئی کاؤچ پر قابض ہوگیا۔ ٹونی ڈھٹائی سے بولا۔

''معاف کرنا، لگتا ہے کہ تمہیں پورچ میں ہی سونا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں اپنا انتظام کرلوں گی۔''

وہ تینوں نہیں جانتے تھے کہ رات کے وقت کاٹیج کا اندرونی حصہ بہت زیادہ گرم رہتا ہے۔ خصوصاً جب ہوا نہ چل رہی ہو کیونکہ کھڑکیاں صنوبر کے گھنے درختوں کے ساتھ تھیں جن کی وجہ سے تھوڑی بہت ہوا بھی رک جاتی تھی اور کمرے گرم ہوجاتے تھے۔ لہٰذا میں نے ایک پرانا کمبل اور فالتو تکیہ اٹھایا اور لیمپ بجھا کر باہر آگئی۔ البتہ میں نے کچن سے ایک ٹارچ اور چند دوسری چیزیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ میں سکون سے کاؤچ پر بیٹھ گئی اور جو کچھ ہورہا تھا اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے خیال آیا کہ جیسے ہی وہ جہاز سے باہر آئے تھے، مجھے اسی وقت بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن وہ تینوں مسلح تھے اور مجھ پر گولی چلانے میں دیر نہ لگاتے۔

میں اپنے ذہن سے تمام باتوں کو جھٹک کر اس کاؤچ پر لیٹ گئی جس کے نیچے میں نے اپنے کاغذات یعنی امتحانی کاپیاں چھپائی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کیا مجھے ان کاغذات کو نکالنے کا خطرہ مول لینا چاہیے۔ کیا میں انہیں کسی محفوظ جگہ پر منتقل کردوں۔ اسی وقت لکڑی کے فرش پر چرچراہٹ سنائی دی جو بتدریج تیز ہوتی جارہی تھی اور چند لمحوں بعد ان میں سے ایک پورچ میں آتا دکھائی دیا۔ چاند کی روشنی میں پورچ کے اندرونی حصے کا منظر صاف نظر آرہا تھا لہٰذا میں دیکھ سکتی تھی کہ آنے والا شخص ٹونی تھا۔ اس نے بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا۔ میرے قریب آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور میرے بالوں سے کھیلنے لگا۔

میں نے تکیے کے نیچے سے ایک چھوٹا لیکن تیز دھار والا چاقو نکالا اور دوسرے ہاتھ سے ٹارچ روشن کردی۔ ٹونی مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''روشنی بجھا دو۔''

میں ٹارچ بجھا کر اسے پیش قدمی کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس کی بات کو نظر انداز کردیا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین لٹک رہی تھی۔ جسم کے مختلف حصوں پر دو بڑے بڑے زخموں کے نشانات تھے اور دونوں بازوؤں پر ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ اس جیسے جرائم پیشہ شخص سے اپنے آپ کو بچانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس لیے میں نے مزاحمت کرنے کے بجائے آہستہ سے کہا۔

''سنی، یہ جگہ باتیں کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

"کیا تمہاری خوب صورتی کی تعریف کرنا جرم ہے؟" اس نے دوبارہ سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم جرم کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔" میں نے آہستہ سے چاقو کی نوک اس کی ران میں چبھوتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم اپنی جگہ پر جاکر لیٹ جاؤ۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔"

"کتیا۔" وہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔

"ایسی کتیا جو اپنی حفاظت کے لیے چاقو استعمال کرنا جانتی ہے۔" میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جیکی اور انجیلو کو بھی معلوم ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ میں چیخ ماروں اور میرا ہاتھ حرکت میں آجائے تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس کیبن میں چلا گیا۔ میں نے ٹارچ بجھائی اور دوبارہ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئی لیکن خوف کے مارے میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ میں نے باہر جانے والے دروازے کی طرف دیکھا اور سوچا کہ کیوں نہ باہر جا کر اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کروں لیکن وہ دروازہ اکثر بند رہتا تھا اور اگر اسے کھولا جاتا تو اس کی آواز سے چرچراہٹ ہوتی جس سے ان تینوں کی آنکھ کھل سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگی جس میں بالآخر مجھے کامیابی ہوئی۔

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ اوس کی ننھی ننھی بوندیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے گہرے گہرے سانس لیے۔ صبح کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا بڑی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ میری نگاہ گودی سے پچاس گز کے فاصلے پر کھیلتی ہوئی مرغابیوں کے جوڑے پر گئی تو یاد آیا کہ مجھے یہ جھیل اتنی کیوں پسند ہے۔ یہ پُرسکون وقت دس منٹ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا جب جیکی کے مسلسل کھانسنے کی آواز نے ماحول کی سحر آفرینی کو بری طرح درہم برہم کر دیا۔ وہ زور زور سے کہہ رہا تھا۔ "میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ بہتر ہے کہ وہ منحوس رابنسن جلدی سے آجائے ورنہ میں اس کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔ اوہ میرے خدا! کمر میں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔"

میں جب پہلی بار اس پُرسکون اور خاموش جگہ پر آئی تو میں نے اس بارے میں بہت سوچا تھا کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے لیکن میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ مجھے تین اجنبی لوگوں کی بچوں کی طرح نگہداشت کرنا ہوگی لیکن

اب یہ سب مجھے کرنا پڑ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور چولھا جلا دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں فرنچ ٹوسٹ، نمکین خشک گوشت اور کافی پر مشتمل ناشتا تیار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ایک بار پھر مجھے خالی برتن دھونا پڑے اور اس وقت مجھے بہت مزہ آیا جب میں برتن خشک کر رہی تھی تو ٹونی نے میرے پاس آکر پوچھا۔

"شاور کہاں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہاں کوئی شاور نہیں ہے۔"

"اچھا، پھر نہانے کا کیا انتظام ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "باہر نکل کر دیکھو، وہ تمہارے نہانے کا ٹب ہے لیکن جھیل میں نہانے سے پہلے پورچ میں رکھے ہوئے شیمپو سے اپنا سر صاف کرلینا تاکہ جھیل کا پانی گندا نہ ہو۔"

ٹونی نے بڑبڑاتے ہوئے کسی کی شان میں گندے الفاظ استعمال کیے اور وہاں سے چلا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ رابنسن کو ہی برا بھلا کہہ رہا ہوگا جو ابھی تک کشتی لے کر نہیں آیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی لیکن انہیں پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ بہت جلد ان پر کتنا برا وقت آنے والا ہے جب کاٹیج میں کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو جائیں گی۔

پھر ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جب انجیلو اس بیڈ روم سے برآمد ہوا جس کی الماری کے نچلے خانے میں میرا سیاہ بیگ رکھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" انجیلو نے پوچھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کی فریم شدہ تصویر تھی۔

"کیا یہ تم ہو ڈورلنڈا؟ مجھے یہ تصویر بستر کے نیچے فرش پر سے ملی ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ حالانکہ میں نے اپنے کمرے کی ساری چیزیں سمیٹ لی تھیں لیکن بستر کے نیچے میرا دھیان نہیں گیا۔ "ہاں، یہ میں ہی ہوں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے تصویر لیتے ہوئے کہا۔ "یہ میری شادی کی تصویر ہے۔ دس سال یا اس سے بھی زیادہ پرانی بات ہے۔"

ٹونی اور جیکی بھی میرے قریب آکر کھڑے ہوگئے۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے شادی کا سفید جوڑا پہن رکھا تھا اور آج کے مقابلے میں

کہیں زیادہ جوان اور خوب صورت نظر آرہی تھی جبکہ میرا شوہر اسٹیو سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آرہی تھی۔

"تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" ٹونی بے ہودہ انداز سے مسکراتے ہوئے بولا۔

جیکی نے متجسس انداز میں پوچھا۔ "تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔ اس کے بال بہت چھوٹے لگ رہے ہیں؟"

"وہ فوج میں تھا۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اب وہ کہاں ہے؟" جیکی نے کہا۔ "کیا کسی دوسرے ملک گیا ہوا ہے؟"

میں نے وہ تصویر کچن کی دراز میں رکھی اور بولی۔ "وہ افغانستان کی جنگ میں مارا گیا۔"

ان تینوں نے احتراماً سر جھکا لیا اور مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ دن بھر جاری رہا۔ ٹین کی چھت پر بارش کے قطروں کی آواز ان لوگوں کے لیے یقیناً ناگواری کا باعث ہوگی جو اس کے عادی نہیں ہوتے اور یقیناً میرے بن بلائے مہمانوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ جوں جوں بارش تیز ہوتی گئی ان کا موڈ بھی لحہ بہ لحہ بگڑتا گیا۔ میں نے ان سے دور رہنے کی پوری کوشش کی لیکن لگتا تھا کہ ان تینوں کے درمیان میری نگرانی کے حوالے سے کوئی خفیہ سمجھوتا ہو چکا تھا۔ میں جب بھی کیبن سے باہر نکلتی تو ان میں سے کوئی نہ کوئی میرا تعاقب کرتا۔ یہاں تک کہ اگر پورچ میں جاتی تو وہاں بھی ان کا ایک نہ ایک ساتھی موجود ہوتا۔

میں نے دن کا بیشتر حصہ کاؤچ پر بیٹھے لیٹے اور جیمس کلیول کی کتاب پڑھتے ہوئے گزارا۔ میرے ذہن میں بار بار یہی سوچ ابھر رہی تھی کہ اس صورتِ حال سے کس طرح نمٹا جائے۔ میری شدت سے خواہش تھی کہ کمرے میں جا کر اپنا بیگ لے آؤں لیکن میرے بیڈروم میں انجیلو نے ڈیرا جما رکھا تھا اور دن کا بیشتر وقت اس نے کمرے میں ہی گزارا۔ ٹونی اور جیکی تاش کھیل رہے تھے۔ ایک مرحلے پر ٹونی نے جیکی پر بے ایمانی کرنے کا الزام لگایا لیکن جیکی نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ ٹونی نے ایک بار پھر اپنا الزام دہرایا جس پر جیکی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے دماغ کا علاج کروائے۔ اس پر ٹونی کو غصہ آگیا اور اس نے جیکی کی ماں کی شان میں گستاخی کر دی۔

بس پھر کیا تھا۔ میدانِ کارزار گرم ہوگیا۔ جیکی نے غصے میں آ کر میز الٹ دی اور ان کے درمیان اطالوی زبان میں گالیوں کا تبادلہ شروع ہوگیا۔ ان کی چیخ و پکار سن کر انجیلو بھی کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے اطالوی زبان میں کچھ کہا اور وہ دونوں ایک دم ہی خاموش ہوگئے۔ جب ان کی گالم گلوچ جاری تھی تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ ان میں سے کون زیادہ خوفناک ہوگا لیکن انجیلو کی مداخلت کے بعد مجھے اس کا جواب مل گیا۔ جس طرح اس نے ان دونوں کو خاموش کردیا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہی ان تینوں میں سب سے زیادہ خوفناک اور دبدبے والا ہے۔

دوپہر کے کھانے میں سینڈوچز پر گزارا کرنا پڑا جبکہ رات کے کھانے کے لیے میں نے ٹن میں پیک گوشت گرم کر کے ان کے سامنے رکھ دیا۔ دن بھر بارش ہوتی رہی لیکن انہیں جس شخص رانسن کا انتظار تھا، وہ نہیں آیا۔ ان کی جھنجلاہٹ بڑھتی جارہی تھی اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے مسلسل باتیں کررہے تھے لیکن جب میں ان کے قریب ہوتی تو وہ خاموش ہو جاتے۔ ایک بار مجھے رفع حاجت کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش آئی تو میں نے برساتی سر پر ڈالی اور چپکے سے کھسک گئی لیکن وہ بھی غافل نہیں تھے۔ جیکی فوراً ہی میرے پیچھے چل دیا۔ اس نے ہارڈ بورڈ کا ایک ٹکڑا اپنے سر پر چھتری کی طرح تان لیا تھا۔

جب میں فارغ ہو کر باہر آئی تو جیکی نے اپنی نظریں مجھ پر جما دیں۔ میں نے بھی جواباً اسے گھورنا شروع کر دیا۔ گھر کے عقب میں ایک پگڈنڈی نظر آرہی تھی جیکی کی نظر اس پر نہیں گئی بلکہ وہ مجھ پر توجہ دے رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"یہ کتنی گندی جگہ ہے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو تم یہاں کے منیجر کو ایک گالیوں بھرا خط بھیج دو۔" میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

اس نے اچانک ہی میرا بازو پکڑ لیا اور بولا۔ "تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتی ہو؟"

"ہاں، بہت زیادہ۔"

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے، ہم بھی دیکھیں گے کہ تم کتنی ہوشیار ہو۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے برتن دھوئے اور جیکی نے ریڈیو سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ وہ بار بار سوئی گھماتا اور وہ کسی نہ کسی نیوز اسٹیشن پر رک جاتی جہاں سے فرانسیسی زبان میں گانے اور خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ ٹونی کچن ٹیبل پر بیٹھا ہوا اکیلے ہی تاش کے پتوں سے کھیل رہا تھا جبکہ انجیلو کھانا کھانے کے بعد دوبارہ میرے

کمرے میں آرام کرنے کے لیے جا چکا تھا۔

جیکی بولا۔ ”سورج غروب ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر میں سگنل صاف سنائی دینے لگیں گے اور نیویارک کا کوئی اسٹیشن لگ ہی جائے گا۔“

ٹونی اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس تمہارے پاگل پن کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

میں نے جیسے ہی تولیے سے ہاتھ صاف کیے، مجھے ریڈیو پر نیویارک اسٹیشن کا ایک صاف سگنل سنائی دیا۔ جیکی چلاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ ہمیں جلد ہی کوئی نہ کوئی اسٹیشن مل جائے گا۔“

”اچھا اب زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔“ ٹونی بولا۔ ”اب خاموش ہو جاؤ تاکہ ہم ریڈیو سن سکیں۔“

اتفاق سے اس وقت ایک نیوز بلیٹن نشر ہو رہا تھا۔ اناؤنسر نے نیویارک سٹی پارک ڈپارٹمنٹ کے ایک اسکینڈل کے بارے میں رپورٹ سناتے ہوئے کہا۔ ”مین ہٹن ڈسٹرکٹ اٹارنی اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے ان تین افراد کی تلاش میں ہیں جن کی گزشتہ ہفتے نشاندہی ہوئی تھی۔ یہ لوگ قتل، بھتا خوری اور سود خوری جیسے جرائم میں ملوث ہیں۔ ان کے نام انجیلو روزی، جیکی پالمبو اور ٹونی کرالنڈی ہیں۔“

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خبریں ختم ہو گئیں تو ٹونی نے ایک گہری سانس لی اور جیکی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ پُرسکون ہو گیا تھا اور چند لمحے پہلے چھائی ہوئی بے چینی اب نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ریڈیو پر خبروں کی جگہ بیس بال سے متعلق کوئی پروگرام شروع ہو گیا تھا۔

اس رات میں سونے سے پہلے ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ میرے کانوں میں ٹونی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو خوش کرنے کے لیے میرے بارے میں فحش مذاق کر رہا تھا جسے سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس سے براہِ راست نہیں الجھ سکتی تھی لیکن میں نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری صبح میں نے انہیں ناشتے میں صرف ٹھنڈا دلیا دیا جس کے ساتھ دودھ، کافی یا جوس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو کوئی کچھ نہ بولا لیکن جب میں برتن دھو رہی تھی تو ٹونی میرے پاس آیا اور بولا۔ ”یہ سب کیا تھا؟“

”یہ میری طرف سے ایک اشارہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہاں تم لوگوں کی تفریح یا خوشی کے لیے نہیں بیٹھی ہوں۔“

وہ بے ہودہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم یہاں اس لیے ہو کہ ہم تمہیں یہاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم نے انجیلو کو دیکھا ہے۔ وہ میری نظر میں ہوشیار ترین شخص ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ وہ اتنا ذہین ہے کہ میلوں دور بیٹھ کر بھی چھوٹے سے چھوٹا اور مشکل ترین مسئلہ حل کر سکتا ہے اور اسی لیے وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔“

”واقعی بہت ذہین ہے۔“ میں نے طنزاً کہا۔ ”شاید یہی وجہ ہے کہ تم تین دن سے اس پُراسرار شخص رابنسن کے آنے کا انتظار کر رہے ہو۔“

”وہ آئے گا۔“ ٹونی نے کہا۔ ”ایسے کاموں میں احتیاط تو کرنا پڑتی ہے۔“

میں نے کیبنٹ کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جھیل مین اور کیوبک کے درمیان سرحد کا کام کرتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ رابنسن تم لوگوں کو کشتی کے ذریعے کیوبک لے جائے گا۔ جہاں پہنچ کر تم لوگ جعلی کاغذات بنواؤ گے اور کیوبا یا وینزویلا چلے جاؤ گے کیونکہ ان دونوں ملکوں کے ساتھ تحویلِ ملزمان کا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تم ایک ٹیچر کے مقابلے میں بہت زیادہ سوچتی ہو۔“ وہ اب بھی بے ہودگی سے مسکرا رہا تھا۔ ”مجھے تو تمہاری اصلیت پر شبہ ہونے لگا ہے۔“

”تمہیں شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ آئندہ اس سے بہتر کارکردگی دکھا سکوں۔“

”اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ جانے تمہیں اس کا موقع کب ملے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ البتہ میں کچن میں ہی رک گئی۔ میں وقفے وقفے سے ان تینوں کی جانب دیکھ رہی تھی جو بہ آوازِ بلند اطالوی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ ان کا غصہ اور مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنی باتوں کے دوران انہوں نے مجھے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا اور یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا۔

میں نے انہیں باتوں میں مصروف دیکھ کر ایک چاقو اٹھایا اور دبے پاؤں چلتی ہوئی فریج کے پیچھے چلی گئی پھر میں نے بڑی آہستگی سے ربر کا پائپ کاٹ دیا جو پروپین ٹینک سے منسلک تھا۔ فوراً ہی اس پائپ سے گیس نکلنے لگی۔ میں زور زور سے چلانے لگی۔ ”جلدی باہر نکلو گیس لیک ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی دھماکا ہو جائے۔“

انہوں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ گیس کی بو بڑی

ناگوار تھی اور اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹونی اور جیکی اتنی جلدی میں تھے کہ اٹھتے وقت ان کی کرسیاں آپس میں ٹکرا گئیں پھر انہوں نے وفادار ملازموں کی طرح انجیلو کے بازو پکڑے اور اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے بیڈروم میں گئی۔ الماری سے بیگ نکالا۔ کمرے کی کھڑکی کھولی اور باہر چھلانگ لگا دی۔ عقبی حصے میں زمین پر ہلکی ہلکی گھاس اگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے چوٹ نہیں آئی۔ میں آہستہ سے اٹھی۔ اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کچھ رسیدیں نکال کر لائٹر سے جلا دیں پھر میں کھلے ہوئے بیگ کے ساتھ اس پگڈنڈی کی جانب بڑھنے لگی جو کھڑکی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ تبھی میں نے اپنے عقب میں ایک آواز سنی۔

”اے، تم کہاں جا رہی ہو؟“

میں نے گھوم کر دیکھا، وہ جیکی تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے بغل میں لٹکے ہوئے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے بڑی سرعت کے ساتھ بیگ میں سے اپنا دس ایم ایم کا ریوالور نکال لیا اور جیسے ہی جیکی نے ہولسٹر میں سے پستول نکالا، میں نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں۔ اس نے ایک زوردار چیخ ماری اور پیچھے کی طرف جا گرا۔ میں نے فوراً ہی پگڈنڈی کی جانب دوڑ لگا دی۔ مکان کی عقبی کھڑکیوں سے شعلے اور دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

اس پگڈنڈی کا اختتام جزیرے کے دوسری طرف ایک الگ تھلگ اور پُرسکون تالاب پر ہوتا تھا جہاں میری چھوٹی سی نیلے رنگ کی کشتی اور چپو گزشتہ چند روز سے موجود تھے۔ میں نے اپنے تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ اس کشتی کو گودی میں کھڑا کرنا مناسب نہیں۔ میں نے اپنا بیگ کشتی میں رکھا۔ اس کی رسیاں کھولیں اور زور زور سے چپو چلاتی ہوئی جزیرے اور ان تین بدبختوں سے دور ہوتی چلی گئی۔ شاید میں غلط کہہ گئی۔ اب وہ تین نہیں بلکہ دو رہ گئے تھے۔ کیونکہ میں نہیں سمجھتی کہ دو گولیاں کھانے کے بعد جیکی دوبارہ کھڑا ہونے کے قابل ہو سکے گا۔

میں تیزی سے چپو چلاتی ہوئی مشرق کی جانب بڑھنے لگی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دھوئیں کے بادل بلند ہوتے جا رہے تھے۔ بارشوں کی وجہ سے موسم مرطوب ہو گیا تھا۔ اس لیے مجھے یہ پریشانی نہیں تھی کہ یہ آگ پھیل کر قریبی جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے سکے گی پھر اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے تیزی سے جزیرے کے گرد ایک چکر لگایا اور واپس گودی کی طرف آ گئی۔ کاٹیج پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا لیکن مجھے صرف امتحانی کاپیوں کی فکر تھی جو میں اپنے ساتھ چیک کرنے کے لیے لائی تھی۔ حالانکہ میرے لیے ان کی نقول حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ واپس جا کر یہ نقول حاصل کروں اور ان پر دوبارہ نمبر لگاؤں۔ میں کشتی کو گودی کے قریب لے آئی۔

میں نے دیکھا کہ ایک سایہ لڑکھڑاتا ہوا چٹانوں کی طرف آ رہا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”ٹونی“ یہ کہہ کر میں نے ہاتھ ہلایا اور چپو چلاتی ہوئی کشتی کو اس کے بالکل قریب لے گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا تھوڑا سا آگے آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کی قمیص اور پتلون کئی جگہ سے جھلس گئی تھی اور چہرہ کالک سے اٹا ہوا تھا۔

”ہائے ٹونی۔“ میں نے بہ آوازِ بلند اسے پکارتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دن کیسا گزر رہا ہے؟“

وہ مجھے انگریزی اور اطالوی زبان میں کوسنے اور بددعائیں دینے لگا۔ اگلے پانچ منٹ تک میں اس کی مغلظات سنتی رہی جب وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں بولی۔ ”انجیلو کیسا ہے؟“

”اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ دھماکے کی وجہ سے لکڑی کا ایک بڑا ٹکڑا اڑتا ہوا اس کے سر کے پچھلے حصے میں آ کر لگا اور وہ پتھروں پر گر گیا۔ اب اس سے ٹھیک طرح سانس بھی نہیں لی جا رہی۔ جیکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔“

”وہ جزیرے کی دوسری طرف جانے والی پگڈنڈی پر پڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے گولی مار دی تھی۔“

ایک بار پھر اس نے مجھے گالیاں اور کوسنے دینا شروع کر دیے۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوا، میں بولی۔ ”ہاں، میں نے اس پر دو فائر کیے تھے۔“

”کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ زور سے چلاتے ہوئے بولا۔

”اس لیے کہ بعض اوقات ایک گولی سے آدمی نہیں مرتا صرف زخمی ہو جاتا ہے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے میں نے اس پر دو مرتبہ گولی چلائی۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس بار اس نے گالیوں اور کوسنے دینے سے اجتناب کیا۔ البتہ چند قدم لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ ”تم آخر کون ہو؟“

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ایک معمولی ٹیچر۔ تم جیسے ہوشیار لوگوں نے میرے بارے میں یہی اندازہ لگایا تھا۔ میرا نام ڈورلنڈا کیپٹن ہے اور واقعی میں ٹیچر ہی ہوں لیکن میرے کام کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔ دراصل میں منی کرمنل جسٹس اکیڈمی میں انسٹرکٹر ہوں اور ریاستی پولیس میں میرا عہدہ کیپٹن کا ہے لیکن تم جیسے ہوشیار لوگ میری حقیقت سے واقف نہ ہو سکے۔''

''لیکن تم نے اپنے گھر کو آگ کیوں لگائی؟''

''یہ میرے سابق شوہر کا مکان ہے جو اس نے طلاق کے بعد مجھے دیا تھا۔ یہ مکان مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا اور اب میرے پاس اس کی دوبارہ تعمیر کا جواز موجود ہے۔''

''لیکن تم نے تو ہمیں بتایا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔''

''میں نے جھوٹ بولا تھا تاکہ بیوہ سمجھ کر تم میرے ساتھ زیادتی نہ کرو۔''

ٹونی دم بخود کھڑا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے میرا یہ روپ ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے اپنا ریوالور نکالا اور بولی۔ ''تم اتنا بھی نہیں دیکھ سکے کہ تمہاری آنکھوں کے سامنے کیا ہو رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں اس جزیرے پر کیسے آئی اور یہاں تنہا بیٹھی کیا کر رہی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ تم کیوبک جانے کے لیے اسی جزیرے پر آؤ گے۔''

ٹونی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے زخمی بازو سے پستول نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس میں کامیاب تو ہو گیا لیکن اس کی انگلیاں ساتھ نہ دے سکیں اور پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ میں نے زمین پر پڑے ہوئے پستول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم سیدھا ہاتھ استعمال کرتے ہو اور تمہارے زخمی بازو کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم مجھے نشانہ بنانے کے قابل نہیں ہو۔ تم اس سے سمجھ سکتے ہو کہ میں کتنی باریک بین ہوں۔''

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔''

میں نے پانی میں زور سے چپو مارتے ہوئے اپنے غصے کا اظہار کیا اور بولی۔ ''جب تم نے پہلی ملاقات میں میرے نام کا مذاق اڑایا تو مجھے بہت برا لگا تھا۔ شاید تم نہیں جانتے کہ میری دادی کا نام بھی ڈورلنڈا تھا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں فیری پائلٹ تھی اور اس نے بمبار طیارہ اڑایا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد اس نے نیو میکسیکو میں مویشی فارم کھولا۔ ہالی ووڈ کی کچھ فلموں میں کرتب دکھائے اور اس کے بعد ورجینیا کی ڈپٹی شیرف بن گئی۔ تم خوش قسمت ہو کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ورنہ تم تینوں زندہ نہ رہتے۔''

میں نے اپنی کشتی کو کھلے پانی کی طرف موڑا اور اس ساحلی پٹی کی جانب روانہ ہو گئی جہاں چند روز قبل اپنی فورڈ کار کھڑی کی تھی۔ ٹونی بے بسی سے چلایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور بہ آوازِ بلند بولی۔ ''پریشان مت ہو۔ اگر میں نے تمہارے ساتھی رابنسن کو اس راستے پر آتے ہوئے دیکھا تو اسے بتا دوں گی کہ تم لوگ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہو کیونکہ ان سرد راتوں میں خوراک اور چھت کے بغیر تم کتنی دیر زندہ رہ سکو گے۔ تم جیسے لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔''

میں نے پوری طاقت سے چپو چلانا شروع کر دیے۔ میں جلد از جلد اس جزیرے، چیختے ہوئے کاتج اور ان بن بلائے مہمانوں سے دور ہونا چاہتی تھی۔ جب ٹونی کی آوازیں آنا بند ہو گئیں تو میں نے سوچا کہ اب مجھے فون کر کے متعلقہ حکام کو بتا دینا چاہیے کہ اس جزیرے پر کیا ہوا، اور اب وہاں کون لوگ اپنی متوقع موت کا انتظار کر رہے ہیں لیکن اگر پولیس نے موقع پر پہنچ کر انہیں گرفتار کر لیا تو وہ مرنے سے بچ جائیں گے۔ ان کی زندگی میں مزید کچھ دنوں، مہینوں یا سالوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ پھر مقدمہ چلے گا۔ جیوری بیٹھے گی اور کوئی ہوشیار وکیل انہیں سزا سے بچائے گا۔ کم از کم انہیں موت کی سزا نہیں سنائی جائے گی۔ اگر سزا ہوئی تو وہ زیادہ سے زیادہ پانچ دس سال جیل میں رہیں گے جبکہ میں انہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے میری اور میری دادی کی بے عزتی کی تھی۔ وہ صرف قانون کے ہی نہیں میرے بھی مجرم تھے۔ میں چاہتی تو انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی لیکن مجھے اپنے ہاتھ خون سے رنگنا پسند نہیں۔ لیکن میں نے ایسا انتظام ضرور کر دیا تھا کہ وہ اس ویران جزیرے پر بھوکے پیاسے ایڑیاں رگڑتے ہوئے مر جائیں۔ اس لیے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔

کشتی منزل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں کشتی سے اتر کر اپنی کار کی جانب بڑھی اور اب مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ پولیس کو اطلاع دوں یا خاموش رہوں۔ میں جانتی تھی کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہوگا۔

محی الدین نواب

مسیحا

دوسرا حصّہ

انسان کی حیثیت محض پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے سمندر کے جھاگ کی طرح ہے... جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں... بالکل اسی طرح ہماری زندگیاں، موت کے ہاتھوں بکھر جاتی ہیں... گزرنے والے ماہ وسال جاودانی زندگی کے سامنے ایک لمحے سے زیادہ کچھ نہیں... مادے کی یہ دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے... اس بیداری کے مقابلے میں ایک خواب کی طرح ہے... ہمارے قہقہے کی صدائیں... اور ہر آہ جو ہمارے دلوں کی گہرائی سے نکلتی ہے... ان کی صدائے بازگشت کہیں اور محفوظ ہو رہی ہوتی ہے... فرشتے غم کے بہائے ہوئے ہر آنسو کا حساب رکھتے ہیں... آج جس عمل کو ہم احساسِ جرم کی وجہ سے کمزوری سمجھتے ہیں، وہ کل کو انسانی زندگی کی مکمل زنجیر میں ایک اہم کڑی بن کر ظاہر ہوتا ہے... ایسے ہی چہروں سے نقاب اٹھاتی کہانی کے نشیب و فراز... جو اپنے مفادات کی خاطر دین کو محض ایک ڈھونگ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں... ان کے اندر ہوس اور تکبر دونوں اس طرح یکجا ہیں جیسے انہوں نے اسی خمیر سے جنم لیا ہو... ناکارہ... ناپسندیدہ اور فرسودہ نظامِ سیاست اور ان کے منتخب کردہ بے ایمان اور بے ضمیر چہروں کے گھناؤنے کارناموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ...

طلسمی طاقت رکھنے والے دو فرشتوں کی بلند سرحدی... ایمان... اقتدار اور محبت کی درد مسیحائی

دشمن عجیب انداز سے چپ چاپ للکار رہا تھا۔ جیسے گالیاں نہ دیتے ہوئے بھی گالیوں دے رہا تھا۔ طمانچے نہ مارتے ہوئے بھی منہ توڑ رہا تھا ہر طرح سے وہ ان کی زندگی کو دشوار بنا رہا تھا۔

معظم نے اعظم سے کہا۔ ''ہم کمزور اور بے بس نہیں ہیں۔ ابھی مجبوری ہے۔ چلو دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔ وہاں باتیں ہوں گی۔''

پھر اس نے بیوی سے کہا۔ ''تم تو اندر سے خوش ہو۔ وہ جوان بیٹی کے پاس بیٹھا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آرہی ہے۔ ابھی دیکھ لینا، اس کمبخت کے یہ جادوئی ہتھکنڈے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔''

وہ دونوں وہاں سے جانے کے لیے آگے بڑھے، انہوں نے رک کر دیکھا۔ خالی کرسی اپنی جگہ سے یوں سرک گئی جیسے وہاں بیٹھنے والا بھی ساتھ چلنے کے لیے اٹھ گیا ہو۔

ان دونوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ نظر آتا تو اسے کچھ کہا جاتا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ کرسی کیوں سرک گئی تھی؟ وہ اسے نظر انداز کر کے ڈائننگ روم سے باہر جانے لگے پھر دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ باہر جانے کے لیے دروازہ خود بخود کھل گیا۔

انہوں نے ایک جھٹکے سے سر گھما کر بیٹی اور خالی کرسی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بے نیازی سے چائے پی رہی تھی۔ جیسے وہاں ہونے والے تماشے سے بے خبر ہو۔ نہ دیکھ رہی ہو، نہ کچھ سمجھ رہی ہو۔ شاید وہ دشمن اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

وہ دونوں وہاں سے پلٹ کر کھلے ہوئے دروازے

سے گزر کر ایک سمت جانے لگے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے لگے۔ ایک نے سر گھما کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے؟''

دوسرے نے کہا۔ ''شاید نہیں ہے۔ وہاں تاباں کے ساتھ چائے پی رہا ہے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے بیڈ روم کے دروازے پر آئے۔ انہیں اندر جانا تھا۔ معظم نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ خود بخود کھلتا چلا گیا۔

دونوں کے منہ دروازے کی طرح کھلے رہ گئے۔ یقین ہو گیا کہ نادیدہ دشمن ان کے پاس ہی موجود ہے۔ وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ انہیں تنہائی میں باتیں نہیں کرنے دے گا۔

ایک نے غصے سے چیخ کر کہا۔ ''یہ کیا بدمعاشی ہے؟ ہمارے سامنے آؤ۔''

دوسرا بھی تلملا کر بولا۔ ''ہم ایسے کالے جادو کی دھونس میں نہیں آئیں گے۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتے ہیں۔''

معظم نے کہا۔ ''ربانی! رحمانی! عقل سے کام لو۔ پیار و محبت سے دوستانہ ماحول میں رشتے داری کرو۔ میں تمہیں بیٹی دینے کے لیے تیار ہوں۔ کچھ اپنی شرائط منواؤ۔ کچھ ہماری شرائط مانو۔ دونوں ہاتھوں سے تالی بجاؤ گے تو بجے گی۔ ورنہ جان لیوا دھماکے ہوں گے۔ صرف ہمیں ہی نہیں تمہیں بھی نقصان پہنچے گا۔''

دوسری طرف خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو۔ وہ دونوں پاؤں پٹختے ہوئے ڈائننگ روم میں واپس آئے۔ باپ نے بیٹی سے کہا۔ ''اس کمبخت سے کہو ہمارے پیچھے نہ آئے۔''

تاباں نے کہا۔ ''آپ ہی نے پیچھے لگایا ہے۔ اپنے گارڈز کو حکم دیں کہ یہاں سے جانے کی اجازت دیں۔ پھر دیکھیں' یہ ابھی چلے جائیں گے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ ہم نے اس پر نہیں، تم پر پابندی عائد کی ہے۔ تم باہر نہیں جا سکتی ہو۔''

''یہ تو مجھ سے بندھے ہوئے ہیں۔ میں یہاں رہوں گی تو یہ بھی یہیں بندھے رہیں گے۔''

اس نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے خالی کرسی پر ایک نظر ڈالی اور گرجتے ہوئے بولا۔ ''تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں یہیں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔''

''آپ خواہ مخواہ چیخ رہے ہیں۔ میں نے کب کہا ہے کہ کہیں جا رہی ہوں۔ جب تک آپ حکم نہیں دیں گے، میں اسی چاردیواری میں رہوں گی۔''

وہ گھور کر اسے دیکھنے لگا۔ اس چاردیواری میں رہنے کا مطلب یہ تھا کہ دشمن بھی اسی کے ساتھ رہے گا۔ وہاں سے نہیں ٹلے گا اور وہ حکمران رازداری سے بات نہیں کر سکیں گے۔

ان کی آزادی اور خود مختاری ختم ہو گئی تھی۔ ایک نادیدہ دشمن ان کے ایک ایک لمحہ کا مالک بن گیا تھا۔ وہ جہاں جاتے' جو کرتے' وہ دشمن سے پوشیدہ نہ رہتا۔ اس نے بیٹی کو قیدی بنا کر خود ہی نادیدہ زنجیریں پہن لی تھیں۔

اعظم خان نے اپنے رفیق کے قریب جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''فی الحال اس کمبخت سے نجات حاصل کی جائے۔ تاباں کو باہر جانے کی اجازت دیں۔ وہ بھی چلا جائے گا۔''

وہ جھکنا اور شکست تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی لیکن اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ بیٹی کو قید کرنے والا خود ایک قیدی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے بے بسی سے تاباں کو دیکھا پھر غصہ برداشت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اپنے بوائے فرینڈ کے ہاتھوں باپ کو ذلیل کرو گی۔ میں تمہاری آزادی بحال کر رہا ہوں۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔''

وہ بیٹی سے منہ پھیر کر اعظم خان کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ کان لگا کر سن گن لیتے رہے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی موجودگی اور عدم موجودگی کو سمجھنے کی کوششیں کرتے رہے۔ پھر اطمینان ہوا کہ بیٹی اسے آنچل میں لپیٹ کر لے گئی ہے۔

☆☆☆

سرحد ٹاؤن میں کئی ممالک کے نمائندے آئے ہوئے تھے۔ اس مثالی شہر کو دیکھنے کے لیے دنیا کے ہر شعبے سے معروف ہستیاں آتی رہتی تھیں۔ بے شمار اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے اس ٹاؤن کو خوب شہرت حاصل ہو رہی تھی۔ جیسے سات عجائب دیکھنے کے لیے لوگ جوق در جوق آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سرحد ٹاؤن میں بھی سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان سیاحوں کے ذریعے لاکھوں روپے کا زرمبادلہ حاصل ہونے لگا تھا۔

سرحد ٹاؤن میں سات عجوبے نہیں تھے لیکن وہ ایک عجائب خانہ بن گیا تھا۔ وہاں کی عجیب بات یہ تھی کہ اس شہر

میں نہ پولیس تھی، نہ تھانہ اور جیل خانہ تھا۔ کہیں ٹریفک کے سپاہی بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہاں لوگوں سے غلطیاں ہوتی تھیں لیکن غلطیاں کرنے والوں کو کوئی سپاہی نہیں پکڑتا تھا۔ محلے پڑوس کے لوگ ہی خطائیں کرنے والوں کا محاسبہ کرتے تھے۔ اگر معاملہ پیچیدہ ہوتا تو مجرموں اور گناہ گاروں کو عوامی عدالت میں پہنچایا جاتا تھا۔ اس عدالت میں دو جج آدم ربانی اور آدم رحمانی گیارہ جیوری کے ساتھ بیٹھ کر فیصلہ کرتے تھے۔

وہ دونوں اگرچہ نادیدہ رہتے تھے لیکن اہم معاملات میں رُو برو آکر مسائل حل کرتے تھے۔ غیر ممالک کے اخباری رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کے سامنے آکر انٹرویو دیتے تھے لیکن ان کے کیمروں کی آنکھوں میں ان دونوں کی تصویریں نقش نہیں ہوتی تھیں۔ ایسی حالت میں دنیا جہان کے مصوران کی قلمی اور روغنی تصویریں بنانے لگے تھے۔

وہ ایسے عجیب و غریب اور پُرکشش تھے کہ ملنے والے اور دیکھنے والیاں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ انہیں دیکھنے کے لیے حسینوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ان باؤلی حسیناؤں کو اکثر مایوسی ہوتی تھی۔ کیونکہ شاذ و نادر ہی ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

بے حد و حساب دولت اور طاقت رکھنے والے اس فکر اور تجسس میں مبتلا رہتے تھے کہ وہ دونوں ان سے برتر ہیں یا کمتر؟ وہ اپنی برتری جتانے کے لیے ان سے ملنا چاہتے تھے۔ لیکن ربانی اور رحمانی ایسے لوگوں کو غیر ضروری سمجھ کر ملنے سے کتراتے تھے۔

ربانی اور رحمانی کے مشیر اور دستِ راست ان کے ای میل اٹینڈ کرتے تھے۔ ان میں سے جو انتہائی ضروری ہوتے تھے اور وہ دونوں جنہیں واقعی وہ ضروری سمجھتے تھے اس کا جواب دیتے تھے۔

ایک دستِ راست نے ایک ہفتہ قبل ان سے کہا تھا۔ ”سر! ایک لڑکی نے اپنا ایک پیغام ارسال کیا ہے۔ وہ آپ سے ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔“

رحمانی نے پوچھا۔ ”کیا وہ ایسی اہم ہے کہ ہمیں اس سے بات کرنی چاہیے؟“

دستِ راست نے کہا۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حیران ہوں کہ اس کی اہمیت سمجھے بغیر کیوں اس کی سفارش کر رہا ہوں۔“

ربانی نے پوچھا۔ ”کوئی تو بات ہوگی جو تم بے اختیار اس کی باتیں کر رہے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”سر! اس کے پیغام میں مہاتما بدھ کا ایک قلمی خاکہ ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا جیسے مہاتما کے پیچھے نور کا ہالا ایک اشارے کی طرح روشن ہو کر بجھ گیا ہو۔“

رحمانی نے پوچھا۔ ”کیا اس کے بعد بھی وہ ہالا روشن رہا؟“

”جی نہیں۔ وہ خاکہ ساکت ہی رہا۔“

”تو پھر وہ فریبِ نظر تھا۔ کبھی کبھی ذہنی رو نگاہوں کے سامنے منظر بدل دیتی ہے۔ اس نے پیغام کیا دیا ہے؟“

”اس نے لکھا ہے 'میرا نام ورشا ہے... ورشا سدھارت اور سدھارت مہاتما بدھ کا پیدائشی نام ہے۔ میں نے ایک بھکشو بیٹی بن کر مہاتما کا نام اپنے نام سے جوڑ لیا ہے۔ مجھ سے باتیں کرو تمہارا کلیان ہوگا۔“

ربانی اور رحمانی بوستانی قوم کا کلیان کرنے آئے تھے اور وہ لڑکی ان دونوں کی فلاح و بہبود چاہتی تھی۔

ایسی کتنی ہی لڑکیاں طرح طرح کی باتیں بنا کر متاثر کن پیغامات ارسال کرتی رہتی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح اپنی طرف مائل کر کے دوستی کرنا چاہتی تھیں۔

انہوں نے دوسروں کی طرح ورشا کو بھی نظر انداز کر دیا۔ وہ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ان کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ وہ دن رات مصروف رہتے تھے۔ تاباں کے سوا کسی اور کو اہمیت دینے کا وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ تاباں کے ساتھ بھی آزادی سے وقت نہیں گزار رہے تھے۔ مختلف پروجیکٹس میں کام کے دوران میں ساتھ رہتا تھا۔

اس رات ربانی اور رحمانی نے ایک جیسا خواب دیکھا۔ انہیں ایک نیم تاریک غار میں بڑے بڑے پتھر اور بلند و بالا چٹانیں دکھائی دیں۔ وہ ایک چٹان کی بلندی پر مہاتما بدھ کی طرح آسن جمائے بیٹھی تھی۔

غار کی نیم تاریکی میں اس کی صورت اور شخصیت واضح نہیں تھی۔ اس کے آسن سے تپسیا سے اور دھیان گیان کے انداز سے خیال آیا کہ وہ ای میل کے راستے آنے والی عظیم بدھا کی بیٹی ہے۔

غار کے بھاری بھرکم پتھروں اور چٹانوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ برف کی دھیمی دھیمی سی چمک میں مہاتما کی بھکشو بیٹی عبادت میں مصروف تھی۔ اس کی زلفیں رہ رہ کر ہوا کی زد میں لہرا رہی تھیں۔ وہ عجیب سا پُراسرار خاموش منظر تھا۔

وہ بڑی خاموشی سے خواب کے منظر میں متعارف ہو رہی تھی۔ کچھ نہ بولنے کے باوجود سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ ورشا سدحارت ہے۔ دھیمے دھیمے مترنم سے گنگناتے ہوئے الفاظ سنائی دیے۔ وہ بول رہی تھی۔ ''تاباں...!''

وسیع و عریض غار کے خالی گنبد میں وہ نام گونجنے لگا۔

''تاباں۔ یاں... باں... آں... آں... آں...''

گونج دھیمی ہوئی تو لفظ پھر گونج اٹھے۔ ''تاباں۔ رسوائیاں... تاباں۔ رسوائیاں۔ وایاں... وایاں... آں... آں...''

تاباں کا نام اس برفانی غار میں گونج رہا تھا۔ اس البیلی کے وجود نے اور اس کی پیاری سی شخصیت نے ربانی اور رحمانی کے خواب میں بھی دھوم مچا رکھی تھی۔ وہی نام ایک جگنشو ورشا کی زبان سے نکل کر خوابوں میں گونج رہا تھا۔

وہ نام پھر ابھرا۔ ''تاباں۔ بھول بھلیاں۔ بھولیاں... لیاں... لیاں... آں... آں...''

ایک تو وہ نام میٹھے خنجر کی طرح دل میں پیوست رہتا تھا۔ پھر اس کی گونج میں عجیب سی کشش تھی۔ خواب کا منظر بڑے جذبوں سے لرز رہا تھا۔ اپنی سمت کھینچ رہا تھا۔ خبردار کر رہا تھا کہ تاباں کے ساتھ رسوائیاں ہیں۔

وہ خواب کہہ رہا تھا کہ تاباں باعث رسوائی ہے۔ اور تاباں ایک بھول بھلیاں ہے۔ اسے پا کر بھی ڈھونڈتے ہی رہ جاؤ گے۔

اسی بھول بھلیوں کے چیلنج میں آنکھ کھل گئی۔ فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ وہ اپنے اپنے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ایک نے دوسرے کو خواب سنایا۔ دوسرے نے کہا۔ ''میں نے بھی من و عن یہی خواب دیکھا ہے۔''

''وہ وہی تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہاں وہی تھی۔ مہابدھ کی جگنشو بیٹی...''

''یہ کیا اسرار ہے؟''

''وہ ہم دونوں کے خوابوں میں بیک وقت آئی ہے۔''

''وہ چیلنج بن گئی ہے کہ ہم اسے اہمیت دیں گے اور اس سے ضرور بات کریں گے۔''

''کمال ہے۔ اس نے ہمارے اندر بے چینی پیدا کردی ہے۔ اس سے ملے بغیر بے تاب رہیں گے۔''

وہ اپنے اپنے باتھ روم میں شاور لینے گئے۔ غسل کے دوران وہ خواب والی رہ رہ کر تصور میں جھلکتی رہی اور تاباں سے نسبت رکھنے والی باتیں ذہن میں گونجتی رہیں۔

ربانی نے رحمانی سے کہا۔ ''پتا نہیں وہ جگنشو لڑکی کون ہے؟ تعجب ہے تاباں کا نام اس کی زبان پر کیسے آگیا؟''

''میں بھی حیران ہوں۔ اس جگنشو لڑکی نے تاباں کا نام لے کر رسوائی کی بات کیوں کی؟ وہ کیا کہنا چاہتی ہے؟''

جو سوال ان کے دماغوں میں گردش کر رہا تھا، اس کا جواب اسی لڑکی سے مل سکتا تھا۔

رسوائی کمانے والی بات درست تھی۔ جب وہ دونوں تاباں سے چھپ کر ملنے کے لیے اس کے گھر آئے تھے اور محلے والوں نے قدرتی خوشبو سے ان کی موجودگی کو تاڑ لیا تھا۔ تب سے چوری چھپے کی ملاقات رسوائیاں کما رہی تھی۔

نہ جانے ورشا کو ان کے ذاتی معاملات کا علم کیسے ہو رہا تھا؟ ویسے خواب درست ثابت ہوا تھا۔

رحمانی نے کہا۔ ''تعجب ہے۔ کیا وہ پہلے بھی ہمارے اور تاباں کے قریب آچکی ہے؟''

ربانی نے کہا۔ ''لڑکیاں بڑی چالباز ہوتی ہیں۔ ہمیں اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تاباں کا زائچہ بنا کر پیش گوئی کر رہی ہے یا اس کے اندر آتما شکتی ہے اور وہ پیش آنے والی باتیں پہلے سے کہہ دیتی ہے؟''

ربانی نے کہا۔ ''اس نے ایک اور پیش گوئی کی ہے۔''

رحمانی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اس نے تاباں کو بھول بھلیاں کہا ہے۔''

''ہاں یاد آیا۔ ذرا سوچو اس نے ایسا کیوں کہا ہے؟''

وہ سوچنے لگے۔ تاباں کو پیش نظر رکھ کر کئی پہلوؤں سے غور کرنے لگے پھر ایک نے کہا۔ ''ہم دو چاہنے والے ہیں۔ میرے لیے وہ ایک بھول ہے۔ کیونکہ تم اسے چاہتے ہو۔ تمہارے لیے ایک بھول ہے۔ کیونکہ میں اسے چاہتا ہوں۔ یا خدا... وہ ہماری بھلیوں میں رہے گی۔''

دوسرے نے تائید کی۔ ''ہم اس کی چاہت تو حاصل کرتے رہیں گے لیکن ہم میں سے کوئی اسے اپنا نہیں سکے گا۔ آخر تک وہ ہمیں حاصل نہیں ہوگی۔ ایک بھول بن کر رہے گی۔''

''لیکن مجھے یوں لگ رہا ہے۔ اس جگنشو لڑکی نے کسی اور معنی اور مفہوم میں اسے بھول بھلیاں کہا ہے۔''

''اس نے الجھا دیا ہے۔ ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ اس سے رابطہ کریں۔''

ربانی تاباں کے ساتھ شبیر آباد میں وقت گزار رہا

تھا۔ معظم خان اور اعظم خان کے پیلس میں ان سے نشست رہا تھا۔ اس نے رحمانی سے کہا۔ ''معظم نے اپنی بیٹی پر پابندی عائد کی تھی کہ نہ وہ ہم سے ملے گی نہ پیلس کے باہر کہیں جا سکے گی۔ میں نے اس مغرور کو پابندی ختم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب تاباں کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔''

رحمانی نے مسکرا کر کہا۔ ''آج پہلے دن وہ تمہارے ساتھ ہے۔ کل میرے ساتھ ہوگی۔ اس کے ساتھ رہنے سے یوں لگتا ہے جیسے زندگی بھرپور ہوگئی ہے۔''

''ہاں رحمانی! مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میں ابھی تاباں کو ورشا کے متعلق بتانے والا ہوں۔ تم ای میل کے ذریعے اس بھکشو لڑکی سے رابطہ کرو۔ تفصیلی معلومات حاصل کرو کہ وہ کون ہے؟ ہمارے اور تاباں کے معاملات میں اسے کیا دلچسپی ہے؟ یہ بھی ضرور معلوم کرو کہ وہ زائچے اور علم نجوم کے ذریعے معلومات حاصل کرتی ہے یا آتما شکتی جیسی پراسرار صلاحیت کی حامل ہے؟''

''میں ابھی معلوم کرکے تم سے رابطہ کروں گا۔''

رحمانی اپنی رہائش گاہ میں تھا۔ ایک ایزی چیئر سے اٹھ کر کمپیوٹر کے سامنے آکر بیٹھ گیا پھر اسے آپریٹ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس نے ورشا کو پیغام ارسال کیا۔ ''میں آدم رحمانی تم سے مخاطب ہوں۔ کیا ابھی باتیں ہوسکتی ہیں؟''

جواب موصول ہوا۔ ''سوری۔ بھکشو ورشا دھیان گیان میں ہیں۔ شاید آج شام تک رابطہ ہوسکے گا۔''

رحمانی نے ربانی سے فون پر کہا۔ ''وہ عبادت میں مصروف ہے۔ شاید شام کو رابطہ ہوسکے گا۔''

ربانی نے کہا۔ ''اس اجنبی لڑکی نے اچھا خاصا تجسس پیدا کر دیا ہے۔ اب وہ شام تک پھانس کی طرح چبھتی رہے گی۔''

رحمانی کسی اہم معاملے میں مصروف نہیں تھا۔ وہ شام تک وقت گزارنے کے لیے معظم خان کے پاس آگیا۔

☆☆☆

معظم اور اعظم نے پیلس کی بالکونی سے تاباں کو دیکھا۔ وہ احاطے میں کار کی اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ رہی تھی۔ اسی لمحے.... اس کے برابر والی سیٹ کا دروازہ خود ہی کھل گیا تھا اور پھر خود بخود بند ہوگیا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ربانی، تاباں کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا ہے۔

باپ نے مجبوراً بیٹی کو جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے ناگواری سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر اعظم خان سے کہا۔ ''اب یہ اطمینان رہے گا کہ وہ دشمن ہمارے سر پر تلوار کی طرح نہیں لٹک رہا ہے۔ ہم آزادی سے باتیں کرسکیں گے۔''

اعظم نے کہا۔ ''کامران سے بہت کام لیا جاسکتا ہے۔ ابھی ہم اس کے موکل کو ان کم بختوں کے پیچھے لگائیں گے۔''

''یہ عامل تو ہمارے گھر میں بیٹھا ہے۔ اس سے تھوڑی دیر بعد کام لیں گے۔ پہلے ملک وائٹ اسکائی اور بلیو اسکائی کے پریذیڈنٹ اور منسٹرز کو معلوم ہونا چاہیے کہ دشمن ہم پر کس طرح حاوی ہو رہے ہیں؟''

''بے شک ان سے اہم مشورے بھی ملیں گے اور ان کا عملی تعاون بھی حاصل ہوگا۔''

معظم نے فون کے ذریعے سمندر پار کے آقا سے رابطہ کیا۔ آقا کے پی اے نے پوچھا۔ ''یس مسٹر معظم خان؟''

معظم نے کہا۔ ''بہت سنگین معاملہ ہے۔ ہم پریذیڈنٹ روز ڈی ویلر سے براہِ راست گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔''

جواب ملا۔ ''پریذیڈنٹ بہت مصروف ہیں۔''

''آپ ہمارا پیغام پہنچا دیں کہ ہمیں ان سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''آل رائٹ! انتظار کریں۔ کال بیک کی جائے گی۔''

انہوں نے فون بند کر دیا۔ وہ بالکونی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہاں کامران کے سامنے ایک بڑی سی ٹرالی میں تازہ پھل، خشک میوے اور صبح کا بھرپور ناشتا رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑے مزے سے کھا رہا تھا اور ڈکار لے رہا تھا۔ ان حکمرانوں کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اعظم خان نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھو، آرام سے کھاؤ اور کام دکھاؤ۔''

آدم رحمانی وہاں پہنچ گیا تھا۔ کامران اگرچہ محل میں عیش کر رہا تھا لیکن اندر سے پریشان بھی تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے کئی بار موکل کو دل ہی دل میں پکارتا رہا تھا اور اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ کوئی جادوئی تحریر بھی دیوار پر نہیں ابھر رہی تھی۔

دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی کہ کام کے وقت موکل نہ آیا تو کیا ہوگا؟ یہ حکمران اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ابھی اس کی شامت نہیں آئی تھی۔ اس لیے رحمانی

وہاں پہنچ گیا تھا۔ معظم نے اس سے پوچھا۔ ”ان دونوں میں سے کوئی ایک ابھی تاباں کے ساتھ گیا ہے، یہ معلوم کرو کون ہماری بیٹی کے ساتھ ہے اور جو ساتھ نہیں ہے وہ کہاں ہے؟“

دوسرا ان کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دیوار پر تحریر پیش کی۔ کامران نے پڑھا۔ ”آدم ربانی آپ کی صاحبزادی کے ساتھ ہے۔ دوسرے کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ نظر آئے گا تو اس کے متعلق بتایا جائے گا۔“

معظم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے۔ وہ دوسری تاباں جہاں ہے وہیں دوسرا ہوگا۔“

”وہاں نہیں ہے۔ دوسری پچھلی رات جاگتی رہی تھی۔ ابھی تنہا سو رہی ہے۔“

”وہ کہاں ہے، تمہیں معلوم تو ہو؟“

”اگرچہ رحمانی اس سے وابستہ رہے گا۔ تاہم وہ بھی یہ جان نہیں سکے گا کہ وہ دوسری کہاں سے آتی ہے اور ابھی کہاں ہے؟“

”تمہارا موکل تو جانتا ہوگا۔“

”جانتا ہے لیکن نہ بتانے والی باتیں وہ کبھی نہیں بتاتا۔“

”وہ بتا سکتا ہے۔ تم اسے مجبور کرو۔“

”میں اسے مجبور نہیں کرسکوں گا۔ وہ ایک حد تک میرے قابو میں رہتا ہے۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ میری بات مانتا ہے اور بڑی حد تک میرے کام آتا رہتا ہے۔“

”ہم ادھورا کام نہیں چاہتے۔ اس سے کہو دوسری تاباں کو ہمارے لیے پراسرار نہ بنائے۔ وہ ہمارے کام آنے والی ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان پردہ نہیں ہونا چاہیے۔“

”پردہ تو رہے گا۔ پراسرار عمل کے اصول بہت سخت ہوتے ہیں۔ دوسروں کو بتائے نہیں جاتے۔ آپ جبراً ایسا چاہیں گے تو موکل ناراض ہو کر چلا جائے گا تو کیا ہوگا؟ پھر میں آپ کے کام نہیں آسکوں گا۔ آپ مجھ پر غصہ اتاریں گے۔ مجھے جان سے مار ڈالیں گے تو میں جان سے جاؤں گا لیکن نقصان آپ کو بھی ہوگا۔ بنا ہوا کام بگڑ جائے گا۔ پھر میرے جیسا عامل آپ کو پوری دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ کام کسی حد تک بنتا نظر آ رہا تھا۔ آئندہ وہ دوسری تاباں کام دکھانے والی تھی۔ وہ کامران اور اس کے موکل کو اپنے احکامات کا پابند نہیں بنا سکتے تھے۔

اعظم نے معظم سے کہا۔ ”ہمیں صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ فی الحال ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ربانی اور رحمانی پر گرفت مضبوط نہیں ہو رہی ہے۔“

کامران نے کہا۔ ”میرے موکل نے دوسری تاباں کے ذریعے آپ کی مشکل آسان کی ہے۔ آپ ناشکری نہ کریں۔ تدبیر سوچیں کہ کس طرح دوسری کے ذریعے دونوں کو داماد اور تابعدار بنا سکیں گے؟“

”وہ بھی ہمارے تابعدار نہیں بنیں گے۔ وہ آگ ہیں ہم پانی ہیں۔ ہم زمینی چالیں چلتے ہیں اور وہ ہمیں آسمانی ہدایات دینے لگتے ہیں۔“

رحمانی نے تحریر پیش کی۔ کامران نے پڑھی۔ ”تم پانی ہو تو ڈبو دیتے ہو۔ آگ ہو تو جلا دیتے ہو۔ وہ پانی ہیں تو سیراب کرتے ہیں۔ کلیجا ٹھنڈا کرتے ہیں۔ آگ ہیں تو کھانا پکاتے ہیں اور کھلاتے ہیں۔ اپنے اصول کو سمجھو گے تو اپنی بہتری کے راستے ہموار کرسکو گے۔“

اعظم نے پوچھا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟“

”میرا موکل جو کہہ رہا ہے وہی کہہ رہا ہوں۔ وہ آپ کے لیے آسانیاں فراہم کر رہا ہے۔ ربانی اور رحمانی کے بارے میں بہت کچھ بتا رہا ہے۔ دوسری تاباں کے ذریعے دو دامادوں کا مسئلہ حل کر رہا ہے۔ لیکن آپ کو اپنے طور پر جو کرنا ہے وہ نہیں کر رہے ہیں۔“

اسی وقت معظم کے فون سے کالنگ ٹون ابھری۔ وہ ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر خوش ہو کر بولا۔ ”اب ہم کچھ کر سکیں گے۔ عالی جناب روڈنی ویلر کا فون ہے۔ آئیں اعظم صاحب! ہم تنہائی میں باتیں کریں گے۔“

وہ فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر اعظم کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ رحمانی بھی وہاں پہنچ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ دوسری طرف سے روڈنی ویلر کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہیں ہم سے بہت کچھ کہنے کی بے چینی ہوگی۔ ہم بھی بہت کچھ کہنے کے لیے پریشان ہیں۔ سرد ٹاؤن ہم سب کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گیا ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر زبان کے ٹی وی چینل پر اسی کا تذکرہ ہے۔ وہاں بڑی حد تک جرائم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ وہاں تھانہ پولیس نہیں ہے۔ کسی معاملے کو پیچیدہ ہونے سے پہلے ہی عوامی عدالت میں نمٹا دیا جاتا ہے۔

”ہمارے متعلق یہ رائے قائم کی جا رہی ہے کہ

چھوٹے بڑے حکمران جرائم کو کم کرنے میں ناکام رہے ہیں اور تھانہ پولیس کے ذریعے جرائم میں اضافہ ہی کرتے آرہے ہیں۔

"سرمدٹاؤن کے کسی ایک گھر میں بھی ایک چھوٹا سا ہتھیار نہیں ہے۔ وہاں لوگ خود ہی دفاعی اور سلامتی کے اصولوں کے تحت ایک دوسرے کا محاسبہ کرتے ہیں۔ محبت سے معاملات طے کرتے ہیں۔ ناکامی ہو تو آدم ربانی اور آدم رحمانی آکر خوش اسلوبی سے تمام مسائل حل کردیتے ہیں۔

"ہمارے تمہارے لیے یہ چیلنج ہے کہ انہوں نے تمہارے ملک بوستان میں رہ کر ایک ننھا سا صاف ستھرا ایسا بوستان قائم کیا ہے جس کے سامنے تمہارا پورا ملک غلیظ اور شرمناک دکھائی دے رہا ہے۔ ہر سمت سے آوازیں اٹھائی جارہی ہیں کہ ہماری دنیا میں جتنے ملک ہیں' وہ اپنا نظام حکومت سرمدٹاؤن کے مطابق تبدیل کریں۔

"سرمدٹاؤن سے جو آندھی اٹھی ہے' وہ تمہاری حکومت کو تہس نہس کرکے ایک نیا عوامی بوستان بنانے کا چیلنج کرچکی ہے۔ آپ حضرات کیا کررہے ہیں؟ ربانی اور رحمانی کو زیر کرنے یا نابود کردینے کے لیے اب تک کیا کیا ہے؟ ان کی کتنی کمزوریاں تمہارے ہاتھ آئی ہیں؟ تم اپنے اقتدار کی پائیداری کے لیے کیا کررہے ہو؟"

فون کا وائڈ اسپیکر آن تھا۔ معظم کے علاوہ اعظم اور آدم ربانی بھی سن رہے تھے۔ معظم نے کہا۔ "سر! اینٹ کا جواب پتھر سے' چھری کا جواب کٹاری سے اور بندوق کا جواب توپ سے دیا جاتا ہے۔ ہم جادو کا جواب جادو سے دینے کی حتی الامکان کوشش کررہے ہیں۔"

اعظم خان نے کہا۔ "اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دونوں نادیدہ بن کررہتے ہیں۔"

"سر... ! جو کمبخت نظر نہیں آتے ہیں' وہ بھلا گرفت میں کیسے آسکتے ہیں؟ انہیں تو ان کی طرح ہی پراسرار علوم کے ذریعے مات دینی ہوگی۔"

"ہم یہ عجیب سی بات بتاچکے ہیں کہ ہماری بیٹی تاباں ان دونوں کی شریک حیات بننا چاہتی ہے۔ وہ دونوں بھی صرف اسی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی احمقانہ شادی کو مہذب سوسائٹی میں کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔"

"دونوں کو داماد بنائے رکھنے کے لیے دو تاباں ضروری تھیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ہم نے ہو بہو تاباں جیسی دوسری بیٹی پیدا کرلی ہے۔"

روڈنی ویلر نے واقعی حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اگر دوسری بیٹی پیدا کی ہے تو وہ ابھی نوزائیدہ بچی ہوگی۔"

"سر! یہی تو کمال ہے۔ وہ پہلی بیٹی کی طرح جوان ہے۔ ہو بہو ویسی ہی ہے۔"

"تعجب ہے۔ یہ کیسے ہوگیا۔ فوراً بتاؤ؟"

"ہمارے پاس کامران نامی ایک بہت ہی زبردست عامل کامل ہے۔ اس کا موکل بہت زبردست ہے۔ اس نے بالکل میری بیٹی جیسی تاباں پیدا کی ہے۔"

"فوراً دونوں تاباں کی تصویریں ارسال کرو۔"

"دوسری نادیدہ ہے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آئے گی۔ وہ صرف آدم رحمانی کو دکھائی دے گی۔ میں باپ ہوں۔ مجھے بھی نظر نہیں آئے گی لیکن ان دونوں کو داماد بنانے کا مسئلہ حل کردے گی۔"

"کیا وہ دوسرے داماد رحمانی کو تمہارے سیاسی مزاج کے مطابق ڈھال سکے گی؟"

"وہ کل رات پیدا ہوئی ہے۔ ابھی سو رہی ہے۔ ہم اس نادیدہ تاباں سے بات کریں گے۔ اسے سمجھائیں گے کہ کس طرح ہمارے کام آنا چاہیے۔"

روڈنی ویلر نے پوچھا۔ "کیا تمہارا عامل کامران دشمنوں تک پہنچ جاتا ہے؟ جیسا کہ تم نے بتایا ہے' وہ دشمن ربانی اور رحمانی بھی نادیدہ ہوجاتے ہیں۔"

"اس کے باوجود میرے عامل کا موکل انہیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز کم نہیں کہ اس نے ان کی لاعلمی میں رحمانی کے لیے دوسری تاباں پیدا کی ہے۔"

"پھر تو وہ حیران ہوں گے۔ ان دونوں کا ردعمل کیا ہے؟"

"ہم نہیں جانتے لیکن یہ جانتے ہیں کہ رحمانی نے دوسری تاباں کے ساتھ رات گزاری ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری کو پاکر خوش ہے۔"

"یہ بتاؤ۔ کیا تمہارا عامل ربانی اور رحمانی کی ہسٹری' ان کی حقیقت معلوم کرسکے گا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ کیا ان کی ایسی کمزوریاں معلوم کرسکے گا جن کے ذریعے ہم انہیں نیست و نابود کرسکیں؟"

"ہمارا عامل نہ جانے کیسے کیسے پراسرار علوم جانتا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے کہ وہ آپ کے انتہائی خفیہ ریکارڈ زروم کے راز بھی جانتا ہے۔"

روڈنی نے ناگواری اور بے یقینی سے کہا۔ "دہاٹ

نان سینس! کیا ہمارے خفیہ ریکارڈز روم تک پہنچنا کوئی مذاق ہے؟ بچوں کا کھیل ہے کہ کوئی جادوگر وہاں پہنچ جائے؟''

معظم نے کہا۔ ''آپ نے مجھے اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے ایک اقرار نامہ لکھوایا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کے ملک وہائٹ اسکائی کی خفیہ فائلیں کہاں رکھی جاتی ہیں۔ یہ بات عامل کامران نے بتائی ہے کہ میرا اقرار نامہ آپ نے کہاں رکھا ہے اور اس سیکرٹ فائل کا نام ہے 'معظم بوستان اور کوڈ نمبر ہے' ۷ ۳۳۰۳...''

شدید حیرانی سے روڈنی کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ معظم نے کہا۔ ''آپ ہی بتائیں' مجھے اتنے اندر کا راز کیسے معلوم ہوگا؟ جبکہ آپ نے بھی مجھے نہیں بتایا ہے۔''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ روڈنی دم بخود رہ گیا۔ فون کو کان سے لگائے سامنے بیٹھے ہوئے مشیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے سر؟''

اس نے کہا۔ ''ناممکن سی بات ممکن ہو رہی ہے۔ بوستان کا ایک بلیک میجک عامل ہمارے انتہائی خفیہ ریکارڈز روم کے راز جانتا ہے۔''

وہاں سننے والوں کے ذہنوں کو جھٹکا لگا۔ انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر نے مٹھیاں بھینچ کر پوچھا۔ ''اور وہ ابھی تک زندہ ہے؟''

ایک اور اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ''ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔''

دوسری طرف معظم یہ نہیں جانتا تھا کہ روڈنی ویلر کے چیمبر میں عہدیداروں اور مشیروں کے تیور کس طرح بدل گئے ہیں۔ وہ فون پر یہ بتا رہا تھا کہ کامران کا موکل کسی کے بھی بینک اکاؤنٹس اور لاکرز کی مالیت معلوم کرلیتا ہے۔ کسی کے ذاتی شرمناک راز بھی اس سے چھپے نہیں رہتے۔ وہ عامل خطرناک بھی ہے اور کارآمد بھی۔''

روڈنی نے کہا۔ ''مسٹر معظم! جسٹ اے منٹ۔ ہم ابھی بات کریں گے۔ آپ آن لائن رہیں۔''

پھر وہ اپنے لوگوں سے بات کرنے لگا۔ رحمانی سمجھ گیا کہ دوسری طرف اہم باتیں ہو رہی ہوں گی۔ وہ پلک جھپکتے ہی ان آقاؤں کے اجلاس میں پہنچ گیا۔

ویلر کہہ رہا تھا۔ ''بے شک وہ عامل کامران ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ لیکن دانش مندی یہ ہوگی کہ اسے مارنے سے پہلے اپنا قیدی بنا کر اس کے پُراسرار علوم سے فائدہ اٹھایا جائے۔''

ایک نے تائید کی۔ ''بے شک ہم اس عامل کے ذریعے اپنے دشمن ممالک کے اہم عسکری رازوں تک پہنچ سکیں گے۔ ربانی اور رحمانی کی بہت سی کمزوریاں معلوم کر سکیں گے۔''

ایک نے کہا۔ ''ہمارے ملک کے رازوں تک پہنچنے والے کو فوراً ہی ختم کر دینا چاہیے یا پھر اسے کسی بھی پہلی فلائٹ سے یہاں بلا کر اپنے شکنجے میں رکھنا چاہیے۔''

وہ پُراسرار علوم سے فائدہ اٹھانے کے سلسلے میں کئی پہلوؤں سے بحث کرنے لگے۔ پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس عامل کو فوراً ہی اپنے پاس بلا کر اسے قیدی بنا کر رکھا جائے اور یہ سب کچھ انتہائی رازداری سے کیا جائے۔

ویلر نے فون پر معظم سے کہا۔ ''مسٹر معظم! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ربانی اور رحمانی سے ہم نمٹیں گے۔ تم سے وہاں جو ہو سکتا ہے' وہ کرتے رہو۔ لیکن نادیدہ دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کامران ہمارے لیے ضروری ہے۔ اسے ہمارے ملک میں ہماری نگرانی میں رہنا چاہیے۔''

''سر! ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہماری حکومت ہمارا اقتدار آپ سے قائم ہے۔ آپ جو کہیں گے' وہی ہوگا۔''

ویلر نے کہا۔ ''کامران کا پاسپورٹ' ویزا اور دیگر اہم کاغذات ابھی تیار کرائے جائیں گے۔ اسے کسی بھی پہلی فلائٹ سے یہاں بھیج دو۔ اس کے یہاں آنے کی وجہ محض تفریح اور سیاحت ظاہر کی جائے گی۔ اس عامل کو بھی یہ معلوم نہ ہو کہ اہم سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اسے یہاں بلایا جا رہا ہے۔''

''ہم آپ کے حکم کے مطابق اسے یہاں سے روانہ کر دیں گے۔ لیکن اسے رازداری سے کیوں بلایا جا رہا ہے؟''

ویلر نے پوچھا۔ ''کیا تم چاہو گے کہ تمہارے اہم راز جاننے والا جب غیر ضروری ہو جائے تو زندہ رہے اور تمہارا بھانڈا پھوڑتا رہے؟ پلیز ہم سے کوئی سوال نہ کرو۔''

اس نے تابع داری سے سر ہلا کر کہا۔ ''آل رائٹ سر! میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔''

''ہم اس وقت تک اسے زندہ رکھیں گے' جب تک اس سے سیاسی فائدے حاصل ہوتے رہیں گے۔ جب وہ غیر ضروری ہو جائے گا تو اسے چپ چاپ موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ عامل ہمارے ملک میں پہنچنے کے بعد کہاں لاپتا ہو گیا ہے؟''

کامران ڈرائنگ روم میں ناشتا کرنے کے بعد صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے مال و دولت حاصل کرنے کی راہیں کھل رہی تھیں۔

جب توقع سے زیادہ کامیابیاں حاصل ہونے لگتی ہیں تو آدمی پھیلتا ہے۔ اسے سمیٹنے کے لیے ایک موت ہی آتی ہے۔

ملک بوستان کی قوم سالوں سے وطن فروش سیاست دانوں کو جھیلتی آرہی تھی۔ جو بھی سیاست داں اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ پہلے وہائٹ اسکائی کے آقاؤں کے آگے گھٹنے ٹیکتا تھا۔ وہائٹ اسکائی سے ملنے والا وہائٹ کالر پہنتا تھا۔ یوں غلامی کا طوق گردن میں ڈال کر اپنی حکمرانی کیا کرتا تھا۔

معظم خان اور اعظم خان خواہ کسی رنگ کی شرٹ پہنیں اس کا کالر وہائٹ ضرور ہوتا تھا۔ وہ ایک اہم شناختی نشان تھا۔ وہ دونوں وہائٹ کالر کے بغیر نہ وہائٹ اسکائی جاسکتے تھے نہ ہی ان آقاؤں کی مضبوط پناہ حاصل کرسکتے تھے۔

وہائٹ اسکائی کے سیاسی ماہرین نے ویلر سے کہا۔ "جادوئی ہتھکنڈوں سے پیدا کی ہوئی تاباں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ جادو خواہ کتنا ہی خطرناک ہو وہ دیرپا نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ آپ ہی زائل ہوجاتا ہے۔"

ویلر نے پوچھا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

اس نے کہا۔ "آپ تاباں کی ڈمی تیار کرائیں۔ ایک نہیں دو ڈمی ہو بہو تاباں ہوں۔ اصل تاباں سے بال برابر فرق نہ ہو۔ دونوں ڈمی کی چال ڈھال لب ولہجہ اور ذہانت ایسی ہو کہ ربانی اور رحمانی دھوکا کھاجائیں۔"

ویلر نے کہا۔ "وہ دونوں اپنے سامنے والوں کو اندر سے پہچان لیتے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے پہچان نہ پائیں اور پہچان بھی جائیں تو ڈمی تاباں کے دیوانے ہوجائیں گے۔ ہم اصلی تاباں کو غائب کر دیں گے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں سے اسے ڈھونڈنا چاہیں گے تو ہم اصلی کو موت کی نیند سلادیں گے۔ معظم خان کو شبہ تک نہ ہونے دیں گے کہ جوان بیٹی کی ہلاکت میں ہمارا ہاتھ ہے۔"

ایک اور ماہر نے کہا۔ "عاشق دو ہیں اور تاباں ایک ہے۔ وہ بعد میں ہلاک ہونے والی تاباں پر صبر کرکے ہماری دو تاباں میں دلچسپی لینے لگیں گے۔"

ربانی اور رحمانی سے کوئی دوستی نہیں کرنی ہے اور دشمنی اس طرح کی جائے گی کہ دوستی کے انداز میں ان کی مطلوبہ و محبوبہ باتیں پیش کی جائیں گی۔ ان کی مرادیں پوری ہوں گی۔ ہم اپنی دونوں ڈمی کے ذریعے ان کے دن رات کی مصروفیات اور اہم معاملات سے آگاہ ہوتے رہیں گے۔"

"وہ دونوں تاباں کے دیوانے ہیں اور وہ دو تاباں ان کی منکوحہ بھی نہیں بن پائیں گی۔ ہماری پیش کی ہوئی دو ڈمی منکوحہ بن کر ان کی ضرورتیں پوری کریں گی۔"

"ایک دوسرے کو حاصل کرنے کی ہوس میں ہی محبت کی جاتی ہے۔ وہ دونوں اپنی اپنی تنہائی میں ہماری دی ہوئی ایک ایک تاباں کو حاصل کرسکیں گے۔"

بڑی گرما گرم بحث ہورہی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ تاباں کی دو بھرپور ڈمی تیار کی جائیں گی۔ صرف دو مصنوعی تاباں کے ذریعے پہلے ربانی اور رحمانی کو لگام دی جائے گی پھر سرد ٹاؤن کی اینٹ سے اینٹ بجائی جائے گی۔

معظم اور اعظم کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تو اپنے آقاؤں کی ہر بات مانتے تھے۔ ان کے تمام جائز اور ناجائز احکامات کی تعمیل کرتے رہتے تھے۔ تاباں کی دو تو کیا دس ڈمی تیار ہوجاتیں تب بھی یہ دیکھ کر مطمئن رہتے کہ ربانی اور رحمانی کو کامیابی سے زیر کیا جارہا ہے۔

البتہ روڈنی ویلر نے اپنے تابع دار معظم خان سے یہ بات چھپائی کہ کبھی اہم ضرورت کے وقت اس کی بیٹی تاباں کو اغوا کرایا اور قتل کرایا جاسکتا ہے۔ وہ آقا اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے تھے۔

ان آقاؤں کے اندر کی باتوں کو اور ان کی ڈھکی چھپی کمینگی کو آدم رحمانی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا۔

اس نے فون کے ذریعے ربانی کو مخاطب کیا۔ وہ براہ راست ربانی کے پاس فوراً آسکتا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر کترا رہا تھا کہ ربانی اس روز تاباں کے ساتھ سیر و تفریح میں وقت گزار رہا تھا۔

ربانی نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہاں بولو کیا خبر ہے؟"

اس نے کہا۔ "خبر دلچسپ بھی ہے اور انتہائی سنگین بھی..."

اس نے بتایا کہ کامران کو ملک وہائٹ اسکائی میں کیوں بلایا جارہا ہے؟ اور اس نجومی کا کیا انجام ہونے والا ہے؟

پھر اس نے بتایا کہ تاباں کی دو ڈمی کن مقاصد کے

نیے تیار کی جانے والی ہیں؟ اور ان دو عاشقوں کو دو تاباں کے فریب میں مبتلا رکھنے کے لیے اصل تاباں کو اغوا کر لیا جائے گا پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

ربانی نے تڑپ کر کہا۔ ”ان کی شامت آئی ہے۔ ہماری تاباں پر ذرا بھی آنچ آئے گی تو ہم ان فرعونوں کو الٹا لٹکا کر عبرت کا نشان بنا دیں گے۔“

تاباں نے کہا۔ ”رحمانی! تم فون پر کیوں بول رہے ہو؟ یہاں آؤ۔“

ربانی نے کہا۔ ”ہاں رحمانی۔۔۔! معاملہ سنگین ہے ہم رُوبرو بات کریں گے۔“

دوسرے ہی لمحے وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دونوں ایک خوبصورت سے گارڈن میں ناچتے تھرکتے ہوئے فوارے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ فوارے کا پانی ایک دائرے میں اوپر نیچے تھرک رہا تھا۔ اس کی بوندیں دور تک بکھر رہی تھیں۔ پانی کے ہلکے ہلکے ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹے بھلے لگ رہے تھے۔ وہ نمی اور ٹھنڈک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

رحمانی نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”زندگی بہت خوبصورت ہے اگر محبتیں ملتی رہیں۔ لیکن عداوتیں خوبصورتی کو مسخ کر دیتی ہیں۔ ہم اس ملک اور اس دنیا کو خوبصورت بنانا چاہتے ہیں۔ ہر باشعور شخص یہی چاہتا ہے۔ لیکن دشمن عناصر ایسا ہونے نہیں دیتے۔ ہمارے خوابوں کی تعبیر ہم سے چھینتے رہتے ہیں۔“

تاباں نے کہا۔ ”واقعی سچائی اور ایمان کی بقا کے لیے جہاد کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے اور دنیا ہے کہ گھوم پھر کر بدصورتی کی سمت سفر کرنے لگتی ہے۔“

ربانی نے کہا۔ ”ایک تو غمِ دوراں ہوتا ہے اور ایک غمِ جاناں۔ ہمیں زندگی میں دونوں سے نمٹنا پڑتا ہے۔ بوستان کے حکمران معظم خان اور اعظم خان، وہائٹ اسکائی کا حکمران روڈنی ویلر اور بیو اسکائی کا حکمران ایرک گارسن غمِ دوراں پیدا کرنے والے لوگ ہیں۔ انشاء اللہ ہم ان سے بخوبی نمٹتے رہیں گے۔

”اور ہم تینوں عشق و محبت کے مجذوم ہیں۔ ایک مثلث کے تین زاویے ہیں۔ ہم میں سے کوئی زاویہ مثلث سے باہر نہیں ہو سکے گا اور یہ معاملہ ہم تینوں کے لیے غمِ دوراں ہے۔ فکر ہے، پریشانی ہے اور الجھنیں ہیں۔“

رحمانی نے کہا۔ ”الجھنیں محض اس لیے ہیں کہ ایک تاباں ہم دونوں کے دل میں اور دماغ میں سمائی ہے۔ یہ ہمارے حواس پر چھا گئی ہے۔ ہم دیکھتے آ رہے ہیں کہ اور کوئی ہستی ہمیں متاثر نہیں کر رہی ہے اور ایسا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی اور لڑکی ہمارے دلوں میں جگہ بنا سکے گی۔“

تاباں نے کہا۔ ”میں نے بھی خود کو اچھی طرح ٹٹول لیا ہے، پرکھ لیا ہے اور اچھی طرح سمجھ لیا ہے تم دونوں کے سوا کوئی مجھے متاثر نہیں کر سکے گا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ تم دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دوں لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”شرم و حیا کے حوالے سے سمجھا جائے تو یہ بے حیائی ہے۔ مردوں کو ایک سے زیادہ عشق کرنے کا حق ہے۔ عورتوں کو نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں عورتوں کو یہ حق نہیں ملنا چاہیے اور شریف زادیاں ایسا کرتی بھی نہیں ہیں۔“

اس نے گہری سانس لی پھر کہا۔ ”میرا خدا جانتا ہے میں شرافت، شرم و حیا کا پاس رکھتی ہوں۔ ہر نماز میں دعا مانگتی ہوں اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی ایک کی طرف مجھے مائل کر دے۔ مجھ پر بے حیائی کا الزام نہ آئے لیکن میں کیا کروں، یہ معاملہ قدرتی ہے۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ یہ ہماری بے بسی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ خدا کو کیا منظور ہے؟“

”قدرت ہمیں آزمائشوں سے گزار رہی ہے اور ہمیں ہر حال میں گزرنا ہے۔“

وہ بولی۔ ”خدا کا شکر ہے ہمیں ان کی سازشوں کا علم ہو رہا ہے۔ وہ میری دو ڈمی تیار کرنے والے ہیں۔ ان کے ذریعے نہ جانے کیسی کیسی چالیں چلیں گے؟“

ربانی نے کہا۔ ”ان کی ایک آخری چال تو معلوم ہو گئی ہے۔ وہ ہمارے درمیان تمہیں جینے نہیں دیں گے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے تمہاری سلامتی چاہتے ہیں اور دشمنوں کو سلامتی سے جینے نہیں دیں گے۔“

”میری ڈمی تیار کرنے میں انہیں کچھ وقت لگے گا۔ پھر یہ کہ ان دو تاباں کو میرے مزاج کے مطابق ٹریننگ دینے میں دو چار ہفتے یا دو چار مہینے ضرور لگیں گے۔“

”یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا تیز رفتار زمانہ ہے۔ چند دنوں میں ان کی پلاسٹک سرجری ہو جائے گی۔ وہ دونوں یقیناً تمہاری طرح ذہین اور حاضر دماغ ہوں گی۔ ہر پہلو سے مکمل تاباں بننے میں دیر نہیں کریں گی۔“

تاباں فوارے سے گردش کرتے ہوئے پانی کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی پھر بولی۔ ”مجھ سے پہلے کامران کی شامت آنے والی ہے۔ تم دونوں پہلے اس کی خبر لو۔“

''ہم نے اس نجومی کو ایک خطرناک عامل بنا کر پیش کیا ہے۔ ہم اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔''

''ہم اسے وہائٹ اسکائی جانے سے پہلے روک سکتے ہیں۔ نہ وہ جائے گا' نہ آسانی سے موت کے شکنجے میں آئے گا۔''

ہم اسے جانے سے روکیں گے تو وہائٹ اسکائی کے قاتل یہاں آکر کسی بھی دن کسی بھی وقت اسے ہلاک کر دیں گے۔ جس طرح ہم یہاں اس کی نگرانی اور حفاظت کر سکتے ہیں' اسی طرح وہاں بھی کر سکتے ہیں۔ اسے وہائٹ اسکائی جانے دیا جائے۔''

انہوں نے طے کیا کہ سمندر پار کامران کی نگرانی کرنے کے دوران روڈنی ویلر اور ایرک گارسن کے قریب رہ کر ان کی سازشوں کو دیکھتے سنتے اور سمجھتے رہیں گے۔ اس مقصد کے لیے ربانی اور رحمانی وہاں باری باری جاتے رہیں گے۔

وہ تینوں کھاتے پیتے اور پلاننگ کرتے رہے پھر رحمانی وہاں سے چلا آیا۔ منتظم اعظم اور کامران کے پاس پہنچ کر دیکھنے لگا کہ وہ کیا کرتے پھر رہے ہیں اور ان کی نئی مصروفیات کیا ہیں؟

بوستان میں وہائٹ اسکائی کا سفارت خانہ تھا۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانوں سے کامران کے پاسپورٹ' ویزا اور دیگر اہم کاغذات تیار کیے جا رہے تھے۔ دوسری صبح کی فلائٹ میں اس کی سیٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ وہ دوسرے دن جانے والا تھا۔

رحمانی اس سے پہلے ہی روڈنی ویلر کے وہائٹ آفس میں پہنچ گیا۔ وہاں خفیہ ریکارڈز روم کے اعلیٰ عہدیدار اور افسران موجود تھے۔ اس ریکارڈز روم کے اندر اور باہر ایسے جدید الیکٹرونک حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے کہ ایک چیونٹی بھی فرش پر یا دیوار پر رینگتی ہوئی وہاں سے گزرتی تو خطرے کے سگنل آن ہو جاتے تھے۔ وہاں صرف چند متعلقہ عہدیدار ہی قدم رکھ سکتے تھے۔

کامران نے جس اقرار نامے کی فائل اور کوڈ نمبرز بتائے تھے' وہ فائل ان تمام عہدیداروں اور افسروں کے درمیان میز پر رکھی ہوئی تھی۔ روڈنی ویلر کہہ رہا تھا۔ ''اس فائل پر جو کوڈ نمبرز ہیں وہ صرف یہاں کے کمپیوٹر میں محفوظ ہیں اور صرف دو افسران کے علم میں یہ نمبرز ہیں۔ ہمیں اس بنیادی سوال کا جواب معلوم ہونا چاہیے کہ یہ خفیہ کوڈز کامران کو کیسے معلوم ہوئے؟''

ایک عہدیدار نے کہا۔ ''بوستان کا حاکم اعلیٰ منتظم کہہ رہا ہے کہ کامران نے پُراسرار علوم کے ذریعے معلومات حاصل کی ہیں۔ کیا یہ یقین کرنے کی بات ہے؟''

ویلر نے کہا۔ ''میں تو کبھی یقین نہیں کروں گا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں کالا جادو ایک بچگانہ سی بات ہے۔ آج تک کوئی خطرناک جادوگر کسی ملک کے خفیہ اہم رازوں تک پہنچ نہیں پایا۔ یہ کامران ہے کون؟''

انٹیلی جنس کے چیف نے کہا۔ ''وہ جادوگر نہیں ہے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کوئی شاطر ہے۔ اسے گرفت میں لینے کے بعد ہی اس کی حقیقت معلوم ہوگی۔''

ایک افسر نے کہا۔ ''ہم حیران ہیں۔ عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ آخر وہ ہمارے خفیہ آئرن سیف کے اندر کیسے پہنچا ہوگا؟ اور پتا نہیں وہ یہاں سے اور کیا کچھ معلوم کر رہا ہوگا۔''

بلیک فورس کے چیف نے سگار کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ یہاں آ تو جائے۔ تھرڈ ڈگری کا ایک ہی نشتر اسے سب کچھ اگلنے پر مجبور کر دے گا۔''

ویلر نے کہا۔ ''اسے اس طرح اغوا کرو اور غائب کرو کہ ہم پر اس کی گمشدگی کا الزام بھی نہ آئے۔''

وہ سگار کا کش لے کر بولا۔ ''پلاننگ ہو چکی ہے۔ وہ مسلمان ہے۔ اسے ایک انتہا پسند دہشت گرد ثابت کیا جائے گا۔ سیدھا سا لائن آف ایکشن ہے۔ جب وہ ہمارے کام کا نہیں رہے گا تو اسے پولیس مقابلے میں ختم کر دیا جائے گا۔''

ایک نے پوچھا۔ ''اور اگر یہ سچ ثابت ہو گیا کہ واقعی وہ پُراسرار علوم کے ذریعے آہنی سیف کے اندر خفیہ رازوں تک پہنچ جاتا ہے۔ تب ہمارا رویہ کیا ہوگا؟''

''تب اسے سر پر بٹھایا جائے گا۔ اس کے پُراسرار علوم سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ وہ ہمیں دوست اور دشمن ممالک کے خفیہ رازوں تک پہنچائے گا۔ ہم اسے ایک آرام دہ رہائش گاہ میں نظر بند رکھیں گے، وہ تاحیات وہاں عیش و عشرت کی زندگی گزارے گا اور جب تک زندہ رہے گا' اپنے گھر اپنے وطن واپس نہیں جا سکے گا۔''

کامران ایک تشویشناک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ فی الحال اسی کو موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھے۔ رحمانی کے لیے اب وہاں کچھ سننے اور سمجھنے کے لیے نہیں رہا تھا۔ لہٰذا وہ سرد ٹاؤن واپس آ گیا۔

☆☆☆

محبت ابتدا میں ڈنکے کی چوٹ پر نہیں ہوتی۔ فوراً ہی

اعلان نہیں ہوتا کہ ہمیں محبت ہو گئی ہے بلکہ محبت کرنے والوں کو پہلے یقین نہیں ہوتا' شبہ ہوتا ہے کہ حسن کی بارگاہ میں عشق کو پذیرائی ملے گی بھی یا نہیں؟

پھر نگاہیں دور سے ڈھارس بندھاتی ہیں۔ دنیا والوں کے ڈر سے چھپ چھپ کر اشارے کنائے ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چوری چھپے محبت کرنے میں جو مزہ آتا ہے' وہ اعلانیہ محبت میں نہیں آتا اور شاید محبت کو پُرلطف بنانے کے لیے ہی دنیا والے پیار کرنے والوں پر پہرے بٹھاتے ہیں۔

تاباں' ربانی اور رحمانی پر پورے سرمد ٹاؤن کی نگاہیں گڑی رہتی تھیں۔ یہ بات گھر گھر پہنچی ہوئی تھی کہ وہ دونوں چھپ چھپ کر تاباں سے ملتے رہتے ہیں۔ جب سے یہ بات پھیلی تھی' تب سے وہ ٹاؤن والوں کے لیے لاپتا ہو گئی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ وہ فرار ہو گئی ہے اور باقاعدہ منصوبے کے مطابق گئی ہے۔ اس کے عاشقوں نے صفائی پیش کی تھی کہ وہ اپنے والدین کے پاس شیر آباد میں ہے۔

محلے پڑوس والوں سے مل کر جانے میں اور اچانک چھپ کر جانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس شبہے پر مہر لگ گئی تھی کہ ان تینوں کے درمیان' ازدواجی زندگی کی طرف جانے والی محبت نہیں ہے۔ سچے دل کی لگی نہیں ہے۔ چھپنے چھپانے والی ناجائز دل لگی ہے۔

ان مسیحاؤں کے سامنے کوئی ایسی باتیں بول نہیں سکتا تھا۔ عورتیں تاباں کی بھی بہت عزت کرتی تھیں لیکن جوان لڑکیاں اسے راستے کی رکاوٹ سمجھ رہی تھیں۔ اس نے ایک نہیں دو خوبرو اور گبرو جوانوں کو ان کی طرف مائل ہونے سے روک رکھا تھا۔

تاباں کے جانے کے بعد لڑکیوں کو کسی حد تک اطمینان ہوا کہ شاید وہ واپس نہیں آئے گی۔ بڑے باپ کی بیٹی بڑے ممالک کی طرف چلی جائے گی۔ اب ربانی اور رحمانی دوسری تمام چاہنے والیوں کو توجہ دے سکیں گے۔

ہوس اور محبت میں فرق یہ ہے کہ ہوس کسی کی بھی سمت لے جاتی ہے لیکن محبت کسی ایک سے ہی ہوتی ہے۔ وہ دونوں دل سے مجبور تھے اور دل والیاں اپنے دل سے مجبور تھیں۔ سب ہی اپنے دل کی لگی سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی لگی نہیں سمجھتے۔

وہ اگرچہ اسی زمین کے باشندے بن چکے تھے لیکن ان کا حسن' ان کی شخصیت ملکوتی تھی۔ صرف سرمد ٹاؤن کی ہی نہیں' دنیا جہاں سے آنے والی حسینائیں بھی انہیں دیکھتے ہی دل ہار جاتی تھیں۔ اپنے گھر کا راستہ بھول کر اسی دو شہر یار کے شہر میں رہ جانا چاہتی تھیں۔

جب مطلوبہ چیز نہ ملے تو اسے حاصل کرنے کی دیوانگی بڑھ جاتی ہے۔ وہ سیدھی طرح نہ ملے تو جبراً چھین لینے کی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ کتنی ہی حسینائیں ان دونوں تک پہنچنے کے لیے جائز اور ناجائز ذرائع اختیار کر رہی تھیں۔ کبھی اپنی دولت اور جائداد سے اور کبھی حسن و جمال کی بارود سے دھماکے کرتی ہوئی قریب آتی تھیں لیکن وہ نادیدہ ہو جاتے تھے۔

یہ دنیا بہت خوبصورت ہے اور خوبصورتی ہمیشہ عورتوں کے وجود سے اور پھولوں کے کھلنے سے قائم رہتی ہے۔ اس زمین پر ایسی حسینائیں ہیں جو اپنے حسن کی چکاچوند سے ایک نظر میں دیوانہ بنا دیتی ہیں اور پھر ہاتھ نہیں آتیں۔

ایسی حسینائیں اپنے ناز و انداز اور غرور کو بھول کر سرمد ٹاؤن آتی رہتی تھیں اور ان ملکوتی آدم زادوں سے مل بیٹھنے کے لیے بڑی بڑی آفر دیتی تھیں پھر مایوس ہو جاتی تھیں۔

ایک حسینہ نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ سرمد ٹاؤن کو دس کروڑ روپے کا عطیہ دینا چاہتی ہے۔ اس رقم کا چیک ربانی اور رحمانی کے ہاتھوں میں رکھ کر ان کے ساتھ دو چار دن گزارنا چاہتی ہے۔

انہوں نے دس کروڑ کی آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔

یہ بات سب ہی جانتی تھیں کہ تاباں نے خود کو فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ محل کا آرام چھوڑ کر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے۔ اس طرح ان دونوں کے قریب رہ کر انہیں اچھی طرح پھانس لیا ہے۔

کئی لڑکیاں یہی کر رہی تھیں۔ اپنا گھر' اپنے رشتے داروں کو چھوڑ کر اس ٹاؤن میں رہائش اختیار کر چکی تھیں۔ ربانی اور رحمانی ان کے فلاحی جذبوں اور ان کے فرائض کی ادائیگی کو دیکھتے تھے۔ ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کی یہ خواہش پوری کرتے تھے کہ فرائض کی ادائیگی کے دوران میں نادیدہ نہیں رہتے تھے۔ ان سے ملتے اور باتیں کرتے رہتے تھے۔

لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ آگے تاباں ایک سرخ سگنل کی طرح تھی۔ اس چوراہے پر دوسری تمام گاڑیاں رک جاتی تھیں۔

ایک بار یوں ہوا کہ سرزمین 'یاقوت' کی سلطانہ نے

ایک شاہی پیغام، ربانی اور رحمانی کے نام بھیجا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”آدم ربانی اور آدم رحمانی پر خدا کی رحمت ہو۔

میرے بچو! یہ ایک ماں کی دعا ہے۔ ہم سلطنتِ ’یاقوت‘ کی بلاشرکت غیرے ایک آزاد اور خودمختار سلطانہ ہیں۔ ایک جوان دختر نیک اختر کی والدہ ہیں اور تمہیں بھی اپنا فرزند کہنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ ہمارے دل میں تم سے ملاقات کی تمنا ہے۔ کیا اپنی ماں کی یہ تمنا پوری کرو گے؟

تحریر کے نیچے فون نمبر اور نام لکھا تھا۔ اس نام پر شاہی مہر لگی ہوئی تھی۔ ربانی اور رحمانی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے؟“

دوسرے نے کہا۔ ”تحریر سے اندازہ ہوتا ہے خاتون ایک جوان دختر کی والدہ ہیں۔ یقیناً تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں۔ بڑے سلیقے سے ملاقات کی تمنا کر رہی ہیں۔“

”ہم ملاقات سے انکار نہیں کریں گے۔ انہوں نے ایک ماں کی زبان سے دعائیں دی ہیں۔ ہم دعاؤں کے سائے میں جائیں گے۔“

ربانی نے اس کے فون نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر پی اے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ ”ہم ہیں آدم ربانی اور آدم رحمانی...“

دوسری طرف سے مسرتوں بھرے لہجے میں سلام کیا گیا۔ پھر فوراً ہی سلطانہ یاقوت بدرالنساء ظہوری سے رابطہ ہو گیا۔ سلطانہ یاقوت کی آواز اور لہجے میں سرشاری تھی۔ حیرانی سے بول رہی تھی۔ ”ہمیں توقع نہیں تھی کہ ہماری مراد فوراً پوری ہوگی اور تم اتنی جلدی اپنی ماں کا مان رکھو گے۔ خدا تم دونوں کو سلامت رکھے اور لمبی عمر عطا کرے۔“

ربانی نے کہا۔ ”ہم آپ کے بچے ہیں۔ حکم کریں۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“

”بیٹے! میری میزبانی قبول کرو۔ خواہ چند دنوں کے لیے خواہ چند گھنٹوں کے لیے یا چند منٹ کے لیے میرے پاس ضرور آؤ۔ ماں کے رُوبرو بیٹھ کر باتیں کرو۔“

”آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہم کس قدر مصروف رہتے ہیں۔ پھر بھی آپ کے لیے وقت نکالیں گے۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو ہم ابھی تھوڑی دیر کے لیے آسکتے ہیں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ابھی...؟ بوستان یہاں سے دو ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ کس فلائٹ سے آؤ گے؟ ہم ابھی تمہارے استقبال کی تیاری کرتے ہیں۔“

”آپ زحمت نہ کریں۔ وہاں ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔ آپ کسے دکھانے کے لیے تیاریاں کریں گی؟ ہم کسی ہوائی جہاز میں نہیں آئیں گے۔ آپ محل کے دروازے بند رکھیں۔ پھر بھی آپ کے ٹی وی لاؤنج میں یا ڈرائنگ روم میں پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔“

وہ شدید حیرانی سے بولی۔ ”پانچ منٹ میں آسکتے ہیں یا خدا! یہ تو طلسم ہوا۔“

”ہم جادو نہیں جانتے۔ خدا جانتا ہے ہم کچھ نہ جانتے ہوئے بھی بہت کچھ کر گزرتے ہیں۔“

سلطانہ یاقوت نے کہا۔ ”میں ابھی اپنے ڈرائنگ روم میں آرہی ہوں۔“

وہ فون بند کر کے آئینے کے سامنے آئی۔ اپنے لباس کو درست کیا۔ سنگار کرنا ضروری نہیں تھا۔ ایک ماں بچوں سے ملنے والی تھی۔ وہ خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آتے ہی ٹھٹک گئی۔ دو اجنبی خوبرو جوان صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی تعظیماً اٹھ کر سلام کیا۔ وہ پہچان گئی تھی پھر بھی سلام کا جواب دیتے ہوئے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ایک نے کہا۔ ”میں آدم ربانی ہوں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”میں آدم رحمانی ہوں۔“

سلطانہ یاقوت نے فوراً ہی قریب آکر بڑی محبت سے ان کی بلائیں لیں۔ ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ پھر کہا۔ ”یہ سب ہی کہتے ہیں کہ تمہاری ایک جھلک بھی دیکھ لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ اتنی آسانی سے تم دونوں کو اپنے گھر میں دیکھ رہی ہوں۔“

رحمانی نے کہا۔ ”جنت کا دروازہ ماں کے قدموں میں کھلتا ہے اسی لیے ہم دوڑے چلے آئے ہیں۔“

ربانی نے کہا۔ ”صرف ملنے نہیں آئے ہیں، آپ کی خدمت کرنے بھی آئے ہیں۔ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم دیں۔“

”ہاں بیٹے! مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ میں اپنی ایک مختصری رُوداد سنانا چاہتی ہوں۔ میرا دکھڑا سنو گے تو میری ضرورت کو سمجھ لو گے۔“

”آپ فرمائیں۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔“

”پہلے کچھ پی لیا جائے؟“

”تکلف نہ کریں۔ یہ کھانے پینے کا وقت نہیں ہے اور ہم بے وقت بھی چائے بھی نہیں پیتے۔ پلیز اپنی رُوداد شروع

کریں۔''

وہ تینوں لاؤنج میں آکر ایک دوسرے کے رُوبرو بیٹھ گئے پھر سلطانہ یاقوت نے کہا۔ ''میں سلطان حاتم علی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد سلطنتِ یاقوت کی حکمرانی میرے نام ہوگئی۔ میں یہاں کی خودمختار سلطانہ بن گئی۔ میں نے شادی کی اور ایک اچھی خوش حال ازدواجی زندگی گزارتی رہی۔

''ہمیں جنگلی جانوروں کے شکار کا شوق تھا۔ ایک بار ہم ایک قافلے کی صورت میں شکار کھیلنے حبشہ کے جنگلوں میں نکل گئے۔ وہاں ہم نے کھلی فضاؤں میں خوب تفریح کی۔ شکار کھیلنے کے دوران بہت اچھا وقت گزارا پھر اچانک ہی ایک رات کالے کلوٹے حبشی درندوں کے گھیرے میں آگئے۔

''انہوں نے رات کی تاریکی میں یوں اچانک حملہ کیا تھا کہ ہمیں اپنا اسلحہ استعمال کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ایسے وقت ہمارے قافلے کا ایک... شکاری کسی طرح ان سے بچ بچاکر فرار ہوگیا۔ ان حبشیوں نے ہمیں سرکنڈوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ایسے باندھ کر رکھا جیسے ہم قربانی کے جانور ہوں۔

''میں نے ایک چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر تقریباً بیس فٹ اونچا ایک شیطانی مجسمہ ایستادہ تھا۔ درجنوں حبشی عورتیں اور مرد اس مجسمے کے آگے جھوم جھوم کر رقص کر رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔

''یہ معلوم ہوا کہ ان کا سردار ہم میں سے کسی حسین عورت سے شادی کرے گا۔ باقی کو شیطان کی بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔ میں نے ایسی باتیں کہانیوں میں پڑھی تھیں یا فلموں میں ایسے مناظر دیکھے تھے۔ مجھے اس وقت ایسے ماحول سے گزرتے ہوئے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ بھی سچ مچ ایسا ہونے والا ہے۔

''تھوڑی دیر بعد یہی ہوا۔ دو کالوں نے آکر میری رسیاں کھولیں پھر مجھے کاندھوں پر لاد کر وہاں سے لے جانے لگے۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ یہی سمجھ میں آیا کہ شیطانی مجسمے کے سامنے میری بلی دی جائے گی۔ میری گردن اڑائی جائے گی۔

''میرا شوہر اور تمام جیالے شکاری بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ میری سلامتی کے لیے ان کے آگے گڑگڑا رہے تھے لیکن وہ ہماری زبان نہیں سمجھتے تھے۔ سمجھتے بھی تو کیا ہوتا؟ وہ رحم کھانے والے نہیں تھے۔

''وہ مجھے کاندھوں پر لاد کر اپنے سردار کی جھگی میں لے آئے۔ معلوم ہوا وہ مجھ سے شادی کرنے والا ہے۔ مجھے اس کے برابر لے جاکر بٹھا دیا گیا۔ وہاں مردہ انسانی کھوپڑی اور کالے جادو سے تعلق رکھنے والی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دو بھیانک چہرے والے پجاری منتر پڑھ رہے تھے۔

''ایسے بھیانک ماحول میں میرے تو ہوش اڑ گئے۔ میں سحرزدہ سی ہوکر چیخنا بھول گئی۔ حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی تو بولتی کیا؟ شاید ان کے پُراسرار منتر مجھے ذہنی طور پر کمزور بنا رہے تھے۔

''ایک پجاری گنگنانے کے انداز میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ ''اے گوری چٹی حسینہ! یہ حبشہ قوم کا ناقابلِ شکست سردار ہے۔ اسے موت بھی شکست نہیں دیتی۔ ہم نہیں جانتے، یہ کتنے برسوں سے کتنی صدیوں سے زندہ چلا آرہا ہے۔ ہمارے باپ دادا بھی نہیں جانتے۔''

''دوسرے پجاری نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔ ''اے حبشہ قوم کے عظیم سردار! تجھے مبارک ہو۔ یہ حسینہ تیرے لیے شہر چھوڑ کر جنگل میں آئی ہے۔ یہ تیری اولاد پیدا کرے گی۔ پھر تیری نسلیں بھی گوری چٹی اور خوبصورت ہوکر ان جنگلوں سے نکل کر مہذب دنیا میں جائیں گی۔''

''میں سن رہی تھی اور گھبرا رہی تھی۔ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ ان کے پُراسرار علوم کے اثر سے میری آواز بند ہو گئی تھی اور قوتِ مدافعت بھی ختم ہوچکی تھی۔ اپنے ہاتھ پاؤں کو ایک ذرا حرکت نہیں دے پا رہی تھی۔

وہ نہ جانے کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہوئے شادی کی رسمیں ادا کرتے رہے پھر دو کالوں نے مجھے اٹھا کر گھاس پھوس کے ایک بستر پر لٹا دیا۔ وہ سہاگ کی سیج تھی۔ میرے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ وہ موٹا بھدا دیوہیکل سردار میرے پاس آکر لیٹ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہاں کوئی طاقت مجھے شیطانی عذاب سے بچانے والی نہیں تھی۔

وہ دونوں پجاری منتر پڑھتے ہوئے اس بستر کے چاروں طرف ناچتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ سدا جی وت سردار زنگورارا کی نسلیں آج کے بعد خوبصورت ہوں گی اور مہذب دنیا میں جاکر زنگورارا کا نام روشن کریں گی۔

''اگرچہ میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تاہم دماغ میں سنسناہٹ سی تھی۔ یہ سوچ کر تمام اعصاب کھنچے جا رہے تھے کہ میری شرم و حیا کی دھجیاں اڑنے والی ہیں۔ میں خدا

کو پکار رہی تھی اور مایوس ہو رہی تھی۔ میرا شوہر اور دوسرے تمام شکاری مجھ سے دور قیدی بنے ہوئے تھے۔

''ایک پجاری تھال میں پھول سندور اور کھانے کی چیزیں لے کر آیا۔ اس نے زیرِ لب کچھ پڑھتے ہوئے میری پیشانی پر سندور لگایا۔ وہاں پھول کی پتیاں چپکا دیں۔ میرا منہ کھول کر.... ایک چمچی میں کوئی کھٹی سی بدمزہ سی چیز لے کر مجھے کھلانے لگا اور کہنے لگا۔ ''سدا جی وت سردار زنگو رارا...! یہ تیرا جھوٹا کھا رہی ہے۔ تیری ہونے والی اولاد کی پرچھائیں اس کے اندر اتر رہی ہے۔ یہ تیری آغوش میں آنے کے بعد تیرے بچے کی ماں بن جائے گی۔''

''اس نے پھر وہی زنگو رارا کی کھٹی میٹھی بدمزہ سی جھوٹی خوراک مجھے کھلائی اور یقین اور اعتماد سے کہا۔ ''یہ شیطانی خوراک ہے۔ اپنا اثر ضرور دکھائے گی...''

''پوجا کا یہ سلسلہ ختم ہوا، وہ پجاری منتر پڑھتے ہوئے وہاں سے جانے لگے۔ میں اس شیطان کی سیج پر تنہا رہ گئی۔ زنگو رارا بہت خوش تھا۔ وہ میری طرف کروٹ لے کر پیلے پیلے دانتوں سے مسکرانے لگا۔ میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ دل کی گہرائیوں سے گڑگڑاتے ہوئے خدا کو پکار رہی تھی۔

''شامت آجائے تو ٹلتی نہیں اور کبھی ٹل بھی جاتی ہے۔ ان لمحات میں میری دعائیں جیسے عرش سے جا کر ٹکرائی تھیں جس کی توقع نہیں تھی، وہ ہوگیا۔ اچانک ہی اِدھر اُدھر سے فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ تیر اور نیزے رکھنے والے حبشی بارودی اسلحے کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ وہ جنگلی کچھ تو مر گئے۔ باقی زنگو رارا کے ساتھ فرار ہوگئے۔

''یہ خدا کی شان ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہوگیا۔ ہم سب کو رہائی مل گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارا ایک ساتھی جو حبشیوں کے نرغے سے نکل بھاگا تھا، وہ شہر سے پولیس فورس لے آیا تھا۔ اس کی ذہانت اور دلیری سے آج مجھے یہ آبرومندانہ نئی زندگی مل رہی تھی۔

''آج بھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ آج کی مہذب دنیا کے لوگ ایسے بے لباس جانوروں کی طرح رہنے والے حبشیوں کے متعلق کبھی سوچتے بھی نہیں ہوں گے۔

''میں انہیں آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ہمیشہ کے لیے نظر انداز کر دینا چاہتی تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ زنگو رارا وقتاً فوقتاً میرے تصور میں آ کر مسکراتا رہتا تھا۔

''مجھے ایک بات عجیب سی لگنے لگی۔ میں جب بھی رات کو اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تو وہ کھٹی بدمزہ سی خوراک میرے حلق اور سینے سے اترتی ہوئی محسوس ہوتی۔ جس پجاری نے مجھے وہ خوراک کھلائی تھی اس کی سرگوشی سنائی دیتی۔ ''یہ شیطانی خوراک ہے۔ اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔''

''اگر یہ باتیں میرے ذہن میں گردش نہ کرتیں تو میں بڑے سکون سے رہتی لیکن رفتہ رفتہ میرا سکون برباد ہو رہا تھا۔ میں تنہائی میں اس گزرے ہوئے شیطانی واقعے کے متعلق بے اختیار سوچنے اور الجھنے لگتی۔

''میرا خاوند مامون ظہوری شکی مزاج ہے۔ اسے شک ہی نہیں یقین ہے کہ میں حبشی سردار کی تنہائی میں برباد ہو چکی ہوں۔ جب میں نے ایک ماہ بعد یہ خوش خبری سنائی کہ ماں بننے والی ہوں تو اس کا یقین اور پختہ ہوگیا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ ہونے والا بچہ مشکوک ہے۔

''یہ ایسا شرمناک الزام تھا کہ میں تکلیف سے چیخ پڑی۔ ''آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟ کیا میں بے حیا اور بدکار ہوں؟ کیا سمجھ کر مجھے الزام دے رہے ہیں؟ کیا میں کوئی گری پڑی عورت ہوں؟''

وہ بولا۔ ''نہ تم بے حیا ہو نہ بدکار۔ تم پر ظلم ہوا ہے۔ تمہاری پارسائی کو جبراً تار تار کیا گیا ہے۔''

''آپ بکواس کر رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں نے اس رات کی رُوداد آپ کو پوری سچائی سے سنائی تھی۔ میرے خدا نے میری پارسائی برقرار رکھی تھی اور آپ نے اس وقت میری بات کا یقین کیا تھا۔''

''میں نے بے دلی سے یقین کیا تھا۔ یہ بات ذہن میں چبھتی رہی تھی کہ جہاں ہم جیسے شکاری مرد بے بس ہوگئے تھے، وہاں تمہاری جیسی کمزور عورت کیسے پاک دامن رہ پائے گی؟ تمہاری کوئی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ کوئی معجزہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ہونے والا بچہ کہہ رہا ہے کہ سچ کیا ہے؟''

میں اپنے شوہر کی بے اعتمادی پر دنگ رہ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں اب بھی کہتا ہوں، تم بے حیا اور بدچلن نہیں ہو۔ میں آج بھی تمہاری عزت کرتا ہوں اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔ لیکن...'' وہ ایک ذرا رک کر بولا۔ ''وہ ہونے والی اولاد میری نہیں ہے۔ تم ہمیشہ میری رہو گی۔''

میں نے ناگواری سے کہا۔ ''اس لیے میری ذات سے چپکے رہو گے کہ میں سلطنت یاقوت کی ملکہ ہوں۔ میری وجہ سے تمہیں عزت، شہرت اور اونچا مقام حاصل ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو میری توہین کر کے میری زندگی میں رہ سکو گے؟''

"میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ توہین نہیں کر رہا ہوں جو سچ ہے وہ کہہ رہا ہوں۔"

"اور میں جھوٹ کہہ رہی ہوں کہ پاک دامن ہوں۔ تمہارے سوا کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"چلو مان لیتا ہوں۔ وہ ہونے والا بچہ میرا ہے۔ جھگڑا ختم کرو۔ ہمیں ایک ساتھ ایک لمبی زندگی گزارنی ہے۔"

"ایک ملکہ کے شوہر بن کر رہنے کے لیے جھگڑا ختم کر رہے ہو۔ تمہارے اندر کی بات معلوم ہو چکی ہے۔ تم کبھی دل سے نہ مجھے پاک دامن سمجھو گے۔ نہ میرے بچے کو دل سے اپنی اولاد سمجھو گے۔ ہمارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔" اگر میں پاک دامن نہ ہوتی تو ضرور شرمندہ ہوتی۔ کوئی شریف زادی بھی گالی برداشت نہیں کرتی اور میرا شوہر میری پارسائی کو گالی دے رہا تھا۔

میں نے نفرت سے کہا۔ "لعنت ہے تم جیسے شوہروں پر جو اپنی بیویوں کی حفاظت نہیں کر پاتے۔ ان کی بربادی کا تماشا دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد ان بیچاریوں کو ساری عمر آبرو باختہ ہونے کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔"

ماموں ظہوری میری خالہ کے صاحبزادے ہیں۔ گفتار کے غازی ہیں۔ مردانگی خوب جتاتے ہیں دکھا نہیں پاتے۔ میں ان کی شریکِ حیات تو ہوں لیکن سلطنتِ یاقوت کی ملکہ کی حیثیت سے برتر ہوں اور وہ کمتر ہیں۔

ایک شوہر نے ملکہ کو گالی دی تھی۔ میں نے غصے سے کہا۔ "چلو نکلو میرے محل سے۔۔۔"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں نے ایک مرد کی انا سے مجبور ہو کر ناگوار اور قریب جان کر ایک غلط بات کہہ دی۔ میں۔۔۔"

میں نے سختی سے بات کاٹ کر کہا۔ "میں کچھ نہیں سنوں گی۔ سلطانہ یاقوت پر انگلی اٹھانے والوں کی سزا موت ہوتی ہے اور تم نے مجھ پر کیچڑ اچھالی ہے۔ اگر فوراً یہاں سے نہ گئے تو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤ گے۔"

"وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ یہ بات پورے شاہی خاندان میں پھیل گئی کہ میں نے شوہر کو محل سے نکال دیا ہے۔ میں نے خاندان کے بزرگوں اور عزیزوں کے سامنے فیصلہ سنایا۔ "میں ماموں ظہوری کو اپنی زندگی سے نکال رہی ہوں۔ کوئی شخص بیوی پر شبہ بھی کرتا رہے۔ الزام بھی دیتا رہے اور شوہر بھی بن کر رہے تو وہ سراسر دوغلا اور مطلب پرست ہوتا ہے۔ میں ایسے شخص کو اپنی زندگی میں برداشت نہیں کروں گی۔

"بزرگوں نے مجھے سمجھایا کہ طلاق نہ لوں۔ علیحدگی اختیار کر لوں۔ شاید آگے چل کر اس سے سمجھوتا ہو جائے۔ میں نے بزرگوں کی بات مان لی۔ یہ فیصلہ سنایا کہ وہ محل میں نہیں رہے گا۔ میں اپنی ہونے والی اولاد پر اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ وہ کبھی اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائے گا۔

"میں سلطنتِ یاقوت کی مطلق العنان ملکہ ہوں۔ میرے احکامات کی تعمیل ہو رہی ہے۔ ماموں ظہوری اس محل میں نہیں آتا ہے۔ نہ ہی میں اس کی صورت دیکھتی ہوں۔ میں نے ایک بہت ہی خوبصورت سی بچی کو جنم دیا ہے۔

"شاہی خاندان کے تمام بزرگ ماموں کو باتیں سناتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ ایک بھیانک حبشی کی اولاد اتنی حسین گوری چٹی نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایسا شاعرانہ ناک نقشہ ہوتا ہے۔

ماموں ظہوری نے میری توہین کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے اور میں اس غلطی کو کبھی معاف کرنے والی نہیں ہوں۔"

سلطانہ یاقوت اتنا کہہ کر ذرا چپ ہو گئی۔

آدم ربانی اور رحمانی اسے بڑی توجہ سے دیکھتے اور سنتے آ رہے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ سلطانہ یاقوت سے ایک سرسری سی رسمی ملاقات ہوگی۔ وہ اس سے مل کر جلد ہی واپس چلے جائیں گے لیکن وہاں ایک دلچسپ داستان چھڑ گئی تھی اور اس داستان کا سب سے اہم کردار بھی سامنے آنے والا تھا۔

سلطانہ یاقوت نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میرا نام بدر النساء ہے۔ شادی کے بعد بدر ظہوری کہلانے لگی۔ بدر پورے چاند کو کہتے ہیں۔ میں نے بیٹی کا نام ہلالہ رکھا ہے۔ ہلال پہلی رات کا چاند ناخن برابر ہوتا ہے۔ آسمان کو توجہ سے دیکھو تو دکھائی دیتا ہے۔ میری بیٹی کسی مرد کو دکھائی نہیں دیتی۔ آج تک اسے کسی مرد نے نہیں دیکھا ہے۔"

یہ ایسی چونکا دینے والی بات تھی کہ ربانی اور رحمانی نے بے یقینی سے چونک کر ملکہ یاقوت کو بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "حتیٰ کہ اس کے باپ نے بھی اسے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے اس کی پیدائش سے پہلے کہا تھا باپ کو بیٹی کی صورت دیکھنے نہیں دوں گی۔ اب قدرتی طور پر یہی ہو رہا ہے۔"

ربانی نے پوچھا۔ ''کیا آپ کی صاحبزادی صرف مردوں کے سامنے نہیں آتی ہے؟''

''ہاں۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ایک عجیب سی بات دیکھنے میں آئی۔ اس کے نانا کان میں اذان دینے کمرے میں آئے۔ تب وہ اچانک ہی رونے لگی۔ نانی نے اسے گود میں لے کر بہلایا' چپ کرانے کی کوششیں کیں لیکن وہ ایسے روتی رہی جیسے سخت تکلیف میں مبتلا ہوگئی ہو۔

نے ابا جان سے کہا۔ ''پتا نہیں اسے کیا ہوگیا ہے؟ آپ دوسرے کمرے میں تشریف رکھیں۔ بچی چپ ہوگی تو اسے آپ کی گود میں دیا جائے گا۔''

وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ہلالہ چپ ہوگئی پھر ابا جان سے کہا گیا کہ اذان دینے آجائیں۔ وہ آئے تو ہلالہ پھر ہاتھ پاؤں جھٹک کر رونے لگی۔ نماز کا وقت ہورہا تھا، انہوں نے کہا۔ ''مسجد سے آکر اذان سناؤں گا۔ اسے دیکھو۔ معلوم کرو کیا تکلیف ہے؟''

وہ چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی وہ چپ ہوگئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے اچھی طرح چیک کیا۔ وہ پوری طرح صحت مند تھی۔ کوئی بیماری کوئی تکلیف کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ حیرانی کی بات تھی کہ اپنے نانا کے آتے ہی رونے لگتی۔ ان کی عدم موجودگی میں بڑے آرام سے تھی۔

میرا ایک کزن مجھے ماں بننے کی مبارک باد دینے پھولوں کا ایک گلدستہ لے کر آیا تو ہلالہ پھر چیخیں مار کر رونے لگی۔ وہاں سب ہی خواتین پریشان ہورہی تھیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے؟

میری ایک خالہ اسے چپ کرانے دوسرے کمرے میں لے گئی تو سب حیران رہ گئے۔ وہ فوراً ہی چپ ہوگئی۔

ایسا کئی گھنٹوں تک ہوتا رہا۔ ہمارے خاندان کا کوئی مرد آتا تو وہ رونے لگتی۔ وہ جاتا تو چپ ہوجاتی۔ شام تک یہ حیران کردینے والی بات سمجھ میں آہی گئی کہ وہ ننھی سی بچی کسی مرد کا وجود برداشت نہیں کرتی ہے۔''

ربانی اور رحمانی نے بھی حیران ہوکر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سلطانہ یاقوت نے کہا۔ ''جو سنتا تھا' حیران رہ جاتا تھا۔ قدرت نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی ضد بنا کر ان کے درمیان کشش پیدا کی ہے۔ وہ دنیا میں آکر ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے۔ جوانی کے پہلے لمحے سے ایک دوسرے کے لیے ضروری ہوجاتے ہیں۔ یہ کیسی عجیب سی بات تھی کہ میری بیٹی نے پیدا ہوتے ہی اس ضرورت سے انکار کردیا تھا۔

میں نے سوچا' جوان ہوگی تو قدرتی تقاضوں کے مطابق اپنے کسی پسندیدہ مرد کی طرف مائل ہوگی۔ اب وہ پورے بیس برس کی ہوگئی ہے۔ میں اس کی طرف سے تشویش میں مبتلا رہتی ہوں۔''

رحمانی نے پوچھا۔ ''اب تو عمر کا تقاضا ہوگا۔ کیا اس کا رجحان کسی مرد کی طرف ہے؟''

سلطانہ یاقوت نے انکار میں سر ہلایا پھر کہا۔ ''آج بھی وہ کسی مرد کے وجود سے گھبراتی ہے۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے میری بیٹی کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے۔''

ربانی نے کہا۔ ''آپ نے تجزیہ کیا ہوگا' اسے مردوں سے بیزاری ہے یا نفرت؟''

''نفرت کیوں ہوگی؟ کسی بھی مرد سے نفرت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور بیزاری کا بھی کوئی سبب نہیں ہے۔ اس نے آج تک بھی کسی مرد کے خلاف کوئی بات نہیں کی ہے۔ اپنے باپ مامون ظہوری کو بہت چاہتی ہے لیکن کبھی ان کے سامنے بھی جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

''میں بیٹی سے پوچھتی بھی ہوں اور اس کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا تھا' یہ کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی عمر ہے۔ کیا تمہارے دل میں کسی کے لیے چاہت پیدا نہیں ہوئی ہے؟

''وہ جواب دیتی ہے۔ کسی کے لیے چاہت پیدا ہوگی تو پہلے ماں کو بتائے گی۔ اس کے بعد میں اسے اور کیا کہہ سکتی ہوں؟''

رحمانی نے پوچھا۔ ''یہ دنیا مردوں کی ہے۔ وہ محل سے باہر دنیا کی سیر کرتی ہوگی۔ مردوں سے سامنا ہوتا ہی ہوگا۔ کیا چار دیواری سے باہر نقاب میں رہتی ہے؟''

''وہ سر سے پاؤں تک برقع نہیں پہنتی۔ بہترین نت نئے ڈیزائن کے ملبوسات پہننے کی شوقین ہے۔ وہ سرِعام بے نقاب رہتی ہے پھر بھی کوئی اسے دیکھ نہیں پاتا۔''

دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔

''ہلالہ اپنے چہرے پر ماسک پہنتی ہے۔ ایک دوسری لڑکی کے روپ میں اپنا اصلی روپ چھپا لیتی ہے۔ یوں وہ تمام مردوں کو دیکھتی ہے۔ کوئی اسے دیکھ نہیں پاتا۔ وہ ایک عام لڑکی کی طرح سب سے ملتی ہے۔ کوئی اس شہزادی سے مل نہیں پاتا۔''

رحمانی نے کہا۔ ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بچپن میں وہ کسی مرد کی موجودگی سے تکلیف میں مبتلا ہوکر رونے لگتی تھی۔ اب وہ ماسک میک اپ میں ان کا سامنا کیسے کرتی

ہے؟ کیا اب وہ تکلیف محسوس نہیں کرتی ہے؟''

''تکلیف اس وقت ہوتی تھی جب کوئی اس کی پیدائشی صورت دیکھتا تھا۔ اب وہ محتاط رہتی ہے۔ پیدائشی صورت ماسک میں چھپائے رکھتی ہے۔ اس لیے اس پر ایسا کوئی دورہ نہیں پڑتا ہے۔''

''بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بہت لمبی مدت ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

ماں نے دکھ سے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ ''ہم ماں بیٹی کو اب معلوم ہوا ہے۔''

''کیا ہمیں بتانا چاہیں گی؟''

وہ بولی۔ ''یاد ہے میں نے اپنی رُوداد کے دوران یہ بیان کیا تھا کہ زنگورارا کے ایک ساحر پجاری نے مجھے ایک تھنی بدمزہ سی کوئی چیز کھلائی تھی اور کہا تھا کہ وہ زنگورارا کی کھائی ہوئی جھوٹی خوراک ہے؟''

ربانی نے کہا۔ ''ہاں ہمیں یاد ہے۔ اس پجاری نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ شیطانی خوراک ہے۔ اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔''

سلطانہ نے کہا۔ ''وہ اثر دکھا رہی ہے۔ ہلالہ مامون ظہوری کا نطفہ ہے۔ لیکن اس کے لہو میں اور رگ رگ میں اس شیطانی خوراک کے ذرات رچ بسے ہیں۔ میں نے ایک رات دیکھا۔ ہلالہ کچن میں کھانے کی کوئی چیز تیار کررہی تھی۔ میں نے قریب آکر دیکھا پھر پوچھا۔ ''یہ معجون جیسی کیا چیز ہے؟''

اس نے ایک کٹوری میں تھوڑا سا معجون نکال کر کہا۔ ''آپ ذرا سا چکھ کر دیکھیں بڑی مزیدار چیز ہے۔''

اس نے ایک چمچی معجون میرے منہ میں رکھا تو شدید حیرانی سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ وہی تھنی بدمزہ شیطانی خوراک تھی۔ اسے میں کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔ میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''یہ تم کیا کھا رہی ہو؟''

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے یاد نہیں ہے موم...! کب سے کھا رہی ہوں؟ اسے کھاتی ہوں تو میرے اندر کی نامعلوم سی بے چینی یکلخت ختم ہوجاتی ہے۔ میں خود کو بہت پُرسکون اور تازہ دم محسوس کرنے لگتی ہوں۔''

میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''تعجب ہے۔ تم یہ معجون کیسے تیار کرلیتی ہو؟''

وہ سوچنے لگی پھر بولی۔ ''مجھے یاد نہیں آرہا ہے ایک دن نامعلوم سی بے چینی اور پریشانی کے دوران اسے کیسے تیار کرلیا تھا۔ اسے کھایا تو آرام آگیا۔ بڑی زود اثر دوا ہے۔ اب تو ہر رات سونے سے پہلے ضرور کھاتی ہوں۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر محبت سے سمجھایا۔ ''میری جان! یہ شیطانی خوراک ہے۔ اسے پھینک دو۔''

''کیسے پھینک دوں؟ میں نے ایک بار اسے دو دن تک نہیں کھایا تو ایسا لگا' اندر سے بیمار ہوں۔ کیا آپ بھول گئیں کہ میں کیسے ایب نارمل ہوگئی تھی؟''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہ دوبار خطرناک حد تک ایب نارمل ہوگئی تھی۔ مردوں سے سخت نفرت کرنے لگی تھی۔ محل سے باہر نہیں جاتی تھی۔ تاکہ کوئی شخص اسے نظر نہ آئے۔ ایک رات وہ میری لاعلمی میں باہر گئی۔ واپس آئی تو معلوم ہوا وہ کسی نوجوان کو گولی مار کر آئی ہے۔''

وہ بڑے دکھ سے ربانی اور رحمانی کو دیکھ کر بولی۔ ''میرے دکھ اور پریشانی کا اندازہ کرسکتے ہو۔ میری بیٹی نے یعنی ایک شہزادی نے قتل کی واردات کی تھی۔ میں نے دوسری بار اسے ایب نارمل نہیں ہونے دیا۔ بڑی مشکلوں سے اسے قابو میں رکھا۔ علاج اور دواؤں سے وہ نارمل ہوگئی۔

پھر اس نے ایک دن کہا۔ ''موم! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں۔ آپ دیکھیں گی کہ مجھے اب کسی مرد سے نفرت نہیں ہوگی۔''

اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا اور واقعی وہ نارمل رہنے لگی ہے۔ اس کی وجہ اس روز معلوم ہوئی جب وہ چھپ کر شیطانی معجون کھا رہی تھی۔ بیٹے! میری مجبوریاں دیکھو۔ میں ماں ہوں۔ ایک سلطنت کی ملکہ ہوں اور اسے شیطانی دوا کھانے سے روک نہیں سکتی۔ روکوں گی تو وہ خطرناک حد تک ایب نارمل ہوجائے گی۔

وہ بھی یہی کہتی ہے۔ ''موم! میں غیرانسانی واردات کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی۔ مجھے یہ دوا کھانے سے نہ روکیں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر چپ ہوگئی۔ وہ دونوں بھی چپ رہ کر سوچ میں پڑ گئے۔ ایک ماں پر کیے جانے والے شیطانی عمل نے اس کی بیٹی کو جکڑ لیا تھا۔

ایک واردات جو بیس برس پہلے ہوئی تھی' اس کے اثرات لاعلمی میں اب تک جاری تھے اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہنے والا تھا؟ اور نہ جانے آئندہ بیٹی کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

ربانی اور رحمانی کے ذہنوں میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے۔ رحمانی نے پوچھا۔ ''کیا ہلالہ ان جادوئی اثرات

کو تسلیم کر رہی ہے کہ آپ کا ماضی اس کے حال اور مستقبل کو نقصان پہنچا رہا ہے؟''

''پہلے وہ جادو ٹونے کو نہیں مانتی تھی۔ اس شیطانی دوا کو محض ایک زود اثر دوا سمجھتی تھی۔ لیکن ایک روز۔۔۔''

وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ اس نے خلا میں تکتے ہوئے جیسے کچھ یاد کیا پھر کہا۔ ''ہلالہ نے ایک رات اس حبشی دیو ہیکل سردار زنگورارا کو خواب میں دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''میں تیرا باپ تو نہیں ہوں لیکن جس طرح باپ کا لہو اولاد کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اسی طرح میرا کھایا ہوا، اُگلا ہوا جھوٹا تیری رگ رگ میں سما گیا ہے۔ وہ جھوٹا تیری ماں کی کوکھ میں تھا اور وہ سوغات تُو وہاں سے لائی ہے۔''

وہ کہہ رہا تھا۔ ''تیری ماں میرا اُگلا ہوا اپنے اندر چھپا کر بھاگ گئی۔ وہ ساری خوراک تم ماں بیٹی کے اندر رہا کرے گی اور تجھ کو بھی میری ضرورت بن کر رہا کرے گی۔ اپنی ماں سے بول واپس آئے۔ نہیں آئے گی تو تجھے آنا ہوگا۔ تجھے ماں کا قرض چکانا ہوگا۔۔۔''

سلطانہ یاقوت نے صدمے سے ربانی اور رحمانی کو دیکھا۔ ربانی نے کہا۔ ''آپ حوصلہ رکھیں۔ یہ بتائیں ابھی کیا حالات ہیں۔ کیا وہ ہلالہ کو پریشان کر رہا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ایک رات مجھے اس کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا، بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ اپنی خیر چاہے گی تو بکری کو لے جاؤں گا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ابھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ ابھی میں اپنی جگہ چھوڑ نہیں سکتا۔ جلد ہی تم لوگوں کی طرح مہذب بن کر پورا لباس پہن کر تمہاری دنیا میں آؤں گا۔ اور تب تک تمہاری بیٹی شیطانی خوراک کے بغیر سکون سے جی نہیں سکے گی اور نہ ہی کبھی کسی مرد کا وجود برداشت کر سکے گی۔

اسے صرف اور صرف میرا ہی وجود برداشت کرنا ہوگا۔ بیٹی کی خیر چاہتی ہو تو ابھی آجاؤ۔ آج نہ سہی، کل آجاؤ۔ تم میں سے کسی کو تو آنا ہی ہوگا۔۔۔''

یہ کہہ کر سلطانہ یاقوت نے آنکھیں بند کرلیں۔ اندر جو صدمات تھے انہیں چپ چاپ جھیلنے لگی۔

ماں اور بیٹی دونوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آئندہ کیا ہو سکتا ہے؟ اور جو ہو سکتا ہے اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر ربانی اور رحمانی کو دیکھا پھر کہا۔ ''میں پچھلے چھ ماہ سے تم دونوں کا چرچا سنتی آرہی ہوں۔ پھر تمہاری واٹر کلر اور آئل کلر سے بنی ہوئی تصویریں دیکھیں۔ تم دونوں کے بارے میں عجیب و غریب باتیں گردش کر رہی تھیں۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ تم دونوں جب چاہتے ہو نادیدہ ہو جاتے ہو۔ پھر سنا کہ کرسی توڑوں کو پتھر بنا دیتے ہو۔ مجرموں کو اور غلط لوگوں کو ان کے اندر گھس کر پہچان لیتے ہو۔ میرے دل نے کہا 'تم بوستان قوم کے لیے مسیحا بن کر آئے ہو تو ہم ماں بیٹی کے لیے بھی مسیحا ضرور بنو گے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ہم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ معبود ہمیں مسیحائی کی مزید توفیق عطا فرمائے اور ہم آپ کی توقع کے مطابق کام آتے رہیں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔''

ربانی نے پوچھا۔ ''آپ کی صاحبزادی کہاں ہیں؟''

''اسی محل میں ہے۔ وہ تم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ خود کو نہیں چھپائے گی۔ سامنے آئے گی۔ میں ابھی دیکھتی ہوں وہ کہاں ہے؟ کیوں نہیں آرہی ہے؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لاؤنج سے چلی گئی۔ وہ دونوں نادیدہ ہو کر ماں کے پیچھے بیٹی تک پہنچ سکتے تھے۔ لیکن اپنے اصولوں کے پابند تھے۔ کسی عورت سے اجازت حاصل کیے بغیر اس کی چار دیواری میں قدم نہیں رکھتے تھے۔

سلطانہ یاقوت جلد ہی واپس آگئی۔ اس نے کہا۔ ''میری ہلالہ بہت خوش ہے۔ تم دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ماسک میک اپ میں نہیں ہے۔ اصلی چہرے اور اصلی شخصیت کے ساتھ آنا چاہتی ہے لیکن لاؤنج کے دروازے تک پہنچتے ہی تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔''

وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ تو پریشان ہو ہی رہی ہے اور میں یہ دیکھ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ تمہارا اور اس کا سامنا نہ ہوا تو اس کی مشکلیں کس طرح آسان کرو گے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''اگر وہ اجازت دے تو ہم روپوش رہ کر اس کے پاس جا سکتے ہیں۔''

''بات وہی ہوئی۔ تم نادیدہ ہو کر یا کسی بھی طرح چھپ کر جاؤ۔ اسے دیکھو گے تو وہ تکلیف میں مبتلا ہوگی۔ اصل بات یہی ہے کہ کسی مرد کی آنکھ اسے نہ دیکھے۔''

پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی وہ یہاں دروازے تک آئی تھی۔ تم دونوں سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن نہ کر سکی۔ جبکہ چند لمحے پہلے مجھ سے بول رہی تھی۔''

''آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ حبشی زنگورارا مہذب بن کر اپنی مجبوریاں دور کر کے کسی دن اچانک آپ ماں بیٹی کے پاس پہنچ جائے گا؟''

"ہاں۔ ایسا کسی دن بھی اچانک ہوگا تو کیا ہوگا؟ ہم دولت، طاقت اور فوج رکھنے کے باوجود کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ خدا پر بھروسا رکھیں۔ ربّ کریم نے جبشہ کے جنگلوں میں آپ کی آبرو رکھی تھی، یہاں بھی رکھے گا۔"

"کیا تم دونوں اس خبیث کے پاس پہنچ کر اسے جہنم میں پہنچا نہیں سکتے؟"

"وہ ایک بار ہماری نظروں میں آئے گا یا ہم اس کی آواز سن پائیں گے یا اس کا لباس یا اس کی اور کوئی خاص چیز ہماری راہنمائی کے لیے ملے گی تو ہم اس کی شہ رگ تک پہنچ جائیں گے۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "ایسی کوئی چیز، کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ذرائع اور اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے بڑا ذریعہ اور کیا ہوگا کہ ہم آپ کے بیٹے بن گئے ہیں۔ آئندہ بھی آپ کی ایک فون کال پر چشم زدن میں یہاں پہنچ جائیں گے۔"

وہ خوش ہو کر انہیں دعائیں دینے لگی۔ ایک ملازمہ نے ان کے آگے مشروب اور تازہ پھل لا کر رکھے۔ وہ بولی۔ "اگرچہ کھانے پینے کا وقت نہیں ہے پھر بھی ماں کے گھر سے کچھ کھا پی کر جاؤ۔"

وہ تینوں کھانے پینے کے دوران میں باتیں کرنے لگے۔ ربانی اور رحمانی بڑی خاموشی سے ہالالہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔ وہ شاید دنیا کی پہلی لڑکی تھی جسے آج تک کسی مرد کی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں بھی اسے ایک نظر دیکھے بغیر جانے والے تھے۔

ایک ملازمہ نے آ کر کہا کہ بیٹی ماں کو بلا رہی ہے۔ ماں فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ ربانی نے رحمانی کے قریب ہو کر دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ آدمی کی فطرت ہے۔ اس سے کوئی چیز چھپائی جائے تو وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ وہ چھپ رہی ہے اور ہمیں تجسس میں مبتلا کر کے اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔"

رحمانی نے سر ہلا کر کہا۔ "نہ وہ جان بوجھ کر چھپ رہی ہے نہ ماں اسے چھپا رہی ہے۔ حالات اسے ان دیکھی ان چھوئی کشش بنا رہے ہیں۔"

"اور تجسس کو بھڑکا رہے ہیں۔ بے تابی یہ نہیں ہے کہ وہ کس قدر حسین اور دل نشین ہوگی۔ ہمارے دلوں میں صرف تاباں روشن رہتی ہے۔ ہالانہ کو صرف دیکھنے اور اس کے کام آنے کا جذبہ ہے۔"

"ہاں۔ اسے دیکھنا اور اس سے ملنا ضروری ہے۔"

"وہ نظر نہیں آئے گی۔ معمّا بنی رہے گی تو زنگورارا سے نمٹنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔"

"تو پھر کیا کریں؟"

"عقل یہی کہتی ہے، اسے دیکھنا اور دیکھ کر سمجھنا ضروری ہے۔ خواہ آج دیکھو یا اور کسی دن۔ ہم آنکھ بند کر کے بھی ماں بیٹی کی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"زنگورارا اور اس کے پجاری جادوگر فی الحال ان ماں بیٹی سے دور ہیں۔ ابھی نہ وہ آئیں گے نہ انہیں جسمانی اور دماغی نقصان پہنچائیں گے۔ ہم یہاں سے جا کر سوچیں گے کہ ہالالہ کس تدبیر سے ہمارے رُوبرو آسکتی ہے؟"

وہ دونوں سرمدنا ڈن کے معاملات... اور اپنے ذاتی معاملات میں بہت مصروف تھے۔ تاباں وہاں ربانی کا انتظار کر رہی تھی اور ایک گھنٹے بعد شام کو ای میل کے ذریعے یدھا کی جگجشو بیٹی ورشا سے رابطہ ہونے والا تھا۔ ان کا بوستان واپس جانا ضروری تھا۔

سلطانہ یاقوت نے لاؤنج کے دروازے پر آ کر کہا۔ "بیٹے! تم دونوں یہاں آؤ۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب آئے۔ وہ بولی۔ "کیا میری بیٹی کو تم دونوں بھی دیکھ نہیں پاؤ گے؟ ہمیں تم سے ہی سلامتی کی امید ہے۔ تم اس کے قریب نہیں رہو گے تو اسے کس طرح تحفظ حاصل ہوگا؟"

وہ دونوں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "بیٹے! ہماری پریشانیوں کو سمجھو۔"

"ہم سمجھ رہے ہیں۔ کوئی تدبیر سوچ رہے ہیں۔ ہم آپ کے دل میں ہیں اور آپ کے دل کا سارا درد ہمارے دلوں میں ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"تم پر خدا کی رحمت ہو۔ میں ماں ہوں۔ فکر نہ کروں تب بھی فکر لاحق رہے گی۔ تم نے کہا ہے کہ زنگورارا کی کوئی چیز مل جائے تو اس شیطان تک پہنچ سکتے ہو۔"

"ہاں ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک ذرا سی رہنمائی، ایک ذرا سا اشارہ چاہیے۔"

"کیا اپنے اور پرائے تک پہنچنے کے لیے بھی ایسی رہنمائی لازمی ہوتی ہے۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ چاہتی ہیں کہ ہلالہ کی کوئی چیز ہمارے پاس رہے اور اس کے ذریعے ہم دیدہ یا نادیدہ رہ کر اس سے منسلک ہو جائیں۔"

"ہاں، اور چاہتی ہوں، کسی بھی طرح ہلالہ کو دور سے ہی دیکھتے ہوئے اس کی بہتری کے لیے کچھ کرو۔"

"ہلالہ کی چیزوں میں سب سے اہم اس کی تصویر ہوگی۔ کیا اس کی تصویر دے سکتی ہیں؟"

"تصویر ہوتی تو اسے ساری دنیا دیکھ لیتی۔ ہم نے ابتدا میں اس کی تصویریں اتارنے کی کوششیں کی تھیں۔ لیکن کیمرا اس کے سامنے آتا تھا تو وہ تکلیف میں مبتلا ہو کر چیخیں مارنے لگتی تھی۔"

"یعنی تصویر نہیں ہے۔ کیا اس کے ہاتھ کی لکیروں کا عکس مل سکتا ہے؟"

وہ بھی نہیں تھا۔ اس کی پازیب، چوڑیاں، اور ملبوسات مل سکتے تھے لیکن وہ دو کنوارے ایسی چیزیں گھر میں رکھ کر گرما گرم اسکینڈل پھیلانے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔

سلطانہ یاقوت نے کہا۔ "ہلالہ بلا رہی ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ دروازے کے پیچھے گئی پھر واپس آکر بولی۔ "وہ نہیں چاہتی کہ اس سے ملاقات کیے بغیر جاؤ۔ اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اس کی آواز نہیں سن سکتے۔ ایک اور راستہ ہے۔ اُدھر دیکھو۔"

سلطانہ یاقوت دروازے پر تھی۔ ایک طرف ہٹ گئی۔ سامنے ایک وسیع کوریڈور کی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا' ایک لڑکی کا سایہ فرش پر رینگتا ہوا اس دیوار پر طلوع ہو رہا تھا۔

وہ کوریڈور میں نہیں تھی۔ وہاں روشنی کے سامنے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اسی مناسبت سے سایہ آہستہ آہستہ ابھرتا ہوا دیوار پر سرتاپا مکمل ہو رہا تھا۔

اس کا سایہ مجسم سامنے آگیا تھا۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نصف پردہ داری ختم ہوگئی تھی۔ اور کیا ختم ہوئی تھی۔ خاک دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی چلمن کے پیچھے ہو تو کہتے ہیں۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

نہ وہ چھپی ہوئی تھی' نہ ہی سامنا ہو رہا تھا۔ سایہ تاریک سیاہ ہوتا ہے۔ تاریکی کو تراش کر اسے پیش کیا گیا تھا۔

دیوار پر اس کا سراپا ایسا لگ رہا تھا جیسے نرم لچکیلی شاخ پھولوں کے بوجھ سے خم کھا گئی ہو۔ روشنی دکھانا چاہے تو سائے میں بھی دیدہ زیبی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ اس وقت ماسک میک اپ میں نہیں تھی۔ اس لیے صورت نہیں صرف سایہ پیش کر رہی تھی۔ آئندہ بھی چہرہ بدل کر شاید سامنے آسکتی تھی۔

ربانی نے کہا۔ "یہ سایہ فی الحال ایک بہلاوا ہے۔ شاید کسی وقت یہ ہمارے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔"

رحمانی نے کہا۔ "ہلالہ! تم ہم سے بول نہیں سکتیں۔ ہماری باتیں سن سکتی ہو۔ آج کا دن گزرنے دو۔ کل تمہارے لیے وقت نکالیں گے۔ ہم یہاں آئیں گے۔ تم چہرہ بدل کر سامنے آسکو گی۔ کل شاید کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

ربانی نے پوچھا۔ "کل چہرہ بدل کر آؤ گی۔ کیا آواز بھی بدلتی ہو۔ کیا وہ شیطانی خوراک آواز پر بھی اثر انداز ہوئی ہے؟"

ہلالہ کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ وہ چپ رہی۔ ماں نے جواب دیا۔ "یہ آواز بدل کر بول نہیں پاتی ہے۔ مرد حضرات کے سامنے گونگی بن کر رہتی ہے۔ سب اسے سلطنتِ یاقوت کی گونگی شہزادی کہتے ہیں۔"

دیوار پر اس کا سایہ بھی گونگا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے اپنی غیر معمولی قدرتی صلاحیتوں کو آزما رہے تھے۔ اس سائے کے اندر اتر کر ہلالہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے اور ناکام ہو رہے تھے۔

سلطانہ یاقوت نے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ اور ہلالہ کی زندگی کا دوسرا رخ دیکھو۔"

وہ انہیں ایک ایسے کمرے میں لے کر آئی جہاں ایک حسین دوشیزہ کی مختلف تصویریں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ربانی نے کہا۔ "ہم سمجھ گئے۔ یہ ہلالہ ہے۔ اسی بہروپ میں رہتی ہے۔ دنیا والے اسی چہرے سے آپ کی صاحبزادی کو پہچانتے ہوں گے۔"

"ہاں۔ اصلی چہرہ صرف ہمارے خاندان کی خواتین نے دیکھا ہے۔ یہ جب سے پیدا ہوئی ہے' اپنے چہرے کو صرف آپ ہی دیکھ پاتی ہے۔ ایک ماں یہ چاہتی ہے کہ جسے پیدا کیا ہے' اسے ساری دنیا دیکھے۔ کیا ایسا بھی ہو سکے گا؟"

"اللہ نے چاہا تو ضرور ہوگا۔"

وہ جو تصویروں میں نظر آرہی تھی وہ بہت ہی حسین اور دل نشین تھی لیکن وہ قدرتی حسن نہیں تھا۔ مصنوعی تھا۔ اسے پلاسٹک سرجری کے ماہرین کا شاہکار کہا جا سکتا تھا۔

انہوں نے سلطانہ یاقوت سے کہا۔ ”اب ہمیں جانا ہے۔ آپ ہمیں رخصت کرنے باہر نہیں جائیں گی۔ ہم جا رہے ہیں آپ اُدھر دیکھیں۔“

جدھر کہا تھا اُدھر سلطانہ نے دیکھا۔ ان دونوں کی طرف پشت کی تو آواز آئی۔ ”خدا حافظ......!“

سلطانہ نے گھوم کر دیکھا پورے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ وہ نہیں تھے، جا چکے تھے۔

☆☆☆

وہ دونوں پہنچے تو معظم، اعظم، کامران اور تاباں کے ساتھ سرکاری پیلس میں مصروف رہے پھر سمندر پار کے حکمرانوں کی سازشوں سے آگاہ ہوتے رہے تھے۔ اس کے بعد سلطانہ یاقوت کے حالات معلوم کرکے واپس سرد ٹاؤن آئے تو ان کا پورا دن گزر چکا تھا۔

اس روز ٹاؤن کے لوگوں نے انہیں کسی پروجیکٹ میں مصروف نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات سب ہی کے ذہنوں میں سما گئی تھی کہ وہ دیوانے تاباں کے پیچھے بہک گئے ہیں۔

سرد ٹاؤن کا ایک باشندہ اپنے رشتے داروں سے ملنے شبیر آباد گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک گارڈن میں تاباں کو ربانی اور رحمانی کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک فوارے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

اس شخص نے سرد ٹاؤن میں گھر والوں کو فون پر بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے تاباں کو دونوں مسیحاؤں کے ساتھ وہاں گھومتے پھرتے دیکھا ہے۔ یہ بہت بڑی خبر تھی۔

اس کے گھر والوں نے اس خبر میں مرچ مسالا لگا کر محلے والوں کو مزے لے لے کر سنائی۔ دل اور دماغ کو گرما دینے والی اطلاع ہو تو اسے پر لگ جاتے ہیں۔

محلے والوں نے اس چٹ پٹی اطلاع کو اور زیادہ مسالے کی چاٹ بنا کر دوسرے محلے والوں کے کانوں میں پھونک دی۔

شام ہوتے ہوتے پورے ٹاؤن میں یہ خبر پھیل گئی کہ وہ تینوں بدنامی سے بچنے کے لیے دوسرے شہر میں آزادی اور بے باکی سے ملاقات کر رہے ہیں۔

ایک خاتون نے کہا۔ ”ہم نے انہیں تو پچھلی رات ہی ان کی خوشبو سے پہچان لیا تھا۔ وہ دونوں چھپ کر تاباں سے ملنے آئے تھے۔ وہ وہاں موجود تھے۔ ہمارا سامنا نہیں کر رہے تھے۔“

اسی وقت خبر ملی کہ دونوں مسیحا واپس آ گئے ہیں۔ بولنے والوں کو چپ لگ گئی۔ ایک تو انہوں نے غلط سوچا تھا کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ پھر یہ خوف طاری ہوا کہ مخالفت میں بولنے والے پکڑے جائیں گے۔

کتنے ہی لوگ ان کی رہائش گاہ کی طرف جا کر انہیں دور سے دیکھنے لگے۔ کوئی کسی ضرورت اور کسی وجہ کے بغیر ان سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے دور ہی دور سے یہ معلوم کرکے یقین کر رہے تھے کہ وہ واپس آ گئے ہیں۔

یہ الزام دینے اور ان کے منہ پر یہ کہنے کی کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ تاباں سے عشق کرنے سرد ٹاؤن سے سیکڑوں میل دور گئے تھے اور ابھی وہیں سے آ رہے ہیں۔ ان کے ذاتی معاملات میں بولنے کا حق کسی کو نہیں تھا۔

ویسے یہ بات ان دونوں کے کانوں تک پہنچ گئی تھی کہ انہیں شبیر آباد کے ایک گارڈن میں تاباں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہنستے بولتے دیکھ لیا گیا ہے۔

وہ پریشان ہو گئے۔ تاباں کے جانے کے بعد بدنامی ختم نہیں ہوئی تھی، کچھ اور بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سیکڑوں میل دور جا کر ملنے کے باوجود ان کی چوری پکڑی جائے گی۔ جگنو لڑکی نے پہلے ہی رسوائی کی پیش گوئی کی تھی۔ بدنامی میلوں دور سے بھی مشتہر ہو رہی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ربانی نے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم عزت اور نیک نامی کما رہے ہیں اور بدنامی کے چھینٹے بھی پڑتے جا رہے ہیں۔“

رحمانی نے کہا۔ ”بدنامی خواہ مخواہ نہیں ہو رہی ہے۔ چھپ کر محبت کرنے والوں پر گناہ گار ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ ہماری چوری کھلے عام پکڑی گئی ہے۔ اب صرف شبہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ پورے ثبوت کے ساتھ یقین کیا جا رہا ہے۔“

”کیا مصیبت ہے۔ ہم پیار کے شکنجے سے باہر نہیں نکل سکتے، نہ ہی اپنی پارسائی جتا سکتے ہیں۔ ہمیں کسی طرح اپنی صفائی پیش کرنی ہوگی۔ ہم رہنما غلط سمجھے جائیں گے تو ہماری رہنمائی کے صحیح نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔“

رحمانی نے کہا۔ ”ہم کیسے صفائی پیش کریں؟ تاباں کے گھر میں آدھی رات کے بعد ہماری خوشبو پکڑی گئی۔ پھر آج ہم تینوں کو شبیر آباد کے گارڈن میں دیکھ لیا گیا ہے۔ سچ تو یہی ہے، ہم بدنامی کی راہوں پر چلتے ہوئے محبت کر رہے ہیں۔“

ربانی شکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ ”آئندہ بھی ہم چھپ کر ملتے رہیں گے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

’’ہاں۔ اس کے ساتھ تنہائیوں میں بڑی اپنائیت کے ساتھ جو وقت گزرتا ہے‘ وہی ہماری زندگی کا حاصل ہے۔ ورنہ دن رات کی جدوجہد سے اور کیا ملتا ہے؟‘‘

’’ہاں کھانا کپڑا اُسنا رونا تو سب ہی کو ملتا ہے۔ اگر انعام میں خوش نصیبی سے تو تاباں ملے۔‘‘

رحمانی نے کہا’’بات یہ ہے کہ سچ خواہ کتنا ہی مشکل ہو‘ اسے بولنا چاہیے۔ سچ بولنے سے خواہ ہمارا مذاق اڑایا جائے۔ خواہ ہم پر پھبتی کسی جائے کہ دو مرد ایک عورت اور ایک عورت دو مردوں کی تمنا کر رہی ہے تو زبانِ خلق کو کہنے دو۔‘‘

’’ہاں، یہ الزام نہیں ہوگا، سچ ہوگا۔ ہمیں اس سچ کا جواب سچائی سے اور بڑی سہولت سے دینا ہوگا۔‘‘

’’انہیں سمجھانا ہوگا کہ فی الحال ہم سے غلطی ہو رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ غلطی کے نتیجے میں گناہ سرزد نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی ہم میں سے کوئی تاباں کو اپنی شریکِ حیات بنائے گا۔‘‘

’’بے شک ہم غلط فہمی پیدا کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے بدنام ہو رہے ہیں۔ ہم حوصلہ کریں گے۔ وضاحت کریں گے۔ لوگوں کا دل صاف کریں گے تو واقعی اپنی تاباں کو بھی رسوائیوں سے بچا سکیں گے۔‘‘

انہوں نے اپنے موجودہ حالات پر اچھی طرح غور کیا۔ پھر پورے ٹاؤن میں اعلان کرایا کہ رات کو بعد نماز عشا دونوں مسیحا اپنی تقریر کریں گے۔ ان کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جو غلط فہمی ہے، اسے دور کریں گے۔

وہاں ہر چوک اور گلی گلی میں لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ ان کے ذریعے وقتاً فوقتاً اہم اعلانات ہوا کرتے تھے۔ کوئی سی بھی بات ہو، وہ اسی سے عوام تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ پہلی بار اپنے دل کی باتیں دنیا کے سامنے کھولنے والے تھے۔

مہاتما بدھ کی جگتشو بیٹی ورشا نے ان دونوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ بڑی پُراسرار لگ رہی تھی۔ اپنی پیش گوئی کے ذریعے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ علم نجوم میں مہارت رکھتی ہے یا پھر اسے آتما شکتی جیسی کوئی غیر معمولی قوت حاصل ہے۔

ورشا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تاباں کے ساتھ رسوائیاں ہیں۔ وہ رسوائیاں ان دونوں کو ہی نہیں‘ تاباں کو بھی مل رہی تھیں۔

عشق بھی کیا عجیب ہوتا ہے۔ عاشق امیر بھی ہوتا ہے۔ غریب بھی ہوتا ہے۔ وہ دونوں بے چارے سے ہو کر رہ گئے تھے۔

ورشا نے وعدے کے مطابق شام چھ بجے انٹرنیٹ کے ذریعے انہیں صدا دی۔ ’’میں مہاتما بدھ کی بجگشو بیٹی ورشا سہ حارت تحریر کے ذریعے آپ دونوں سے بول رہی ہوں۔‘‘

انہوں نے جواب دیا۔ ’’شکریہ، ہم انتظار کر رہے تھے۔‘‘

’’میں بڑی بھاگوں والی ہوں کہ آپ کی نظروں میں‘ آپ کے خیالوں میں اور آپ کی یادداشت میں رہتی ہوں۔ آپ نے صبح مجھ کو یاد کیا تھا۔ میں تپسیا میں کھوئی تھی۔ شما چاہتی ہوں۔‘‘

رحمانی نے کہا۔ ’’کوئی بات نہیں۔ پہلے عبادت لازمی ہے۔ یہ معلوم کر کے مسرت حاصل ہوئی کہ تم اپنے خداوند بدھا کی عبادت میں مصروف تھیں۔ ہم بھی عبادت کے وقت دنیاوی تعلقات بھول جاتے ہیں۔‘‘

ربانی نے کہا۔ ’’ہم کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا جواب دینا چاہو گی؟‘‘

’’مجھے خوشی ہوگی۔ میرا خیال ہے کچھ ایسے سوالات بھی ہوں گے جن کے جوابات شاید میں نہ دے سکوں۔‘‘

’’ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔ ہماری پہلی گزارش ہے کہ اپنے متعلق تفصیل سے بتاؤ‘ کون ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ کیا کرتی ہو؟ ہمیں اور تاباں کو کیسے جانتی ہو؟‘‘

وہ بولی۔ ’’انٹرنیٹ ایسی دنیا ہے جہاں پہنچتے ہی اس سنسار کے تمام انجانے‘ جانے پہچانے بن جاتے ہیں۔ میں نے اسی کمپیوٹر سے آپ دونوں کی شہرت اور نیک نامی دیکھی ہے اور آپ سے متاثر ہوئی ہوں۔

’’میں کون ہوں... یہ میرے گرو دیو جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنی پوتھی میں میرے متعلق لکھا ہے کہ میں ماں باپ کے بغیر دنیا میں آئی ہوں۔‘‘

وہ دونوں ایسی بچکانہ بات پر مسکرانے لگے۔ کوئی ماں باپ کے بغیر دنیا میں نہیں آتا۔ اسکرین پر اس کی تحریر ابھر رہی تھی۔ وہ اپنی رُوداد سنا رہی تھی۔

’’پیدائش کے لیے ماں باپ لازمی ہوتے ہیں۔ شاید وہ کہیں ہوں گے۔ اب تک ان کا وجود‘ ان کا نام و نشان نہیں ہے۔ اس لیے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اٹھارہ برس پہلے بجگشوؤں کا ایک قافلہ دیوا جھیل کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ تب گرو دیو نے میرے رونے کی آواز سنی۔ سب نے آواز کی سمت آ کر دیکھا۔ میں جھیل کے پانی میں پھول کنول کے ایک بڑے سے پتے پر

پڑی رو رہی تھی۔

گرو دیو نے پانی میں اُتر کر مجھے کنول کے پتے سے اٹھایا۔ اسی جھیل کے پانی سے مجھے صاف ستھرا کیا پھر سینے سے لگا کر چوم لیا۔ اس سنسار میں آتے ہی مجھے پہلا پیار ملا تھا۔

سب حیران تھے۔ کہہ رہے تھے۔ میں بالکل نوزائدہ ہوں۔ ابھی ابھی پیدا ہوئی ہوں پھر اس ویرانے میں مجھے پیدا کرنے والی ماں کہاں ہے؟

نہ ماں تھی نہ باپ تھا۔ نہ ان کا کوئی سنگی ساتھی تھا۔ وہاں دور تک نہ کوئی انسان تھا اور نہ ہی انسانی آبادی تھی۔

آپ نے پوچھا ہے میں کون ہوں؟

ایک انسان کی بچی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔

نہیں جانتی کہ ایک نوزائدہ بچی اس ویرانے میں کیسے پہنچ گئی تھی؟ جبکہ اسے پہنچانے والے بھی دور دور تک نظر نہیں آئے تھے۔ کیا میں آسمان سے ٹپک پڑی تھی؟

کون بتائے گا کہ میں کون ہوں؟

آپ نے پوچھا ہے میں کہاں رہتی ہوں؟

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میں آج بھی مہاتما بدھ کے پیٹ میں رہتی ہوں۔"

ربانی اور رحمانی نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔ وہ پھر ایک بچگانا سی بات کہہ رہی تھی۔ اس نے تحریر کے ذریعے کہا۔

"یہ مذاق بھی ہے اور حقیقت بھی۔ یہاں ایک صدی پہلے ایک بلند پہاڑی کو کاٹ کر نہ جانے کتنی محنت و مشقت سے چٹانوں کو تراش کر مہاتما کا مجسمہ بنایا گیا تھا۔ مہاتما اپنے مخصوص آسن کے مطابق پلتھی مارے بیٹھے ہیں۔ بیٹھنے کے باوجود مجسمے کی بلندی سو فٹ سے زیادہ ہے۔ اس کے پیٹ میں چار منزلہ رہائشی کمرے ہیں۔ میں ان ہی میں سے ایک کمرے میں رہتی ہوں۔

مہاتما کے پیٹ میں صرف وہی بھکشو رہتے ہیں جو دھرماتما اور دھرم دیوی بننے کی کٹھن تپسیاؤں سے گزرتے ہیں۔ گرو دیو مجھے بچپن ہی سے آتما گیان کی شکشا دیتے رہے ہیں۔ میں بچپن سے اب تک شریر (جسم) اور آتما کی گتھیوں میں الجھتی اور سلجھتی رہی ہوں۔

دھنیے ہو گرو دیو...! مجھے شکتی مل رہی ہے۔ میں آتما گیان سے دکھی لوگوں کا علاج کرتی رہتی ہوں۔

تم دونوں مہا پُرش ہو۔ بوستان کی جنتا کو ایک نیا جیون دے رہے ہو۔ میرا گیان کہتا ہے... اور کیا ہی سچ ہے کہ تم دوسروں کی مصیبتیں دور کرتے کرتے خود مصیبتوں میں پڑتے جا رہے ہو؟

پہلی مصیبت محبت کے راستے آئی ہے۔ تمہاری نیک نامی پر بدنامی کے دھبے پڑ رہے ہیں۔ تاباں کے بھوگ میں رسوائی تھی۔ وہ رسوائی تم دونوں کو مل رہی تھی۔"

ربانی نے حیرت سے پوچھا۔ "'تھی' کا مطلب کیا ہوا؟"

"تھی کا مطلب 'تھی'۔ اگر تم دونوں چاہو گے تو رسوائیاں ختم ہو جائیں گی۔"

"کون نہیں چاہتا کہ بدنامیوں سے نجات ملے؟ بخدا ہم تو دل سے چاہتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "دل سے نہیں چاہتے۔ اپنے من میں ڈوب کے دیکھو۔ من سے چاہتے ہو تو... کوئی ایک اسے اپنی منو کامنا بنائے۔ تمہیں بچاؤ کا راستہ ملے گا۔ اس راستے پر چلو گے تو نجات ملے گی۔"

"کیا بتا سکتی ہو وہ راستہ کہاں سے ملے گا؟"

ربانی نے پوچھا۔ "اور کب ملے گا؟"

"میں مہا گیانی نہیں ہوں۔ ہاں مگر... اتنا جانتی ہوں کہ دونوں مرد ہو۔ تم میں سے ایک حوصلہ کرے اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر دوسرے کے راستے کا پتھر ہٹا دے۔"

"ہم ابھی ایسا کر سکتے ہیں لیکن تاباں ہم دونوں کو ایک ہی دل سے ایک ہی دھڑکنوں سے چاہتی ہے اور ہم دونوں سے چاہت کا یہ انداز ہمیں دیوانہ کر رہا ہے۔"

"پھر تو بوستان کو کبھی جنت نہیں بنا سکو گے۔ آدم و حوا کی طرح ایک دن وہاں سے نکالے جاؤ گے۔ یا پھر سرد ٹاؤن کو گناہ گاروں کی بستی بنا کر اپنا منہ بھی کالا کرتے رہو گے۔"

وہاں کے عوام ان دونوں کے منہ پر ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ورشا وہاں سے دور بیٹھ کر زہریلی سچائی پیش کر رہی تھی۔

رحمانی نے کہا۔ "تمہارے ایسا کہنے سے پہلے ہی ہم یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ اپنے عشق کے مقدم کو نہ توڑا تو اس ٹاؤن کو اس ملک کو جنت نہیں بنا سکیں گے۔"

ربانی نے کہا۔ "ہم رفتہ رفتہ تاباں کو سمجھائیں گے۔ وہ بہت ذہین ہے۔ ابھی جذباتی معاملے میں الجھ گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ جلد ہی ہم میں سے ایک کو قبول کرے

گی اور دوسرے کی طلب سے باز آجائے گی۔"

"ایک بہت ہی آسان سا راستہ یہ ہے کہ تم دونوں میں سے کوئی ایک کسی لڑکی کو پسند کرے اور شادی کر لے۔ پھر تم کچھ کہے سنے بغیر بستی کے لوگوں کے سامنے آئینے کی طرح صاف اور بے داغ ہو جاؤ گے۔ تمام الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔"

"تم ذہانت سے بھرپور مشورہ دے رہی ہو لیکن شادی ازدواجی زندگی کا فیصلہ آخری سانس تک کے لیے ہوتا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر شریکِ حیات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔"

رحمانی نے کہا۔ "انشاء اللہ میں جلد ہی کسی کو شریکِ حیات بنا کر یہ قصہ ختم کروں گا۔"

ربانی نے کہا۔ "تم سے پہلے میں کسی سے شادی کر لوں گا۔ تاباں تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔"

رحمانی نے کہا۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں، وہ تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔"

اسکرین پر ورشا کی تحریر ابھری۔ "میں ہنس رہی ہوں۔ تمہیں سنائی نہیں دے گا۔ پریشوری تم تینوں کا علاج کرے گا۔ جانے دو، دوسری بات کرو۔"

ربانی نے پوچھا۔ "تم ہمارے خواب میں کیسے آگئی تھیں؟"

"نہ آتی تو مجھے اہمیت نہ دیتے۔"

"درست کہتی ہو۔ تمہاری پیش گوئی نے ہمیں متاثر کیا ہے۔ واقعی ہمیں رسوائی مل رہی ہے۔"

رحمانی نے پوچھا۔ "اور تم نے تاباں کو بھول بھلیاں بھی کہا ہے؟"

"وہ بھلیوں میں ڈالے گی بلکہ ڈال رہی ہے۔ آج دوسری تاباں آئی ہے۔ کل تیسری آئے گی اور اس کے بعد بھی..."

وہ دونوں چونک گئے۔ ایک نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ دوسری تاباں...؟"

دوسرے نے پوچھا۔ "آج آئی ہے...؟"

"نہیں ورشا... کوئی دوسری کہاں سے آجائے گی؟"

"میں نہیں جانتی۔ میرے گیان میں جو بات آئی ہے وہ میں نے کہہ دی۔ یہ لکھ لو کہ کل تیسری بھی آسکتی ہے۔"

"تم اپنی پیش گوئی سے حیران کر رہی ہو۔"

"میں نہیں جانتی میری یہ باتیں کہاں تک درست ہوں گی۔ لیکن یہ درست ہے کہ ایک تاباں کے پیچھے بھول بھلیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔"

"تمہاری باتوں سے تجسس بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی دوسری تاباں آئے گی تو کیا ہم اسے پہچان نہیں پائیں گے؟"

"میں کیا بتاؤں۔ جو ہونی ہے وہ کبھی کبھی میرے ذہن میں جھلکتی ہے۔ پوری طرح دکھائی نہیں دیتی۔ جھلک دکھا کر پرے ہٹ جاتی ہے۔ خود ہی سمجھنا پڑتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے؟ ویسے اتنا تو ہے کہ سمجھنے کے لیے اشارے ملتے رہتے ہیں۔"

ربانی نے کہا۔ "ابھی تم نے ایک بات کہی تھی۔ پلیز اسے دہراؤ۔ کیا آج کوئی دوسری تاباں آئی ہے؟"

رحمانی نے پوچھا۔ "کیا ہمارے قریب ہے؟ یہاں ہے؟ یا باہر ہمارے قریب سے گزر گئی ہے؟"

"گزر جانا ہوتو کیوں آئے گی؟ میں پھر دھیان کروں گی۔ یہ معلوم کروں گی کہ کوئی دوسری نہیں آئی تھی تو مجھے اس کی جھلک کیوں ملی تھی؟"

"ہمارا ذہن بھی الجھ رہا ہے۔ تم سے پھر کب رابطہ ہوگا؟"

"کل کسی بھی وقت باتیں ہوں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ تم دونوں بہت اچھے ہو۔ ایشور تمہارے لیے اچھا ہی کرے گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ کمپیوٹر خاموش ہو گیا۔ ان دونوں کے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ یہ دوسری تیسری تاباں کہاں سے پیدا ہو رہی ہیں؟ اور کیوں پیدا ہو رہی ہیں؟ کیا الجھاوے کم ہیں کہ اور پیدا ہوتی رہیں گی...؟

یاد آیا کہ دشمن بھی سمندر پار اس کی ڈمی تیار کرنے والے ہیں۔ اس طرح تو تاباں واقعی بھول بھلیاں بننے والی ہے۔ کیا یہ ہمیں یوں الجھانے کے لیے ہے کہ تاباؤں کی بھیڑ میں ہماری تاباں گم ہو جائے اور ہم بھی اسے پا نہ سکیں؟

رحمانی نے کہا۔ "ابھی وہ کیا کہہ گئی ہے؟ اس کی بات مجھے چبھ رہی ہے کہ آج دوسری تاباں آئی تھی۔"

ربانی نے کہا۔ "مگر کہاں آئی تھی؟ وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آئی؟ آج ہم ایک نادیدہ اور گونگی بن جانے والی شہزادی ہلالہ کے قریب گئے تھے۔ کیا وہ عظیم بدھا کی بیٹی ورشا اس ہلالہ کو دوسری تاباں کہہ رہی ہے؟"

وہ دونوں سنجیدگی سے سوچنے لگے۔ یہ محض ایک اندازہ تھا کہ اس نے ہلالہ کو دوسری تاباں کہا ہے۔ یہ دیکھنے

میں آیا ہے کہ بعض اوقات اندازے درست ثابت ہو جاتے ہیں۔

ہوسکتا ہے ہلالہ' تاباں کی ہم شکل ہو۔ وہ ان کے سامنے نہیں آسکی تھی۔ دنیا میں بے شمار لوگ ہم شکل ہوتے ہیں۔ ہلالہ کی پیدائشی صورت تاباں جیسی ہوسکتی تھی۔

رحمانی نے کہا۔ ''کیا یہ قدرت کا تماشا نہیں ہے کہ ہلالہ کو پیدا ہوتے ہی دنیا کے تمام مردوں سے چھپادیا گیا۔ شاید اس لیے کہ آج ہم بھی اسے نہ دیکھ سکیں اور سوچتے ہی رہ جائیں کہ چھپنے والی کی صورت کیسی ہوگی؟''

ربانی نے چونک کر کہا۔ ''مجھے یاد آرہا ہے' ورشا نے کہا تھا کہ ہم چاہیں گے تو ہماری بدنامی ختم ہوجائے گی اور اس نے جلد ہی شادی کا مشورہ دیا تھا۔ کیا وہ چاہتی ہے کہ اگر ہلالہ دوسری تاباں ہے تو ہم میں سے کوئی اسے قبول کرے۔ یوں ہماری شادی کا مسئلہ حل ہوجائے؟''

''اور اگر ہلالہ دوسری تاباں ہے تو تیسری تاباں کی بھی پیش گوئی ہوچکی ہے۔''

''اور ان قدرتی تاباؤں کے علاوہ دو مصنوعی بھی پیدا ہونے والی ہیں۔ یا خدا...! ہماری تاباں واقعی ان بھول بھلیوں میں کہیں کھوجانے والی ہے۔''

''پتا نہیں تاباں کے سلسلے میں کیسی ہیرا پھیری اور سازشیں ہونے والی ہیں۔ ہمیں محتاط رہ کر ابھی سے کوئی ایسی ٹھوس پلاننگ کرنی ہوگی کہ کسی حال میں بھی وہ جانِ حیات ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک چپ رہ کر سوچتے رہے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ پھر ربانی نے کہا۔ ''ہمیں سلطانہ سے پوچھنا چاہیے کہ اس کی بیٹی کی صورت اور ناک نقشہ کیسا ہے؟ سلطانہ نے تاباں کو دیکھا ہوگا۔ اگر نہیں دیکھا ہے تو ہم ابھی اس کی تصویر کمپیوٹر کے ذریعے ارسال کریں گے۔''

ورشا نے پیش گوئیوں کے ذریعے ان کے اندر بے چینی بھردی تھی۔ رحمانی نے اسی وقت اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر سلطانہ یاقوت کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو۔ میں ربانی بول رہا ہوں۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''میرے بیٹے نے اتنی جلدی یاد کیا ہے۔ کیا آرہے ہو؟''

''کل کسی وقت آسکیں گے۔ کیا آپ نے بوستان کے حاکم اعلیٰ مظفر خان کی صاحبزادی تاباں کو دیکھا ہے؟''

وہ ذرا چپ رہی پھر سوال کیا۔ ''یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''پلیز آپ میری بات کا جواب دیں۔''

اس نے جواب دیا۔ ''وہ ایک حکمران باپ کی بیٹی ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کی تصویریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اسے خبروں کے چینلز میں بھی دیکھا ہے۔ پھر یہ کہ...''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ رحمانی نے پوچھا۔ ''ہاں بولیں۔ کیا بات ہے؟''

''وہ میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے اور ربانی کے ساتھ اس کا نام آتا رہتا ہے۔ اب میں سوال کروں؟''

''سوال سے پہلے ہی جواب حاضر ہے کہ تاباں ہم میں سے کسی کی دلہن بنے گی۔''

''خدا کا شکر ہے' جو سوچا تھا' وہی کہہ رہے ہو۔ اب میں ایک سچ کہوں؟''

''بے شک سچ سے اعتماد کے رشتے قائم ہوتے ہیں۔''

''میں تم دونوں میں سے کسی کو بھی اپنا داماد بنانا چاہتی ہوں اور تم میں سے کوئی انکار نہیں کرے گا۔''

''آپ اتنے اعتماد سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''ایسے کہ میری بیٹی تاباں کی ہم شکل ہے۔ ہو بہو تاباں ہی تاباں ہے۔''

وہ دونوں وائڈ اسپیکر کے ذریعے سن رہے تھے اور اس نے ایسی بات سنائی تھی کہ وہ چند ساعتوں تک دم بخود رہ گئے تھے۔

کیسے عجیب حالات تھے۔ وہ آج انجانے میں دوسری تاباں کے قریب رہ کر آئے تھے۔

ورشا پہلے ہی پیش گوئی کرکے جاچکی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ دونوں چاہیں گے تو بدنامی ختم ہوجائے گی۔ کیا ورشا جانتی ہے کہ ہلالہ دوسری تاباں ہے اور وہی ان کی بدنامیوں کو ختم کرے گی۔ شاید وہ کچھ بتانے کے باوجود بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ انہیں اور الجھا رہی ہے۔

ان دونوں کو آج نہیں تو کل یہ طے کرنا تھا کہ ان میں سے کون تاباں کی اصل روح سے اصل وجود سے محروم ہونا چاہے گا' ور نقل میں اصل کی جاذبیت پوری طرح پاسکے گا؟

رحمانی نے پوچھا۔ ''محترمہ! آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ ہلالہ تاباں کی ہم شکل ہے؟''

''اگر بتا دیتی تو کیا وہ نظر آجاتی؟ کیا اسے کالے جادو سے نجات مل جاتی؟ میں چاہتی تھی کہ پہلے شیطانی عمل کا توڑ

کرو پھر سیدھے اس کے رُوبرو پہنچ کر اسے دیکھو اور حیران رہ جاؤ۔ میں اس کے ہم شکل ہونے کو راز بنا کر بعد میں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ اب تم دونوں میری ہلالہ میں گہری دلچسپی لو گے۔ اسے زیادہ سے زیادہ توجہ دیتے رہو گے۔ دوسری تاباں میں اپنی تاباں کو دیکھتے رہو گے اور اس کی بہتری کے لیے دن رات ایک کرتے رہو گے۔"

پھر اس نے پوچھا۔ "ربانی چپ کیوں ہو؟ تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہے؟"

ربانی نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں آپ کی صاحبزادی کو ہم دیکھ نہیں سکتے لیکن قریب سے سمجھ سکتے تھے۔"

"وہ کیسے؟"

"تاباں آپ کے پاس محل میں آئے گی۔ ہلالہ کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارے گی۔ اس کے قریب رہے گی۔ اس پر ڈھکے چھپے کالے جادو کے جو اثرات ہیں ان کی اسٹڈی کرتی رہے گی اور ہمیں ایک ایک تفصیل بتاتی رہے گی۔"

رحمانی نے کہا۔ "ہوسکتا ہے تاباں ہلالہ کے اندر سے ایسی کوئی بات معلوم کرلے جو ہمیں زنگورارا اور اس کے شیطان جادوگروں تک پہنچا دے۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "بیٹے! اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ تاباں اور تم دونوں میری بیٹی کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتے رہو گے۔ انشاء اللہ جلد ہی زنگورارا تک پہنچو گے۔ تاباں یہاں آئے گی تو میں اسے سرآنکھوں پر بٹھاؤں گی۔"

"ہم ابھی تاباں سے بات کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ آج یا کل کسی فلائٹ سے آپ کے پاس آجائے۔"

"میں ہلالہ کی طرح اسے ماں کا پیار دوں گی۔ لیکن بیٹے! ذرا ایک منٹ۔۔۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "میں ایک اہم پہلو پر غور کررہی تھی۔"

"وہ اہم پہلو کیا ہے؟"

"ہمارے شاہی خاندان کی خواتین تاباں اور ہلالہ کو ہم شکل دیکھ کر حیران ہوں گی۔ اور اپنے مردوں کو بتائیں گی کہ وہ جسے پیدائش کے دن سے کبھی دیکھ نہیں پائے اس کی ہم شکل آگئی ہے۔ اسے دیکھ لو تو گویا شہزادی ہلالہ کو دیکھ لو۔"

"ہاں یہ تو ہوگا شاہی خاندان کے مرد حضرات تاباں کو دیکھیں گے تو گویا برسوں سے چھپی ہوئی شہزادی کو دیکھ لیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس سے کوئی فرق پڑے گا؟"

"اس ماں کے دل میں یہ اندیشہ ہے کہ مرد حضرات یہاں تاباں کی صورت دیکھیں گے تو کالے جادو کے بداثرات میری بیٹی کو تکلیف میں مبتلا کریں گے اور۔۔۔ اور ایک اندیشہ ہے۔"

رحمانی نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

"میری بیٹی کی ہم شکل تاباں رُوبرو آئے گی تو کالا جادو تاباں پر بھی مسلط ہوسکتا ہے۔"

وہ دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ ایسا ممکن تھا۔ کالا عمل ہلالہ کی ہم شکل میں منتقل ہوسکتا تھا۔ یہ بات غور طلب تھی کہ وہ زنگورارا تاباں کو بھی اپنا اسیر بنا سکتا تھا۔

سلطانہ یاقوت نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ کیا میں درست کہہ رہی ہوں؟ کیا تم چاہو گے کہ تاباں ایسے کسی خطرے سے دوچار ہونے کے لیے یہاں آئے؟"

"یہ دانشمندی نہیں ہوگی۔ ہم ابھی سوچیں گے کیا کرنا ہے۔ پھر آپ کو کال کریں گے۔ ابھی اجازت دیں۔"

انہوں نے رابطہ ختم کردیا پھر چپ چاپ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ بیک وقت کتنی ہی باتیں ذہن میں گردش کررہی تھیں۔ وہ ترتیب سے ایک ایک معاملے کو پیش نظر رکھ کر اس پر غور کرنے لگے۔

ایک اہم بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ ہلالہ پیدائش کے وقت سے جادو کے زیر اثر تھی۔

ربانی اور رحمانی بڑی بے باکی سے اس کے کام آنے والے تھے۔ اور وہ تاباں کی ہم شکل ہوکر خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔

عاشقوں کے دل دہلا رہی تھی کہ نئی جنگی پڑے گی۔ معشوق کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

دل کے معاملے میں عقل کام نہیں کرتی پھر بھی عقل سمجھا رہی تھی کہ تاباں کو اس کی ہم شکل سے دور رکھا جائے۔

اس کے برعکس بھگشو ورشا نے ہلالہ کو دوسری تاباں کہہ کر یہ اشارہ دیا تھا کہ وہ ربانی یا رحمانی کی زندگی میں آئے گی اور آئے گی تو تاباں کے قریب بھی آئے گی اور یوں ہلالہ پر ہونے والے جادو سے ضرور متاثر ہوگی۔

بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ ابھی تو یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ اصل تاباں کس کے نصیب میں ہوگی؟ کس کی شریک

حیثیت ہے گی؟

یہ معاملہ اور پیچیدہ تھا کہ تاباں ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنا کر کیا دوسرے کی محبت سے باز آجانا چاہے گی؟ کیا دونوں میں سے ایک کے لیے قدرتی کشش ختم ہو جائے گی؟

وہ دونوں جیسے دلدل میں دھنس گئے تھے۔ باہر نکلنے کے لیے جتنا زور لگا رہے تھے، اتنی ہی گہرائی میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆

آدم ربانی اور آدم رحمانی عوامی عدالت میں تمام جیوری اور معزز بزرگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنا مدعا بیان کرنے والے تھے۔

ربانی نے بسم اللہ پڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہ عوامی عدالت ہے۔ یہاں گمراہ ہونے والوں کو راہِ راست پر لایا جاتا ہے اور جرائم سے باز نہ آنے والوں کو سزائیں دے کر اس شہر سے نکال دیا جاتا ہے پھر انہیں واپس آکر یہاں رہنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔''

رحمانی نے کہا۔ ''خدا گواہ ہے۔ ہم نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے ہماری گردن جھک جائے۔ ہماری ذات سے جو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے ہم اس کی وضاحت کرنے اور اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے آئے ہیں۔

''اگر ہم سے گناہ سرزد ہوگا تو آپ ہم سے عقیدت کے باعث یا ہمارے خوف سے ہم پر انگلی نہیں اٹھا سکیں گے۔ جس طرح عوام کرپٹ حکمرانوں کو سزا دے نہیں پاتے اسی طرح آپ ہمیں بھی سزا نہیں دے پائیں گے۔

''ہم سپر پاور کہلانے والے ممالک کے حکمرانوں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ دنیا کا کوئی شہزور حکمران بھی ہمارا محاسبہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ہماری دیانت داری کو سمجھیں۔ ہم ناقابلِ تسخیر ہونے کے باوجود آپ کے سامنے عوامی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں۔

''یہاں جیوری صاحبان ہیں۔ سرد ٹاؤن کے معزز باشندے ہیں اور ان لمحات میں پورا شہر اپنے گھروں میں، دکانوں میں اور دفتروں میں ہماری باتیں سن رہا ہے۔ عدالت سے ہماری درخواست ہے کہ ہمارے خلاف جو شکایتیں ہیں انہیں مکمل کر بیان کریں اور قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہمارا محاسبہ کریں۔''

ایک وکیل اپنی جگہ سے اٹھ کر ادب سے بولا۔ ''اصولاً یہاں تاباں صاحبہ کو بھی موجود ہونا چاہیے کیونکہ شکایت ان سے بھی ہے۔ بہرحال عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تاباں اور دو مسیحاؤں کے درمیان محض شناسائی ہے یا شناسائی سے آگے دوستی ہے یا دوستی سے بھی آگے عشق و محبت ہے؟''

ربانی نے کہا۔ ''تاباں سے عشق ہے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''میرا بھی یہی جواب ہے۔ اور یہ کہ تاباں بھی ہمارے عشق میں گرفتار ہے۔''

وکیل نے پوچھا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک تاباں دونوں سے عشق فرماتی ہیں؟''

رحمانی نے کہا۔ ''جی ہاں۔ فی الحال ہم سے یہ غلطی ہو رہی ہے لیکن ہم تہذیب، اخلاق، شرم و حیا اور دانائی کے تقاضوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ خدا گواہ ہے کہ ہم سے کوئی شرمناک غلطی نہیں ہوئی ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک تاباں کو اپنی منکوحہ بنائے گا۔''

وکیل نے کہا۔ ''آپ کو حق ہے کہ نامحرم ہونے کے باوجود تاباں کے ساتھ یہاں کے تمام پروجیکٹس میں ساتھ رہیں۔ تعمیری معاملات میں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن...'' اس نے دونوں عاشقوں کو دیکھا پھر کہا۔ ''لیکن رات کی تاریکی اور تنہائی میں آپ کو تاباں سے ملتے دیکھا گیا ہے۔ کیا آپ اس الزام سے انکار کریں گے؟''

''سچ پھر سچ ہے۔ ہم جھوٹ بول کر انکار نہیں کریں گے۔ سچ یہ بھی ہے کہ ہم بے حیا اور بے غیرت نہیں ہیں۔ ہم نے تنہائی میں تاباں سے ملاقات کی لیکن ہماری نیت ہمارے ارادے نیک تھے۔''

''کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ تاباں یہاں سے چلی گئی تو آپ دونوں بھی اس کے پیچھے گئے اور شبیر آباد میں آزادی سے اس کے ساتھ وقت گزارتے رہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''ہم چشم زدن میں میلوں دور جاتے ہیں اور واپس آجاتے ہیں۔ ہم نے شبیر آباد میں دنیا والوں سے چھپ کر وقت نہیں گزارا ہے۔ دن کے اجالے میں تاباں سے ملاقات کی پھر واپس آگئے۔''

ربانی نے کہا۔ ''اس کے باوجود ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی ملاقاتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یا پھر موجودہ دنیاوی قوانین کے مطابق عورتوں اور مردوں کو آزادی سے ملنے کی اجازت دینی چاہیے۔ جب ان سے غلطی یا گناہ سرزد ہو تب انہیں قانونی گرفت میں آنا چاہیے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''قانون یہ ہے کہ جب تک ثبوت اور

گواہوں کی موجودگی سے الزام سچ ثابت نہ ہو تب تک وہ ملزم نیک، معتبر اور معزز شہری ہوتا ہے۔"

"ہمارے خلاف گواہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے تاباں کے گھر میں ہماری خوشبو محسوس کی تھی۔ یہ چشم دید گواہی نہیں ہے۔ یہ تو ہم دیانت داری سے تسلیم کررہے ہیں کہ وہاں ہم موجود تھے۔ جب ہم سچ کہہ رہے ہیں تو ہماری اس سچائی کو بھی تسلیم کریں کہ ہم سے آج تک کوئی بے حیائی سرزد نہیں ہوئی ہے۔"

جیوری کے ارکان نے کہا۔ "بے شک۔ ہم کسی ثبوت اور گواہ کے بغیر آپ کو الزام نہیں دیں گے اور آپ دونوں کو تاباں سے ملاقات کرتے رہنے سے کوئی قانون نہیں روک سکے گا۔ لیکن ہم قانون سے ہٹ کر آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ جتنی جلدی ممکن ہو آپ میں سے کوئی تاباں کو اپنی منکوحہ بنالے۔"

"جلدی ممکن نہیں ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ہم کتنے اہم معاملات میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وعدہ کرتے ہیں کہ ایک ماہ کے اندر ہم دونوں عدالت کے احکامات کی تعمیل کریں گے۔"

رحمانی نے کہا۔ "ہم یہ وضاحت کردیں کہ ہم دو ہیں۔ ہماری دلہنیں بھی دو ہوں گی اور وہ دوسری سرد ٹاؤن سے نہیں ہوگی۔ آپ ہمارے معاملات ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم آپ کی بہتری کے لیے جو کررہے ہیں وہ کرنے دیں۔ خواہ مخواہ رکاوٹیں پیدا نہ کریں۔"

ربانی نے کہا۔ تاباں جلد واپس آنے والی ہے۔ آئندہ اسے بدنام کیا جائے گا۔ آزادی سے کام کرنے نہیں دیا جائے گا تو ہم شرپسندوں کو سخت سزائیں دیں گے۔"

عدالت میں سب نے یہ تسلیم کیا کہ سرد ٹاؤن کی ترقی اور عروج کو دیکھ کر دشمن اور حاسد سازشیں کررہے ہیں اور دونوں مسیحاؤں کو فرائض کی ادائیگی سے روکنے کے لیے عوام کو گمراہ کررہے ہیں۔ سب نے متفق ہوکر کہا' آئندہ ایسے شر پسندوں کو سرد ٹاؤن سے نکال دیا جائے گا۔

عدالتی کارروائی ختم ہوتے ہی ربانی اور رحمانی ٹاؤن کے مختلف علاقوں میں جاکر لوگوں کی باتیں سننے لگے۔ ان کی حمایت میں بولنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان مسیحاؤں نے وہاں کے لوگوں کو مہنگائی' بیروزگاری اور مجرمانہ زندگی کی لعنتوں سے بچایا تھا۔ آئندہ ان کی نسلوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کررہے تھے۔

ہزاروں عقیدت مند بڑی عزت و احترام کے ساتھ ان کی تعریفیں کررہے تھے لیکن شرپسند عناصر ان پر کیچڑ اچھالنے سے باز نہیں آرہے تھے۔

ایک بازار میں لوگ کھانے پینے کے دوران میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے۔ ایک پہلوان نما شخص نے کہا۔ "یہ مسیحا صحیح منصف نہیں ہیں۔ انہوں نے یک طرفہ فیصلہ سنایا ہے کہ ان کے خلاف بولنے والوں کی شامت آجائے گی۔ وہ انہیں عوامی عدالت میں لائے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ یہ تو سراسر آمریت اور فرعونیت ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "جابر حکمران ہمارے جیسے مظلوموں کو ڈرا دھمکا کر اسی طرح ہمارا منہ بند کرتے ہیں۔"

ربانی نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا پیچھے جا کر گر پڑا۔ رحمانی نے پہلوان کی پٹائی کی۔ لوگ دور ہٹ کر یہ تماشا دیکھنے لگے۔ وہ دونوں بری طرح مار کھاتے ہوئے لہولہان ہورہے تھے اور مارنے والے نظر نہیں آرہے تھے' سمجھ میں آرہا تھا کہ مسیحا انہیں سزائیں دے رہے ہیں۔

آہنی روبوٹ کے ہاتھوں نے انہیں دو منٹ میں زمین بوس کردیا۔ وہ تکلیف سے تڑپ رہے تھے۔ معافیاں مانگ رہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگئے۔

وہاں سب ہی کہنے لگے کہ مسیحاؤں کے خلاف بولنے والوں کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ تاکہ گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے عبرت حاصل کریں۔

خواتین کی ایک محفل میں ایک خاتون کہہ رہی تھی۔ "عاشق ہوں تو ایسے... واہ کس صفائی سے تاباں کو بدنام ہونے سے بچایا ہے۔ میں تو کہتی ہوں وہ عاشق نہیں دھوبی ہیں' چنری کے داغ بڑی صفائی سے دھو دیتے ہیں۔"

اچانک کئی خواتین نے چیخیں مارتے ہوئے ایک سمت دیکھا۔ ایک بہت بڑا ڈسٹ بن فضا میں معلق ہوکر اس خاتون کی طرف آرہا تھا۔ پھر وہ اس کے سر کے اوپر آکر الٹ گیا۔ وہ بدبو سے بھرے ہوئے ڈھیر سارے کچرے میں نہا کر خوف سے چیخنے لگی۔ ان پر کیچڑ اچھالنے والی کے بدن سے پتا نہیں کیسی کیسی انسانی غلاظتیں لپٹ گئی تھیں۔

ایک خاتون نے کہا۔ "یہ ہمیشہ مسیحاؤں کے خلاف بولتی پھرتی ہے۔ اچھا ہے اس کو خوب سزا ملے۔"

پورے سرد ٹاؤن میں مجاہے اور سزاؤں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ دور دور تک خبریں پھیل رہی تھیں کہ مسیحا اپنے

فیصلے کے مطابق شرپسندوں کو موت کی سزائیں دے رہے ہیں۔ رہانی اور رحمانی سے عقیدت رکھنے والے بے شمار تھے۔ وہ بے شمار لوگ شرپسندوں کو دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔

وہاں ایک مدت کے بعد انسانی خون بہایا جارہا تھا۔ اس کے بغیر شیطان ماننے والے نہیں تھے۔ وہ لوگوں کا غم و غصہ دیکھ کر ٹاؤن چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ مجرموں کے لیے سزائیں لازمی ہوتی ہیں۔ اس کے بغیر نہ دہشت طاری ہوتی ہے۔ نہ توبہ کی جاتی اور نہ جرائم کم ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اس رات وہ دونوں گہری نیند سوتے رہے۔ دن رات کی معروفیات انہیں بری طرح تھکا دیتی تھیں۔ اتنی محنت کے باوجود بہت سارے کام اور معاملات ادھورے رہ جاتے تھے۔ آئے دن یہی ہوتا تھا۔ پچھلا کام ادھورا رہ جاتا تھا اور جب پورا ہوتا تو دوسرا شروع ہوجاتا تھا۔ بہرحال، بہت عرصے بعد انہیں گہری نیند آئی تھی۔ وہ صبح تک اپنے آپ سے غافل رہے۔

حسبِ عادت فجر کی اذان سے پہلے آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے اپنے اپنے بیڈ پر کروٹ لے کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ رحمانی نے کہا۔ ''آج میں گہری نیند سوتا رہا۔''

رہانی نے کہا۔ ''اور میں بھی غافل پڑا رہا۔''

''جب گہری نیند آتی ہے تو خواب نہیں آتے مگر میں نے خواب دیکھا ہے۔''

''میں نے تاباں کو دیکھا ہے۔''

وہ دونوں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے۔ رہانی نے کہا۔ ''میں نے بھی تاباں کو دیکھا ہے۔ وہ ایک ہندو عورت کی طرح ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔''

''اور وہ ساڑی گیروے رنگ کی تھی۔''

''دو افراد کبھی ایک ہی خواب نہیں دیکھتے۔ آج دیکھا ہے اور آج سے پہلے بھی ایک خواب میں بھگشو ورشا کو کسی پتھریلی چٹانی غار میں دیکھا تھا۔''

''ہم دونوں نے اسی ایک غار کو دیکھا تھا۔ تم نے ورشا کی وہی باتیں سنی تھیں جو میں سنتا رہا تھا۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جبکہ آج بھی یہی ہوا ہے۔ یہ بتاؤ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟''

رہانی نے کہا۔ ''اپنے اسی کمرے میں آئی تھی۔ تمہارے سرہانے کھڑی تھی۔''

رحمانی نے اپنے بیڈ کے سرہانے کو دیکھا پھر کہا۔ ''ہاں۔ وہ یہاں سے چل کر ادھر آئی تھی۔ ہم دونوں کے بیڈ کے درمیان رک کر مجھ سے کہہ رہی تھی...''

رہانی نے کہا۔ ''رک جاؤ میں بتاتا ہوں وہ کیا کہہ رہی تھی۔''

''چلو تم ہی کہو۔''

''وہ تم سے کہہ رہی تھی رہانی کے کمرے میں کیوں سوتے ہو؟ ہمارا کمرا الگ اور رہانی اور تاباں کا کمرا الگ ہونا چاہیے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''اور میں نے اس سے پوچھا تھا۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ جب میرا اور تمہارا کمرا الگ ہوگا تو تم رہانی کے ساتھ دوسرے کمرے میں کیسے پہنچو گی؟''

''تب اس نے کہا، رہانی کی تاباں اس وقت اپنے باپ کے سرکاری پیلس میں ہے۔ میں تمہاری تاباں ہوں۔ میں حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کوئی دوسری نہیں لگ رہی تھی، ہماری ہی تاباں تھی۔''

رہانی نے کہا۔ ''لیکن وہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی کہ ہماری تاباں حسبِ معمول اپنے ماں باپ کے ساتھ پیلس میں ہے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے اور سوچنے لگے۔ انہوں نے معظم اعظم اور کامران کو الّو بنانے کے لیے پیلس میں ایک دوسری تاباں کا شوشہ چھوڑا تھا۔ جبکہ نہ وہ پیلس کے دو کمروں میں تھے اور نہ ہی دوسرے کمرے میں کوئی دوسری تاباں تھی۔

دوسری کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ تو ان دونوں کی ذہنی اختراع تھی۔ لفظوں کے کھیل اور تصور کے جادو سے ہزاروں ہم شکل پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن اب جو آئی تھی وہ کھیل تماشا نہیں لگ رہی تھی۔ انہیں سمجھا رہی تھی کہ سچ مچ دوسری کا وجود ہے۔ رحمانی کا کمرا الگ ہوگا تو وہ پھر آئے گی۔

رہانی نے پوچھا۔ ''اس نے اور کیا کہا تھا؟''

رحمانی نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔''

''ہاں میری بھی آنکھ کھل گئی تھی۔'' دونوں نے ہر جگہ دوسری تاباں کو ڈھونڈا مگر انہیں وہ کہیں نہ ملی... یقیناً وہ ایک خواب ہی تھا۔

وہ اپنے اپنے کمرے کے باتھ روم میں چلے گئے۔ نہانے دھونے اور عبادت کرنے میں مصروف ہوگئے۔ وہ ایسا چونکا دینے والا سنگین خواب تھا کہ بہ آسانی ذہن سے محو نہیں ہورہا تھا۔ وہ عبادت سے فارغ ہوکر مسجد سے واپس

آ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئے۔

ربانی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں ورشا کھٹک رہی ہے۔''

رحمانی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''ورشا نے کہا تھا کہ ہماری زندگی میں دوسری تاباں آچکی ہے۔ اس کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہلالہ ہماری تاباں کی ہم شکل ہے۔''

''پھر تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دوسری تاباں آچکی ہے۔ کیا تمہیں یاد ہے اس کے بعد ورشا نے پھر پیش گوئی کی کہ دوسری کے بعد تیسری بھی آئے گی۔''

رحمانی نے چونک کر کہا۔ ''واقعی وہ تیسری ہمارے خوابوں میں آئی تھی۔ یہ ورشا کیا چیز ہے؟ دل میں کھب جانے والی باتیں کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔''

''بندہ مانتا ہوگا' وہ بہت گہری ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''ربانی! ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے ایک سے تین تاباں ہوگئی ہیں۔ منظم اور اس کے آقا ہی نہیں' قدرتی حالات بھی ہمیں الجھا رہے ہیں۔ آخر ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟''

''یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ ایک اندازہ ہے کہ ہمیں تاباں کی بھول بھلیوں میں انتہائی پیچیدہ اور سنگین حالات سے گزرنا پڑے گا۔''

''ورشا سے بات کرنی ہوگی۔ شاید وہ تیسری کے متعلق کچھ بتاسکے۔''

رحمانی نے اسی وقت ای میل کے ذریعے پیغام بھیجا۔ ''کیا ابھی بات ہو سکتی ہے؟''

وہ انتظار کرنے لگے۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔ ربانی نے کہا۔ ''شاید سو رہی ہے یا عبادت میں مصروف ہوگی۔ کیوں نا ہم تاباں کو موجودہ حالات سے آگاہ کریں؟''

اس نے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر تاباں نے سلام کیا۔ ربانی نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''کچھ اہم واقعات پیش آرہے ہیں۔ تمہیں ان سے باخبر رہنا چاہیے۔ ہم نے پرسوں رات تمہارے ابو کو الجھانے کے لیے ایک فرضی تاباں کو پیدا کیا تھا۔ اس کا کوئی وجود نہیں تھا لیکن تمہارے ابو اور انکل' منظم کو یقین ہوگیا تھا کہ دوسری تاباں پیدا ہوگئی ہے۔''

تاباں نے پوچھا۔ ''کیا اس طرح انہیں الجھانے سے کوئی بات بن رہی ہے؟''

''بات تو کچھ سے کچھ ہو رہی ہے۔ سوچا تھا کیا اور کیا ہو رہا ہے۔ ہم خود الجھ رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''تم بھی سن کر الجھو گی۔ حیران رہ جاؤ گی۔ سچ مچ ایک اور تاباں پیدا ہوگئی ہے۔''

وہ بولی۔ ''یہ تو یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔ وہ کہاں سے پیدا ہو جائے گی؟''

''یہ بڑی لمبی بات ہے۔ کیا ہم آجائیں؟''

''فوراً آؤ۔ تم نے تو میرے سر پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ دیے ہیں۔ رحمانی کو بھی آنا چاہیے۔''

وہ دونوں دوسرے ہی لمحے تاباں کے رُوبرو پہنچ گئے۔ بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر کسی کو ان کی موجودگی کا علم نہ ہوتا۔ ربانی نے کہا۔ ''شاید ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو؟''

''ہاں تمہاری فون کال سے آنکھ کھلی تھی۔''

ربانی نے پہلے اسے بھکشو ورشا کی پیش گوئیوں کے متعلق بتایا کہ وہ دوسری اور تیسری تاباں کے بارے میں کیا کہہ چکی ہے۔ پھر اس نے بتایا کہ کس طرح سلطانہ یاقوت سے شناسائی ہوئی۔ وہ دونوں اس کے شاہی محل گئے تھے۔ انہوں نے وہاں ماں بیٹی کی رُوداد سنی تھی۔ بیٹی کا نام ہلالہ ہے اور اسے پیدائش کے دن سے آج تک کسی مرد نے نہیں دیکھا ہے۔

تاباں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا واقعی آج تک کسی مرد نے اسے نہیں دیکھا ہے؟''

''وہ ماسک میک اپ میں رہ کر لوگوں کا سامنا کرتی ہے۔ اس کے باپ نے بھی اس کی پیدائشی صورت نہیں دیکھی ہے۔ یعنی کوئی مرد اسے دیکھ نہیں پاتا ہے۔''

''کیا وہ تم دونوں کے سامنے بھی نہیں آئی؟''

''نہیں۔ وہ سامنے آسکتی تھی لیکن ہم جہاں تھے وہاں دروازے تک بھی نہ آسکی۔ نہ جانے اس پر کیسا دورہ پڑتا ہے۔ وہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہم نے اس کے میک اپ میں رہنے والی تصویریں دیکھی ہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''صرف اس کی ماں اور شاہی خاندان کی خواتین نے اس کی اصل صورت دیکھی ہیں۔ تصویر اتارنے کے لیے کیمرا بھی سامنے آئے تو وہ تکلیف سے چیخنے لگتی ہے۔''

ربانی نے کہا۔ ''ہم اس محل میں اس کے قریب رہ کر تقریباً دو گھنٹے گزار چکے ہیں۔ لیکن اسے کسی تدبیر سے نہیں

دیکھ سکے۔ ہم نے سلطانہ یاقوت سے کہا ہے کہ ہم اسے قریب سے سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تم اس محل میں جاکر ہلالہ کے قریب رہ کر جائزہ لو کہ جادوئی اثرات کے باعث اس کا مزاج کیسا ہے؟ کیا میں اور رحمانی ان اثرات کو سمجھنے کے بعد زنگورارا اور اس کے جادوگروں تک پہنچ سکیں گے؟"

تاباں نے کہا۔ "تم دونوں جب کہو گے، میں چلی جاؤں گی۔ خواتین اس کا چہرہ دیکھ سکتی ہیں۔ میں بھی دیکھوں کہ کیا بھید ہے؟"

رحمانی نے کہا۔ "ایک چونکا دینے والی بات تو ہمیں معلوم ہوئی ہے۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کیا؟"

دونوں نے مسکرا کر تاباں کو دیکھا پھر کہا۔ "وہ دوسری تاباں ہے۔"

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا۔۔۔؟"

"ہم نے تو دیکھا نہیں ہے۔ اس کی ماں نے کہا ہے، وہ تمہاری ہم شکل ہے۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "یعنی ورشا کی پیش گوئی درست ثابت ہو رہی ہے؟"

"اصل میں یہی نظر آرہا ہے۔ ویسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہماری زندگی میں آسکے گی۔ وہ تو ابھی سے کترا رہی ہے۔ تم اس کے قریب رہ کر معلوم کر سکتی ہو کہ جادوئی ہتھکنڈوں کے برعکس وہ کس طرح ہمارے زیر اثر آسکتی ہے؟"

"میں تو جی جان سے کوشش کروں گی۔ بولو مجھے کب وہاں جانا ہے؟"

"اب یہی بات دوسرے پہلو سے سنو۔ عقل کہتی ہے، تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔"

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟"

"ہلالہ آسیب زدہ ہے اور تمہاری ہم شکل ہے۔ اس پر طاری رہنے والے جادوئی اثرات تم پر بھی ہو سکتے ہیں۔"

تاباں نے کہا۔ "یہ محض اندیشہ ہے۔"

"شیطانی عمل سے کچھ بعید نہیں ہے۔ تم بولو، کیا ہمیں خطرہ مول لینا چاہیے؟"

وہ بولی۔ "اللہ تعالیٰ نے شیطانوں سے لڑنے کے لیے ہی تم دونوں کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ تم دونوں باری باری وہاں آتے رہو گے اور میرے قریب رہا کرو گے تو شیطانی قوتوں کو دیکھتے سمجھتے اور مات دیتے رہو گے۔"

"کیا تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں اس محل اور سرد ٹاؤن کے بدنام کرنے والے ماحول سے کچھ روز کے لیے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔ یہ بہت اچھا لگے گا کہ تم دونوں میرے پاس آتے جاتے رہو گے۔"

ربانی نے کہا۔ "ابھی کامران ایک فلائٹ سے وہائٹ اسکائی جارہا ہے۔ ہم اس کی نگرانی اور حفاظت کے لیے اب سے چھ گھنٹے بعد اس کے قریب مصروف رہیں گے۔"

رحمانی نے کہا۔ "اس کی حفاظت کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ پتا نہیں وہاں اس کے ساتھ کیسے حالات پیش آئیں گے۔ یہاں ہم تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکیں گے۔ تمہیں آج شام یا کل یاقوت جانا چاہیے۔"

تاباں نے کہا۔ "کامران کو چاہے جتنے بھی خطرات پیش آتے رہیں، میں اتنا جانتی ہوں کہ تم دونوں میرے پاس دوڑے آتے رہو گے۔ میرے چاہنے والے میری فکر میں مبتلا رہیں گے، مجھے اچھا لگے گا۔"

"چلو یہی سہی۔ تم آج ہی جاؤ۔"

"تم سلطانہ یاقوت کو اطلاع دو کہ میں آج کسی فلائٹ سے آرہی ہوں۔"

پھر اس نے فون کے ذریعے اپنے باپ سے کہا۔ "ابو! میں سلطانہ بدر ظہوری سے ملنے سلطنتِ یاقوت جانا چاہتی ہوں۔ میرے لیے کسی بھی پہلی فلائٹ میں سیٹ بک کرادیں۔"

باپ نے پوچھا۔ "تم اچانک یاقوت کیوں جارہی ہو؟"

"یوں ہی سیر و تفریح کے لیے۔۔۔"

"وہ دونوں ضرور تمہارے ساتھ جائیں گے۔"

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ وہ سرد ٹاؤن میں بہت مصروف ہیں۔ اگر میرے پیچھے آئیں گے تو میں کیا کرلوں گی اور آپ کیا کرلیں گے؟"

"یہ جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تمہاری سیٹ آج ہی کی فلائٹ میں ہو جائے گی۔"

باپ سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فون بند کر کے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ورشا کی پیش گوئی کے مطابق تیسری تاباں تم دونوں کے خوابوں میں آئی تھی۔ کیا ہلالہ کی طرح سچ مچ اس کا بھی وجود ہوگا؟"

رحمانی نے کہا۔ "میں ربانی کے کمرے میں تھا۔ وہ

مجھ سے یہ کہہ کر گئی ہے کہ مجھے اپنے کمرے میں سونا چاہیے۔ میرا خیال ہے آج رات اپنے بیڈروم میں رہوں گا تو وہ پھر آئے گی۔''

وہ تینوں خاموش ہو کر اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے پھر تاباں نے کہا۔ ''پتا نہیں یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ تیسری بھی ضرور اپنا وجود رکھتی ہوگی۔ محض خواب نہیں ہوگی۔''

''یہ تو تماشا ہوگا۔ ہماری زندگی میں تین تاباں ہو جائیں گی۔ ہماری اُلجھنیں بڑھ جائیں گی۔''

''ابھی ایک ہو اور ہم دو ہیں تو مسئلہ بن گئے ہیں۔ بعد میں ہم دو ہوں گے اور تاباں تین ہوں گی تو اور توازن بگڑے گا۔ حالات اور پیچیدہ ہوں گے۔''

اچانک رحمانی ہنسنے لگا۔ دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تین نہیں پانچ تاباں ہوں گی۔ دو سوغات سمندر پار سے آنے والی ہیں۔''

تاباں نے سر پکڑ لیا پھر کہا۔ ''دشمنوں کی سوغات میں سراسر دشمنی اور سازشیں بھری ہوں گی۔ وہ بڑے پیار سے تم دونوں کا سکون برباد کریں گی۔ طرح طرح سے تم دونوں کو ذہنی عذاب میں مبتلا کرتی رہیں گی۔''

''اور جو قدرتی طور پر آرہی ہیں کیا وہ نہیں اُلجھائیں گی؟ بلالہ تو آنے سے پہلے ہی پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ پتا نہیں وہ تیسری کیا گل کھلانے والی ہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جیسے بھی حالات پیش آئیں ان سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال ابھی ہم جارہے ہیں۔ تم یاقوت جانے کی تیاری کرو۔ ہم تمہارے پاس آتے جاتے رہیں گے۔''

وہ دونوں سرد ٹاؤن کی رہائش گاہ میں واپس آگئے۔ رحمانی نے فون پر سلطانہ یاقوت سے کہا۔ ''ہم نے طے کیا ہے کہ تاباں آپ کی صاحبزادی کے قریب رہ کر کچھ وقت گزارے گی اور آپ بھی یہی چاہتی ہیں۔''

''بے شک بہرحال میں اپنی بیٹی کی بہتری چاہتی ہوں لیکن یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہاری تاباں کو کوئی نقصان پہنچے۔''

''اللہ نے چاہا تو ہمیں نیکی کے بدلے نیکی ہی ملے گی۔ ہم وہاں تاباں کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہمیں امید ہے وہاں تاباں کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاسکیں گے۔ اللہ نے چاہا تو ہم چند گھنٹوں میں زگو دارا کے پُراسرار عمل کو شاید سمجھ لیں گے۔''

''خدا تم دونوں کے ایمان اور حوصلوں کو سلامت رکھے۔ تاباں بھی بڑے حوصلے سے آرہی ہے۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ یہاں اسے بیٹی کی طرح کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔''

رحمانی نے کہا۔ ''وہ تھوڑی دیر بعد آپ سے رابطہ کرے گی اور بتائے گی کہ آج کون سی فلائٹ سے آرہی ہے۔ ہم بہت مصروف ہیں پھر بھی آتے جاتے رہیں گے۔ ابھی اجازت دیں۔''

اس نے کان پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے گویا فون کو آف کیا پھر رحمانی سے کہا۔ ''تاباں کی بھول بھلیوں میں اہم فرائض کی طرف توجہ کم ہوگئی ہے۔ اب ہمیں چھ گھنٹے تک سرد ٹاؤن کے معاملات میں مصروف رہنا چاہیے۔''

وہ چھ گھنٹے بعد کامران کی نگرانی کے لیے وہائٹ اسکائی میں مصروف رہنے والے تھے۔ تاباں کے چکرا دینے والے جذباتی مسائل سے نکل کر ایک بڑی سپر پاور سے ٹکرانے والے تھے۔

☆☆☆

طیارہ اپنی مخصوص بلندی پر پرواز کررہا تھا۔ کامران کی بلندی پرواز نامعلوم تھی۔ خیالی پرواز کی بلندی ناپی نہیں جاسکتی۔ وہ بوستان جیسے چھوٹے سے ملک سے نکل کر سپر پاور وہائٹ اسکائی میں عزت اور دولت کمانے جارہا تھا۔ مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

معظم خان نے اس سے کہا تھا۔ ''تم بہت خوش نصیب ہو۔ تمہارے تو دن پھر گئے ہیں۔ وہائٹ اسکائی کے حکام تمہیں سرکاری نجومی کے طور پر بلارہے ہیں۔''

اعظم خان نے کہا۔ ''آج سے سمجھ لو تمہاری زندگی کا معیار بدل گیا ہے۔ تم وی آئی پی بن گئے ہو۔ اگر وہاں بھی تمہارا موکل کام دکھاتا رہا تو تم دنیا کے سب سے مشہور و معروف اور دولت مند نجومی کہلاؤ گے۔''

وہ دونوں اسے باری باری سمجھا رہے تھے۔ معظم نے کہا۔ ''ابھی یہ سرکاری دورہ راز میں رہے گا۔ اپنے بیوی بچوں پر تم یہ ظاہر کرو گے کہ سیاحت کی غرض سے ذاتی اخراجات پر جارہے ہو۔ بوستان اور وہائٹ اسکائی کے حکام سے تو کیا، وہاں کے کسی سرکاری ملازم سے بھی تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''جب وہاں کی حکومت کے لیے فائدہ مند ثابت ہونے لگو گے تو تمہیں سرکاری نجومی کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے گا۔''

اس بے چارے کو تاریکی میں رکھا جارہا تھا۔ یہ

حقیقت چھپائی جارہی تھی کہ شاید وہ بھی اپنے وطن واپس نہیں آسکے گا اور شاید وہ آخری بار اپنے بیوی اور بچوں کا منہ دیکھ رہا ہے۔

وہ انجانے میں جس قدر خوش تھا، اسی قدر اندر سے گھبرایا ہوا تھا۔ گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ وہ پچھلی رات سے موکل کو آوازیں دے رہا تھا۔ دن ہی دن میں اسے پکارتا رہا تھا اور اسے کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

وہ سفر کے دوران میں عجیب ملی جلی کیفیات سے دو چار ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو مستقبل میں مسرتوں کے خزانے لوٹنے جارہا تھا۔ دوسری طرف حال دھمکیاں دے رہا تھا کہ موکل واپس نہ آیا تو وہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔ کبھی اس کی دائیں آنکھ پھڑک رہی تھی کبھی بائیں۔ آثار اچھے بھی تھے اور برے بھی۔

جہاز کی محدود فضا میں خوش حال مسافر ہنس بول رہے تھے۔ کھا رہے تھے۔ مہنگی شرابیں پی رہے تھے۔ اپنی محبوباؤں کے ساتھ سفر کو یادگار بنا رہے تھے اور وہ کلام پاک کی آیتیں پڑھتا جارہا تھا۔ اپنی بہتری کے لیے دعائیں مانگتا جارہا تھا۔

وہائٹ اسکائی کے آئرن سیف کے اندر ایک چیونٹی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہاں تک کسی کی نظر تو کیا جاتی، کوئی تصور میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کیسے کیسے گہرے سیاسی اور عسکری راز چھپا کر رکھے جاتے تھے۔ وہاں کامران پہنچ رہا تھا۔ یوں سپر پاور کے کلیجے میں دو دھاری خنجر کی طرح گھس گیا تھا۔ وہ تمام آقا اس نجومی کو دیکھنے اور یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ اس کے پاس کیا جادو ہے؟

ان آقاؤں کی بے چینی ایسی تھی کہ انہوں نے کامران کے آنے سے پہلے ہی اس کے پیچھے جاسوس لگا دیے تھے۔ شبیر آباد کے ائرپورٹ سے ہی دو جاسوس اس کے ہم سفر بن گئے تھے۔ اس وقت طیارے میں ایک تو اس کے برابر والی سیٹ پر تھا دوسرا اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

جب طیارہ فضا میں بلند ہو کر پرواز کرنے لگا تو برابر بیٹھے ہوئے جاسوس نے کہا۔ ''میرا نام مارٹن گرووز ہے۔ میں وہائٹ اسکائی کے کیپیٹل زون جارہا ہوں۔ سفر لمبا ہے ہمارے درمیان شناسائی رہے گی تو وقت آسانی سے گزر جائے گا۔''

اس نے کہا۔ ''میرا نام کامران ہے۔ میں بھی کیپیٹل زون جارہا ہوں۔''

مارٹن نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں الیکٹرونک آلات کا ڈیلر ہوں۔ میرا بزنس دور تک پھیلا ہوا ہے۔ تم کیا کرتے ہو؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں ہوا میں تیر چلاتا ہوں۔ یعنی کہ نجومی ہوں۔ پیش گوئی کرنا گویا کہ ہوا میں اندھا تیر چلانا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا تیر اکثر نشانے پر بیٹھتا ہے۔''

''کیا ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر بولتے ہو؟''

''ہاتھ بھی دیکھتا ہوں اور زائچہ بھی بناتا ہوں اور کچھ عمل بھی پڑھتا ہوں۔ پتا نہیں کیا کیا کرتا رہتا ہوں۔ روزی روٹی کمانے کے لیے مختلف ہنر آزمانے پڑتے ہیں۔''

''کیا اپنا ہنر آزمانے کے لیے کیپیٹل زون جارہے ہو؟''

''فی الحال سیاحت اور سیر و تفریح کا ارادہ ہے۔ اگر لوگ مجھ سے قسمت کا حال معلوم کرنا چاہیں گے تو میں ان کا حال اور مستقبل بتا کر اپنی قسمت چمکاؤں گا۔''

''تو پھر اپنی قسمت چمکانے کی ابتدا مجھ سے کرو۔ میں اپنے اور اپنے دشمنوں کے بارے میں صحیح معلومات رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ان کے اندر چھپی ہوئی باتیں بتا سکو گے تو تمہاری توقع سے زیادہ معاوضہ ادا کروں گا۔''

''میں تمہارے دشمنوں کا ہاتھ دیکھے بغیر اور ان کا زائچہ بنائے بغیر کچھ نہیں بتا سکوں گا۔''

مارٹن گرووز نے ذرا جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''ہمارے پیچھے والی سیٹ پر میرا ایک دشمن بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا نام مکی واٹسن ہے۔ بظاہر تو دوست بن کر رہتا ہے مگر آستین کا سانپ ہے۔''

''اگر دوست بن کر رہتا ہے تو کیا تمہارے کہنے سے اپنے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے دے گا؟''

''میری اتنی سی بات ضرور مانے گا۔ میں ابھی پیچھے جا کر اسے یہاں بھیج دوں گا مگر پہلے میرا ہاتھ دیکھو۔''

اس نے اپنی دائیں ہتھیلی اس کے آگے کر دی۔ وہ ہاتھ کو تھام کر لکیروں کا مطالعہ کرنے لگا۔ مکمل ستارہ شناسی کا علم کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن میں ماہر تو نہیں تھا لیکن ادھورا اور نا اہل بھی نہیں تھا۔ اکثر سچی پیش گوئی کیا کرتا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر مارٹن گرووز کو دیکھا پھر کہا۔ ''تم کہتے ہو کہ خطرات سے کھیلتے ہو۔ جبکہ الیکٹرونک آلات کے بزنس میں کوئی خطرہ پیش نہیں آتا ہے۔''

''کسی بھی کاروبار میں دشمن تو ہوتے ہی ہیں اور وہ جان لینے کی حد تک نقصان پہنچاتے ہیں۔''

''مسٹر مارٹن! تم نے نقصان کم ہی اٹھائے ہیں۔ تم دوسروں پر حاوی رہنے والے شخص ہو اور تم نے حاوی رہنے کے لیے ہی قتل بھی کیے ہیں۔ یہ ہاتھ کہتا ہے کہ تم قاتل ہو۔''

مارٹن نے فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس سے ہاتھ چھڑا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت خطرناک ہو۔ اندر کے بھید معلوم کر لیتے ہو۔ کیا بتا سکتے ہو کہ میں نے کیوں قتل کیے تھے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاتھ کی لکیریں اشارے دیتی ہیں۔ وضاحت سے کچھ نہیں بتاتیں۔ ہاں تمہارا زائچہ بنا کر بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں پاگل نہیں ہوں کہ تم سے زائچہ بنواؤں گا۔ دنیا کی کوئی عدالت ہاتھ کی لکیروں کا بیان درست نہیں مانتی۔ اگر مانتی تو تمہارے جیسے نجومی بڑی آسانی سے ہمیں پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''میں سینٹرل زون جا رہا ہوں۔ کسی عدالت نہیں جا رہا ہوں۔ نہ تم سے کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی میرے کہنے سے تمہیں قاتل مانا جائے گا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا تم پوشیدہ رکھی ہوئی کسی چیز کا سراغ لگا سکتے ہو؟ اپنے علم سے اس چیز تک پہنچ سکتے ہو؟''

اس بات پر کامران نے تڑپ کر اپنے موکل کو یاد کیا۔ بڑی شدت سے اسے پکارا۔ وہ آجاتا تو پوشیدہ رکھی کسی چیز تک ابھی پہنچ جاتا۔ یہ اندیشہ جان لے رہا تھا کہ موکل بھی واپس نہیں آئے گا۔

مارٹن نے کہا۔ ''پیچھے بیٹھے ہوئے دوست نما دشمن نے میری ایک چیز چرائی ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے وہ چیز کہاں چھپا کر رکھی ہے؟''

اس نے اپنی جیب سے سو پاؤنڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ پیشگی رقم رکھو۔ اگر اس پوشیدہ چیز تک پہنچ کر اس کی نشان دہی کر دو گے تو اور چار سو پاؤنڈ ابھی دوں گا۔''

اسے بیٹھے بیٹھے اچھی خاصی رقم مل رہی تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے موکل کو پھر پکارنے لگا۔ ''ارے کیوں میری جان لے رہا ہے۔ آتا کیوں نہیں ہے؟''

اپنی بیوی اور بچوں کے لیے یہ پانچ سو پاؤنڈ کمانے دے۔ خدا کے لیے آجا۔ خدا کے بعد تیرا ہی سہارا ہے۔ مجھے کچھ تو تسلی دے کر آئے گا۔''

کامران اپنی مادری زبان میں زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ مارٹن اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے کان لگا کر سنتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا منتر پڑھ رہے ہو؟ معلوم ہوتا ہے پُراسرار علوم بھی جانتے ہو؟''

وہ خلا میں تک رہا تھا اور اپنی زبان میں اسے پکار رہا تھا۔ ''میں کل تک بہت بڑا عامل تھا۔ آج کچھ بھی نہیں ہوں۔ تو نہ آیا تو میری دست شناسی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ ارے آجا! کم از کم ایک ہی تحریر پیش کر دے۔ مجھے نئی زندگی مل جائے گی۔''

مارٹن نے کہا۔ ''منتر پڑھ رہے ہو تو بتا دوں وہ کیا چیز ہے؟ وہ ہیرے کی ایک انگوٹھی ہے۔ میں نے اپنی محبوبہ کو دی تھی۔ یہ جو پیچھے میرا دشمن بیٹھا ہے یہ بھی میری محبوبہ سے عشق کرتا ہے۔ میرا رقیب ہے۔ اس نے وہ انگوٹھی چرائی ہے۔''

وہ دونوں جاسوس مارٹن گروور اور میکی ولسن یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ نجومی وہائٹ ایکائی کے ریکارڈز روم تک پہنچ گیا تھا۔ ابھی ایک انگوٹھی تک پہنچ پائے گا یا نہیں؟

وہ ہیرے کی انگوٹھی نہیں تھی۔ بس یوں ہی آزمائش کے لیے میکی نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں اسے چھپا کر رکھا تھا۔ ابھی معلوم ہونے والا تھا کہ وہ نجومی اور عامل کتنے پانی میں ہے؟

روڈنی ویٹر نے انہیں تاکید کی تھی کہ اسے اچھی طرح آزمایا جائے۔ اگر وہ نااہل اور ناکارہ ثابت ہوگا تو سرکاری طور پر اس کا استقبال نہیں کیا جائے گا۔ اسے گرفتار کر کے ٹارچر سیل میں پہنچا کر پوچھا جائے گا کہ وہ ان کے ریکارڈز روم تک کیسے پہنچ گیا تھا؟

مارٹن اپنی جگہ سے اٹھ کر پچھلی سیٹ کی طرف گیا۔ میکی پچھلی سیٹ سے اٹھ گیا۔ وہاں ان دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ باتیں کیں پھر میکی کامران کے پاس اس طرح آیا کہ اسے دو سیٹوں کے درمیان سے ترچھا ہو کر کامران کی طرف پشت کر کے گزرنا پڑا۔ اس نے چست پتلون پہنی ہوئی تھی۔ ایسے وقت پچھلی جیب کے اندر سے ایک ننھا سا ابھار دکھائی دیا۔ وہاں کوئی چھوٹی سی دائرہ نما چیز رکھی ہوئی تھی۔

کامران کے دماغ نے ایک دم سے چیخ کر کہا۔ ''وہ وہی ہیرے کی انگوٹھی ہے جس کا ذکر ابھی مارٹن کر چکا ہے۔''

میکی اس کے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''ابھی مارٹن گروور نے بتایا ہے کہ تم بھی پیش گوئی کرنے والے نجومی ہو۔ کیا میری قسمت کا حال بتانا چاہو گے؟''

اس نے جواب سننے سے پہلے ہی اپنی دائیں ہتھیلی اس کے سامنے کر دی۔ وہ خاموشی سے لکیروں کا مطالعہ

کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ ابھی حال ہی میں تم ایک صدمے سے دوچار ہوئے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”یہ درست ہے۔ دو ہفتے پہلے میرا ایک جوان بیٹا ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ بہت یاد آتا ہے۔ میرے متعلق کوئی اہم بات ہے تو بتاؤ؟“

”اہم بات تم خود ہی جانتے ہو۔ اس ہاتھ میں قتل کی لکیریں ہیں اور تم ایسی واردات کر چکے ہو۔“

”کیا مارٹن کا ہاتھ بھی یہی کہتا ہے؟“

”ہاں۔ تم دونوں قانون کے خلاف زندگی گزار رہے ہو۔“

وہ لکیروں کو مہارت سے پڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ دونوں اگرچہ قانون کے خلاف قتل کی واردات کر چکے تھے۔ تاہم ایسا قانون کے سائے میں رہ کر کرتے آئے تھے۔ وہ سراغرساں تھے۔ مجرموں کو یا مخالفین کو قتل کرنے کا لائسنس رکھتے تھے۔ کئی مجرموں کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔ آئندہ بھی یہی کرنے والے تھے۔

کامران ان دونوں کے درمیان آپھنسا تھا۔ میکی نے پوچھا۔ ”کیا تم اپنے علم کے ذریعے پوشیدہ چیزوں کا سراغ لگا سکتے ہو؟“

”ایسا علم نجوم کے ذریعے نہیں ہوتا۔ ایسی باتیں پُراسرار علوم سے معلوم کی جاتی ہیں۔ میں عامل بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کوشش میں کبھی کامیابی ہوتی ہے، کبھی ناکام ہو جاتا ہوں۔“

”تو پھر کوشش کرو۔ شاید میرے معاملے میں کامیاب ہو سکو۔ یہ جو میرا دوست نما دشمن ہمارے پیچھے بیٹھا ہے، اس نے میرے معاملات سے تعلق رکھنے والی ایک اہم فائل چرائی ہے۔ معلوم کرو اسے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟ میں ابھی منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے جیب سے سو پاؤنڈز نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ کامران نہال ہو رہا تھا اور موکل کی غیر حاضری سے بے جان ہو رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”وہائٹ اسکائی پہنچنے سے پہلے ہی اچھی آمدنی کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ ارے او موکل! تُو کہاں مر گیا ہے؟ آتا کیوں نہیں؟ تحریر کے ذریعے نہ بول۔ کسی اور طرح سے میری مدد کر۔ نہیں تو میں تجھے پکارتے پکارتے مر جاؤں گا۔“

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے میکی کی پچھلی جیب میں ایک ننھی سی دائرہ نما کسی چیز کا اُبھار دیکھا ہے۔ وہ اُبھار ضرور اس کے موکل نے دکھایا ہے اور وہ ضرور وہی ہیرے کی انگوٹھی ہے۔

وہ ایک دم سے خوش ہو گیا۔ دل کی گہرائی سے یقین ہوا کہ وہاں تحریر کے لیے دیوار نہیں ہے۔ اس لیے موکل نے اسے دور سے انگوٹھی کی جھلک دکھائی ہے۔

وہ ان لمحات میں سیٹ پر پہلو بدل رہا تھا۔ اپنے وجود سے زیادہ وہ چھلک رہا تھا۔ دل ہی دل میں موکل کو سلام کر رہا تھا۔ ”السلام علیکم میرے باپ...! بس اسی طرح اشارے دیتے رہو۔ میرا بیڑا پار ہوتا رہے گا۔“

وہ اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ خوشی کے مارے بے اختیار سر گھما کر جہاز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جیسے جہاز کے اندر سے اُڑ کر بادلوں میں پہنچ جانا چاہتا ہو۔

میکی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تم اچانک بہت خوش نظر آ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”بیٹھے بیٹھے اچانک ہی گم شدہ چیز مل جائے تو کیا آدمی خوش نہیں ہوتا؟“

”یعنی میری چرائی ہوئی فائل تم نے ڈھونڈ لی ہے؟“

”تمہاری فائل نہیں، اپنے گمشدہ موکل کو پا لیا ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔ یہ میرے پُراسرار عمل کی باتیں ہیں۔“

”یعنی تم صرف نجومی نہیں ہو۔ اس سے بھی آگے بلیک میجک کے عامل بھی ہو؟ تم آہنی تجوری اور دلوں میں چھپے ہوئے راز معلوم کر سکتے ہو؟“

وہ ایک شانِ بے نیازی سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”میں زمین کی تہ میں اور سمندر کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے راز بھی معلوم کر لیتا ہوں۔“

وہ دونوں سراغرساں یہی معلوم کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگے تھے۔ پُراسرار علوم میں اس کی مہارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔

کامران نے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑے اعتماد سے تڑپ کر موکل کو پکارا۔ ”میرے باپ کے باپ...! کہاں ہے تُو؟ آ جا اور دو سو پاؤنڈز ملیں گے۔“

وہ بڑے کرب سے بولا۔ ”نہ آیا تو تمام رقم چھین لی جائے گی۔ میرے ان داتا...! میرے عامل کامل ہونے کا کچھ تو بھرم رکھ لے۔ آ جا...“

وہ کہاں سے آتا؟ ربانی اور رحمانی سرمد تاؤن میں مصروف تھے۔ وہ اپنے حساب سے ایسے وقت اس کے پاس آنے والے تھے، جب وہ وہائٹ اسکائی پہنچ جاتا... فی الحال نہ وہ آ رہے تھے، نہ کوئی فرضی موکل آ سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد مایوس ہونے لگا۔ پہلے کی طرح اندیشے ستانے لگے۔ کیا موکل پھر بھاگ گیا ہے؟ یا اللہ! وہ

بھنور ابھرنہ جانے کب آئے گا؟

وہ تو پچھلی رات سے مایوس ہوتا آ رہا تھا۔ اس وقت بھی مایوسی کے بھنور میں ڈوب رہا تھا۔

ذرا سوچنے کے بعد دماغ نے اچھی طرح سمجھا دیا۔ ”ابے او کامران! میکی کی فائل تمہارا باپ بھی ڈھونڈ کر نہیں لا سکے گا۔ اسے اس وقت تک ٹالتے رہو جب تک موکل نہ آ جائے۔ ابھی کوئی بات بناؤ۔“

وہ سوچنے لگا۔ مکاری سے ہی بات بن سکتی تھی۔ ذہن میں بات آئی کہ میکی خواہ مخواہ مارٹن پر شبہ کر رہا ہے۔ اس نے فائل نہیں چرائی ہوگی۔ چرائے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ محض شبہ ہے۔

اس نے آنکھیں بند کیں پھر میکی کی طرف سر گھمایا۔ میکی نے کہا۔ ”تم نے میری طرف رخ کیا ہے مگر آنکھیں بند ہیں۔ کیا کسی طرح کا عمل کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میری بند آنکھیں مارٹن کے خفیہ سیف اور الماریوں کے اندر دیکھ رہی ہیں۔ تمہارا شبہ غلط ہے۔ اس نے فائل نہیں چرائی ہے۔“

”تو پھر میری فائل کہاں ہے؟“

”تم یاد کرو کہاں ہے؟ خود ہی کہیں رکھ کر بھول گئے ہو۔“

”نہیں ہوسکتا۔ تم اپنے پُراسرار عمل سے وہاں تک پہنچ نہیں پا رہے ہو۔“

”میں جہاں چاہتا ہوں پہنچ جاتا ہوں۔ تمہارے اس دوست اور دشمن مارٹن نے کہا تھا کہ تم نے اس کی ہیرے کی انگوٹھی چرائی ہے اور اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ میں اسے تلاش کروں۔“

”تم تلاش کرو۔ ویسے میں نے نہیں چرائی ہے۔“

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”تم نے چرائی ہے۔“

میکی نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ بولا۔ ”انگوٹھی اس وقت تمہاری پتلون کی ایک جیب میں رکھی ہوئی ہے۔“

اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ پچھلی جیب پر رکھا۔ شدید حیرانی سے اسے دیکھا۔ یہ ثابت ہوگیا کہ وہ عامل ماہر ہے۔ کامل ہے۔ بے شک چھپے ہوئے رازوں تک پہنچ جاتا ہے۔

اور حیرانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ واقعی میکی کی کوئی فائل چرائی نہیں گئی تھی۔ میکی نے اسے آزمانے کے لیے ایک جھوٹ بات کہی تھی۔ کامران نے انجانے میں مکاری سے جھوٹ کہا تھا اور وہ سچ ہوگیا تھا۔

اس نے میکی سے پوچھا۔ ”تم نے جھوٹ کیوں کہا تھا کہ مارٹن نے تمہاری فائل چرائی ہے؟ کیا میری علمی مہارت کو آزمارہے تھے؟ کیوں آزمارہے تھے؟ مجھ سے تمہیں کیا دلچسپی ہے؟“

میکی نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس نے وہاں سے اٹھ کر مارٹن کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں وہاں سے جہاز کے پچھلے حصے میں آگئے۔ مارٹن نے پوچھا۔ ”کیا رہا؟“

وہ بولا۔ ”بہت ہی زبردست اور خطرناک عامل ہے۔ اس نے فوراً ہی معلوم کرلیا کہ انگوٹھی میری پچھلی جیب میں ہے اور یہ بھی بتایا کہ تم نے میری کوئی فائل نہیں چرائی ہے۔“

”پھر تو واقعی زبردست ہے۔ ہم ابھی ویلر صاحب کو رپورٹ دیں گے۔“

وہاں سے ہزاروں میل دور روڈنی ویلر چند اعلیٰ حکام کے ساتھ ایک اہم اجلاس میں مصروف تھا۔ وہ سب موجودہ مصروفیات کے علاوہ ان دو سراغرسانوں کی رپورٹس کے بھی منتظر تھے۔ کامران کے پُراسرار علم نے ان کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی تھی۔

معظم اور اعظم نے ان آقاؤں کو اس کے اور موکل کے متعلق جو حیرت انگیز باتیں بتائی تھیں ان کی حقیقت وہ اپنے سراغرسانوں سے معلوم کرنے والے تھے۔

میکی وانسن نے فون پر ویلر سے کہا۔ ''سر! یہ عامل... پُراسرار علوم میں غضب کی مہارت رکھتا ہے۔ یہ چھپائی ہوئی چیزوں اور رازوں تک پہنچ جاتا ہے۔''

ویلر نے پوچھا۔ ''تم دونوں نے اسے کس طرح آزمایا ہے؟''

اس نے انگوٹھی کے متعلق بتایا کہ وہ عامل اپنی جگہ بیٹھے ہی بیٹھے دور سے ہی اس کی پتلون کی پچھلی جیب میں پہنچ گیا تھا اور اس نے یہ جھوٹ پکڑ لیا تھا کہ میکی کی کوئی فائل چرائی نہیں گئی تھی۔

ویلر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''یعنی وہ صرف آہنی تجوریوں کے اندر ہی نہیں انسانوں کے اندر بھی پہنچ کر جھوٹ اور سچ معلوم کرلیتا ہے؟''

''یس سر! ہم یقین سے کہتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاتھوں میں جادو کا چلتا پھرتا ہتھیار بن کر رہے گا۔''

ویلر نے متاثر ہوکر اجلاس میں بیٹھے ہوئے عہدیداروں کو دیکھا پھر کہا۔ ''کامران کی رپورٹس حیرت انگیز ہے۔ وہ بچ آہنی پردوں کے پیچھے چھپے رازوں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن کر ہمارے ہاتھوں میں رہ سکے گا۔''

وہ جوشیلے انداز میں میز پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''وہ ہماری حکومت اور ہمارے اقتدار کے استحکام کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن کر رہے گا۔''

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''پھر تو ہم ہر حال میں اسے اپنی سیاست اور اقتدار کا ستون بنا کر رکھیں گے۔ اس کا شایانِ شان استقبال کریں گے۔''

ایک ماتحت افسر نے کہا۔ ''ہمیں پہلے ہی حکم دیا گیا تھا۔ اس کے مطابق انتظامات مکمل ہیں۔ اسے ایک آرام دہ بنگلے میں نظر بند رکھا جائے گا۔ بنگلے کے اندر اور باہر سیکیورٹی کے سخت انتظامات ہوں گے۔ اس عامل سے صرف ویلر اور آرمی کے اہم افسران ہی ملاقات کرتے رہیں گے۔ باقی کسی کو اس کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دیا جائے گا۔''

یہ تو دستور ہے۔ جو اہم سرمایہ ہوتا ہے، اسے سخت حفاظتی انتظامات میں رکھا جاتا ہے کہ کسی شاطر سراغرساں کو بھی وہاں قدم رکھنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اچانک ہی کامران وی آئی پی بن گیا تھا۔ اس کے معاملے میں سب سے زیادہ یہی اندیشہ تھا کہ دشمن اسے لے اڑیں گے اور ان کا یہ اندیشہ درست تھا۔

اپوزیشن پارٹی کا ایک لیڈر بیگون برنارڈ انتہائی شاطر سیاست داں تھا۔ اس نے روڈنی ویلر کے قابلِ اعتماد جاسوس مارٹن گروڈر کو ایک بھاری رقم سے خرید لیا تھا۔ یوں اس کے ذریعے کامران کی اہمیت کو سمجھ رہا تھا۔

اس وقت ان سیاسی کھلاڑیوں کے درمیان صورتِ حال یہ تھی کہ بیگون برنارڈ آئندہ الیکشن میں روڈنی ویلر کو مات دینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور ایسے وقت کامران خطرے کا سگنل بن گیا تھا۔ وہ اس کے اندر کی تمام سیاسی چالوں اور رازوں تک پہنچ سکتا تھا۔ ویلر کے ہاتھوں میں رہ کر حزبِ اختلاف لیڈر کے تمام خفیہ منصوبوں کو بے نقاب کرسکتا تھا۔

اس لیے وہ خطرناک عامل بیگون برنارڈ کے لیے بھی بہت ضروری ہوگیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ آجاتا تو روڈنی ویلر کے خفیہ منصوبوں کو بے نقاب کرسکتا تھا اور اسے اقتدار کی کرسی تک بڑی آسانی سے لے جاسکتا تھا۔

طیارے میں سفر کرنے والا مارٹن گروڈر دوغلا تھا۔ وہ ویلر کا نمک کھاتا تھا لیکن اس کی وفاداری بیگون برنارڈ کے لیے تھی۔ اس نے بیگون تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ کامران جادو کا زبردست ڈنڈا ہے۔ جس کے ہاتھ میں رہے گا، اس کی حکمرانی کا جھنڈا گاڑ دے گا۔ اسے ویلر کے ہاتھ نہ لگنے دیا جائے۔

بیگون پہلے سے انتظامات کیے بیٹھا تھا کہ وہ عامل کام کا ہوگا تو اسے ویلر تک پہنچنے نہیں دے گا۔ اسے اغوا کرکے اپنے مصرف میں لائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوسکا تو اس عامل کو گولی مار دے گا۔ اسے ویلر کے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔

پہلے ویلر سمیت دیگر عہدیداروں نے یہی طے کیا تھا کہ کامران نااہل اور ناکارہ ثابت ہوگا تو اسے خفیہ ریکارڈز روم تک پہنچنے کی سزا دی جائے گی اور وہ سزائے موت ہوگی۔ فی الحال وہاں سے اس کی موت ٹل گئی تھی۔

وہ جہاز سینٹرل زون کے ائرپورٹ پر اترنے لگا۔ اس وقت میکی وانسن اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اب ہم جہاز سے اترنے والے ہیں۔ اس لیے اپنی اور مارٹن گروڈر کی حقیقت بتا دوں۔ ہم انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہاری نگرانی پر مامور کیے گئے ہیں۔''

کامران نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ اس نے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ''میکی وانسن۔ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی۔ انٹیلی جنس بیورو یونائٹڈ اسٹیٹ...''

کامران نے یقین کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے

لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ تمہاری حکومت میرے گھر سے مجھے سیکیورٹی دیتی آرہی ہے۔ تھینکس فار دی وی آئی پی ٹریٹمنٹ۔''

میکی نے کہا۔''تمہارے لیے بہترین رہائش گاہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ تم ہماری زمین پر قدم رکھنے کے بعد کسی سے بات نہیں کروگے۔ کسی کو اپنا نام اور کام نہیں بتاؤ گے۔ وہاں امیگریشن کاؤنٹرز اور کسٹمز سے ہم تمہیں لے جائیں گے۔ کسی سے کچھ بولنے نہیں دیں گے۔''

مارٹن نے کہا۔''تمہیں کسی رشتے دار دوست یا شناسا سے بات کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ ائرپورٹ پر کوئی تم سے ملنے آئے گا تو اسے دور سے لوٹا دیا جائے گا۔''

وہ بولا۔''تمہارے ملک میں میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔''

انہوں نے اس کا پاسپورٹ اور اہم کاغذات لے لیے پھر جہاز سے اتر کر ائرپورٹ کی عمارت میں آگئے۔ وہاں کامران کو کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مارٹن اور میکی کے آئی ڈی کارڈز دیکھ کر امیگریشن اور کسٹمز چیکنگ کے شعبوں میں نہ کوئی سوال کیا گیا۔ نہ کسی طرح کی تلاشی لی گئی۔

وہ تینوں لگیج ہال سے نکل کر وزیٹرز لابی سے گزرنے لگے۔ ان سے کچھ فاصلوں پر مسلح پولیس والے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن ایسے انجان تھے جیسے کامران سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ بھی ان کے لیے محض ایک عام مسافر ہو۔

وہ سپر حکمرانوں کی زمین پر آکر خود نہیں جانتا تھا کہ کس طرح اس کی نگرانی کی جارہی ہے اور آئندہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

وہاں مسافر مرد، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا ہجوم تھا۔ سب ہی مختلف سمتوں میں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے ہی وقت ایک حسینہ تیزی سے چلتی ہوئی آکر کامران سے ٹکرا گئی۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ حسینہ اسے لیے فرش پر گر پڑی۔

مارٹن اور میکی لپک کر ان کے قریب آئے۔ وہ نیچے تھی اور وہ اوپر تھا۔ وسکی کو چھوڑ کے آیا تھا۔ ایک فریش بدسکی مل رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بوکھلا گیا تھا۔ کچھ نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ سنبھلنے اور اٹھنے کی جلدی نہیں تھی۔

مارٹن اور میکی نے اسے کھینچ کر الگ کیا۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ میکی نے حسینہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کون ہو تم؟ کیا آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا اندھیرا ہے کہ اس سے ٹکرا گئیں؟''

حسینہ نے تڑاخ سے جواب دیا۔''نو نان سنس! تمہارے آدمی کی آنکھیں نہیں ہیں؟ یہ مجھ سے جان بوجھ کر ٹکرایا ہے۔ یہ کوئی گلفام نہیں ہے کہ میں اس سے لفٹ لینا چاہوں گی۔''

لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ اور وہ سب حسینہ کی حمایت میں بول رہے تھے۔ مارٹن اور میکی نے بات نہیں بڑھائی۔ کامران کا ہاتھ پکڑ کر پارکنگ ایریا کی طرف جانے لگے۔

وہاں سے کچھ دور ایک بڑی کار کھڑی تھی۔ اس کار کے اندر ایک آفس بنا ہوا تھا۔ وہاں تین مسلح افراد ایک ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے ٹی وی کو آپریٹ کرتے ہوئے کہا۔''ہیلو۔ ہیلو... روزانا کامیاب رہی ہے۔ وہ ڈیٹکو آلہ کامران کی جیب میں پہنچ گیا ہے۔ ابھی ہم کچھ فاصلے سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا ہے۔ اور... اور وہ گاڑی مین روڈ پر آگئی ہے۔''

دوسرے شخص نے فون پر اپنی ٹیم کے دوسرے جیالوں سے کہا۔''ڈیٹکو آلہ کام کررہا ہے۔ ان کی گاڑی کونٹز روڈ پر آگئی ہے۔ ان کے تعاقب میں چلتے رہو۔''

ٹی وی اسکرین پر جہاں جہاں وہ ڈیٹکو آلہ جلتا بجھتا جارہا تھا، وہاں سڑکوں اور علاقوں کا نقشہ نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ ان کا شکار کن راستوں سے گزر رہا ہے۔

کامران ایک بڑی سی لگژری کار کی پچھلی سیٹ پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کوٹ کی ایک جیب میں آدھے انچ کا ایک ننھا سا آلہ پڑا ہوا تھا اور وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

میکی کار ڈرائیو کررہا تھا اور مارٹن فون پر کہہ رہا تھا۔

''آگے پیچھے خاصا ٹریفک ہے۔ کسی تعاقب کرنے والی گاڑی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے کوئی ایک کلر اور ایک ہی ماڈل کی گاڑی مستقل ہمارے پیچھے نہیں ہے۔''

دوسری طرف سے ہدایت دی گئی۔''اور کچھ دور تک دیکھو۔ کوئی تعاقب میں نہ ہو تو راستہ بدل کر چلے آؤ۔''

انہوں نے آگے جاکر راستہ بدل دیا۔ نئے راستے پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ میکی نے رفتار بڑھادی۔ فی الحال ان کے پیچھے جو گاڑی آرہی تھی، اس میں ان ہی کے مسلح گارڈز تھے۔ کوئی بات خلافِ توقع نہیں تھی۔ وہ مطمئن ہوگئے۔

پھر جیسے شامت طلوع ہوئی۔ سامنے سے ایک ہیوی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ وہ آتی جاتی چند گاڑیوں کے درمیان ایک محدود رفتار سے چلا آرہا تھا اور ون وے کے باعث

ساتھ والی سڑک پر تھا۔ کچھ وقت پر کوئی نہیں سمجھتا کہ موت اچانک تیور بدل کر اور راستے بدل کر جھپٹ پڑتی ہے۔

ایک دھماکا سا ہوا۔ ہیوی ٹرک کے سامنے وہ کار ایک کھلونے کی طرح اچھلی پھر اُلٹ کر سڑک پر گھسٹتی ہوئی دوسری گاڑیوں سے ٹکرانے لگی۔ کامران اور وہ دونوں جاسوس کار کے اندر اُلٹ پلٹ ہو کر بری طرح زخمی ہو رہے تھے۔ بے چارہ واشنگ مشین کے میلے کپڑوں کی طرح دائیں بائیں، اوپر نیچے ہو رہا تھا اور تکلیف سے چیخیں مار رہا تھا۔

دوسرے سیکیورٹی گارڈز اپنی گاڑیوں سے نکل کر دوڑتے اور فائر کرتے آ رہے تھے۔ پھر وہ قریب آ کر ان تینوں کو گاڑی کے اندر سے کھینچ کر نکالنے لگے۔ وہ نکل تو گئے لیکن نکالنے والے فائرنگ کی زد میں آ کر فنا ہو گئے۔

حملہ آوروں نے پہلے فوگی گیس کی پھر آنسو گیس کی شیلنگ کی تو دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کے ماحول میں سفید دبیز دھواں پھیلنے لگا۔ لڑنے مرنے والوں کی آنکھیں جلنے لگیں۔ آنسو بہنے لگے۔ اس دھند میں فائرنگ کا تبادلہ کرنے والے بمشکل نظر آ رہے تھے۔ دھند انہیں چھپا رہی تھی۔

نیکی نے چیخ کر کامران سے کہا۔ ”اوندھے منہ پڑے رہو۔ سر بھی نہ اُٹھانا۔ بس رینگتے ہوئے میرے پیچھے آؤ۔“

اس نے اپنی زندگی میں تو کیا تصور میں بھی ایسا میدانِ جنگ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں ہے؟ اور جہاں ہے، وہاں زندہ ہے یا مر چکا ہے یا کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے؟

بہرحال جہاں بھی تھا، وہاں سے ہلنے جلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تمام اعصاب اور حواس ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ جلتی ہوئی آنسو بھری آنکھیں کھول کر دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

پھر فائرنگ کے شور میں نیکی والسن کی چیخ سنائی دی۔ ایک ہی چیخ نے سمجھا دیا کہ موت نے آ کر اسے دبوچ لیا ہے۔

کامران کلمہ پڑھنے لگا۔ یقین ہو گیا کہ وہ بھی دنیا سے جانے والا ہے۔ وہ اوندھے منہ زمین سے چپکا ہوا تھا۔ وہ چند گولیاں اس کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ حملہ کرنے والے محتاط تھے۔ اسے زندہ لے جانے آئے تھے۔

مفاد پرست صرف اپنے مفادات پر نظر رکھتے ہیں اور میدان جیت لینے کے لیے اپنے کسی وفادار کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ مارٹن اپنے آقا سے غداری کر رہا تھا۔ دو لاکھ پاؤنڈز کے عوض اپوزیشن کے شاطر لیڈر بیگون برنارڈ کے لیے کام کر رہا تھا۔ ادھر بیگون کی ضرورت پوری ہو رہی تھی، اسے مارٹن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کی موت کا پروانہ جاری کر دیا گیا تھا۔

مارٹن جوابی فائرنگ کرتا ہوا گولیوں کی بوچھاڑ سے دور نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زمین پر لڑھکتا جا رہا تھا پھر اس نے چھپنے کے لیے دوسری گاڑیوں کی طرف چھلانگ لگائی۔ اسی وقت ایک گولی نے اسے زمین بوس کر دیا۔ اس نے بیگون سے سودے کی پوری رقم نہیں لی تھی۔ صرف پچیس ہزار ایڈوانس کے طور پر لیے تھے۔ کام ہو جانے پر باقی رقم ملنے والی تھی۔ گویا اس نے صرف پچیس ہزار میں جان بھی دی اور ایمان سے بھی گیا۔

کامران کی آنکھیں جلن کے باعث کھل رہی تھیں نہ وہ دیکھ پا رہا تھا کہ موت اس سے کتنی دور رہ گئی ہے؟ اچانک ایسا لگا کہ موت کے فرشتے آ گئے ہیں۔ انہوں نے اس کی دونوں بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچا۔ پھر اسے بڑی بےدردی سے سڑک پر گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔

اسے لے جانے والے میدانِ جنگ کے کھلاڑی تھے۔ کاؤنٹر فائرنگ سے بچتے بچاتے ایک بڑی سی ویگن کار کے پاس آ گئے۔ اس کا دروازہ کھلا پھر کامران کو اس کے اندر ایک سیٹ پر پھینک دیا گیا۔ وہ ویگن کار فوراً ہی وہاں سے دوڑتی چلی گئی۔

اگرچہ اسے کچرے کی طرح پھینکا گیا تھا لیکن وہ خوشبو کی گود میں آ کر گرا تھا۔ سیٹ کے آخری سرے پر ایک حسینہ مختصر سے لباس میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کامران سیٹ پر چاروں شانے چت تھا اور اس کا سر گداز زانوؤں پر رکھا ہوا تھا۔ وہ حسینہ اس کے سر اور چہرے کے زخموں سے لہو صاف کر رہی تھی اور کوئی دوا لگا رہی تھی۔

وہ گم صم سا آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ نظارہ ایسا تھا کہ آنسو گیس کی جلن کم ہو گئی تھی۔ وہ جیسے موت کے میدان سے سیدھا جنت میں چلا آیا تھا۔ کیا مقدر تھا کہ جنت میں آتے ہی حور مل گئی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا، اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی ابھی بارود، آگ اور لہو کے بہتے ہوئے جہنم میں تھا اور ابھی پرفیوم مہکاتی حسینہ کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔ وہ سب خواب سا لگ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا، آنکھ کھلے گی تو وہ وہائٹ اسکائی کے اعلیٰ حاکم روڈی ویلر کے سائے میں خود کو محفوظ اور سلامت دیکھے گا...

لوگوں کی زندگی بدلنے والے معجزوں کی اہمیت تلبت ہو جانے والی زندگی کے انوکھے واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

مقدر کا چکر

امجد رئیس

زمینی خداؤں سے جنگ جیتی جا سکتی ہے مگر معاملہ جب تخلیقِ کائنات سے ہو تو وہی ہوتا ہے... جو اس نے طے کر دیا ہے... دلچسپ اور حیران کن صورتِ حال سے لبریز کہانی کے موڑ در موڑ... وار کون کر رہا تھا... ہدف کون بن رہا تھا... قاتل اور مقتول کے درمیان کھیلی جاتے والی جان لیوا آنکھ مچولی...

تدبیر سے تقدیر کے آگے بند باندھے جا سکتے ہیں... شکار اور شکاری کا آغاز و انجام

سارجنٹ کونی ٹرینٹ ایک کیس کی تفتیش کے بعد ہیڈ کوارٹر جا رہی تھی جب اسے پولیس ریڈیو پر ایک مسلح لڑکی کی اطلاع ملی۔ سارجنٹ کونی نے گاڑی کا رخ بائرن شیوٹ کے اپارٹمنٹ کی جانب موڑ دیا۔

مسلح لڑکی کی عمر بہت کم تھی۔ شاید اٹھارہ انیس برس۔ زلف سنہری، نیلی آنکھیں، نوجوان حسینہ، شاعروں کے خواب میں سفر کرنے والی پری کے مانند تھی۔ آفت جان ہاتھ میں پسٹل تانے جان لینے پر تلی تھی۔ سارجنٹ کونی

بروقت پہنچی تھی۔ اسے وہ کوئی فلم کا منظر معلوم ہوا۔

''سارجنٹ کونی، پولیس۔'' کونی نے اپنا آئی۔ ڈی کارڈ بلند کیا۔ ''قبل اس کے کہ کوئی حادثہ ہو، پسٹل مجھے دے دو۔''

''میں شیوٹ کو ختم کرنے آئی ہوں۔'' اس کی آواز بھی سُریلی تھی۔ ''تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔'' حسینہ نے بھڑک کر پسٹل تان لیا تھا۔

کونی کا ایک ہاتھ اپنا پسٹل نکالنے کے لیے تیار تھا۔ تاہم اس نے کچھ نہیں کیا۔ آفت جان ہسٹریائی کیفیت سے دوچار تھی۔ فاصلہ کم تھا اور اناڑی ہونے پر بھی قاتل حسینہ کی گولی نشانے پر بیٹھتی یا تو دونوں مارے جاتے۔ ورنہ ایک کی موت یقینی تھی۔

''اگر تم پسٹل مجھے دے دو تو ہم سکون سے بات کریں گے۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔'' کونی نے دھیما لہجہ اختیار کیا۔ ہاتھ آگے پھیلا کر وہ غیر محسوس انداز میں ایک قدم آگے چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ دوسری اسکواڈ کار بھی پہنچنے والی ہے جس کے بعد سچویشن نازک ہو جائے گی۔

''تم شیوٹ کو کیوں مارنا چاہتی ہو؟'' کونی نے نرمی سے سوال کیا۔

''کیونکہ وہ میرے باپ کا قاتل ہے۔ اس نے زہریلی وائن کی بوتل بھیجی تھی۔''

''ٹھیک ہے ہم بات کرتے ہیں۔ ثابت ہونے پر ہم اسے گرفتار کریں گے۔ تم خود کو مصیبت میں نہ ڈالو۔'' کونی مکالموں کے دوران میں آگے کھسکتی رہی۔ ''واقعی اگر شیوٹ مجرم ہے تو تمہارا غصہ فطری ہے۔'' کونی اس کے پسٹل پر ہاتھ ڈالنے ہی والی تھی کہ پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ آواز پر حسینہ گھائل ہرنی کے مانند اچھلی۔

کونی نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور فیصلہ کن قدم بڑھا کر آتشیں حسینہ کو دبوچ لیا۔ خود کو بچاتے ہوئے کونی نے لڑکی کی مسلح نازک کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ ٹریگر دبا چکی تھی۔ گولی چھت کی جانب پرواز کر گئی۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔ جہاں ایک درمیانی عمر کا آدمی ہکا بکا کھڑا نظر آیا۔

''تم نے پکڑ لیا اسے؟'' اس نے پوچھا۔ ''مائی گاڈ! یہ مجھے قتل کرنے آئی تھی۔''

''تم بائرن شیوٹ ہو؟'' کونی نے الٹا سوال کیا۔ اس دوران وہ لڑکی کی کلائی موڑ کر اسے غیر مسلح کر چکی تھی۔

''ہاں، میں ہی ہوں۔ پولیس کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' شیوٹ کے حواس بحال ہونا شروع ہوئے۔

''کبھی بار کبھی ایسی صورت حال میں دھونا کا سنو تو یک دم دروازہ کھولنے کی حماقت مت کرنا۔'' کونی نے تیکھا انداز اختیار کیا۔

''میں یاد رکھوں گا۔'' جواب ملا۔

☆☆☆

لڑکی کا نام ٹینا نو۔ ڈی تھا۔ ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے وہ تمام راستے روتی رہی۔ کیپٹن لیوپولڈ چھٹی پر تھا۔ لیوٹینٹ فلیچر کی رائے پر وہ لڑکی کو لیوپولڈ کے آفس میں لے آئی۔ کیونکہ نوعمر لڑکی کو تفتیشی کمرے میں لے جانا مناسب نہیں تھا۔

ٹینا گورڈی کو پانی پلا کر پہلا سوال کونی نے عمر کے بارے میں کیا۔ ٹینا انیس برس کی کالج گرل تھی۔ کونی نے تھوڑی کاوش سے ٹینا کو بیان دینے پر رضامند کر لیا۔ ٹینا کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس نے بتایا۔

''میرے باپ کو کل مارا گیا۔ وہ اور شیوٹ پارٹنر تھے۔ رئیل اسٹیٹ کا کاروبار تھا۔ کل تین شراکت دار تھے۔ تیسرے کا نام رسل ہے... چند روز قبل شیوٹ نے سالگرہ کے موقع پر فرنچ وائن ارسال کی تھی۔ گزشتہ شب میں نے ڈنر سرو کیا تھا۔ اس وقت وہ بوتل کھولی گئی۔ میں بھی پینے والی تھی کہ اچانک ان کی طبیعت تیزی سے بگڑی۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے راستے میں دم توڑ دیا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ بوتل شیوٹ کی جانب سے آئی تھی؟''

''ہاں کیونکہ وہ ان کی پسندیدہ 1975ء کی بورڈیکس تھی۔ اور میرے باپ نے جواباً شیوٹ کو شکریے کا فون کیا تھا۔'' ٹینا کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ ''جیسے ہی ڈاکٹروں نے تصدیق کی کہ وائن زہریلی تھی، میں پاگل ہو گئی۔ سیدھی گھر گئی۔ باپ کی اسٹڈی سے پسٹل حاصل کیا اور مردود شیوٹ کی تلاش میں نکل گئی۔''

''وہ کیا بولا؟ جب تم نے اس پر الزام عائد کیا؟''

''اس نے تردید کی۔ دروازہ میرے منہ پر دے مارا۔ پھر پولیس کو فون کر دیا۔ میری غلطی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے گولی مار دینی چاہیے تھی۔''

''کیا ماضی میں شیوٹ کا تمہارے باپ سے کوئی تنازعہ ہوا تھا؟''

''ہاں لیکن اس میں رسل بھی شریک تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تینوں میں کسی بات پر کھٹ پٹ ہوئی تھی۔'' ٹینا نے جواب دیا۔

"کیا معاملہ تھا؟"

"وہ تینوں شہر کے شمال میں شاپنگ مال بنا رہے تھے۔ میرے باپ کو شک تھا کہ اس پروجیکٹ میں کوئی بے ایمانی کر رہا ہے لیکن شاید یہ تنازعہ بعد میں ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔"

کونی نے فون اٹھا کر فلیچر کو لائن ملائی۔

"کوئی خبر؟"

"بیکٹ اسپتال گیا ہے۔" فلیچر نے بتایا۔ "آٹوپسی رپورٹ ابھی آئی ہے۔ تاہم زہر نہایت سریع الاثر تھا۔"

"اور شیوٹ؟" کونی نے استفسار کیا۔

"بیکٹ اسپتال سے نکل کر شیوٹ سے ملے گا یا تم خود جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں، مجھے جانا چاہیے۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں بیکٹ کو منع کر دوں گا۔"

"اوکے، تھینکس۔" کونی نے فون واپس رکھ دیا۔

پھر وہ ٹینا گورڈی کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چند گھنٹوں میں تمہارا وکیل ضمانت کروا لے گا۔ گھر پہنچ کر خود کو سنبھالو۔ میں شیوٹ کو دیکھتی ہوں۔"

☆☆☆

"تم وہی ہو جس نے میری جان بچائی تھی؟" شیوٹ، سارجنٹ کونی کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ کونی کو وسیع لیونگ روم میں لے آیا۔ "اس پاگل لڑکی نے تو مجھے شوٹ ہی کر دیا تھا۔"

کونی بیٹھ گئی۔ اس نے نشست گاہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ قیمتی فرنیچر تھا۔ دیواروں پر پینٹنگز بھی آویزاں تھیں۔ کونی نے براہ راست کہنا شروع کیا۔

"ٹینا گورڈی کا بیان ہے تم نے وائن کی زہریلی بوتل اپنے پارٹنر اور ٹینا کے باپ کو ارسال کی تھی؟" وہ بغور شیوٹ کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ آدھا سچ ہے۔ میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔"

"ٹینا کا خیال اس کے برعکس ہے۔ کسی شاپنگ مال کا معاملہ تھا اور یہ رسل کون ہے؟"

"ہاں، رسل ہمارا پارٹنر... جو بوتل میں نے سیموئل گورڈی کو بھیجی تھی وہ دراصل رسل کی طرف سے آئی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"رسل اور اس کی بیگم گزشتہ ہفتے یہاں ڈنر پر آئے تھے۔ مذکورہ بوتل رسل نے مجھے دی تھی۔ مجھے سالگرہ کے موقع پر گورڈی کو کچھ دینا تھا۔ مذکورہ وائن اس کی پسندیدہ تھی۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ وہ اسے پسند کرے گا۔ میں نے تحفتاً اس کو روانہ کر دی۔"

"وہی بوتل؟ تمہارا مطلب ہے بورڈیکس وائن؟" شیوٹ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"ہاں، وہی بورڈیکس۔ پرانی شراب..." وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"تم کچھ چھپا رہے ہو؟" کونی تیز آواز میں بولی۔

"نہیں میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ بتاتا ہوں۔ دراصل رسل نے بورڈیکس وائن کی جو بوتل مجھے دی تھی، اس پر 1976ء کا لیبل لگا تھا۔ میرے خیال میں مذکورہ وائن کے لیے 1975ء کا لیبل زیادہ بہتر تھا۔ چنانچہ میں نے صرف اتنا کیا، پانی سے بھگو کر وہ لیبل اتار دیا۔ میرے پاس ایک 1975ء کی خالی بوتل تھی۔ اس کا لیبل اتار کر میں نے رسل والی بوتل پر چسپاں کر دیا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" کونی نے سوال کیا۔

"یہ کوالٹی سے تعلق رکھتا ہے۔" شیوٹ نے جواب دیا۔ "میں قسم کھاتا ہوں۔ میرے علم میں نہیں تھا کہ وائن زہریلی ہے۔"

"اگر تمہاری باتیں صحیح ہیں تو اس کا واضح مطلب ہے کہ..." کونی ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

"ہاں، میں سمجھ رہا ہوں۔ لل... لیکن... رسل اور بیگم رسل کیوں مجھے زہر دینا چاہتے تھے؟" شیوٹ کا چہرہ اتر گیا۔ کونی نے نوٹ بک بند کی اور کھڑی ہو گئی۔ "یہ تو رسل سے مل کر ہی پتا چلے گا۔ امید کرتی ہوں کہ تم غلط بیانی سے کام نہیں لے رہے۔"

"نہیں، قطعی نہیں۔ میں نے ہر بات سچ بتائی ہے۔"

"رسل کہاں ملے گا؟"

شیوٹ نے ایک پتا لکھوایا۔

کونی اس کے تعاون کا شکریہ ادا کر کے جانے لگی۔

"ایک منٹ، سارجنٹ۔"

"یس؟"

"اس کو مت بتانا کہ میں نے لیبل بدل دیا تھا۔"

"دیکھوں گی، تمہارا رابطہ ہوا ہے؟"

"نہیں۔"

☆☆☆

رسل کی طرف کار دوڑاتے ہوئے کونی نے فلیچر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔ پھر ٹینا گورڈی کے بارے میں سوال کیا۔ پتا چلا کہ وہ گھر جا چکی ہے۔

بعد ازاں کونی نے ٹینا سے رابطہ کیا۔ صرف اتنا بتایا

کہ بظاہر زہریلی بوتل رسل نے شیوٹ کو دی تھی۔

"کیا رسل کسی معقول وجہ کے تحت شیوٹ یا تمہارے باپ کو مارنے کی کوشش کرسکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ رسل کے پاس کیا محرک ہوسکتا ہے؟ تم کچھ جانتی ہو یا کوئی رائے رکھتی ہو؟"

دوسری جانب قریباً 30 سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر ٹینا کی آواز آئی۔ "ان کے درمیان تکرار تو ہوئی تھی۔ تاہم معاملہ بظاہر سلجھ گیا تھا۔ شاپنگ مال کے معاہدے میں ایک ایسی شق تھی جو کسی ایک شراکت دار کی موت سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر کوئی ایک مرجاتا ہے۔۔۔ کسی بھی وجہ سے۔۔۔ تو باقی دونوں شراکت دار مرنے والے کا شیئر خرید لیں گے لیکن صرف مرنے والے کی اصل سرمایہ کاری کی قدر کے تحت جو کافی کم ہوگی۔ کیونکہ بہت سا کام تو مکمل ہو چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تینوں کا جھگڑا محض دب گیا ہو۔ ختم نہ ہوا ہو۔ ایسی صورت میں شیئرز کی خریداری کا محرک مزید اہمیت اختیار کر جائے گا۔"

"میں سمجھ گئی۔ تھینک یو! تم کافی ذہین ہو۔" کوئی نے رابطہ ختم کر دیا۔

ارنسٹ رسل کا گھر بھی شاندار تھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا۔ اس کا جسم فربہی کی جانب مائل تھا جبکہ اس کی سرخ بالوں والی بیوی جوان اور خوب صورت تھی۔ کوئی نے اندازہ لگایا کہ وہ رسل کی دوسری شادی ہوسکتی ہے۔

وہ دونوں کوئی کو آرام دہ لیونگ روم میں لے آئے۔

"یہ ہیلن ہے۔ میری بیوی۔" رسل نے جوان لڑکی نما عورت کا تعارف کرایا۔ "ہم کیا مدد کرسکتے ہیں؟"

کوئی شکریہ ادا کر کے نرم کاؤچ میں دھنس گئی۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر اس نے نوٹ بک کھولی۔

"یقیناً تمہیں سام گورڈی کی ناگہانی موت کی خبر مل چکی ہوگی؟"

"ہاں، بے حد افسوس ہوا۔" رسل بولا۔

"اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ موت کی وجہ زہریلی وائن تھی۔ میرا مطلب ہے، بورڈیکس۔ جو شیوٹ نے بطور تحفہ سام گورڈی کو دی تھی۔۔۔ اب شیوٹ کا کہنا ہے کہ وہ بوتل تم نے اسے دی تھی؟"

"اس گدھے نے ہماری دی ہوئی بوتل آگے کیوں بڑھا دی۔" رسل کسمسایا۔

"مسٹر رسل! نکتہ یہ ہے کہ وائن زہریلی تھی۔ وہ پیتا تو وہ مرجاتا۔ وہ اتفاقاً بچ گیا لیکن سام مارا گیا۔ تم کیوں شیوٹ کو مارنا چاہتے تھے؟" کوئی نے رسل کو گھورا۔

رسل اور اس کی جوان بیوی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔" رسل نے نروس انداز میں سگار سلگایا۔ "وہ قاتل بوتل ہمیں گفٹ میں ملی تھی۔"

"وہاٹ؟" کوئی بدک گئی۔ یہ کیا مذاق ہے، وہ زیرلب بڑبڑائی۔ کوئی کو اس جواب کی قطعی توقع نہیں تھی۔ آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"میں سچ بول رہا ہوں۔" رسل نے زور دیا۔

"کس نے بھیجی تھی؟"

"چند ہفتے قبل میسنجر سروس کے ذریعے، بطور نئے سال کی شام کا تحفہ۔" رسل نے بتایا۔

"نام بتاؤ۔" کوئی نے ٹانگ سے ٹانگ اتار کر پہلو بدلا۔

"نام نہیں تھا۔ نام کی جگہ لکھا تھا۔ ایک پرستار کی جانب سے۔"

"خوب! کس کا پرستار؟" کوئی نے معنی خیز نظروں سے میاں بیوی کو باری باری دیکھا۔

نشست گاہ میں تناؤ کی کیفیت تھی۔

"پرستار والی بات نے ہمارا گھریلو ماحول خراب کر دیا تھا۔" رسل نے ہیلن پر نظر ڈالی۔ "ہیلن سمجھی کہ یہ کسی عورت نے میرے لیے بھیجی ہے۔۔۔ نیا مسئلہ گھر میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے میسنجر سروس کو فون کیا اور پوچھا کہ مذکورہ تحفے کی ادائیگی کس نے کی ہے؟"

کوئی نوٹ بک پر کچھ لکھ رہی تھی۔

"میں مطلوبہ معلومات حاصل نہ کرسکا۔ بھیجنے والے نے احتیاط کی تھی۔ البتہ انہوں نے ایک نام بتا دیا۔"

"کیا؟" کوئی نے سر اٹھایا۔

"میلوڈی شوگر۔"

کوئی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "عورت؟"

"عورت یا پھر کوئی ریس کی گھوڑی۔" ہیلن نے خشک لہجے میں کہا۔ "نام سے لگتا ہے کوئی شوگرل ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔ میں کسی بھی میلوڈی شوگر کو نہیں جانتا۔ یہ نام میں نے پہلی بار سنا ہے۔" اس نے بے بسی سے ہیلن کو دیکھا۔

ہیلن اٹھ کر ایک طرف بنے چھوٹے سے بار پر گئی اور جام تیار کرنے لگی۔

"ہیلن پریشان تھی اور مجھ پر شک کر رہی تھی۔ ایسے حالات میں ہم اسے استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ ہم نے اس وائن کو ریک میں رکھ چھوڑا۔ پھر کچھ روز پہلے میں نے وہ

بوتل شیوٹ کو دے دی۔ اس وقت ہیلن بھی ہمراہ تھی۔"

کونی نے مینیجر سروس کا نام معلوم کیا۔ پھر فیچر سے رابطہ کر کے اسے تصدیق کی ہدایات جاری کر دیں۔

وہ دوبارہ رسل کی جانب متوجہ ہوئی۔ "اب تم سوچ رہے ہو گے کہ کسی نے تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی... اتفاقاً تم بچ گئے اور اتفاقاً شیوٹ بھی بچ گیا، کیوں؟"

"ہاں، ایسا ہی لگتا ہے۔" رسل نے سر ہلایا۔

کونی مزید کچھ بولنے والی تھی کہ ڈور بیل کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہیلن لیونگ روم سے نکل کر بیرونی دروازے کی جانب چلی گئی۔

"اور سام خوامخواہ مارا گیا؟"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" رسل بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ..." کونی کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔ ہیلن کے چیخنے کی آواز آئی۔ کونی کھڑی ہو گئی۔ اس کا ہاتھ اضطراری طور پر شولڈر ہولسٹر کی طرف گیا۔ رسل بھی گھبرا گیا۔

کونی نے پسٹل نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ بے یقینی سے آفت جان ٹینا گورڈی کو دیکھ رہی تھی جو گن پوائنٹ پر ہیلن کو دھکیلتی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ہیلن کو ایک طرف دھکا دیا اور رسل کو نشانے پر لے لیا۔ رسل اور ہیلن دونوں بدحواس تھے۔ کونی کو اس جذباتی لڑکی پر غصہ آ گیا۔

کچھ دیر پہلے ٹینا گورڈی کی ضمانت ہوئی تھی اور وہ ایک بار پھر سابقہ انداز میں آن دھمکی تھی۔ اس مرتبہ نشانہ شیوٹ کے بجائے رسل تھا۔ ٹینا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

کونی کو پتا تھا کہ اس مرتبہ دیوانی لڑکی سوال جواب کیے بغیر گولی داغ دے گی۔ وہ پھرتی سے دونوں کے درمیان آ گئی۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" کونی نے غصے سے کہا۔ "گن ایک طرف رکھ دو۔"

"اس مرتبہ نہیں۔ مجھے اپنے باپ کے قاتل کو ٹھکانے لگانا ہے۔" ٹینا تڑخی۔

"شیوٹ اور رسل دونوں بے قصور ہیں۔"

"رسل بھی؟ وہ کیسے؟"

"تم گن رکھو تو میں بتاؤں۔ رسل قاتل ہوتا تو میں اب تک اسے گرفتار کر چکی ہوتی۔"

ٹینا کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''میرا بھروسا کرو۔ میں بھی اصل مجرم تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' کونی پُراعتماد انداز میں آگے گئی اور پسٹل اپنے قبضے میں لے لیا۔

نینا مایوس کن انداز میں کاؤچ پر ڈھیر ہوگئی۔ رسل اور ہیلن نے اطمینان کی سانس لی۔

کونی نے گری ہوئی نوٹ بک اٹھائی اور بیٹھ کر ''میلوڈی شوگر'' کے نام کو گھورنے لگی۔

''تم کیا سوچ رہی تھیں؟'' رسل نے سوال کیا۔

کونی کسی سوچ میں غرق تھی۔ اس نے سنا ہی نہیں۔

کونی نے میلوڈی شوگر کے سامنے سیموئل گورڈی لکھا اور سر اٹھایا۔ ''کسی پرشنگ؟'' اس نے رسل کو دیکھا۔

''نہیں۔''

کونی نے پھر فلیچر سے بات کی اور دومنٹ میں رابطہ ختم کردیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ لیونگ روم میں سکوت طاری تھا۔

''تم نے جو بیان دیا ہے وہ ٹھیک ہے۔'' کونی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ''یہ بتاؤ کہ تم تینوں کے درمیان تکرار ہوئی تھی؟''

''ہاں، ایسا ہوا تھا۔''

نینا کو تاریخ یاد نہیں تھی۔ شیوٹ نے تاریخ بتادی تھی۔ ''کیا تمہیں تاریخ یاد ہے؟''

''شاید میں بتاسکوں... تاہم اس روز چھٹی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' کونی نے نوٹ بک پر کچھ لکھا۔

''لیکن وہ تکرار ختم ہوچکی تھی۔'' رسل نے وضاحت کی۔

''نہیں ختم نہیں ہوئی تھی۔'' کونی نے بلند آواز میں کہا۔ سب چونک پڑے۔ کونی نے نوٹ بک پر نظر ڈالی۔ ''جس روز تنازع ہوا اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ''میلوڈی شوگر'' نے زہریلی وائن رسل کو بھیجی۔ بوتل یہاں کئی ہفتے پڑی رہی، پھر رسل نے شیوٹ کو دے دی... شیوٹ نے تحفتاً وہی بوتل نینا کے باپ سیموئل گورڈی کو روانہ کردی... نینا آئی ایم ویری سوری، وہ بوتل تمہارے باپ نے رسل کو بھیجی تھی۔''

''کیا بکواس ہے؟'' نینا کا چہرہ فق ہوگیا۔ رسل اور ہیلن بھی سکتہ زدہ رہ گئے۔

''کسی نے تمہارے باپ کو مارنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کوشش تمہارے باپ کی طرف سے کی گئی تھی۔''

''نہیں۔'' نینا چلا اٹھی۔ ''یہ جھوٹ ہے۔''

''رسل ''میلوڈی شوگر'' کے نام کی وجہ سے بچ گیا کیونکہ میاں بیوی میں غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی اور شیوٹ کی قسمت اچھی تھی کہ تحفہ دینے کے لیے اس نے وہی بوتل منتخب کی۔ تمہارا باپ کئی ہفتے رسل کی موت کا انتظار کرتا رہا۔ اس دوران میں وہی بوتل گھوم پھر کر خود اس کے پاس پہنچ گئی۔''

''اگر انہوں نے بھیجی تھی تو بوتل پہچان لیتے؟'' نینا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''ہاں، وہ پہچان جاتے لیکن شومئی قسمت، بہتر کوالٹی ظاہر کرنے کے لیے شیوٹ نے بوتل کا لیبل بدل دیا اس لیے وہ بے خبر رہے اور...'' کونی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تاسف سے ہاتھ مسلنے۔ ''ان کو آخری سانسوں کے دوران پتا چلا ہوگا کہ بوتل وہی تھی جو ''میلوڈی شوگر'' نے رسل کو بھجوائی تھی۔''

نینا کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''لیکن ''میلوڈی شوگر'' کون ہے؟''

''سیموئل گورڈی!''

''کیسے... کیسے تم ایسا کہہ رہی ہو؟''

''تمہارے باپ نے ایک فرضی نام چنا تھا۔'' کونی نے نوٹ پیڈ کو گھورا۔ ''لیکن شاید وہ یہ نام پہلے بھی کہیں استعمال کرچکے تھے یا پھر ان کے لاشعور میں کوئی گرہ تھی... کیا کہہ سکتے ہیں؟ وہ اپنے ہی اصلی نام کے حروف سے کھیل رہے تھے۔''

''کیا مطلب ہے؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

کونی نے ایک گہری سانس لی۔

''میلوڈی شوگر، سیموئل گورڈی کا ''اینا گرام (ANAGRAM)'' ہے۔'' ''ایک ہی شخص کے دو نام۔''

''اینا گرام'' سمجھتی ہو؟''

''ہاں۔'' نینا کی آواز ٹوٹ گئی۔ رسل اور ہیلن کا منہ کھل گیا۔

''دونوں ناموں میں ایک جیسے گیارہ گیارہ حروف ہیں۔ صرف ترتیب کا فرق ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سارجنٹ کونی نے پسٹل نینا کو واپس کردیا۔

نینا کے ذہن میں ان دونوں ناموں کے حروف ابھی گڈمڈ ہورہے تھے۔ MELODY SUGAR اور SAMUEL GORDY نام مختلف تھے لیکن دونوں کے حروف واقعی یکساں تھے۔

⌖

ہیراپھیری

تنویر ریاض

جو تن آسانی کے قائل ہوتے ہیں... وہ محنت سے جی چراتے ہیں... بے قرار جھرنا مشکل ہی سے سمندر تک پہنچ پاتا ہے... صلاحیت اور کاوش ہی منزل تک پہنچنے کا زینہ ہیں... کتابوں سے دوستی رکھنے اور نبھانے والے فنکاروں کی یکجائی... وہ ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع تھے... مگر اچانک ہی ہیراپھیری... حسد اور جلن کی تیز آندھی نے ان کو بکھیر دیا...

جرم محبت اور لالچ میں ڈوب کر راہ کھوٹا کر دینے والے ناکاروں کا منصوبہ

''واقعی یہ بہت شاندار ہے۔'' میں نے اس پارکر پین کو روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نایاب قلم پر زردوزی کا کام تھا اور چھوٹے چھوٹے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ نوئی ریر بکس کے مالک میک ڈریبل نے تالی بجاتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔

''بہت خوب!'' پھر وہ اپنی نئی ملازمہ نیز میتھیوز کی طرف مڑا جو یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ ''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟''

ٹیلر نے اپنے لمبے بال پیچھے ہٹائے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ان کا کہنا تھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی قدیم شے آئے اور تم سمجھتی ہو کہ اس میں کوئی خاص بات ہے تو جوزی پریسکاٹ کو ضرور فون کرو۔ اس کی ماہرانہ رائے سننے کے بعد ہی تمہیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا اور تم اسے اچھے داموں فروخت کرسکو گی۔''

''اس تعریف کے لیے تمہارا شکریہ میک۔'' میں دوبارہ مین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

''تم بتاؤ۔'' میک نے ٹیلر سے کہا۔

یہ دکان میک کے پردادا نے قائم کی تھی اور وہ اس پر فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا اور نایاب کتابوں سے اسے بہت محبت تھی جس طرح میں پرانی چیزوں پر جان چھڑکتی تھی۔ یہ دکان نیو ہیمپشائر کے بارونق علاقے روکی پوائنٹ میں واقع تھی۔ چوڑائی کے مقابلے میں اس کی لمبائی زیادہ تھی اور پوری دکان میں جگہ جگہ گہرے سبز رنگ کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں تاکہ گاہک بیٹھ کر سکون سے کتابوں کا معائنہ کرسکیں۔ جس چھوٹے سے دفتر میں ہم بیٹھے ہوئے تھے، وہ مرکزی دروازے کے بالکل سامنے تھا اور وہاں سے گاہکوں کی آمدورفت پر بہ آسانی نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔

ٹیلر نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے جیسے یاد کرنے کی کوشش کررہی ہو کہ اسے پین کی تاریخ کے بارے میں کیا بتایا گیا تھا پھر اس نے پین پر سے نظریں ہٹا کر میک کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں شبہ ہو تو اسے گول مول کردینا چاہیے۔''

''نہیں۔'' میک نے کہا۔ ''پہلا سبق یہی ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔ اگر تمہیں اس کی تاریخ کے بارے میں معلوم نہیں تو صاف صاف بتادو۔''

''سوری۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''کیا واقعی اس کی اتنی زیادہ اہمیت ہے؟''

''ہاں، ہم پچاس سینٹ والی پرانی کتابیں نہیں بیچ رہے بلکہ نایاب اور قیمتی کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہمیں جتنا زیادہ کسی چیز کی ابتدائی تاریخ اور اس کی ملکیت کے ریکارڈ کے بارے میں معلوم ہوگا، ہم اسی حساب سے اس کی قیمت لگا سکیں گے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جوزی؟''

''بالکل۔'' میں نے مسکراتے ہوئے ٹیلر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اگر تم کسی شے پر ریسرچ کرنے میں ناکام ہوگئیں اور اندازے سے اس کی قیمت لگا دی تو نقصان ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر زیادہ قیمت لگی تو وہ چیز فروخت نہیں ہوگی اور کم قیمت لگانے کی صورت میں تمہیں مالی نقصان ہوگا۔ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو ایک دن کاروبار ٹھپ ہو جائے گا اور جہاں تک اس قلم کا تعلق ہے۔'' میں نے اسے اپنے سر سے اوپر اٹھایا اور ایک ٹرافی کی طرح گھماتے ہوئے بولی۔ ''میک! تمہارے لیے اس سے اچھا موقع کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہم اکتوبر میں ایک نیلامی کی منصوبہ بندی کررہے ہیں اور یہ پین اس نیلامی کے لیے بہت مناسب رہے گا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے جوزی، اسے تم اپنی امانت سمجھو۔ میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ ٹیلر تمہیں دوسرا پین بھی دکھادے گی اور اگر تم وہ لینا چاہو تو ہم اسے بھی تمہارے آرڈر میں شامل کردیں گے۔ میری طرف سے ٹیلر معاہدے پر دستخط کرسکتی ہے۔''

''فی الحال میں تمہیں اس کی رسید دے دوں گی۔ ایک بار میں اس کی قیمت کا اندازہ لگالوں پھر معاہدے پر دستخط بھی ہوجائیں گے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' پھر وہ ٹیلر کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا۔ اسٹال پر میری موجودگی ضروری ہے کیونکہ مجھے اسٹیفن کنگ کے دوسرے ناول سالم زلاٹ، کی بولی لگانی ہے۔''

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ ایک نایاب کتاب تھی اور میرے خیال میں اس کی چند ہی کاپیاں موجود ہوں گی۔ میرے پوچھنے پر میک نے بتایا کہ اس کے پاس اس ناول کی کم از کم پانچ کاپیاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے ان کتابوں کی کیا قیمت لگائی ہے؟''

''کم از کم نوے ہزار ڈالر، تم کیا دے سکتی ہے؟''

میک بولا۔

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اوہ میرے خدا! کہیں میرے دل کی دھڑکن نہ رک جائے۔ کیا میں تم سے اس کی تاریخ جان سکتی ہوں؟''

''اشاعت کے بعد سے یہ ذخیرہ ایک شخص کی ذاتی لائبریری میں رہا ہے۔ وہ ایک دوراندیش آدمی تھا جس نے یہ مجلّا کتابیں اسی وقت خرید لی تھیں جب یہ پہلی بار 1975ء میں شائع ہوئیں۔''

''کیا شاندار دریافت ہے۔'' میں نے حاسدانہ انداز میں کہا۔

''شاید زندگی میں ایک بار ایسا موقع ملتا ہے۔'' میک

نے کہا۔ ’’کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس قسم کی قیمت کا تعین کرنے میں تمہیں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟‘‘

’’میں تمہیں اگلے ہفتے کے آغاز میں اس کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم کر دوں گی۔‘‘

’’تمہارا بہت بہت شکریہ جوزی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ دکان سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ٹیلر بولی۔ ’’میک نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اسٹیفن کنگ کی دوسری کتاب اس کی پہلی کتاب کے مقابلے میں قیمتی کیوں ہے؟‘‘

’’کنگ کے پبلشر نے اشاعت سے قبل اس میں کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام یروشلم زلاٹ سے بدل کر سالم زلاٹ رکھ دیا اور قیمت بھی آٹھ سو پچانوے سے کم کر کے سات سو پچانوے سینٹ کر دی۔ ان میں سے چند سو کاپیاں ہی فروخت ہونے سے رہ گئی تھیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر کے گرد پوش گم یا ضائع ہو گئے۔ چند ہی کاپیاں ایسی تھیں جن کے گرد پوش بہتر حالت میں تھے اور ان میں پرانی قیمت کاٹ کر نئی قیمت کی مہر لگا دی گئی تھی۔ یہ میں نے پہلی بار سنا ہے کہ پہلے ایڈیشن کی چار سے زیادہ اصل کاپیاں موجود ہیں۔ جب لوگوں کو میک کے پاس ان کتابوں کی موجودگی کا علم ہوگا تو یہ ایک بڑی خبر بن جائے گی۔‘‘

’’واؤ، میں جانتی تھی کہ یہ کتابیں نایاب ہیں لیکن ان کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔‘‘ ٹیلر نے ایک گتے کا ڈبا اپنی طرف کھینچا اور جھک کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ ’’دوسرا پین بھی یہیں کہیں ہوگا۔‘‘ اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ ٹیلر بولی۔ ’’معاف کرنا جوزی، میں اس گاہک سے نمٹ لوں، تم اگر چاہو تو خود ہی دوسرا پین تلاش کر سکتی ہو۔‘‘

میں نے دکان میں آنے والے شخص کو پہچان لیا۔ وہ ایتھن تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو گھوم پھر کر پرانی چیزیں خریدتے اور بیچتے ہیں۔ میں نے بھی اس سے بہت سی چیزیں خریدی تھیں اور اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب بھی وہ کوئی چیز سب سے پہلے میرے پاس لے کر آئے گا تو اسے بہت اچھی قیمت ادا کروں گی۔

میں نے بیگ سے آئی فون نکالا اور اپنے منیجر کو فون کر کے پوچھا۔ ’’کیا ایتھن آج ہمارے دفتر آیا تھا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس کا جواب سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ وہ میرے دفتر جانے کے بجائے پہلے یہاں آیا۔ اس طرح وہ یہ پیغام دینا چاہ رہا تھا کہ میک اسے مجھ سے زیادہ پیسے دیتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ میک بہت کم منافع پر کام کر رہا تھا۔

میں نے گتے کا باکس کھنگالنا شروع کر دیا۔ اس میں گرد آلود کتابوں اور اخبارات کا ڈھیر جمع تھا۔ جب میں نے دوبارہ ٹیلر کی طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں وہی چمک نظر آئی جو کسی کتے کی آنکھوں میں ایک بڑی ہڈی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ ایتھن خوش شکل، لمبا اور متناسب جسم والا تھا لیکن جسمانی اور سماجی طور پر پس ماندہ تھا جبکہ اس کے مقابلے میں ٹیلر بہت خوب صورت، نرم مزاج اور خوش اخلاق تھی اور ان دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ عین اسی وقت میری انگلیاں اخبار کے نیچے رکھی ہوئی کسی چیز سے ٹکرائیں۔ مجھے دوسرا پین مل گیا تھا۔

ٹیلر نے ان تینوں کتابوں کا معائنہ کیا جو ایتھن نے اس کے حوالے کی تھیں۔ ان کے صفحات پلٹ کر دیکھے کہ کوئی صفحہ پھٹا ہوا تو نہیں یا کہیں کوئی دھبا تو نظر نہیں آ رہا۔ گرد پوش کی حالت دیکھی اور پھر تینوں کتابیں قریبی میز پر رکھ دیں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایتھن سے کچھ کہا جو میں نہ سن سکی۔ البتہ ایتھن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ٹیلر نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے سامنے کر دیں جیسے وہ ان کتابوں کے دس ڈالر دینا چاہ رہی ہو لیکن ایتھن نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر یہ سلسلہ چلتا رہا پھر ایتھن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جواب میں ٹیلر بھی مسکرائی جیسے اپنی کامیابی پر خوش ہو رہی ہو، پھر اس نے کیش رجسٹر کھولا اور اس میں سے بیس بیس ڈالر کے پانچ نوٹ نکال کر ایتھن کو پکڑا دیے۔ اس نے وہ نوٹ جیب میں رکھے اور ٹیلر سے کچھ کہا جس کے جواب میں اس نے انکار کر دیا۔ اور اس طرح پیچھے ہٹی جیسے ایتھن کی کہی ہوئی بات اسے ناگوار گزری ہو۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکان سے باہر چلا گیا۔

ٹیلر وہ کتابیں لے کر میک کے دفتر میں آئی اور انہیں اس کی میز کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ میں نے ان کتابوں پر ایک نظر ڈالی اور سرسری انداز میں پوچھا۔ ’’کیا ان میں کوئی خاص بات ہے؟‘‘

’’نہیں، ان میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔‘‘

میں نے سب سے نیچے رکھی ہوئی کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ گرد پوش والی کتاب ’’گون وتھ

واونڈ“ ہے؟“

”ہاں، یہ میری پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔“ میں پیچھے کی جانب ہوئی اور دونوں ہاتھ سر کے عقبی حصے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں تو کتابوں کی بہت پہچان ہے، میں سمجھ رہی تھی کہ تم ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتیں۔“

اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”میرے والدین کتابیں جمع کرنے کے شوقین ہیں اور یہی حال میرے بوائے فرینڈ کا بھی ہے۔“

”بہت خوب، وہ کس طرح کی کتابیں جمع کرتے ہیں؟“

”میرے ڈیڈی کو پرانی ریفرنس بکس، ڈکشنریاں اور آداب محفل کے بارے میں لکھی گئی کتابیں پسند ہیں جبکہ میری ماں خاصی ماڈرن واقع ہوئی ہیں اور وہ ہر طرح کی کتابیں جمع کرتی رہتی ہیں، میرا بوائے فرینڈ جم، کامک بکس اکٹھی کرتا رہتا ہے۔“

میں نے اپنی توجہ دوسرے پین کی جانب مبذول کرلی۔ وہ کونکلین پین بھی پارکر کی طرح خوب صورت تھا۔ ٹیلر نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟“

”میں نہیں جانتی۔ اس کے لیے مجھے کچھ ریسرچ کرنا ہوگی۔“

ایک طویل قامت شخص ڈینم کی قمیص اور جینز پہنے ہوئے دکان میں داخل ہوا۔ اس نے قمیص کی آستینیں کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ اسے دیکھ کر ٹیلر کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ جم ہے۔“ پھر اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”دفتر میں آجاؤ، میں تمہیں جوزی پریسکاٹ سے ملوانا چاہتی ہوں۔“

”جم ونسینٹ۔“ اس نے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور میری جانب مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

ٹیلر نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”جوزی، قدیم اشیا کی ماہر ہے۔“

میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کامک بکس جمع کرتے ہو۔“

”کیا تم بھی کامکس خریدتی اور بیچتی ہو؟“

”بس تھوڑی بہت کا پیاں اپنی ہفتہ وار سیل میں رکھ دیتے ہیں۔“ پھر میں نے ٹیلر کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں پین بہت زبردست ہیں۔ میں ابھی ان دونوں کی تصویریں لیتی ہوں اور جلد ہی تمہیں ان کی رسید بھیج دوں گی۔“

کار میں بیٹھ کر میں نے اتھن کا نمبر ملایا اور بولی۔ ”تم میرے آفس نہیں آئے اس لیے سوچا کہ تمہیں چیک کروں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ہمیشہ تمہاری لائی ہوئی چیزوں کی اچھی قیمت دی ہے اور اب اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ ہمیشہ تمہیں دوسروں سے زیادہ قیمت دوں گی۔“

اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”آج میں نے تمہیں ٹرمبلز پر دیکھا تھا۔“

”میں نے بھی تمہیں وہاں دیکھا۔“

”میں جہاں چاہوں اپنی چیزیں فروخت کرسکتا ہوں۔“

”بالکل تم ایسا کرسکتے ہو لیکن جب میں تمہیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قیمت دے رہی ہوں تو پھر یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

اس بار خاموشی پہلے سے زیادہ طویل تھی پھر وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”یہاں سوال پیسوں کا نہیں ہے۔“ میں کسی کی خواہش کے آگے بند نہیں باندھ سکتی تھی لہٰذا مصلحت آمیز انداز میں بولی۔ ”کوئی بات نہیں اتھن۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ ہم ناراض نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم وہ کتابیں ٹیلر کو فروخت کرنا چاہ رہے تھے لیکن آئندہ جو بھی کوئی چیز ملے تو ضرور رابطہ کرنا۔ ہمیں تم سے کاروبار کرکے خوشی ہوگی۔“

”شکریہ۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اس شام میں اور ٹونی وِلیج گرین میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ہر ہفتے کی شام بینڈ لوگوں کی پسندیدہ دھنیں پیش کیا کرتے تھے۔ موسم خاصا گرم تھا اور آسمان پر دور دور تک بادلوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ تبھی میری نظر میک پر گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری اور دوسرے میں کمبل تھا۔ وہ لوگوں کے درمیان راستہ بناتا آگے بڑھا اور اس جگہ رک گیا جہاں ٹیلر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کمبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک جم اور دوسرا کوئی اجنبی تھا۔ میک کی کسی بات پر ٹیلر نے قہقہہ لگایا اور داد دینے کے انداز میں وائن کا گلاس اوپر اٹھایا۔ میک نے پیچھے مڑ کر اپنی بیوی میری کی طرف دیکھا۔ نیز مسکرائی۔ جواب میں میری نے سرکو ہلکا سا خم دیا

اور آگے بڑھ گئی۔ اس کے انداز میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔

میری دبلی پتلی خوب صورت عورت تھی لیکن میں نے کبھی اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکی کہ میک جیسے ملنسار اور ذہین شخص کو اس میں کیا خوبی نظر آئی۔ ٹونی کا خیال تھا کہ اس میں حسد کا مادہ تھا اور وہ کسی دوسری عورت کو برداشت نہیں کر سکتی تھی لیکن تھوڑی دیر پہلے اس نے ٹیلر کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، وہ محض حسد نہیں بلکہ اس میں ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل تھا۔

''جوزی!'' میک کی آواز آئی۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم اپنا کمبل تمہارے ساتھ ہی بچھا لیں۔''

''ضرور۔''

میک نے کمبل بچھایا۔ اس کے ایک کونے پر اپنی ٹوکری رکھی اور چت لیٹتے ہوئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا خوب صورت رات ہے۔'' پھر بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ بے بی، کھڑی کیوں ہو؟''

میری بیٹھ گئی تو اس نے اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ میری نے آہستہ سے خود کو علیحدہ کرتے ہوئے ٹیلر کی جانب اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''کیا یہی وہ لڑکی ہے؟''

''ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''خوب صورت ہے۔''

میک ہنستے ہوئے بولا۔ ''خوب صورت، تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔ یہ تو لوگوں کے ہوش اڑانے والی اور تقریباً تمہارے جیسی ہی خوب صورت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹوکری میں سے وائن کی بوتل نکالی اور بولا۔ ''چلو موج اڑائیں۔''

''میلہ کیسا رہا؟'' میں نے میک سے پوچھا۔

''بہت زبردست، مجھے توقع سے زیادہ ہی آمدنی ہو گئی یعنی ستانوے ہزار۔''

''میں تمہیں سلام کرتی ہوں۔'' میں نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا۔ ''خریدار کون تھا؟''

''نیویارک کا رہنے والا ہے لیکن گمنام رہنا پسند کرتا ہے۔''

''حیرت ہے، وہ یہاں کیسے آیا؟''

''دراصل میں نے پہلے ہی مختلف ذرائع سے ان کتابوں کی پبلسٹی کر دی تھی۔ مثلاً ٹوئٹر وغیرہ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ شخص روکی پوائنٹ پہنچ جائے گا۔ بہرحال اس نے سب سے بڑی بولی لگائی اور وہ کتابیں لے گیا۔''

''تمہیں تو بہت خوشی ہوئی ہو گی۔'' میں نے میری سے پوچھا۔

''ہمیشہ ہی ہوتی ہے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے اس طرح کہا کہ مجھے اس کی وفاداری پر شبہ ہونے لگا۔ میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے میک سے پوچھا۔

''کیا تم نے ''گون ود دا ونڈ'' دیکھی جو ٹیلر نے آج ہی خریدی ہے۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''نہیں، میں ابھی تک دکان پر واپس نہیں گیا۔ کون سا ایڈیشن ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔ بس دور سے ہی اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔''

اس نے ٹیلر کی جانب دیکھا جو آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی اور جم اس کا خالی گلاس دوبارہ بھر رہا تھا۔ اسی وقت میں نے اسٹمن کو آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنے بازو میں ایک بڑا سا ڈبا دبایا ہوا تھا۔ وہ ٹیلر کے قریب پہنچا اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ تھوڑا سا اچھلی۔ اسے گھورا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اسٹمن نے اسے وہ پیکٹ دینا چاہا لیکن اس نے دوبارہ انکار کر دیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو، چلے جاؤ۔ جم کے چہرے پر بھی غصے کے آثار ہونے لگے۔ اس نے اسٹمن سے کچھ کہا اور وہ سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔

پیر کی صبح چھ بجے میں نے اپنے بیرونی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا سنا۔ ٹونی کسی کام کے سلسلے میں واشنگٹن گیا ہوا تھا اور اس کی واپسی شام تک متوقع تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور آواز آئی تو میں سمجھ گئی کہ یہ بارش کی دستک ہے۔ میں نے کمبل لپیٹ کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ آدھے گھنٹے تک بستر میں کروٹیں بدلنے کے بعد میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ناشتا بنایا اور تیار ہو کر کام کے لیے نکل پڑی۔ دفتر پہنچ کر میں نے اپنے آپ کو چھتری، رین کوٹ اور گیلے جوتوں سے آزاد کیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو آٹھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ میں جانتی تھی کہ ایک گھنٹے سے پہلے کوئی نہیں آئے گا۔

میں نے گودام کو جانے والا بھاری دروازہ کھولا اور اندر جا کر سیف سے وہ پین نکالے جو میں میک کی دکان سے لائی تھی اور ان کے بارے میں ریسرچ شروع کر دی۔ ساڑھے نو بجے تک میں اپنی ابتدائی رپورٹ اور خریداری کا معاہدہ تیار کر چکی تھی۔ ان میں سے پارکر پین کی قیمت دو

ہزار اور ٹونگسین چین کی مالیت ایک ہزار ڈالر تھی۔

میں جب ڈمبلو کے اسٹور پر پہنچی تو وہاں دو پولیس کاریں پہلے سے موجود تھیں جبکہ پولیس چیف کی ایس یو وی وٹس پارک ہوتی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا کیونکہ پولیس چیف ایلس ہنٹر میرا دوست تھا۔ زرد رنگ کا پولیس ٹیپ اسٹور سے دس فٹ کے فاصلے پر چاروں طرف لگا دیا گیا تھا۔ بارش ہلکی ہوگئی تھی لیکن بونداباندی مسلسل ہو رہی تھی۔

میں پولیس ٹیپ کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ایک سنہرے بالوں والی پولیس آفیسر فلورنس میڈ، ایلس سے باتیں کر رہی تھی۔ ایلس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم نے ٹیلی پیتھی سیکھ لی ہے۔ میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔''

''سب ٹھیک تو ہے۔'' میں نے پوچھا۔

وہ میڈ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''جوزی کو اندر آنے دو۔''

میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اپنی چھتری ایک طرف رکھی۔ ایلس نے میرا رین کوٹ ایک باوردی پولیس آفیسر کو پکڑا دیا اور بولا۔ ''ٹیلر مر چکی ہے۔''

میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ اندر سے نکلنے والی چیخ کو روک سکوں پھر میں نے دفتر کی طرف دیکھا۔ ٹیلر کی لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر دائیں طرف تھا لیکن میں دیکھ سکتی تھی کہ اس کا چہرہ سوجا ہوا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ ''اوہ میرے خدا۔''

''ہمارے پاس کئی سوالات ہیں جن میں سے بیشتر کا تعلق نوادرات سے ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کرو گی؟''

''بالکل۔'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا؟''

''میں تمہیں وہی بتا سکتا ہوں جو ہم نے اخبارات کو جاری کیا ہے۔ میک ڈمبل صبح ساڑھے آٹھ بجے دکان پر آیا تو اس نے ٹیلر کو مردہ پایا۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا۔ اس وقت دکان میں کوئی اور نہیں تھا اور نہ ہی نقب زنی کی کوئی علامت نظر آئی۔ اس کے علاوہ کوئی چیز بھی غائب نہیں ہے۔ آلۂ قتل مل گیا ہے۔ اس کے لباس سے کمربند نکال کر گردن پر لپیٹا گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے آج صبح سات اور آٹھ بجے کے درمیان مارا گیا۔''

''وہ دکان میں کیسے داخل ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے پاس چابی تھی جبکہ میک کا کہنا ہے کہ اس نے اسے کبھی کوئی چابی نہیں دی تھی۔ دکان میں کوئی کیمرا یا الارم نہیں ہے اور ایک ہی چابی سے آگے پیچھے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ تالا بھی خاص نوعیت کا نہیں ہے۔ اس نے بہ آسانی میک کی چابی کی نقل تیار کرلی ہوگی۔ وہ اکثر چابی اپنی میز پر چھوڑ جاتا تھا۔ ہم مقامی ہارڈ ویئر کی دکانیں بھی چیک کریں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس نے چابی کسی بڑے اسٹور سے بنوائی ہوگی جہاں کوئی اسے یاد نہ رکھ سکے۔ میک کا خیال ہے کہ اس نے کتابیں چرانے کے لیے یہ حرکت کی ہوگی کیونکہ اس کے اسٹور میں کچھ کتابیں بہت قیمتی ہیں لیکن مجھے اس پر یقین نہیں ہے، اگر کسی نے کتابیں چرائی ہوتیں تو میک کو اس کا ضرور پتا چل جاتا اور کسی سستی کتاب کو چرانے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔''

میں نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا میک نے تمہیں گون وِتھ دا ونڈ کے بارے میں بتایا جو ٹیلر نے ہفتے کے روز خریدی تھی؟''

''نہیں، اس کتاب میں کیا خاص بات ہے؟''

''کیا میک یہاں موجود ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ایلس نے لمحہ بھر توقف کیا اور میرا چہرہ پڑھنے لگا جیسے میرے کہے ہوئے الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر بولا۔ ''ہاں، میں اسے لے کر آتا ہوں۔ ہم کار میں بیٹھ کر بات کریں گے۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور چند لمحوں بعد ہی میک کو ساتھ لے کر آگیا۔ باہر نکل کر اس نے اپنی کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میک بھی میرے برابر میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جسے میں سراغ رساں گلوریا براؤنی کے نام سے جانتی تھی۔ ایلس نے پسنجر سیٹ سنبھال لی اور بولا۔

''میں نے سراغ رساں براؤنی سے درخواست کی تھی کہ اہم نکات نوٹ کرنے کے لیے ہمارے ساتھ شامل ہو جائے، یہ ایک سرکاری لیکن غیر رسمی گفتگو ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''گون وِتھ دا ونڈ کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''کیا تم نے وہ کتاب دیکھی میک؟''

''میں صرف اسی وجہ سے کل بھی آیا تھا۔ حالانکہ ہم اتوار کو دکان نہیں کھولتے۔ میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا دیکھا۔ میری میز پر جو کتاب رکھی ہوئی تھی اس کا گردپوش بالکل صاف تھا۔ شاید دوبارہ چڑھایا گیا ہو البتہ اس پر تاریخ

طباعت جون 1936ء درج تھی۔ جب میں نے نیلر کو فون کیا تو وہ بولی کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے پھر تھوڑے سے لیت و لعل کے بعد اس نے تمہیں جھوٹا قرار دے دیا اور کہا کہ تم اس سے میرے ذرائع کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھیں اور جب اس نے کچھ نہیں بتایا تو تمہیں غصہ آ گیا۔''

''یہ انتہائی احمقانہ بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ میرے جانے کے بعد تم نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے تمہیں مطلوبہ معلومات نہیں دیں تو تم اسے یہ کہہ کر نوکری سے نکلوا دو گی کہ تم نے اسے رسیدیں جیب میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''یہ بالکل غلط ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو لیکن اس کی بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تاہم میں نے اسے کہا کہ وہ اس بات کو بھول جائے لیکن آج صبح جب میں آیا تو وہ مر چکی تھی۔''

میں نے ایلس سے کہا۔ ''ہمیں ایتھن سے پوچھنا چاہیے جس نے نیلر کے ہاتھ یہ کتاب فروخت کی تھی۔ وہ جانتا ہوگا کہ اس نے کیسی کتاب دی ہوگی۔''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' میک نے کہا۔ ''ان لوگوں کو صرف پیسوں سے غرض ہوتی ہے۔''

''اس نے صرف پیسوں کے لیے یہ سودا نہیں کیا تھا۔'' مجھے ایتھن کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''یہ سب کیا ہے جوزی؟'' ایلس نے کہا۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے دماغ میں ایک خیال آیا ہے۔''

جب میں روکی پوائنٹ پولیس اسٹیشن جا رہی تھی تو راستے میں مجھے اسمتھ کا فون موصول ہوا۔ وہ خاصا ناراض لگ رہا تھا۔ ''تمہیں مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''ہائے اسمتھ۔'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟''

''وہ لڑکی ماری گئی اور تم وہاں موجود تھیں۔ تمہیں ہمیشہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کا شوق ہے۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو، میں وہاں نہیں تھی۔''

''لیکن نعش ملنے کے چند منٹوں بعد ہی وہاں پہنچ گئیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ نیلر مر گئی ہے۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ زندگی سے بھرپور، یہ بہت بڑا حادثہ ہے۔''

''ہر قتل حادثہ ہی ہوتا ہے۔ آج تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟''

''مجھے میک سے خریداری کے معاہدے پر دستخط کروانا تھے۔ میں نے اس سے دو پرانے قلم خریدے تھے۔''

''نیلر کے بارے میں کیا کہو گی۔ اسے کیوں قتل کیا گیا؟ میں نے سنا ہے کہ کوئی چوری وغیرہ کا قصہ تھا۔''

''میں نے بھی کچھ ایسی ہی بات سنی ہے لیکن یقین نہیں آ رہا۔''

''مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''تم کبھی میرا نام نہیں لو گے؟''

''جوزی! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ مجھے صرف ابتدائی معلومات درکار ہیں۔''

''میک کی بیوی میری، پہلی بار نیلر سے ہفتے کے روز ملی تھی۔ مجھے وہ کچھ شکی مزاج لگی۔''

''گویا تمہارا یہ خیال ہے کہ میری دکان میں گئی اور اس نے نیلر کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ ایک مبالغہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''کون جانے کیا ہوا تھا۔ نیلر نے کیا کہا ہوگا۔ میک نے کیا کہا۔ میری بھی کوئی آسان عورت نہیں ہے۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہے؟''

''نہیں، میں نے یہ نہیں کہا۔''

''سوچنے کی بات ہے کہ میری صبح سات بجے دکان میں کیوں جائے گی؟''

''وہ دکان کا حساب کتاب رکھتی ہے اور کسی وقت بھی وہاں جا سکتی ہے۔''

''تم ہر بات جانتی ہو جوزی۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''تمہارے خیال میں اس قتل کی وجہ چوری ہے یا حسد؟''

''میں نہیں جانتی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس لڑکے ایتھن کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ وہ ہفتے کی شام کنسرٹ میں نیلر کو تحفہ دینے کی نیت سے آیا تھا مگر نیلر کی بے رخی اور اس کے بوائے فرینڈ کے تیور دیکھ کر واپس چلا گیا۔''

''پھر پولیس چوری پر ہی کیوں توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''کیونکہ نیلر چور ہو سکتی ہے۔'' میں نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ معلوم کر سکتے ہو کہ آج صبح میری دکان میں گئی تھی؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ضرور۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔“

”جم کو بھی چیک کرو، وہ ٹیلر کا بوائے فرینڈ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے اسی پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔“

روکی پوائنٹ پولیس اسٹیشن پہنچ کر مجھے تفتیشی کمرے میں کچھ دیر ایلس کا انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران میں نے دفتر فون کر کے وہاں کی صورت حال معلوم کی تو مجھے بتایا گیا کہ اتھن کچھ چیزیں لے کر آیا تھا جو انہوں نے بیس ڈالر میں خریدیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے معمولات میں مصروف تھا۔ ایلس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہماری مدد کرنے کا شکریہ جوزی۔ کیا تم تیار ہو؟“

”ہاں۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے عقب میں دیوار پر لگا ہوا سوئچ آن کیا تو وہاں پر نصب دونوں ویڈیو کیمرے کام کرنے لگے۔ اس نے پوچھا۔ ”اگر ٹیلر نے گون وِتھ دا ونڈ کی کاپیاں تبدیل کی ہوں تو اسے کتنا فائدہ ہوا ہوگا؟“

”اس کتاب کے اصلی ایڈیشن کی قیمت کم از کم اٹھارہ ہزار ڈالر ہے۔“

”ٹیلر نے اتنی جلدی وہ کتاب کیسے تبدیل کی ہوگی؟“

”کیا تم نے اتھن سے پوچھا ہے، اگر وہ ٹیلر پر مہربان تھا تو اسی نے اس کی مدد کی ہوگی۔“

”تم مجھے اس کا نمبر دے سکتی ہو؟“

”یقیناً۔“ میں نے اپنا فون نکال کر اتھن کا نمبر اسے نوٹ کروا دیا۔ ایلس نے فوراً ہی اسے پیغام بھیج دیا کہ وہ پولیس اسٹیشن آ جائے۔“

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر اتھن کے پاس وہ کتاب نہیں تھی تو ممکن ہے کہ ٹیلر نے کسی پرانی کتابوں کی دکان سے وہ کتاب حاصل کر لی ہو۔ گون وِتھ دا ونڈ آج بھی مقبول ہے اور اس کا جون ایڈیشن نایاب نہیں ہے۔ ٹیلر کے پاس اس کام کے لیے اتوار کا پورا دن تھا، اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو فون پر ہی دوسری دکانوں سے معلوم کر لیتی۔“

”بہت خوب۔“ ایلس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کا فون ریکارڈ بھی چیک کروں گا۔“ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اتھن نے اسے کیوں قتل کیا ہوگا؟

اگر اس نے ٹیلر کو مطلوبہ کتاب فراہم کر دی تھی تو پھر ان کے درمیان اختلاف کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اتھن اپنے احسان کی قیمت چاہ رہا ہو۔ جس کے لیے وہ تیار نہیں تھی اور غصے میں آکر اتھن نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔“

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم اسی سے پوچھنا۔“

اسی وقت ایلس کے اسمارٹ فون پر پیغام موصول ہوا۔ اس نے پڑھ کر بتایا کہ اتھن دس منٹ میں پہنچ رہا ہے۔

میں باہر لابی میں ڈیٹی ایلس کے بلاوے کا انتظار کر رہی تھی کہ مجھے اسمتھ کا پیغام موصول ہوا۔ اس نے بتایا کہ میری صبح سات بجے دکان پر آئی تھی اور آدھ گھنٹے وہاں ٹھہری لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس وقت ٹیلر وہاں موجود نہیں تھی مگر مجھے اس کی بات کا یقین نہیں ہے کیونکہ ٹیلر نے ٹھیک سات بجے اپنے دوست کو میسج کر کے بتایا کہ وہ دکان کے لیے روانہ ہو رہی ہے اور پانچ منٹ میں وہاں پہنچ جائے گی لیکن ابھی یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون دوست تھا۔

تبھی اسی وقت سراغ رساں براؤنی، میری کو لے کر استقبالیہ کمرے میں آئی اور اسے وہاں بٹھا کر چلی گئی۔ میری کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”انہوں نے میرا انٹرویو کیا ہے لیکن ابھی بیان ہونا باقی ہے۔“ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم ٹیلر کو جانتی تھیں؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس سے پہلی بار ہفتے کے روز ہی ملی تھی۔“

”میں نے بھی اسے پہلی مرتبہ کنسرٹ میں دیکھا تھا۔“

”جوزی۔“ ایلس نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ میں اس کے قریب گئی تو وہ بولا۔ ”اتھن اندر موجود ہے۔ تم اس سے کوئی بھی سوال کر سکتی ہو۔ اگر وہ غلط بیانی کرے تو اسے ٹوک دینا ورنہ مجھے میسج کے ذریعے بتا دینا۔“

جب ہم اندر داخل ہوئے تو اتھن مجھے دیکھ کر بولا۔ ”میں نہیں جانتا تھا کہ تم بھی یہاں موجود ہو۔“

ایلس نے ویڈیو ریکارڈ آن کیا اور بولا۔ ”مجھے پرانی چیزوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس لیے جوزی کو مدد کے لیے بلایا ہے۔ تم لوگ باتیں کرو، میں کچھ کاغذات دیکھ رہا ہوں۔“

’’مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم آج میرے دفتر آئے تھے۔‘‘ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

’’مجھے امید تھی کہ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔‘‘

’’کوئی خاص بات؟‘‘

’’اب اس کی اہمیت نہیں رہی۔‘‘

’’ٹیلر کے بارے میں کچھ کہنا تھا۔‘‘ میں نے اسے کریدنے کی خاطر کہا۔

وہ خاموش رہا۔ چند سیکنڈ گزر گئے تو ایلس نے کاغذوں پر سے سر اٹھایا اور آئیتھن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

’’ٹھیک ہے۔ کیا تم میرے کچھ سوالوں کا جواب دینا پسند کرو گے؟ آج صبح تم چھ سے نو بجے کے درمیان کہاں تھے؟‘‘

’’گھر پر۔ میں معمول کے مطابق صبح سات بجے اٹھا۔ ناشتا کیا اور شاور لینے کے بعد نو بجے پریسکاٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔‘‘

ایلس سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اب مجھے ان کتابوں کے بارے میں بتاؤ جو تم نے ٹیلر کے ہاتھ بیچی تھیں؟‘‘

’’مجھے اس کے اوقات کار معلوم تھے۔ وہ منگل اور بدھ کی سہ پہر اور ہفتے کے روز پورا دن وہاں کام کرتی تھی۔ میں جو کتابیں لے کر گیا، وہ اسے پسند آئیں اور اس نے مجھے ان کا اچھا معاوضہ دیا۔‘‘

’’تم ان کتابوں کے بارے میں کیا جانتے تھے؟‘‘

’’گون ودھ دا ونڈ، قیمتی تھی۔‘‘

’’کیا تم نے اس کا رنگ نوٹ کیا تھا۔ میں کتاب کی بات کر رہی ہوں۔ اس کے گرد پوش کی نہیں۔‘‘

’’نہیں، کتاب کا گرد پوش کبھی نہیں ہٹایا جاتا۔‘‘ میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’یہ سچ ہے۔ اس کے بغیر کتاب کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔‘‘

’’تمہیں کتابوں کی قیمت کے بارے میں کیسے اندازہ ہوتا ہے؟‘‘ ایلس نے پوچھا۔

’’میں نہیں جانتا۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں جن پر مجھے بھروسا ہوتا ہے۔‘‘

’’اور تم نے ٹیلر پر بھروسا کر لیا؟‘‘ ایلس نے پوچھا۔

’’ہاں، وہ بہت پُرجوش تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ اور فرمائش بھی کی تھی۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

آئیتھن مضطرب نظر آنے لگا۔ ’’میں نے ٹیلر سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔‘‘

’’یہ کب کی بات ہے؟‘‘

’’گزشتہ کل کی۔‘‘

ایلس نے سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’اس نے تمہیں فون کر کے کسی چیز کی فرمائش کی جو تم پوری نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اس نے تم سے اس بات کو خفیہ رکھنے کے لیے کہا۔ وہ کیا چاہ رہی تھی؟‘‘

’’میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں۔‘‘ آئیتھن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ’’میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔ مجھے تم

سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"کیا تم ٹیلر کے قاتل کو پکڑنے میں ہماری مدد کرنا نہیں چاہتے؟"

"میں اپنے وکیل کی موجودگی میں ہی کچھ کہوں گا۔"

اسمتھن کے وکیل کے آنے تک میں ایلس کے دفتر سے پرانی کتابوں کی دکانوں پر فون کرنے لگی۔ زیادہ تر دکانوں سے یہی معلوم ہوا کہ وہ اتوار کو کاروبار نہیں کرتے لیکن ایک دکان ایسی تھی جو چھٹی کے روز بھی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا نام ایلیٹ ریئر بکس تھا۔ تھوڑی سی گفتگو کرنے کے بعد یہ معلوم ہوگیا کہ اتوار والے دن جوائے تھامس نامی لڑکا دکان پر موجود تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور پوچھا کہ کیا گزشتہ روز کسی نے اس سے گون وِتھ دا ونڈ کے بارے میں پوچھا تھا تو اس کا جواب ہاں میں تھا۔ یہی نہیں بلکہ خریدار نے اس کے علاوہ ہیری پورٹر کی کتاب بھی خریدی تھی۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں نے ایلس کے موبائل پر پیغام بھیجا اور دس منٹ سے بھی کم وقت میں سراغ رساں براؤنی اور میں ایلیٹ اسٹور کی جانب روانہ ہوگئے۔

جے تھامس ساٹھ ستر برس کا بوڑھا شخص تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ سراغ رساں براؤنی نے اسے اپنا بیج دکھایا اور اسے وہ سب دہرانے کے لیے کہا جو اس نے مجھے فون پر بتایا تھا۔ جب وہ پوری بات بتا چکا تو سراغ رساں براؤنی نے پوچھا۔ "کیا تم اس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہو جس نے وہ کتابیں خریدی تھیں؟"

"وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا اور قد میں لمبا تھا۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی اور دھوپ کا چشمہ بھی لگا یا ہوا تھا۔ ویسے میں لوگوں کو زیادہ غور سے نہیں دیکھا کرتا۔"

"کیا تمہارے اسٹور میں کیمرے نصب ہیں؟"

"نہیں، اس بلڈنگ کے منیجر کا کہنا ہے کہ وہ اس ماہ کے آخر تک کیمرے لگوا دے گا لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں۔" سراغ رساں براؤنی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم وہاں سے چلے آئے۔ ایلس کی میز پر کاغذات کا پلندا رکھا ہوا تھا وہ بولا۔

"یہ ٹیلر کی فون کال کا ریکارڈ ہے۔ اس نے اتوار کے دن کسی دکان پر فون نہیں کیا۔"

"ممکن ہے کہ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا فون استعمال کیا ہو؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

ایلس نے کلارا سے کہا۔ "جم سے پوچھو کہ کیا ہم اس کا فون ریکارڈ چیک کر سکتے ہیں؟"

"کیا جم یہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ بری طرح ٹوٹ چکا ہے۔" پھر میں نے اس سے اسمتھن کے وکیل کے بارے میں پوچھا تو ایلس نے بتایا کہ وہ راستے میں ہے۔ اتنی دیر میں کلارا بھی آگئی۔ اس نے کہا۔

"جم کا کہنا ہے کہ اس کے فون کا ریکارڈ چیک کرلیا جائے، اس کے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ٹیلر اکثر اس کا فون استعمال کرتی تھی۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اتوار والے دن ایلیٹ کی دکان پر نہیں گیا تھا۔"

"اس سے پوچھو کہ کیا ٹیلر نے ڈرسو کی ڈپلیکیٹ چابی بنوا رکھی تھی؟" ایلس نے کلارا سے کہا۔

کلارا کے جانے کے بعد میں نے ایلس سے کہا۔ "اگر ٹیلر نے کتابیں تبدیل کی تھیں تو اصلی کتابیں کہاں گئیں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ انہیں فروخت کرتی۔ کیا تم نے اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی؟"

"ہاں، وہاں کوئی کتاب نہیں تھی۔"

"تمہارے پاس وہ کتابیں ہیں جو میک کی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔"

"وہ کتابیں تو لیبارٹری میں ہیں لیکن میں نے ان کی تصویریں اتار لی تھیں۔" یہ کہہ کر اس نے مانیٹر میری طرف گھمایا اور کمپیوٹر کے کی بورڈ سے کھیلنے لگا۔ جیسا کہ توقع تھی، وہ ان کتابوں کا پہلا ایڈیشن نہیں تھے۔ جن میں سے دو کتابوں کو تبدیل کیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ٹیلر نے تیسری کتاب کیوں نہیں تبدیل کی؟"

"اس کا جواب میک دے سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کتاب ان کے ذخیرے میں پہلے سے موجود ہوگی۔"

ایک اور تصویر میرے سامنے آئی۔ میں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ چارلوٹ ویب کا پہلا ایڈیشن ہے تب بھی اس کی قیمت ہزار ڈالر کے لگ بھگ ہوگی لیکن سورسیرر اسٹون، کا یہ برطانوی ایڈیشن ہے اور اس کی مالیت پچہتر ہزار بلکہ ایک لاکھ ڈالر بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی پانچ سو کاپیاں شائع ہوئی تھیں۔ جن میں سے تین سو لائبریریوں کو بھیج دی گئیں اور مارکیٹ میں یہ صرف دو سو کاپیاں دستیاب تھیں جن میں سے اب شاید چند درجن ہی موجود ہوں گی۔"

ایلس ہلکے سے سیٹی بجاتے ہوئے بولا۔ "ایک لاکھ ڈالر۔ اس کے لیے تو کسی کا قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔"

ایتھن کا وکیل فرینک ایوڈ آ گیا تھا۔ اس نے ایلس سے کہا۔ ''ایتھن تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس راز کو افشا کر دینے سے ٹیلر کے قاتل کو پکڑنے میں مدد مل سکتی ہے اور ویسے بھی اسے چھپانا اس لیے ضروری نہیں رہا کہ ٹیلر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

اس نے ایتھن کی طرف دیکھا اور اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''ٹیلر نے اتوار کی صبح مجھے فون کر کے گون وتھ داونڈ اور ہیری پورٹر اینڈ سورسیرر اسٹون، کی ایک ایک کاپی کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اس سے معذرت کی تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں۔''

''کیا اس نے یہ بتایا تھا کہ اسے یہ کتابیں کیوں چاہئیں؟'' ایلس نے پوچھا۔

''اس کا کہنا تھا کہ اسے یہ دونوں کتابیں پسند ہیں اور اسے اپنے لیے ایک ایک کاپی چاہیے۔''

''کیا تم نے اس سے دوبارہ بات کی تھی؟''

''نہیں۔''

''کیا تم نے ڈپلیکیٹ چابی بنوانے میں اس کی مدد کی تھی؟''

''نہیں، لیکن اگر وہ کہتی تو میں ضرور کرتا۔ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسی لیے میں اتوار والے روز چھ بجے اسے بتانے گیا کہ میں اس کی مطلوبہ کتابیں لینے جا رہا ہوں۔''

''کیا تم اس سے پہلے بھی اس کے گھر جا چکے تھے؟''

''ہاں، دو مرتبہ۔ گزشتہ مہینے میں نے گھر دیکھنے کے لیے اس کا پیچھا کیا تھا اور پچھلے ہفتے جب وہ بیماری کی وجہ سے کام پر نہیں آئی تو اس کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا۔''

''ہفتے کی شام بھی تم ... ... جو ... لے کر آئے تھے؟'' میں نے کہا۔ ''پہلے میں سمجھی کہ اس ڈبے میں آئسکریم تھی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک کتاب ہی تھی۔''

''ہاں، میرا خیال تھا کہ وہ اسے پسند کرے گی لیکن وہ مجھ پر غصہ ہونے لگی۔'' یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایلس مجھے، ایتھن اور اس کے وکیل کو لے کر باہر آ گیا۔ جونہی ہم لابی کی جانب مڑے، میں نے دیکھا کہ سراغ رساں براؤنی اور جم مرکزی دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ ایتھن کو دیکھتے ہی جم اس کی جانب لپکا اور اسے کھینچتا ہوا دور تک لے گیا۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''تم نے اسے قتل کیا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار مکا ایتھن کے کندھے پر مارا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ جم دوسرا وار کرتا، ایلس اور براؤنی نے اس کے بازو پکڑ لیے اور اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر ایلس نے ایتھن اور اس کے وکیل کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ کیا اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا کہ وہ مجھ سے رابطے میں رہے گا۔

ایلس کے جانے کے بعد میں اپنی کار کے ساتھ کھڑی گہری گہری سانسیں لیتی رہی۔ میں نے جم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس نے ایتھن پر حملہ کیوں کیا۔ اس پر ٹیلر کے قتل کا الزام کیوں عائد کیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے ایتھن کو ٹیلر کے گھر کے گرد چکر لگاتے دیکھ لیا ہو اور اسے منع کیا ہو کہ وہ ایتھن سے میل جول نہ رکھے لیکن ٹیلر نے جم کی بات نہ سنی ہو اور جب جم نے دیکھا کہ کام کے بہانے ٹیلر کا جھکاؤ ایتھن کی طرف ہو رہا ہے تو اس نے جوش رقابت میں اسے قتل کر دیا ہو۔

اسی وقت اسمتھ کا فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس میرے لیے ایک خبر ہے۔ میں نے اسے قریبی ریستوران میں بیٹھنے کے لیے کہا جو پولیس اسٹیشن سے نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے پہلا سوال پولیس اسٹیشن کے بارے میں کیا تو میں نے اسے وہاں ہونے والی کارروائی کے علاوہ یہ بھی بتا دیا کہ وہ تین کتابیں تبدیل کی گئی تھیں اور میری نظر میں ٹیلر نے اصل ایڈیشن ادھر ادھر کر دیے تھے پھر میں نے اس خبر کے بارے میں پوچھا جسے بتانے کے لیے وہ بے چین ہو رہا تھا۔

اس نے گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ ''میری

بیوا پھیوی

استاد صاحب: ''بڑے نالائق ہو تم سے تو کچھ بھی نہیں یاد ہو گا۔ جب میں تمہارے جتنا تھا تو مجھے امریکا کے تمام صدور کے نام اور سن فر فر یاد تھے۔''

شاگرد: ''مگر سر، اس وقت تک تو صرف تین، چار صدور ہی گزرے ہوں گے؟''

ثمینہ یاسمین جعفری، جھنگ

کا کہنا ہے کہ وہ ساڑھے سات بجے دکان سے چلی گئی تھی۔ راستے میں وہ بینک پر رکی۔ اپنے سیف ڈپازٹ باکس تک گئی اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد گھر چلی گئی لیکن کسی نے اسے آتے جاتے نہیں دیکھا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسے پڑھنے کے بعد بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اس روز کتابوں کے میلے میں میک کے اسٹال پر کتنی سیل ہوئی تھی، تقریباً ایک لاکھ ڈالر اور یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ میری وہی رقم ڈپازٹ باکس میں رکھنے گئی ہو لیکن اس نے وہ پیسے اکاؤنٹ میں کیوں نہیں جمع کروائے؟''

''ٹیکس سے بچنے کے لیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کے تھوڑی دیر بعد میک وہاں گیا اور اس نے وہ رقم نکال لی۔''

''ممکن ہے کہ وہ وہاں مزید رقم رکھنے گیا ہو۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میک صبح سات اور نو بجے کے درمیان کہاں تھا؟''

''سات سے آٹھ بجے تک وہ جم میں تھا۔ سوا آٹھ بجے وہ ڈونٹ شاپ پہنچا لیکن اس روز اس نے تمام چیزیں ایک کے بجائے دو کی مقدار میں لیں۔ مثلاً کافی، جوس اور سینڈوچ وغیرہ۔ شاید اسے میری سے ملنا تھا۔''

''ممکن ہے کہ اس نے ٹیلر کے لیے یہ چیزیں لی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اور یہ دیکھ کر میری حسد میں مبتلا ہوگئی۔ کیونکہ وہ گھر جانے کے بجائے واپس دکان پر آگئی تھی۔ وہاں اس کا جھگڑا ہوا اور میری نے ٹیلر کو مار ڈالا۔''

''اگر ایسا ہے تو میک اسے بچانے کی کوشش کرے گا۔ کیا جم جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرسکتا ہے؟''

''نہیں، اس کا کہنا کہ وہ اس وقت سو رہا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق اس نے ٹیلر کو دکان کی ڈپلیکیٹ چابی بنوا کردی تھی۔''

''اگر وہ اسے چابی بنوا کر دے سکتا ہے تو کتابیں بدلنے میں بھی اس کی مدد کی ہوگی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

ایک گھنٹے بعد میک میرے دفتر آیا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں صبح اس کی دکان پر آگئی۔ یقیناً میں معاہدے پر دستخط کروانے آئی تھی اور وہ اسی لیے یہاں آیا ہے۔

میں نے اپنے بیگ میں سے معاہدہ نکال کر اس کے آگے رکھ دیا۔ وہ دستخط کرنے کے بعد بولا۔ ''گزشتہ دو سال سے کاروباری صورتِ حال ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میری اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے وائنڈ اپ کردیں۔''

''نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے چند سال پہلے ایک کلاتھ کمپنی خریدی تھی۔ امید ہے کہ تم میرے اثاثے بھی خرید لوگی۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم کیا کرو گے؟''

''فی الحال آرام کرنے کا ارادہ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بڑا لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس میں دکان کی چابی اور ایک خط ہے جس میں تمہیں اختیار دیا گیا ہے کہ میرے اثاثوں کی مالیت کا تخمینہ لگاؤ اور ان اخراجات کے لیے دس ہزار ڈالر بھی تھا۔''

''تم بہت تیزی دکھا رہے ہو میک۔ میں یہ چابیاں اور رقم نہیں لے سکتی جب تک کوئی فیصلہ نہ کرلوں۔ کیا تم مجھے اپنی مالی پوزیشن کی تفصیل فراہم کرسکتے ہو؟''

''فی الحال تو میں دکان میں نہیں جا سکتا اور نہ ہی پولیس اس بارے میں کچھ بتا رہی ہے۔ مجھے ٹیلر کے مرنے کا افسوس ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔''

''واقعی۔ لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ تمہارے یہاں چوری کررہی تھی۔''

''ہاں، سنا تو میں نے بھی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''تم میری سے کاروباری کوئی بات نہ کرنا۔ وہ اس وقت کافی ڈسٹرب ہے۔''

اس کے جانے کے بعد میں اپنے ذاتی کمرے میں گئی اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر تصویروں والا فولڈر کھولا۔ اس میں سے چند تصویریں منتخب کرکے ان کے پرنٹ نکالے اور کار میں بیٹھ کر ایلیٹ اسٹور کی جانب روانہ ہوگئی۔ میں نے تصویروں والا لفافہ اس کے سامنے رکھا اور بولی۔ ''ان تصویروں کو غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اتوار والے دن تمہاری دکان سے کتابیں لے جانے والا شخص کون تھا۔''

اس نے تصویریں دیکھنا شروع کیں اور بولا۔ ''ان لوگوں کے سر پر ٹوپی اور چہرے پر دھوپ کا چشمہ بھی ہوتا تو مجھے پہچاننے میں آسانی ہوتی۔'' پھر وہ ایک تصویر پر انگلی

دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہی ہے۔''

''تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟''

''کیوں؟ کیا مجھے کسی قاتل کو ڈھونڈنا ہے؟''

اس کے بعد میں وہاں نہیں رکی اور سیدھی پولیس اسٹیشن پہنچی۔ میں نے ایلس کو اب تک ہونے والی پیش رفت کے بارے میں بتایا۔ اس نے غور سے میری بات سنی۔ تصویروں والا لفافہ دیکھا اور بولا۔ ''اس بار تم نے زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

''نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں صرف جاننا چاہتی ہوں کہ ٹیلر کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ میں چاہوں گی کہ میک کے سفری تھیلے کی تلاشی لی جائے۔''

اس نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''کیا؟''

''جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کسی سے فون پر بات کی۔ اس شخص کا نام ڈکس تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ بولا۔ ''انہیں وہ تھیلا میک کی میز کے نیچے سے ملا تھا اور اب وہ اسے لے کر یہاں آرہے ہیں۔ ابھی تک کسی نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ اس میں ایسی کیا چیز ہوسکتی ہے؟''

''تین قیمتی کتابیں اور کوئی ایسی چیز جو قتل کا محرک ہو۔''

کچھ دیر بعد میں پولیس آفیسر میڈ کے ساتھ آبزرویشن روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شیشے کی دوسری جانب ایلس، میک کا انٹرویو کر رہا تھا۔ میرا کام یہ تھا کہ اگر میک جھوٹ بولے یا میرے ذہن میں کوئی سوال آئے تو ایلس کو ٹیکسٹ میسج کردوں۔

''جانتے ہو، تمہیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟'' ایلس نے کہا۔ ''وہ نایاب کتابیں تمہارے سفری تھیلے سے ملی ہیں۔''

''پھر؟'' میک نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ کہ تم چور ہو اور ٹیلر کا ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔''

''وہ یقیناً چور تھی۔ جو کچھ تم بتا رہے ہو اگر وہ صحیح ہے تو یہ اور بھی بُری بات ہے۔ اس نے صرف کتابیں ہی نہیں چرائیں بلکہ میرے پسندیدہ سفری بیگ پر بھی اس کی نظر تھی۔''

''تمہاری شناخت ہوگئی ہے۔ تم نے ہی پرانی کتابوں کی دکان سے ان قیمتی کتابوں کے سستے ایڈیشن خریدے تھے۔''

''تمہیں غلط اطلاع دی گئی ہے۔'' میک نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''کل سہ پہر تم کہاں تھے؟''

''اپنی بیوی کے ساتھ۔''

''تم نے اپنے سیفٹی ڈپازٹ باکس سے ایک لاکھ سے زیادہ ڈالر کیوں نکالے؟''

''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا پیسا ہے جو جائز طریقے سے حاصل کیا گیا۔''

''اس تھیلے سے تمہارا پاسپورٹ اور جکارتہ کے لیے یک طرفہ فضائی ٹکٹ بھی ملا ہے۔''

''ہاں، میں کچھ وقت جزیرہ بالی میں گزارنا چاہ رہا ہوں۔ میں نے وہاں کی خوب صورتی کی بہت تعریف سنی ہے۔''

''تم بیوی کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' ایلس نے پوچھا۔

''تمہیں میرے ازدواجی معاملات سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

میں نے ایلس کو پیغام بھیجا۔ ''بیوی کے پیسے سے ہی اس کا کاروبار چل رہا ہے۔''

''جب میری کو معلوم ہوگا کہ تم نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟''

''تم مجھ سے کیا سننا چاہتے ہو۔ یہی کہ میں ایک ایسے ملک جا رہا ہوں جہاں میری کے وکیل میرے اثاثوں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ تم اس حوالے سے مجھے مجرم ٹھہرا سکتے ہو۔ جب میری کو معلوم ہوا کہ میں اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں تو وہ یہی سمجھی کہ اس کی وجہ ٹیلر ہے اور اگر وہ اسے راستے سے ہٹا دے تو ہمارے درمیان سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا چنانچہ اس نے ٹیلر کو قتل کر دیا۔''

''تم نے وہ کتابیں کیوں تبدیل کیں جو ٹیلر نے خریدی تھیں؟'' ایلس نے پوچھا۔

''میں نے نہیں، وہ کتابیں ٹیلر نے تبدیل کی تھیں۔ وہ چور تھی۔ آج صبح جب وہ دکان پر آئی تو اس نے ڈپلیکیٹ چابی سے دکان کھولی اور وہ کتابیں تبدیل کردیں۔ میری جب دکان پر آئی تو اس نے اسے یہی بتایا کہ میں نے اسے یہ کتابیں گھر لے جانے اور ان پر ریسرچ کرنے کے لیے کہا تھا۔ میری کو ان کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس نے ٹیلر سے یہ ضرور پوچھا کہ میں نے اسے ڈپلیکیٹ چابی کب دی تھی تو اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ گزشتہ ہفتے۔ میری کا دوسرا سوال تھا کہ میں نے اسے کتابیں گھر لے جانے کے لیے کب کہا تھا تو ٹیلر نے کہا کہ یہ بات میں نے اس سے ہفتے کی رات کہی تھی۔ اس طرح گویا اس نے میری کے زخموں پر نمک چھڑک دیا اور وہ یہی سمجھی

کہ اس نے میری چوری پکڑلی ہے۔"

"تم جب دکان پہنچے تو ٹیلر کو مردہ حالت میں پایا؟"

"میں جانتا تھا کہ کیا ہوا ہوگا۔ میری بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتادیا اور وہ توقع کررہی تھی کہ میں اس کی مدد کروں۔ میں نے اسے موقع واردات سے ہٹانے کے لیے بینک بھیج دیا۔ میں جانتا تھا کہ جو رقم وہ سیف ڈپازٹ میں رکھے گی، وہ میں بہ آسانی نکال سکتا ہوں۔ پھر میں نے وہ نایاب کتابیں بینک میں رکھیں اور تمہیں فون کردیا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ بعد میں اس بیگ تک میری رسائی نہیں ہوگی تو میں تمہیں فون کرنے سے پہلے اسے گھر چھوڑ آتا۔ اس ایک غلطی کی وجہ سے میں یہاں پھنسا ہوا ہوں اور خدا جانے کب تک یہاں بیٹھنا پڑے گا۔"

ایلس نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور اس کے چند منٹ بعد فون کرکے میری کو پولیس اسٹیشن بلالیا۔

"میں نے ابھی ابھی میک سے تفصیلی طور پر بات کی ہے۔" ایلس نے نرم لہجے میں کہا اور اب میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ بتادو۔ کیا تم نے ہی ٹیلر کو قتل کیا ہے؟"

"ہاں۔"

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بیان ریکارڈ ہورہا ہے پھر اس نے اتنی جلدی اعتراف کیسے کرلیا۔ میری نے وضاحت سے بتایا کہ اس کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہورہا تھا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ میک کو اس سے دور کرنے والی ٹیلر ہی ہے تو اس نے اسے راستے سے ہٹادیا۔

ایلس اس سے معذرت کرکے آبزرویشن روم میں آیا اور بولا۔ "کیا تم اس عورت کی بات پر یقین کرسکتی ہو؟"

میں نے ایلس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنا بیان بدل دے گی جب اسے معلوم ہوگا کہ میک نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے۔"

ایلس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور سراغ رساں براؤنی کو بھی بلالیا پھر اس نے میری سے کہا۔ "میں تمہیں میک کا ریکارڈ شدہ بیان دکھانا چاہتا ہوں۔ اس نے جو کچھ کہا، وہ یقیناً تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی اسکرین روشن ہوگئی۔ میری پوری توجہ سے اس جانب دیکھ رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ اس کی حالت غیر ہورہی تھی۔ بالآخر اس سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ چلاتے ہوئے بولی۔ "رک جاؤ... میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔"

ایلس نے اشارہ کیا اور اسکرین تاریک ہوگیا۔ پھر وہ میری سے بولا۔ "کیا تم ہمیں سچ بتانا پسند کروگی؟"

میری اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔"

دو دن بعد میں اور اسمتھ اپنے پسندیدہ ریستوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسمتھ نے کہا۔ "میک کے نامی گرامی وکیل کا کہنا ہے کہ میری جھوٹ بول رہی ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ میک نے ہی ٹیلر کو قتل کیا ہے؟"

"ہاں، منطقی طور پر تو یہی لگتا ہے۔ میری کا کہنا ہے کہ میک نے ٹیلر کے ہاتھ میں وہ نایاب کتابیں دیکھیں تو سمجھ گیا کہ وہ انہیں چرا رہی ہے جبکہ خود اس کا بھی یہی ارادہ تھا کہ وہ ان کتابوں کو وہاں سے ہٹا کر ان کی جگہ متبادل ایڈیشن رکھ دے۔ اس نے ٹیلر کو پیشکش کی کہ اگر وہ اس کی خلوتوں کی ساتھی بن جائے تو وہ یہ کتابیں اسے تحفتاً دے سکتا ہے۔ ٹیلر نے اس کی پیشکش حقارت سے ٹھکرادی جس پر میک غصے سے بھڑک اٹھا اور اس نے ٹیلر کا گلا گھونٹ دیا۔ پھر اس نے میری کو اس پر رضامند کرلیا کہ وہ یہ جرم اپنے سر لے لے کیونکہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس جیسا مرتبہ اور شہرت رکھنے والی عورت پر فرد جرم عائد کی جاسکے جو کہ آدھے روکی پوائنٹ کی مالک ہے اور وہ ایک سے ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کرسکتی ہے پھر یہ کہ اس احسان کے بدلے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہوجائے گا۔"

"اور وہ اس کی باتوں میں آگئی؟" اسمتھ نے پوچھا۔

"ہاں جس طرح مچھلی کانٹے میں پھنس جاتی ہے۔"

"عورتیں ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔"

"بات بے وقوفی کی نہیں بلکہ بھروسے کی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں کوئی ایسا شخص مل جائے جس پر بھروسا کیا جاسکے تو اپنی قسمت پر ناز کرو اور ساری عمر شکر ادا کرتے رہو۔"

"جیسے میں تم پر بھروسا کرتا ہوں۔" وہ جذباتی انداز میں بولا۔

میری آنکھوں میں غیر متوقع طور پر آنسو آگئے۔ اس کے الفاظ میرے دل پر جاکر لگے تھے۔ میں نے بوجھل آواز میں کہا۔

"میں بھی تم پر بھروسا کرتی ہوں۔ تم مجھے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز ہو۔"

آپ ہی بتائیں کہ ایک شادی شدہ عورت جواب میں کیا کہہ سکتی تھی؟

وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔

ماہا نام تھا اُس کا۔ اس کا چہرہ واقعی ماہ نور تھا۔ اس کی زلفیں اس کے خوب صورت شانوں پر گھٹاؤں کی طرح جھولا کرتی تھیں۔ اس کی چال میں ایک خاص قسم کی تمکنت اور دلکشی تھی۔ اس کے سفید چھوٹے دانت موتیوں کی طرح دمکتے تھے۔

اور اس کی آنکھیں... اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ کچھ بھی نہیں تھا ان آنکھوں میں۔ سوائے ویرانی اور اندھیروں کے۔

ویسے ان آنکھوں کی بناوٹ بہت خوب صورت تھی۔ لمبی لمبی پلکیں اور آنکھوں کے اوپر خوب صورت گھنی بھویں۔ لیکن وہ بے نور تھیں۔ وہ آنکھیں کسی کو دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ نہ تو زندگی کے رنگ اور نہ ہی کسی کے خدوخال۔

یہ سب کچھ شروع سے ایسا نہیں تھا۔ گیارہ برس کی عمر تک اس کے لیے سب کچھ تھا۔ یہ دنیا روشن تھی۔ زندگی کے سارے رنگ اس کی نگاہوں میں تھے۔ وہ سب چہروں سے آشنا تھی پھر یہ ہوا کہ اس کی بینائی کم ہوتی چلی گئی اور ایک دن

اپنے انداز میں دنیا دیکھنے والی ایک نازک اندام دوشیزہ کی دل ربا کہانی...

بے تابی... تمنا کرنے والوں کو اکثر بے قابو کر دیتی ہے... اور مسلسل ملاقاتیں... قربتوں کو بڑھا دیتی ہیں... وہ افسردہ تھی... تنہا تھی... اچانک ہی اس کی بے ساتھار اور ویران زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی... اور وقت و حالات کے حسین امتزاج نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا... ہجر و وصل کے لمحات اور کشمکش کی یقین و بے یقین کیفیات...

آنکھیں

منظر امام

اس کی دنیا تاریک ہوگئی، بالکل تاریک۔

اس کے والدین کے لیے اس کا یوں نابینا ہو جانا ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے اس کے علاج میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔ اس کے باوجود کچھ نہیں ہو سکا۔

رفتہ رفتہ اسے تقدیر کے اس جبر کو قبول کرنا پڑا۔ کیونکہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ روشنی جب ایک بار ساتھ چھوڑ جائے تو پھر اس کی واپسی بہت مشکل ہوتی ہے۔

اب وہ گیارہ برس کی نہیں تھی بلکہ اٹھارہ انیس برس کی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں تو سو چکی تھیں لیکن اس کے جذبے بیدار ہو گئے تھے۔

وہ سارے جذبے جو اندر ہی اندر اسے گدگدایا کرتے تھے اور کسی لڑکی کو احساس دلاتے کہ دیکھو یہ دنیا تمہارے لیے کتنی حسین ہو سکتی ہے اگر کوئی تمہارا ساتھ دے جائے تو... لیکن کون؟ ایک نابینا لڑکی کے لیے کون ہو سکتا ہے؟

کوئی بھی نہیں۔ ہر طرف سناٹا تھا اور اس سناٹے میں ایک آواز، موبائل کی آواز... بہت دیر سے گھنٹی بج رہی تھی۔

والدین نے اس کی تنہائی کے احساس کو کم کرنے کے لیے اسے ایک سیل فون دلوا دیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

اس کی دوست اس زمانے کی تھیں جب وہ دنیا کو دیکھ سکتی تھی۔ ان دوستوں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے پاس آتی رہتیں اور اس کا حوصلہ بڑھاتی رہتیں۔

لیکن اس رات جس کا فون آیا، وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ اندازے سے نمبر ریسیو بھی کر لیتی تھی اور نمبرز ملا بھی لیتی تھی۔

اس نے فون ریسیو کیا تو دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز آئی۔ بہت شائستہ، بہت مہذب سی آواز۔ وہ آواز اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ وہ بہت ہی مہذب انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

"معاف کیجیے گا آپ کو زحمت دی۔ آپ ماہا بول رہی ہیں؟"

"جی، میں ماہا بول رہی ہوں لیکن آپ کون ہیں؟"

"میرا نام ذیشان ہے۔" اس نے بتایا۔

"آپ کو میرا نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"تلاش سچی ہو تو سب کچھ مل جاتا ہے۔" اس نے کہا۔ "کسی کا نمبر ملنا تو بہت عام سی بات ہے۔"

"خیر، جو بھی ہو، یہ بتائیں آپ مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بس یونہی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ سے باتیں کرتا رہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ کا لہجہ بہت اچھا ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کی آواز میں بہت مٹھاس ہے۔"

وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کیسی ہوں، کیا ہوں؟"

"بہت اچھی طرح۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں..."

"جانتا ہوں میں۔" اس نے بات کاٹ دی۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ دیکھ نہیں سکتیں۔"

"کیا؟" اب وہ بوکھلا سی گئی۔ "کیا آپ یہ جانتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں۔ کیونکہ میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "پچاس دفعہ آپ کو گھر والوں کے ساتھ آتے جاتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔"

"کمال ہے اس کے باوجود آپ مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کے وجود کی آنکھیں تو روشن ہیں نا، آپ محسوس تو کر سکتی ہیں اور اس دور میں جس کے پاس احساس کی دولت اور قوت ہو، وہ نابینا نہیں ہوتا۔ نابینا تو ہم جیسے آنکھوں والے ہوتے ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ شاید زندگی میں پہلی بار اپنے گھر والوں کے علاوہ کوئی اور اپنا اپنا سا محسوس ہوا تھا۔ اس نے ایسی باتیں کی تھیں جیسے کوئی زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو۔

کتنی اپنائیت تھی اس کی باتوں میں۔ کتنا سکون تھا، کتنا پیار تھا۔ کیسا تھا وہ؟ کیا کرتا ہوگا؟ کتنے سوالات ذہن میں مچلنے لگے۔

کچھ بھی ہو... ماہا کی وہ رات بہت اچھی گزری تھی۔ ایک سکون سا مل گیا تھا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ وہ روزانہ رات گیارہ بجے فون کیا کرے گا۔

وہ دن اس کے لیے بہت خوش گوار سا تھا۔ اس دن وہ گھر والوں کے ساتھ بہت دیر تک ہنستی بولتی رہی۔

دوسری رات وعدے کے مطابق پھر فون آ گیا۔ اس رات اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی عدنان ہے اور اس کی دو بہنیں بھی ہیں۔ وہ سب تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ وہ اکنامکس میں ماسٹر کر رہا ہے۔ لیکن اسے لٹریچر بہت پسند ہے۔ اس کا ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔

اس نے بہت سے اچھے شعر سنا دیے۔

ماہا کے پاس سنانے کے لیے کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ گیارہ برسوں تک اس کے سامنے دنیا روشن تھی۔ سب کچھ نگاہوں کے سامنے تھا پھر اس کے بعد اندھیرے کی دیوار سامنے آگئی اور اس دیوار کے آجانے کے بعد سوائے اندھیروں کے اور کچھ بھی نہیں رہا۔

"اور اب میں ہر طرح تنہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"میرے وجود میں صرف اندھیرے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے کہ میں تمہارے وجود کے اندھیروں کو روشنی میں بدل دوں گا۔"

"اوخدایا۔" ماہا کانپ کر رہ گئی۔ "ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت تھی۔ اس نے اپنی دوستوں سے محبتوں کے حوالے سے بہت کچھ سنا تھا۔ وہ بتاتی تھیں کہ جب یہ کسی کو حاصل ہو جائے تو اس کے وجود میں کتنی انرجی آجاتی ہے، اس کا وجود کس طرح پرواز کرنے لگتا ہے۔

اس کی اڑان آسمان سے کم نہیں ہوتی۔ اونچی، اور اونچی اور اونچی۔

"ذیشان۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "تم ایک ایسی لڑکی کو خواب دکھا رہے ہو جو خواب دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔"

"فکر مت کرو۔ تم میری آنکھیں ہو۔" اس نے کہا۔

"تم میری آنکھوں سے دنیا کو دیکھا کرنا۔"

ماہا کے گھر میں اس کی بھابی تھی عالیہ۔ ماں باپ کے بعد ماہا کو سب سے زیادہ پیار اس کی بھابی نے دیا تھا۔ وہ ماہا کی دوست بھی تھی۔ ماہا اس سے اپنے دکھ سکھ شیئر کیا کرتی تھی۔

سب سے پہلے اسی نے ماہا کے اندر جنم لیتی ہوئی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ "کیا بات ہے میری بنو۔" اس نے پوچھا۔ "خدا تمہیں نظر بد سے بچائے، میں تم میں ایک بہت خوش گوار تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔"

"ہاں بھابی، شاید میری زندگی بدلنے لگی ہے۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گی کس نے تمہاری دنیا بدل دی؟"

"میں نہیں جانتی اس کو۔ میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔" وہ پھر افسردہ ہو گئی۔ "میرا مطلب ہے میں اسے دیکھ بھی کیسے سکتی ہوں۔"

"یہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ کون ہے وہ۔ تمہاری زندگی میں کیسے شامل ہو گیا؟"

ماہا نے اسے بتا دیا کہ کس طرح ذیشان نام کے کسی نوجوان کا فون آیا کرتا ہے اور وہ کس طرح کی باتیں کیا کرتا ہے۔ اس کی باتوں نے ماہا کو کس طرح زندہ رہنے کے حوصلے دیے تھے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" عالیہ خوش ہو گئی۔ "میری بنو! محبت بہت طاقتور جذبہ ہوا کرتا ہے۔ میں خود تمہاری اداسی دیکھ کر ہر وقت افسوس کیا کرتی تھی اور اب تمہارے چہرے پر بہار کے رنگ دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔"

"لیکن بھابی یہ تو دیکھو کہ میں کیسی ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ یہ بات جانتا ہے نا۔" عالیہ نے کہا۔

"اس سے تمہاری یہ بات چھپی ہوئی تو نہیں ہے نا، بس میری جان یہ زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اور خوشیوں کے لمحے اور بھی مختصر ہوتے ہیں۔ اگر مل جائیں تو ان کو سینے سے لگا لینا چاہیے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے۔ روز روز ایسا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر تم بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں، بس اس سے پیار بھری باتیں کرتی رہو۔" عالیہ نے کہا۔ "اس کو بھی احساس دلا دو کہ تم اس کی قدر کرنے لگی ہو۔ تمہیں اس کا احساس ہے۔ دیکھو اس کے بعد کیا راستہ نکلتا ہے؟"

اس رات ذیشان نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

"ذیشان! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ اس کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔ "خود سوچو، میں تم سے کیسے مل سکتی ہوں۔ میں تو اپنے گھر سے باہر بھی نہیں جا سکتی۔"

"میں تمہاری آنکھیں بن کر تمہارے ساتھ رہوں گا۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیسے؟ میں ایک نابینا لڑکی ہوں۔" ماہا نے کہا۔ "کون مجھے جانے کی اجازت دے گا؟"

"میں نے دیکھا ہے کہ تم کاشان سپر اسٹور تک آجاتی ہو۔"

"ہاں، کیونکہ وہاں تک کا راستہ میرے ذہن میں نقش ہے۔ میں بچپن میں بھی وہاں جایا کرتی تھی۔" ماہا نے کہا۔ "اس کے علاوہ اس اسٹور کے لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں جیسے ہی پہنچتی ہوں۔ فوراً میری مدد کے لیے آجاتے ہیں۔ مجھے جو کچھ لینا ہوتا ہے، وہ میں ایک چٹ پر لکھ کر ان کو تھما دیتی ہوں اور اپنی چیزیں لے کر گھر واپس آجاتی ہوں۔ میرے پاؤں ان راستوں سے واقف ہیں۔ اس سے آگے تو میرے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"میں یہ سب جانتا ہوں۔" ذیشان نے کہا۔ "تم جب

اسٹور پر پہنچو گی تو وہاں سے میں تمہارے ساتھ ہولوں گا۔"

"میرے خدا! یہ سب کیسے ہوگا؟"

"سب ہو سکتا ہے۔ اگر تم مجھ پر بھروسا کرو تو۔ اصل بات بھروسے کی ہے۔ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ تم ایک نابینا لڑکی ہو اور میں تمہیں اپنے ساتھ جانے کہاں لے جاؤں۔"

"نہیں ذیشان نہیں، ایسا نہیں سوچو۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "میں اپنی بھابی سے بات کرلوں۔ وہی میری رازدار ہیں۔ میں ان سے کچھ نہیں چھپاتی۔"

"او کے، تم ان سے بات کرلو۔"

ماہا نے جب عالیہ سے بات کی تو وہ بھی خوش ہوگئی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ تم ضرور جاؤ۔ ملو اس سے۔"

"لیکن بھابی، خدا جانے وہ کیسا ہو۔ فون پر باتیں کرنا کچھ اور ہوتا ہے اور یوں جا کر ملاقات کرلینا۔۔۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" عالیہ نے کہا۔ "زندگی میں اس قسم کے مرحلے آتے ہی ہیں۔ جب وہ سب کچھ جان لینے کے باوجود تمہاری طرف مائل ہے، تم سے محبت کرنے لگا ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ دھوکا نہیں دے گا اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو تمہاری انا کو ٹھیس پہنچائے۔"

"یعنی تم یہ چاہتی ہو کہ میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ اور تمہارے اطمینان کے لیے میں یہ بتا دوں کہ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔" عالیہ نے کہا۔

"وہ کس طرح؟"

"کچھ فاصلے پر۔" عالیہ نے بتایا۔ "یوں سمجھو کہ نگرانی کرتی رہوں گی۔ اگر مجھے کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی تو خود آجاؤں گی۔"

"چلیں اگر ایسا ہے تو میں اس سے مل لیتی ہوں۔"

"اور ہاں، اس سے پوچھ لینا کہ وہ کہاں لے جائے گا۔" عالیہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں کسی ریسٹورنٹ ہی میں لے جائے گا اور آس پاس صرف ایک ہی ہے جہاں تم دونوں بیٹھ سکو، وہ ہے زمین۔"

عالیہ کا خیال درست ثابت ہوا۔ ذیشان کا جب فون آیا تو اس نے ماہا کے پوچھنے پر زمین ہی بتایا تھا اور دوسری شام کو ملاقات کے لیے کہا تھا۔

عالیہ نے خود اس کا میک اپ کیا تھا۔ اس کے لیے کپڑے منتخب کیے تھے۔

"بھابی، کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔" ماہا نے کہا۔ "میں خود کو تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔"

"لیکن وہ تو تمہیں دیکھ سکتا ہے نا۔" عالیہ پیار سے بولی۔ "اور یہ سب تم اپنے لیے نہیں بلکہ اس کے لیے کررہی ہو جس نے تمہاری زندگی میں رنگ بکھیر دیے ہیں۔"

ماہا بہت ڈرتے ڈرتے سپر اسٹور پہنچی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اور سپر اسٹور کے گیٹ پر کسی نے بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "ماہا! یہ میں ہوں۔" وہی آواز، وہی دھیما اور ٹھہرا ہوا لہجہ، وہ اس کے بہت قریب تھا۔ ماہا کو اس وقت صرف یہ احساس تھا کہ وہ اب تک جس کی صرف آواز ہی سنتی رہی تھی، وہ اس کے قریب، بہت قریب ہے۔

"کیسی ہو ماہا؟" ذیشان کی آواز آئی۔ "تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"نہیں تو۔" اس نے بمشکل جواب دیا۔ "میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔"

"چلو، میں تمہارا ہاتھ تھام لیتا ہوں۔" ذیشان نے کہا۔

بالکل پہلا پہلا لمس، انجانے ہاتھ کا انجانا لیکن گرم جوش سا لمس۔ جس کی حرارت ماہا کی رگوں میں سرایت کرتی جارہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے کانپ کر رہ گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرالے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ وہ جیسے پگھلتی جارہی تھی۔ دھیرے دھیرے، اسے یہ احساس بھی ہورہا تھا کہ اس کی بھابی عالیہ کہیں آس پاس کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی ہوگی۔

وہ کانپتے قدموں کے ساتھ اس کے ہمراہ چلتی رہی۔

وحشت لے جائے یا کہ گھر لے جائے۔ تیری آواز جدھر لے جائے۔ وہ چل رہی تھی۔ وہ اسے بڑی نرمی اور احتیاط کے ساتھ آگے لے جارہا تھا۔

ریسٹورنٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ پانچ منٹ میں وہ وہاں پہنچ گئے لیکن ماہا کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں تک چلتی رہی ہو۔

ذیشان نے اسے بڑی اپنائیت کے ساتھ ایک طرف بٹھاتے ہوئے کہا۔ "اب ہم ریسٹورنٹ میں ہیں۔ بہت خوب صورت ماحول ہے یہاں کا۔"

"کاش میں بھی دیکھ سکتی؟"

"میں ہوں نا، تمہاری آنکھیں بن کر تمہارے ساتھ ہوں۔" ذیشان نے کہا۔ "خیر، یہ بتاؤ کیا لینا پسند کرو گی؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ریسٹورنٹ والے ہم دونوں کو دھکے دے کر یہاں سے نکال دیں گے۔" اس نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ تو لینا ہی ہوگا۔"

''چلیں کچھ بھی منگوا لیں۔''

ذیشان نے دو چار چیزوں کے آرڈرز دے دیے۔

''ہاں اب بتاؤ۔'' ذیشان نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''میرے لیے یہی بہت ہے کہ جب تمہاری آواز سنتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے مرجھائے ہوئے پودے کو زندگی مل گئی ہو۔ زندہ رہنے کی تحریک پیدا ہونے لگی ہے۔ اب تو صرف ایک ہی خواہش رہ گئی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہی کہ کاش میری آنکھیں ہوتیں۔''

''تاکہ دنیا کے رنگ دیکھ سکو۔'' ذیشان نے پوچھا۔

''دنیا کو دیکھنے سے زیادہ صرف تمہیں دیکھنے کی خواہش کی ہے۔''

''مجھے دیکھ کر کیا کرو گی۔ میں تو ایک بے ڈھنگا اور بدصورت سا آدمی ہوں۔ کالا رنگ ہے میرا۔ میرے چہرے پر زخم کا ایک بہت بڑا نشان ہے اور بھی بہت کچھ ہے۔ مجھے دیکھ کر تمہیں افسوس ہی ہوگا۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''وہ کیوں، یہ کیسے جان لیا تم نے؟''

''میں اپنے محسوسات کی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔'' ماہا نے کہا۔ ''تم اچھے خاصے ہو۔''

''شکریہ۔'' وہ ہنس پڑا۔

اس دوران میں ویٹر نے میز سجا دی تھی۔ کھانے کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی باتیں بہت خوب صورت تھیں۔ ماہا کو اتنے برسوں کی محرومیوں کے بعد اچانک ہی سب کچھ مل گیا تھا۔ اس سے باتیں کرتے وقت ماہا یہ بھول ہی گئی تھی کہ عالیہ بھی کہیں آس پاس ہی ہوگی۔

ذیشان نے بہ حفاظت اسے اس کے گھر تک پہنچا دیا تھا۔

عالیہ جب اس کے کمرے میں آئی تو وہ عالیہ سے لپٹ پڑی۔ ''بھابی! اس نے مجھ سے بہت ہی باتیں کی ہیں۔ وہ بہت اچھا ہے۔''

''ہاں ہاں، وہ واقعی بہت اچھا ہے۔'' عالیہ نے کہا۔ ''کیونکہ میں خود تم دونوں کو دیکھتی رہی تھی۔''

''لیکن بھابی۔'' ماہا اچانک اداس ہوگئی۔ ''یہ کہانی شروع تو ہوگئی ہے لیکن اس کا انجام کیا ہوگا؟''

''تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟''

''ناکامی اور مایوسی۔'' ماہا نے کہا۔ ''کوئی بھی شخص کسی ایسے فرد کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا جو اس کے لیے بوجھ بن جائے۔ کہانیوں اور قصوں کی بات کچھ اور ہوتی ہے لیکن زندگی کے حقائق کچھ اور ہوتے ہیں۔''

''اوہو، تم ابھی سے کیوں فکر کرتی ہو۔'' عالیہ نے کہا۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا اور میں سمجھتی ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو بھابی لیکن میں سب سمجھ سکتی ہوں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ شریکِ زندگی میں سے اگر کوئی معذور اور ناکارہ ہو تو دوسرے کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی محبت ہوا ہوجاتی ہے۔ وہ پھر محبت وجبت کی کوئی پروا نہیں کرتا۔''

ماہا کو ان سب باتوں کو احساس تھا۔ اس کے باوجود وہ کبھی کھل کر ذیشان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کے بعد بھی ذیشان کئی بار اسے اپنے ساتھ لے جاچکا تھا۔ ایک بار وہ اسے ساحلِ سمندر بھی لے گیا۔

''سنو ماہا! سمندر کی آواز کو ذرا غور سے سنو۔ کتنی سچی اور گہری آواز ہے اس کی۔''

''ہاں بہت سچی، بہت گہری، کسی بھی قسم کی منافقت اور ریاکاری سے پاک آواز ہے۔''

''اچھا چلو، یہ بتاؤ۔ مجھ سے ملنے کے بعد تم کیسا محسوس کرتی ہو؟'' ذیشان نے پوچھا۔

''بہت اچھا، جیسے کوئی بہت ہی پیارا، بہت ہی اپنا مل گیا ہو۔'' ماہا نے کہا۔ ''میں جیسے ایک محفوظ حصار میں ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔''

''ہاں ایسا ہی ہوگا۔'' ذیشان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اب تو میری ایک ہی خواہش ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہی آنکھیں مل جانے کی۔ تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔'' ماہا نے کہا۔ ''اس کو دیکھ سکوں جس نے میری تاریکی میں اجالے بھر دیے ہیں۔''

''او ہو تم تو شاعرانہ باتیں کرنے لگی ہو۔'' ذیشان ہنس پڑا۔

''پتا نہیں، اگر سچائی شاعری ہے تو پھر مجھے شاعرہ ہی سمجھو۔''

وہ بہت دیر تک بیٹھنے کے بعد واپس آ گئے۔

اس طرح روزانہ مقررہ وقت پر اس کا فون آجاتا اور ماہا کو محسوس ہوتا کہ اس نے وہ سب کچھ پالیا ہے جس کے وہ خواب دیکھتی آئی تھی۔

محبت مل جائے تو زندگی مل جاتی ہے۔ ماہا کو محبت مل گئی تھی۔ ایک دن اس کی بھابی عالیہ نے بتایا۔ "ماہا! تمہارے بے روشنی کی ایک کرن تو سامنے آئی ہے لیکن میں ابھی اس کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہوں اور تم بھی اس خبر کو سننے کے بعد زیادہ توقعات مت باندھ لینا۔ بس خدا پر چھوڑ دینا جو ہوگا بہتر ہی ہوگا۔"

"بتائیں تو سہی کیا خبر ہے۔"

"سری لنکا کے مشہور ڈاکٹر پریرا سانگا کراچی آئے ہوئے ہیں۔" عالیہ نے بتایا۔ "ہم لوگوں نے تمہارے لیے ان سے اپائنٹمنٹ لے لی ہے۔ اس وقت پورے ایشیا میں ان سے اچھا آنکھوں کا ڈاکٹر کوئی نہیں ہے۔"

ایک لمحے کے لیے ماہا کو ایسا لگا جیسے اس خبر کو سن کر اس کی دھڑکنیں رک گئی ہوں۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک بار پھر اس دنیا کو دیکھنے لگے۔

پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔ کبھی کبھی زیادہ توقعات زیادہ مایوسیاں دے جاتی ہیں۔

اس رات ذیشان کو اس نے یہ خبر سنا دی تھی۔ وہ بھی یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ "اگر ایسا ہو جائے تو مزہ آجائے۔" اس نے کہا۔ "جاؤ، ضرور جاؤ، میری ساری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"گھر والوں نے کل کا وقت لے لیا ہے۔" ماہا نے بتایا۔

"بہت اچھا ہے۔ یہ کام جتنی جلد ہو جائے اتنا بہتر ہے۔"

دوسرے دن ماہا کو ڈاکٹر پریرا کے پاس پہنچا دیا گیا۔ وہ بہت دیر تک اس کی آنکھوں کا معائنہ کرتا رہا۔ اس کی کیس ہسٹری دیکھی اور یہ اعلان کر دیا کہ ماہا کی آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں لیکن ٹرانس پلانٹ کے بعد۔

اگر کوئی اپنی آنکھیں ڈونیٹ کر دے تو آپریشن کر کے وہ آنکھیں ماہا کو لگائی جا سکتی ہیں اور اس سلسلے میں آئی ڈونرز کلب سری لنکا سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ بہت بڑی خبر تھی۔ ایسے ہزاروں کیسز ہو چکے تھے۔ پوری دنیا کے نابیناؤں کو سری لنکا والوں کی آنکھیں راس آجاتی تھیں۔

اس رات اس نے ذیشان کو یہ خبر سناتے ہوئے کہا۔ "تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کتنی خوش ہوں۔"

"صرف تم ہی نہیں بلکہ میں بھی خوش ہوں۔" ذیشان نے بتایا۔ "اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ سری لنکا سے جو آنکھیں ڈونیٹ کی جاتی ہیں، ان کا کوئی معاوضہ بھی نہیں ہوتا۔"

"ذیشان! وہ لوگ کتنا بڑا کام کر رہے ہیں، ہیں نا؟"

"ہاں، بہت بڑا کام ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ موت کے بعد سب کچھ خاک میں جانے والا ہے، کسی کام کا نہیں۔ اس لیے وہ آنکھیں کسی کو تحفے میں دے جاتے ہیں کہ ان کی موت کے بعد ان کی آنکھیں کسی اور کے کام آجائیں اور وہ دنیا کو دیکھ سکے۔"

"اس طرح تو وہ لوگ انسانیت کے لیے بہت بڑا کام کر رہے ہیں، ہیں نا۔" ماہا نے پوچھا۔

"ہاں، یہ بہت بڑا کام ہے۔" ذیشان نے کہا۔ "ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔"

امید کا ایک چراغ روشن ہو گیا تھا۔

ماہا کی سوچوں میں اب زندگی اور اس کے رنگ شامل ہو گئے تھے۔ کسی بھی دن دنیا اس کے سامنے روشن ہونے والی تھی۔ پھر سب کچھ نیا اور خوب صورت ہو جاتا۔

ایک شام ایک پارک میں بیٹھ کر ماہا نے ذیشان سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا آج بھی پھولوں کے رنگ اتنے ہی خوب صورت ہیں جتنے پہلے ہوا کرتے تھے؟"

"کیا، تمہیں پھولوں کے رنگ یاد ہیں؟"

"ہاں، بہت سے رنگ تو دھیان میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ میں ان ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ بتاؤ نا۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں اتنے پھول تم نے نہ دیکھے ہوں جتنے آج کل آ گئے ہیں۔" ذیشان نے کہا۔ "رنگ برنگے پھول، ان پر تجربے کیے جا رہے ہیں اور مختلف اقسام کے پھولوں کی بہار آ گئی ہے۔"

"کیا، میں یہ سب دیکھ سکوں گی؟"

"کیوں نہیں، جب تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی تو سارے منظر تمہارے ہی لیے تو ہوں گے۔"

"ذیشان کیا تمہیں اندازہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہوں؟" ماہا نے پوچھا۔

"نہیں، تم بتاؤ تم کیا سوچتی ہو؟"

"یہی کہ تم ایک خوب صورت نوجوان ہو۔ خاص طور پر تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت اور روشن ہیں۔ تم ان آنکھوں سے دنیا کو دیکھتے ہو اور مجھ کو دیکھتے ہو... اور..."

"اور کیا، اور بتاؤ؟"

"اور یہ کہ جب ہم ایک ہو جائیں گے تو پھر ہم روزانہ واک پر جایا کریں گے۔ میں تو گاڑی چلانا نہیں جانتی ہوں لیکن تمہارے پاس گاڑی ہے۔ تم مجھے لانگ ڈرائیو پر لے

جایا کرو گے۔ مجھے چونکہ کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں معلوم اس لیے تم مجھے بتاتے رہو گے کہ یہ کیا ہے۔ اس کو کیا کہتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں جانو، بالکل ٹھیک ہے۔"

لیکن بہت دنوں تک ایسا نہیں ہو سکا۔ سری لنکا سے آنکھوں کے عطیے کی کوئی کھیپ ہی نہیں آئی۔ ماہا کے لیے امیدوں کے موہوم سے چراغ گل ہوتے چلے گئے۔

اور ایک دن اچانک اسے بتایا گیا کہ اس کے لیے آنکھوں کا بندوبست ہو گیا ہے۔ یہ خوش خبری اسے اس کی بھابی عالیہ نے سنائی تھی۔

دونوں بہت دیر تک لپٹ کر ایک دوسرے سے روتی رہی تھیں۔

اس کے بعد کے مرحلے بہت تیزی سے طے ہوتے چلے گئے۔ اس کا اسپتال جانا، وہاں درجنوں قسم کے ٹیسٹ، پھر اسے یہ پتا چلنا کہ عطیے کے طور پر آئی ہوئی آنکھیں اس کے جسم سے میچ کر گئی ہیں۔ اس دوران اسے یہ خبر بھی ملی کہ ذیشان کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ ماہا کو یہ سن کر بہت دکھ سا ہوا۔ یعنی آپریشن کے دوران ذیشان کو اس کے پاس نہیں رہنا تھا۔

اس کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اس کی بھابی عالیہ نے اسے تسلی دی۔ "میری جان! اس میں پریشان یا اداس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ کچھ دنوں کے لیے گیا ہے۔"

آپریشن کامیاب ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو ذیشان کا فون آ گیا۔ ماہا نے جب اسے یہ خبر سنائی تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "چلو، اب تو تم دنیا کو دیکھ سکو گی۔"

"مجھے پوری دنیا کو نہیں، صرف تمہیں دیکھنا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں اگلے ہفتے واپس آ رہا ہوں۔"

"تم آ جاؤ، تو پھر ہم دونوں مل کر اس پرانے خواب کی تکمیل کریں گے۔" ماہا نے کہا۔

"کس خواب کی؟"

"وہی لانگ ڈرائیو والے۔"

"بالکل، تم فکر مت کرو، ویسا ہی ہوگا۔"

ایک ہفتہ تو بہت تھا۔ گھر والوں نے اس سے کہا کہ چلو تمہیں سیر کرا کے لاتے ہیں۔ پارکوں کی سیر کرو۔ سمندر کو دیکھو لیکن وہ انکار کرتی چلی گئی۔ اس نے عالیہ سے کہا۔ "بھابی! میں نے یہ سارے خواب ذیشان کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ آ جائے پھر ہم پورے شہر میں گھومتے پھریں گے۔"

اور ایک شام جب وہ اپنے کمرے میں تھی تو اس کی بھابی نے آ کر خبر دی۔ "ماہا! ذیشان آ گیا ہے۔ وہ ڈرائنگ روم میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

ماہا دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ ذیشان کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید چھڑی تھی۔ وہ چھڑی جو نابیناؤں کے پاس ہوتی ہے۔

وہ سکتے میں رہ گئی۔ "ذیشان! یہ تم ہو؟"

"ہاں ماہا، یہ میں ہوں، تمہارا ذیشان۔"

"لیکن یہ، یہ کیا؟"

"ہاں ماہا، سوری میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا کیونکہ میری آنکھیں نہیں ہیں۔"

ماہا نے چکرا کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

"کیا ہوا ماہا؟" ذیشان نے گھبرا کر پکارا۔ "کیا ہوا تمہیں؟ کہاں ہو تم؟"

"ذیشان۔" ماہا کو خود اپنی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ "معاف کرنا ذیشان کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔ کیونکہ مجھے ابھی آنکھیں ملی ہیں، میں زندگی اور دنیا کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کسی ایسے کے ساتھ جو مجھے سب کچھ بتا سکے، اور تم تو..."

ذیشان خاموش کھڑا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی سفید چھڑی کھٹ کھٹ کرتا باہر نکل گیا۔

اسی وقت عالیہ چیختی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ "بے وقوف، یہ کیا کر دیا تم نے۔ واپس کر دیا اس کو۔"

"بھابی آپ خود سوچیں، میں اس کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکتی ہوں؟"

"نادان لڑکی، تجھے یہ آنکھیں اسی نے تو دی ہیں۔ تو اس کی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھ رہی ہے۔"

ماہا نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ذیشان گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ ماہا نے بھاگ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ذیشان! کہاں جا رہے ہو تم؟"

"اپنی دنیا کی طرف۔"

"بے وقوف، تمہاری دنیا تو میں ہوں نا اور ہماری آنکھیں مشترکہ آنکھیں ہیں، سمجھے۔"

ذیشان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں کو بھگونے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماہا بھی رو رہی تھی۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 13

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

وقت کو جیسے موت آ گئی تھی اور سانسوں کی بازگشت کی طرح گھڑیاں بھی گویا تھم گئی تھیں۔ کمرے کی فضا دم بخود سی تھی۔ چار نگاہیں ایک دوسرے پر جمی تھیں اور ان میں شکایت بھی تھی اور حکایت بھی، گلے بھی تھے، شکوے بھی، تاویلیں بھی اور توجیہات بھی۔ کمرے کی ساکت فضا میں البتہ دو مجبور دلوں کی متوحش سی ”دھک... دھک“ ساعتوں میں ضرور گونجتی محسوس ہو رہی تھی... لگتا یوں تھا کوئی بڑا طوفان آنے والا ہو اور وقت جیسے بُری گھڑی کی طرح ان کے سروں پہ مسلط ہو گیا تھا۔

لئیق شاہ کی سناٹے دار نظریں سامنے سرتاپا فریاد بنی... زہرہ بانو پر جمی ہوئی تھیں اور خود زہرہ بانو کی نگاہیں لئیق شاہ پر اس طرح ٹھہری گئی تھیں جیسے وہ زہرہ کو اپنے کسی ”کڑے“ فیصلے سے آگاہ کرنے والا ہو اور پھر یکلخت کمرے کی تھمی تھمی فضا میں ایک ”آہ“ سے مشابہ ہنکاری اُبھری تھی۔ اس کے بعد لئیق شاہ نے نظریں جھکا لیں اور بہت ہولے سے بولا۔

”بیگم صاحب! کیا مجھے یہاں سے جانے کی اجازت ہے؟“

لئیق شاہ کے فقط ایک اس جملے میں زہرہ بانو کو ننگی تلواروں کی جھنکار سنائی دی تھی... اس کے اجنبی سے لہجے پر وہ جی جان سے تڑپ گئی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تیرتی نمی یک دم اُبھر آئی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم یہاں سے جانا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”میں شاید اب آپ کا ملازم نہیں رہا ہوں۔“

”تم میرے ملازم تھے ہی کب؟“

”کاش میں آپ کا ملازم ہی ہوتا... پھر شاید مجھے اتنا دُکھ نہیں ہوتا... مگر بیگم صاحب! آپ نے تو مجھے اپنا بنا کر میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے، میں اس دھوکے کو کیا نام دوں، یہ مجھے نہیں پتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ آج میری آنکھیں آپ کو اور اپنے دشمن چوہدری ممتاز خان کو ایک ہی قطار میں دیکھ رہی ہیں۔“

سیسے جیسے جلتے سلگتے جملے زہرہ بانو کی زخمی سماعتوں میں اُترنے لگے۔

”... اور ہاں بیگم صاحب! میں آپ کا مشکور تو رہوں گا ہی کہ آپ نے مجھے کمیل دادا کے ذریعے دشمنوں سے رہائی دلوائی... اگرچہ اس میں بھی آپ کا کوئی ذاتی مفاد ہی ہو سکتا ہے... لیکن... بہر حال... آپ کا شکریہ۔“

لئیق شاہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا... زہرہ بانو جیسے اپنی جگہ بت بنی رہ گئی، شدتِ غم سے اس میں تو بولنے کا بھی یارا نہ تھا، بولنا تو کجا اسے اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہا۔

زہرہ بانو کو یکا یک چکر سا آنے لگا اور پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسی وقت جب لئیق شاہ کمرے سے تیزی سے نکل کر باہر جا رہا تھا تو اس کا کمیل دادا سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا... وہ ایک لمحے کو رکا، پھر کچھ سوچتے ہوئے اندر لپکا تو بری طرح ٹھٹکا۔ زہرہ بانو اپنا سر تھامے کسی قریبی صوفے پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ایسے میں کوئی لمحہ جاتا کہ وہ فرش پر جا گرتی، کمیل دادا نے بہ سرعت ”بیگم صاحب“ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

بیگم صاحب کے بے سدھ پڑتے نرم و نازک وجود کو تھام کے کمیل دادا کو یوں لگا جیسے کوئی شاخِ گل اس کے ہاتھوں میں آ گئی ہو، زہرہ بانو کے پھول جیسے بدن کے نرم و لطیف لمس نے ایک لمحے کو کمیل دادا کے حواسوں کو جکڑا تھا، مگر صرف ایک پل، اس کے بعد ہوش و خرد کا یارا ہوا اور اس نے زہرہ بانو کو آہستگی کے ساتھ صوفے پر بٹھا دیا... پھر جلدی سے پانی کا گلاس اس کے لرزتے لبوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ پانی کی برودت نے، سوکھے پڑتے حلق کو تر کر گئے تو زہرہ بانو کو کچھ بولنے کا یارا ہوا اور گویا لبِ ترساں نے حسرت زدہ الفاظ اُگلے۔

”ک... کمیل! وہ... وہ... ل... لئیق شاہ... چلا گیا۔“

”تو کیا ہوا بیگم صاحب؟ آ جائے گا دوبارہ۔“ کمیل دادا نے تشفی آمیز لہجے میں کہا تو زہرہ بانو لرزتی آواز میں بولی۔

”وہ... ناراض ہو کے گیا ہے مجھ سے... شش... شاید ہمیشہ کے لیے... آہ... وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔“ کہتے ہوئے زہرہ بانو کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ کمیل دادا ہکا بکا سا رہ گیا اور دیوانوں کی طرح زہرہ بانو کو پکارنے لگا۔

”بب... بیگم صاحب... بیگم صاحب... ہوش میں آئیں۔“ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے یکدم گہرے ہوتے چلے گئے۔ اس نے دیکھا زہرہ بانو کا حسین چہرہ ایکا ایکی پیلا زرد پڑ گیا اور جسم برف کی طرح ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس نے چلا چلا کر دیگر لوگوں کو بلا لیا اور خود جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔ ایک خادمہ زہرہ بانو کے ہاتھوں پیروں کی مالش کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اس نے تفصیلی معائنے کے بعد بتایا کہ زہرہ بانو کو کسی بات پر

شدید ''شاک'' پہنچا ہے، لہٰذا انہیں فوراً ہاسپٹلائز کرنا ہوگا۔

یہ سننا تھا کہ پورے ''بیگم ولا'' میں کھلبلی مچ گئی۔ زہرہ بانو کو کبیل دادا نے فوراً ایک قریبی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا۔ کچھ ساتھی اور دو عدد وفادار ملازمائیں کبیل دادا نے وہاں تعینات کر دیے۔۔۔ پھر جب زہرہ بانو کی حالت قدرے خطرے سے باہر ہوئی تو کبیل دادا غصے میں لئیق شاہ کو تلاش کرنے نکل پڑا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، صاف نظر آتا تھا کہ وہ لئیق شاہ سے بھڑنے کے لیے جا رہا تھا۔

آندھی طوفان کی طرح کار دوڑاتا ہوا وہ منٹے چند پہنچا اور سیدھا لئیق شاہ کے ڈیرے کا رخ کیا۔ لئیق شاہ ابھی تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ لئیق شاہ کو بیگم ولا سے نکلے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور لئیق شاہ کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، تب پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک نام ابھرا۔۔۔ ''بختیار علی'' جو اس کا گہرا دوست تھا، ممکن ہے لئیق نے وہیں کا رخ کیا ہو؟ اس نے سوچا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا، وہاں پہنچا تو اسے دور سے ہی بختیار علی کے گھر کے باہر ایک بڑی سی کھری چارپائی پر لئیق شاہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا دکھائی دیا۔

لئیق شاہ کو یوں بڑے آرام سے۔۔۔ اپنے دوستوں سے باتیں کرتے دیکھ کر کبیل دادا کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔۔۔۔۔ وہ تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھا اور چارپائی کے بالکل قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے کار کو بریک لگا دیے۔۔۔ گرد و غبار سا اُٹھا اور کبیل دادا بپھرا ہوا کار سے برآمد ہوا اور کسی طوفانی بگولے کی طرح لئیق شاہ کی طرف لپکا۔ بختیار علی۔۔۔ کبیل دادا کی یہ حرکت نہ سمجھ سکا، جبکہ لئیق شاہ کے بشرے پر بھی ایک ذرا سناٹے کی کیفیت طاری ہوئی تھی۔۔۔ پھر جب تک وہ کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کی کوشش کرتا، کبیل دادا، لئیق شاہ پر بجلی بن کر ٹوٹا۔ اسے گریبان سے دبوچ کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور جوشِ غیظ میں کبیل خود بھی اپنا توازن گنوا بیٹھا اور اس سمیت بھربھری مٹی والی زمین پر جا پڑا۔ بیٹھی ذرے ذر کے ایک عدد تالی پیٹ کر چارپائی سے چھلانگ لگا کر پرے ہٹ گیا، جبکہ بختیار علی بیچ بچاؤ کے لیے آگے بڑھا۔ بجلی کی طرح اسے بھی حیرت تھی کہ آخر یہ کبیل دادا کو ہوا کیا ہے؟ یہ دونوں تو دوست تھے جبکہ کچھ دن پہلے ہی کبیل دادا اپنی جان پر کھیل کر اسے دشمنوں سے بچانے نکلا تھا اور کامیاب بھی رہا تھا، پھر اب یہ اس کی جان کا بیری کیوں بن گیا تھا؟

زمین پر گرتے ہی کبیل دادا لئیق کے سینے پر سوار ہو گیا اور اپنے آہنی ہاتھوں سے لئیق کی گردن دبوچنے لگا۔ ڈیل ڈول کے لحاظ سے دونوں ہی ایک دوسرے سے کم نہیں تھے مگر اس وقت بہ ظاہر کبیل دادا، لئیق شاہ پر حاوی ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بختیار علی نے عقب سے کبیل دادا کو پکارتے ہوئے اس عمل سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر کبیل دادا پر اس وقت خون سوار تھا۔ پھر اس نے اسی طرح لئیق شاہ کی گردن دبوچے ہوئے کھڑا کر دیا اور ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا۔۔۔ لئیق شاہ چند قدم پیچھے لڑکھڑایا، کبیل دادا نے آگے بڑھ کر غصے سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر دوسرا گھونسا لئیق شاہ کے چہرے پر رسید کیا، وہ پھر یہ وار بھی سہتے ہوئے چند قدم عقب میں لڑکھڑا گیا۔۔۔ کبیل دادا پھر آگے بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ لیا، اب بختیار کو بھی غصہ آ گیا، وہ کبیل کو دبوچنے کی غرض سے اس کی طرف بڑھا تو لئیق شاہ نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر بختیار کو روک دیا۔

کبیل دادا، لئیق شاہ سے زہریلے لہجے میں بولا۔۔۔ ''تم، احسان فراموش انسان! تم نے بیگم صاحبہ کے احسانوں کا یہ بدلہ دیا کہ آج وہ تمہاری بے حسی اور خود غرضی کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہو چکی ہیں۔۔۔ بولو۔۔۔ تم نے ان کے ساتھ ایسی کیا دل دکھانے والی باتیں کی تھیں؟''

لئیق شاہ کے خراش زدہ چہرے پر چند ثانیے کے لیے تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئیں۔۔۔ پھر جب کبیل دادا نے ایک بار پھر گھونسا مارنا چاہا تو اس بار لئیق شاہ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔۔۔ اور اسے ایک جھٹکے سے مروڑ کے کبیل دادا کو خود سے پرے دھکیل دیا اور چلا کر بولا۔

''اب بس کبیل دادا! میں اب تک اس لیے ذرا کھا رہا کہ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اب میرا ہاتھ بھی اُٹھ جائے گا۔''

کبیل دادا کا غیظ و غضب کم نہیں ہوا تھا، اس نے وہیں سے ہی لئیق شاہ پر چھلانگ لگا دی اور اس کے چوڑے سینے سے ٹکرایا۔ بھاری بھرکم کبیل دادا کی ٹکر سے لئیق شاہ کے قدم تو زمین سے نہیں اُکھڑے تھے مگر وہ اس طوفانی ٹکر کے باعث کئی قدم پیچھے کی جانب ضرور لڑکھڑا گیا تھا۔

''کبیل دادا! میں کہہ رہا ہوں اب بس کر دے۔'' لئیق شاہ اس کی طرف دیکھ کر گونج دار آواز میں بولا۔۔۔ مگر کبیل دادا کہاں بس کرنے والا تھا۔۔۔ اس کی طرف خوں خوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں تجھے اسی طرح ٹھوکروں میں رکھ کر بیگم صاحبہ

کے قدموں میں لے جا کر پٹخوں گا، تاکہ انہیں بھی اچھی طرح تیری دو ٹکے کی اوقات کا اندازہ ہو جائے اور تو دوبارہ ان کی شان میں گستاخی کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔'' وہ پھر جارحانہ انداز میں اس کی جانب لپکا، جبکہ کبیل دادا کی اس لفاظی پر اب لئیق شاہ کا دماغ بھی اُلٹ گیا تھا... چنانچہ جیسے ہی اس بار کبیل دادا غصے و نفرت سے دانت پیستا ہوا اس کی جانب لپکا... لئیق شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے کبیل دادا کی پیش قدمی کو روک دیا اور اسی کوشش میں دونوں کے ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں اُلجھ گئے۔

دونوں کسی مضبوط چٹان کی طرح ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے، دونوں کے سرخ پڑتے چہرے ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے تھے اور آنکھوں میں..... خونخواری کی چمک جیسے لاوا اُگلتی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں کے پنجوں کو مروڑنے کی کوشش میں تھے۔ کبھی کبیل دادا، لئیق شاہ کو دھکیل کر چند قدم پیچھے کھدیڑ ڈالتا تو کبھی لئیق شاہ اسے دھکیل دیتا... مگر ایک دوسرے کے آہنی پنجوں سے گرفت کسی کی بھی کمزور نہیں پڑ رہی تھی... زمین پر دونوں کے بھاری بھرکم وجود کے ''دھپا دھپ'' گرنے کی آواز اُبھری... اور ایک بار پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کے حلق سے وحشیانہ غراہٹیں... برآمد ہو رہی تھیں کہ ٹھیک اسی وقت ایک آواز پر دونوں چونک پڑے، وہ کسی گاڑی کی آواز تھی... اور پھر ان دونوں کی سماعتوں سے بختیار کی چلاتی ہوئی آواز بھی ٹکرائی تھی۔

''ہوشیار۔ دشمن۔''

کبیل دادا اور لئیق شاہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھے.....

تب ہی انہوں نے دیکھا کہ ایک بغیر ہڈ والی جیپ ان سے ذرا فاصلے پر رکی تھی۔ اس کے اندر چار مسلح ڈھاٹا پوش افراد سوار تھے جبکہ پانچواں ڈرائیور تھا۔

''اندر بھاگو... میرے گھر کی طرف... جلدی۔''

بختیار علی پھر چیخا... لیکن شاید اب ان دونوں کے پاس وقت نہیں بچا تھا۔ جیپ کے اندر ہی سے ان چاروں افراد نے ان کی طرف فائر کھول دیے۔ بختیار کے خبردار کرنے پر کبیل اور لئیق خطرہ بھانپتے ہی اپنی لڑائی بھول کر خود کو بچانے کی تگ و دو میں لگے۔ لئیق شاہ نے بختیار کے گھر کے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی تھی جبکہ کبیل دادا قریب کھڑی اپنی کار کی آڑ لینے کے لیے لپکا تھا۔ بجلی بہت پہلے کہیں غائب ہو چکا تھا جبکہ بختیار احمد بھی اپنے گھر کا دروازہ پار کر چکا تھا... اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری تھی۔ دشمنوں نے یک بیک دونوں طرف گولیاں داغی تھیں... کچھ گولیاں دروازے میں پیوست ہوگئیں اور کچھ نے کبیل دادا کا تعاقب کیا تھا اور اس کے اپنی کار کی آڑ میں ہوتے ہی، گولیاں ''ژناژنٹ'' کی آوازوں سے کار کی باڈی میں پیوست ہوگئیں۔

وار خالی جاتے دیکھ کر دشمن جیپ سے اُتر آئے تھے۔ انہوں نے کبیل دادا کو نشانے پر رکھ لیا... اور پھر اس کی کار پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں، کبیل دادا کے لیے یہ نہایت ہی مخدوش صورت حال تھی۔ کیونکہ ایک تواتر سے کار پر گولیوں کا برسنا کسی وقت بھی اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا... مگر اس کے پاس اور کوئی جائے پناہ بھی نہیں بچی تھی... جبکہ اس کا پستول کار کے گلوکمپارٹمنٹ میں پڑا تھا، اسے اُٹھانے کا کوئی موقع اس کے پاس تھا ہی نہیں... ادھر گولیوں کی بارش سے کار کی باڈی جیسے کھمبیوں کے چھتے کا نقشہ پیش کرنے لگی تھی۔

قرب و جوار میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ڈرے سہمے لوگ اندر محبوس ہوگئے تھے۔ کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے لوگوں نے گھروں کے دروازے بھی بند کر لیے تھے۔

کبیل دادا نے اسی وقت زمین پر لوٹ لگائی اور کار سے دور ہوتا چلا گیا مگر اب وہ کسی وقت بھی گولیوں کی زد میں آسکتا تھا... کیونکہ کار سے ہٹتے ہی اب دشمنوں کی گرجتی ہوئی گنز کا رخ اسی جانب ہو گیا تھا۔ کبیل دادا کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی تھی اور اس کے چہرے پہ سناٹے اُتر آئے تھے کہ دفعتاً ہی فضا میں ایک گڑگڑاہٹ سے مشابہ آواز اُبھری... نجانے کہاں سے ایک ٹریکٹر جس کے آگے ایک بڑا سا بلیڈ لگا ہوا تھا... کبیل دادا اور دشمنوں کے بیچ میں آ گیا... اس کے ڈرائیونگ کیبن میں کبیل دادا کو لئیق شاہ بیٹھا نظر آ گیا جو اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ہوشیار کر رہا تھا۔ پہلے تو کبیل دادا اس کا اشارہ سمجھنے سے قاصر ہی رہا... لیکن جب ٹریکٹر رک کر فوراً ریورس ہوا تو کبیل دادا اس سنگین ترلمحات میں لئیق شاہ کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اسی کی آڑ لیتا ہوا ٹریکٹر کے ساتھ ساتھ وہ بھی پیچھے ہٹنے لگا... جبکہ دشمنوں نے اب اپنی گنز کا رخ ٹریکٹر میں سوار لئیق شاہ کی طرف کر دیا تھا... مگر لئیق شاہ اب وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نجانے کس وقت وہ کیبن چھوڑ کر اب ٹریکٹر کے دیوہیکل ٹائر کے ساتھ پیچھے ہوتا ہوا کبیل دادا

کی مدد میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا، اسی وقت کہیں سے جوابی فائرنگ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا... یہ بختیار علی تھا اور اپنی چھت سے دشمنوں پر گولیاں برسا رہا تھا مگر اس کی گن کے مقابلے میں دشمنوں کے ہتھیار جدید اور نسبتاً خطرناک تھے... تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ کمیل اور لئیق کو نکل بھاگنے کا موقع ضرور مل گیا۔

پھر دائیں بائیں گھروں کی چھتوں سے بھی فائرنگ شروع ہوگئی تو دشمنوں کو بھاگتے ہی بنی۔

شکر تھا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ فائرنگ رک گئی تھی۔ دشمن ناکام ہو کے فرار ہونے پر مجبور ہوگیا تھا۔ ایک طوفان تھا جو اب تھم چکا تھا۔ فضا سازگار ہوتے ہی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے، یہ سب لئیق شاہ کی برادری کے ہی لوگ تھے۔

''تو ٹھیک تو ہے نا کمیل؟'' لئیق شاہ نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے کمیل دادا کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے ایک نظر لئیق پر ڈالنے کے بعد بغیر جواب دیے اپنی کار کی طرف دیکھنے لگا جو اب کار سے زیادہ کباڑ دکھائی دے رہی تھی۔

لئیق شاہ نے کمیل دادا کے جواب نہ دینے کا بالکل برا نہیں منایا۔ دوبارہ مسکرا کے بولا۔ ''چل! غصہ چھوڑ اب... شکر کر جان بچ گئی ورنہ تو آج ہم دونوں ہی گئے تھے جان سے۔''

''جان بچانے کا شکریہ۔'' کمیل دادا کو بالآخر کہنا پڑا تو لئیق دوبارہ دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''جان بچانے والی ذات صرف میرے سوہنے رب کی ہے۔''

''پھر بھی تو نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے...''

''تو نے بھی تو اس روز اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے دشمنوں کی قید سے چھڑایا تھا۔''

لئیق شاہ اس کی بات کاٹ کر بولا تو کمیل دادا نے بھی صاف گوئی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میں نے بیگم صاحبہ کے حکم سے کیا تھا۔''

''اچھی لگی تمہاری صاف گوئی۔'' لئیق شاہ نے بھی کھلے دل سے کہا۔ ''ویسے تجھے یہاں نئے پنڈ آتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا، نکا چوہدری (ممتاز خان) اس وقت زخمی سانپ بنا ہوا ہے۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ صلح صفائی کے بعد اتنی جلدی وہ دوبارہ اپنی اوقات پر اتر آئے گا۔''

میں کیا کروں اس نے پہل کی تھی

کمیل دادا نے گومگو سے لہجے میں کہا تو لئیق شاہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''اونہہ... صلح صفائی... یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ بیگم صاحبہ نے غیر جانب داری دکھاتے ہوئے اپنے بھائی کو عین اس وقت معاف کردیا جب اسے کورٹ سے سزا ہونے والی تھی۔''

اس کی بات کمیل دادا کو ناگوار لگی تھی پھر اس سے پہلے کہ ان دونوں کے بیچ اس حساس موضوع پر بحث آگے بڑھتی اسی وقت بختیار اور بجلی ان کی طرف بڑھے، وہاں لوگوں کا شور سا مچ گیا تھا اور لوگ ان کے گرد جمع ہو کے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے تھے۔

بختیار اور بجلی نے ان دونوں کی خیریت پوچھی۔

تھوڑی دیر بعد یہ طوفان غوں غاں تھما تو بختیار نے اپنی بیٹھک کھول دی اور یہ لوگ وہیں جا کر آرام سے بیٹھ گئے۔

کمیل دادا کا موڈ بگڑا ہوا تھا، اسے واپسی کی فکر ہونے لگی تھی۔ ایسے میں بختیار نے ایک نگاہ کمیل دادا پہ ڈالنے کے بعد لئیق شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ان کا تعلق یقیناً نکے چوہدری سے ہی ہوسکتا ہے، ویسے یار لئیق! میں نے کوبے کھوجی کو بلوایا ہے، وہ ''پیر'' دیکھنے کا ماہر ہے۔''

''اس کا کیا فائدہ بختیارے!'' لئیق شاہ کا لہجہ پھر تلخ ہونے لگا۔ ''اس سرزمین پر ہمارا نکے چوہدری کے سوا اور بھلا کون دشمن ہوسکتا ہے؟ پر رنج تو یار اس بات کا ہے کہ اپنے بھی دھوکا کرنے لگ گئے ہیں۔''

''میں تو تجھے پہلے ہی کہتا تھا لئیق کہ یہ سگے سوتیلے کا تو ڈراما ہے بس، دیکھ لیا نا! جہاں بات حویلی اور خونی رشتوں کی آگئی... چھوٹی بی بی (زہرہ بانو) نے فوراً عدالت میں صلح نامے کا پانسا پھینک دیا۔ ان سارے اونچے لوگوں کا نزلہ صرف ہم غریبوں پر ہی گرتا ہے۔''

بختیار علی کی بات سُن کر کبیل دادا کا دماغ پھر سے گرم ہونے لگا مگر بختیار علی اس وقت میزبان کے روپ میں بیٹھا تھا اور پھر تھوڑی دیر پہلے کے حالات بھی۔ کبیل دادا کو اپنے اندرونی اُبال پر بمشکل قابو پانا پڑا، مگر جب لئیق شاہ نے رُزدیدہ نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھتے ہوئے، بختیار علی سے یہ کہا کہ ''او بختیارے! کیا فائدہ ان باتوں کا اب، کہیں پھر یہ ناراض نہ ہو جائے'' ظاہر ہے اس کا اشارہ کبیل دادا کی طرف تھا تو کبیل دادا خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔

''یہ تم سب لوگوں کی کم فہمی ہے، جو تم اپنی جگہ ہمدرد۔ بیگم صاحبہ کو ایسا سمجھ رہے ہو... لیکن...'' وہ اتنا کہہ کر رکا اور پھر لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کم از کم تم کو تو بیگم صاحبہ سے اس قدر دل برا نہیں کرنا چاہیے تھا لئیق شاہ! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بیگم صاحبہ کس قدر اکیلی اور مجبور عورت ہیں... خود ان کی ماں ستارہ بیگم بھی حویلی والوں کی اندرونی سازشوں کا شکار ہو کے جان سے چلی گئیں، اور وہ کیس بھی حل ہوا چاہتا تھا مگر عین وقت پر وڈے چوہدری (الف خان) کی وجہ سے بیگم صاحبہ کو مجبوراً اس کیس سے ہاتھ اُٹھانا پڑا، تبھی اُن کا حویلی والوں سے اتنا دل خراب ہو گیا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے اسے چنڈ کو خیر آباد کہہ دیا۔ تم خود سوچو لئیق شاہ! یہ تو تم ہو، بیگم صاحبہ نے تو اپنی ماں کا خون انہیں معاف کر دیا۔''

''اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ انہوں نے یہ غلط کیا۔'' لئیق شاہ نے بلا توقف کہا۔ ''انہیں کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی ماں کا خون معاف کرتیں؟ اور پھر... اپنا یہی اُصول مجھ پر بھی لاگو کر دیا... کیوں؟''

''اس لیے کہ بیگم صاحبہ نے اپنی ماں کی خاطر ہی یہ سب کیا تھا۔'' کبیل دادا، لئیق شاہ کے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے بولا، تو لئیق شاہ قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''لئیق شاہ! شاید تمہیں ابھی بھی بہت سی باتوں کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ چوہدری الف خان نے بیگم صاحبہ کی ماں، ستارہ بیگم کے ساتھ محبت کی شادی کی تھی۔ اس وقت بیگم صاحبہ اپنی ماں ستارہ بیگم کی گود میں تھیں... جو خود اندر سے ایک بہت دُکھی خاتون تھیں، مگر الف خان سے شادی کے بعد جیسے انہیں دنیا کی ہر خوشی مل گئی۔ الف خان نے بھی ان دونوں ماں بیٹی کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق پورا پورا اور آخری عمر تک انصاف کیا... انہیں ان کے کسی بھی حق سے محروم نہیں کیا۔ ان کے محبت پر ثابت قدم رہنے پر ستارہ بیگم نے بھی نہ صرف اپنے وفادار شوہر کے لیے بلکہ ان کے خاندان کی شان اور عزت کی خاطر خود کو جیسے وقف کر دیا اور اپنی بیٹی زہرہ بانو۔ یعنی بیگم صاحبہ کو بھی آخر تک اسی بات کی تلقین کرتی رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الف خان نے ستارہ بیگم سے شادی کر کے ان کی دُکھی زندگی میں خوشیوں کی شمع روشن کر دی تھی۔ آج بیگم صاحبہ کی یہی مجبوری ہے کہ وہ ایسا جو کچھ کرتی ہیں تو صرف اپنی مرحومہ ماں کی خاطر ہی... اور ان کی وصیت نما نصیحت کی وجہ سے ہی کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ بہت مجبور اور دُکھی خاتون ہیں لئیق شاہ مگر بہت محبت کرنے والی بھی تم... تم... تو خوش نصیب ہو لئیق شاہ! کہ... تت... تمہیں... بیگم صاحبہ جیسی خاتون کا پیار ملا۔''

یہ کہتے ہوئے کبیل دادا کا اپنا لہجہ بھی جانے کس اندرونی خفتہ جذبے سے مرتعش سا ہونے لگا تھا... وہ آگے بولا۔ ''لئیق شاہ! اتنے بے رحم نہ بنو... بیگم صاحبہ کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو... تمہاری بے رُخی کی وجہ سے ہی وہ آج اس حال کو پہنچی ہیں کہ اسپتال داخل ہوئی ہیں۔ مگر ایک بات تم بھی یاد رکھنا لئیق شاہ کہ بیگم صاحبہ اب تک اگر کسی مجبوری کے باعث خاموش ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ممتاز خان کو معاف کر چکی ہیں یا وہ ان سے ڈرتی ہیں، ہرگز نہیں۔ وہ آج بھی ممتاز خان کو منہ توڑ جواب دے سکتی ہیں مگر... اپنے باپ الف خان کی وجہ سے خاموش ہیں، اگر سمجھو تو اس کی بڑی ٹھوس وجہ ہے کہ آج بیگم صاحبہ کے پاس جو کچھ ہے وہ الف خان کی وجہ سے ہی ہے، اس لیے ان کا ضمیر یہ گوارا ہی نہیں کرتا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھائیں۔ بس وہ موقع کی منتظر ہیں۔''

کبیل دادا یہ بتا کر خاموش ہو گیا... بیٹھک میں خاموشی سی طاری ہو گئی۔ اب تک خاموش بیٹھے بگل اور بختیار علی نے بھی کبیل دادا کی باتوں کو غور اور پوری توجہ سے سنا تھا، بلکہ انہیں یہ باتیں غلط بھی نہیں لگی تھیں لہٰذا انہوں نے بھی اپنے طور پر لئیق شاہ کو سمجھایا۔ مگر وہ تو بہت پہلے ہی کبیل دادا کی باتوں سے اندر ہی اندر اثر پذیری کے عمل سے گزرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ لئیق شاہ کو بھی پہلی بار اپنے دل میں ایک کسک سی اُبھرتی محسوس ہونے لگی... ایک ٹیس سی اس کے دل میں اُٹھی تھی... اندر اس کے ایک چھنا کا سا ہوا تھا۔ اس کے چشم تصور میں اب زہرہ بانو کا اُداس اور حسرت زدہ چہرہ رقص کرنے لگا، ایک مجبور اور بے بس سا چہرہ مگر بے انتہا محبت کرنے والا!... اور پھر خود لئیق شاہ کو بھی کب اس بات سے انکار تھا کہ وہ خود بھی تو زہرہ بانو کو چاہتا تھا۔ اس کے دل و

دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی، ایک طوفان سا جاگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یک دم بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمیل دادا سے بولا۔

”کمیل! میں اسی وقت بیگم صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

کمیل دادا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے میں بختیار علی نے بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوشی ہوئی کہ تم لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں لیکن اس وقت تم دونوں کا نئے پنڈ سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا، دشمن نجانے کب سے تمہاری گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”نہیں بختیارے! مجھے اسی وقت جانا ہے... تو کسی سواری کا بندوبست کر دے۔“ لئیق شاہ کی بے چینی پل پل فزوں تر ہو گئی تھی، ایسے میں کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سواری کی فکر نہ کر... میں ابھی بیگم والا فون کر کے گاڑی منگوا لیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے بیگم والا فون کیا اور اپنے کسی ساتھی کو فوراً گاڑی لے کر نئے پنڈ پہنچنے کا حکم دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، وغیرہ۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی یاسر نامی ایک بندہ گاڑی لے کر وہاں آن پہنچا... اگلے چند منٹوں بعد یہ لوگ شہر کی طرف گامزن تھے۔ شہر تک کا سفر بہ خیر و عافیت گزرا۔ انہوں نے سیدھا اسپتال کا رخ کیا جہاں زہرہ بانو داخل تھی۔

لئیق شاہ کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا... اس کے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی... گاڑی سے اتر کے دونوں نے کمرے کا رخ کیا جہاں زہرہ بانو کو رکھا ہوا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی انہیں زہرہ بانو بیڈ پر دراز نظر آ گئی۔ وہ ہوش میں تھی اور جاگ رہی تھی۔ تاہم اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ پر اس نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں... اور پھر لئیق شاہ کو دیکھتے ہی اس کے ستے ہوئے پژمردہ چہرے پہ جیسے یکایک رونق سی آ گئی... اور بجھے بجھے گالوں کی زردی بھی ہوئی گلاب سرخی خوش رنگ شگوفوں کے مانند دمکنے لگی۔ آنکھوں میں چھائی ہوئی مردنی یکایک زندگی کی چمک میں بدل گئی تھی۔ لئیق شاہ اس کے ذرا قریب جا کر اپنا سر جھکائے کھڑا ہو گیا تھا جبکہ کمیل دادا کی نظریں زہرہ بانو کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اور پھر اسی نے زہرہ بانو کو ہولے سے سلام کیا۔ مگر زہرہ بانو تو اس وقت ”من و تو“ کی سی حالت میں تھی۔ کمیل دادا کے دل مجبور میں ایک چبھن سی ابھری مگر دوسرے ہی لمحے زہرہ بانو کے چہرے پر لوٹتی مسرت کو پا کر اسے بھی ایک خوشی کا احساس ہوا تھا کہ وہ خوش ہو گئی تھی۔

پھر جب وہ یہ سوچ کر کہ اس سے پہلے کہ ہمیشہ کی طرح لئیق شاہ کی موجودگی میں بیگم صاحبہ اسے وہاں سے جانے کا کہے... وہ خود ہی خاموشی کے ساتھ اپنا سر جھکائے کمرے سے باہر جانے لگا تو اچانک اس کی سماعتوں سے زہرہ بانو کی آواز ٹکرائی۔

”ٹھہر جاؤ کمیل۔“ پہلے تو کمیل دادا کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہ آیا، تاہم وہ رک گیا اور زہرہ بانو کی طرف گھوم گیا۔

”جی بیگم صاحبہ!“ اس نے ہولے سے کہا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ زہرہ بانو نے اس سے پوچھا۔

”میرا باہر کھڑا ہونا مناسب رہے گا۔“

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ زہرہ بانو نے ہولے سے کہا اور کمیل کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں ایک عجیب سے ٹھہراؤ کی سی فضا طاری ہو گئی تھی، کمرے میں صرف وہ دونوں رہ گئے تھے اور ان کی بے طرح دھڑکنیں تھیں کہ زہرہ بانو کی آواز نے اس دبیز سکوت کو توڑا۔

”کیسے ہو لئیق؟“

”آپ کیسی ہیں، بیگم صاحبہ؟“ بے اختیار لئیق شاہ کے منہ سے بھی نکلا۔

”بیگم صاحبہ!“ زہرہ بانو بہ دستور اس کے پُروجیہہ چہرے کی طرف تکتے ہوئے بولی۔ لہجہ شکوہ کناں تھا۔

”میرا مطلب تھا کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، زہرہ بانو صاحبہ!“ لئیق شاہ کو انداز تخاطب بدلنا پڑا۔

”صاحبہ کا تکلف لگانا ضروری تھا؟“ زہرہ بانو کے دلکش لبوں پہ الوہی سی مسکراہٹ بکھری۔ پھر جیسے دل کی عمیق گہرائیوں سے بولی۔

”تمہارے آنے سے پہلے مجھے اپنی زندگی سے بیزاری سی ہو رہی تھی... مگر اب... ایسا نہیں ہے۔“

”کمیل دادا نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ میری وجہ سے آپ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی... مجھے اس کا واقعی بہت رنج ہوا۔“ لئیق شاہ نے بتایا اور زہرہ بانو کو حیرت کا جھٹکا سا محسوس ہوا۔

”کیا تم کمیل دادا کے ساتھ آئے ہو؟ میرا مطلب ہے نئے پنڈ سے یہاں تمہیں وہی لایا ہے؟“

”جی ہاں۔“ لئیق شاہ نے جواب دیا اور پھر اسے ساری تفصیل بہ شمول نامعلوم حملہ آوروں کے، سے بتا

دی۔ اس مختصر سی صراحت کو سن کر زہرہ بانو کا چہرہ چند ثانیوں کے لیے گم صم سا ہو گیا، اپنے دل میں کمیل دادا کے لیے ایک مقام، ایک احترام سا بنتا محسوس ہوا... لئیق شاہ نے زہرہ بانو کو یہ بھی بتایا کہ ابتدا میں ان دونوں کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی مگر پھر بعد میں کمیل دادا نے اسے ساری بات سمجھا بھی دی تھی، اور وہ اب نادم تھا۔

یہ سب سن کر زہرہ بانو نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ہولے سے بولی۔ ''لئیق! کمیل دادا نے تمہیں میرے بارے میں جو بتایا وہ غلط نہیں ہے۔ چوہدری الف خان نے باپ نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے ایک حقیقی باپ جیسی محبت اور شفقت دی اور میرے اور میری ماں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔''

''میں آپ سے نادم ہوں، غصے اور اصل حقیقت سے ناآشنائی کے باعث میں آپ سے بدتمیزی کر گیا۔'' لئیق شاہ نے ایک نظر زہرہ بانو کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کے بولی۔

''نہیں، تم نے تو میرے ساتھ کوئی بھی بدتمیزی نہیں کی۔''

''آپ کا دل دکھایا میں نے۔''

''ایسے دکھ مجھے ہزار جان سے قبول ہیں لئیق شاہ! جو بعد میں تمہیں کچے دھاگے سے باندھ کر دوبارہ ادھر ہی... میرے پاس... میرے قریب ہی لوٹاتے رہیں۔''

یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہیں لئیق شاہ کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں۔ اب وہ بھی اس کی طرف یک ٹک تکے جا رہا تھا... یوں تو دل کو دل سے بہت پرانی راہ تھی اور اس راہ میں بھٹکانے والے کئی سنگِ میل بھی آئے تھے لیکن شکر ہے کہ تقدیر ان کی بہترین راہ نما ثابت ہوئی تھی۔

زہرہ بانو نے بیڈ پر اسی طرح نیم دراز اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا تو لئیق شاہ نے آگے بڑھ کر زہرہ بانو کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور تب ایکا ایکی اسے یوں لگا جیسے اس کے زخمی سے وجود میں ایک نظافت سی دوڑ گئی ہو، کیسی نرماہٹ، کیسی لذت تھی اس لمس میں، اس نے ایک پل کے لیے سوچا تھا، ادھر زہرہ بانو کے ہاتھ میں لئیق شاہ کی گرفت اسے سرتاپا سرشار کر گئی۔ ایسے ہی وقت میں محبت بھرے دل سے یہ دعا ضرور نکلتی ہے کہ یہ ساتھ نہ ٹوٹے، یہ ہاتھ نہ چھوٹے، اور پھر بے اختیار ہی زہرہ بانو نے لئیق شاہ کے ہاتھ کو اپنی جانب کھینچا اور بولی۔

''میرے پاس بیٹھ جاؤ ناں، میرے سرہانے، میرے قریب... کہیں پھر مجھ سے ناراض ہو کے نہ چلے جاؤ... مجھے تمہاری قربت میں، تمہاری سنگت میں بہت سکون ملتا ہے، لئیق شاہ!'' اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی... لئیق شاہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا تو بے اختیار زہرہ بانو نے اس کا ہاتھ اپنے مرمریں گال کے ساتھ لگا لیا، لئیق شاہ کو اپنا گرانڈیل وجود... یکلخت پگھلتا محسوس ہوا، پھر بھی بس نہ ہوا، زہرہ بانو، اس کا کھردرا ہاتھ اپنے نرم نرم گال سے لگائے لگائے اپنے ہونٹوں تک لے آئی تو لئیق شاہ خود کو جذبات کے تند و تیز بہاؤ کی زد میں محسوس کرنے لگا... پھر فوراً ہی اس نے جیسے ایک گہری سانس کے ذریعے اپنے اندر کا جوار بھاٹا باہر نکالا اور... ہولے سے مسکرا کے بولا۔

''زہرہ صاحبہ! ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے؟ وہ آپ کو کب یہاں سے چھٹی دیں گے؟'' کہتے ہوئے بہت دھیرے سے لئیق شاہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''اب میں ٹھیک ہوں، تم جو آ گئے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔

اسی وقت ایک نرس نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آ رہے ہیں۔ دونوں ذرا سنبھل کے بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے راؤنڈ کے بعد زہرہ بانو کی طبیعت تسلی بخش قرار دی اور پھر اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔

واپسی میں گاڑی یاسر ہی چلا رہا تھا۔ زہرہ بانو دانستہ کار کی عقبی سیٹ پر براجمان تھی جبکہ لئیق شاہ اس کے برابر میں بیٹھا تھا، اور آگے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر کمیل دادا تھا۔ اس کے بشرے پہ اتھاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کار کا رخ بیگم ولا کی طرف تھا۔

بیگم ولا میں زہرہ بانو کی آمد پر ساتھیوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دشمنوں کی طرف سے تازہ کیے گئے حملے سے متعلق ان کے بیچ تبادلۂ خیال ہوا تو کمیل دادا نے برملا زہرہ بانو سے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! اب ہمیں نکے چوہدری کو زیادہ ڈھیل نہیں دینی چاہیے... وہ ہمارے لیے بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کورٹ میں صلح صفائی اور معافی نامے کے باوجود وہ باز نہیں آیا ہے بلکہ الٹا اس کی ہمت اور بڑھ گئی ہے۔''

اس کی تائید میں لئیق شاہ بھی زہرہ سے بولا۔ ''کمیل ٹھیک کہہ رہا ہے، ہمیں چوہدری ممتاز کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا ہی پڑے گا، آخر کب تک آپ اپنی خاندانی

مصلحتوں کی وجہ سے خاموش رہیں گی؟'' کمیل دادا کو لئیق شاہ کی اپنے لیے تائید ایک آنکھ نہیں بھائی، اس کی طرف کڑوی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیگم صاحبہ کی مجبوری بھی اپنی جگہ صحیح ہے، ممتاز خان آخر کو وڈے چوہدری کا سگا بیٹا ہے، اسے ہماری وجہ سے کچھ ہو گیا تو اس کا دکھ الف خان کو تو ہو گا ہی، اپنی بیگم صاحبہ بھی اس کا بہت دکھ کریں گی اسی لیے ہمیں کوئی درمیانی راستہ ہی سوچنا چاہیے۔''

''تمہارے خیال میں درمیانی راستہ اور کیا ہو سکتا ہے، کمیل دادا؟'' لئیق شاہ نے بھی اس کے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے پوچھ لیا تو کمیل دادا اس کے اس اچانک سوال پہ ایک لمحے کو گڑبڑا سا گیا... پھر بولا۔

''درمیانی راستہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو خود بیگم صاحبہ ہی صحیح بتا سکتی ہیں'' یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے صوفے پر براجمان زہرہ بانو کی طرف دیکھا... تو وہ جیسے کسی عمیق خیالات کے بھنور سے ابھر کے بولی۔

''میں خود بھی اسی درمیانی راستے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اول یہ کہ ہمیں ہر وقت اسلحے سے لیس ہو کر محتاط رہنا چاہیے، دوم یہ کہ لڑائی کے جواب میں لڑائی ہی کرنی ہو گی، یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے رہیں، لئیق شاہ نے ممتاز خان کے اہم آدمی وسیم عرف چھیما کو کیفر کردار تک پہنچا کے اسے خاصا بڑا جھٹکا دیا ہے۔ اس کے تازہ ناکام حملے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اُن میں اب زیادہ دم خم نہیں رہا، افسوس اگر اس وقت اس کا کوئی آدمی بھی مارا جاتا تو یہ زیادہ اچھا ہوتا، خیر... اب ہمیں اس کے ہر حملے کا منہ توڑ جواب دینا ہو گا۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی بیزار ہو کر چپ ہو کر بیٹھ رہے۔''

''بیگم صاحبہ یہ تو آپ کی خام خیالی ہو گی، اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ممتاز خان چپکا بیٹھا رہے گا۔'' کمیل دادا نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔ ''ملکیت اور جائداد کے معاملات بڑے اُلجھے ہوتے ہیں۔ نسلی دشمنی کی طرح یہ بھی ختم نہیں ہوتے۔''

''ان ساری باتوں کا ایک ہی حل ہے، ممتاز خان کو ہر محاذ پر منہ توڑ جواب۔'' لئیق شاہ نے کہا۔

''میں نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے کہ اب کی بار ممتاز خان کو معاف نہیں کروں گی۔'' بالآخر زہرہ بانو نے حتمی لہجے میں کہا تو لئیق شاہ بولا۔

''زہرہ صاحبہ! معاف تو میں بھی اسے نہیں کروں گا، اس نے میرے غریب ماں باپ کا خون کروایا ہے اور جس نے یہ سب کیا تھا اس سے تو میں پہلے ہی انتقام لے چکا ہوں لیکن ممتاز خان کو میں بھی نہیں بھولا ہوں۔''

''مجھے تمہارے دوست بختیار علی نے بتایا تھا کہ وہ تمہارے اصلی ماں باپ نہیں تھے؟''

کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر اچانک کہا تو لئیق شاہ نے ایک چونکتی ہوئی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی، پھر زہرہ بانو کی طرف ایک دزدیدہ سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے حقیقی ماں باپ نہیں تھے، لیکن انہوں نے مجھے سگے ماں باپ کی طرح پالا تھا۔''

''اور یہ... خواجہ سرا بجلی کا کیا معاملہ ہے؟ بختیار نے مجھے اس کے متعلق بھی بتایا تھا کہ وہ تمہیں بچپن سے جانتا ہے۔'' کمیل دادا نے اس کے ماضی سے متعلق ایک اور سوال داغا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دانستہ زہرہ بانو کے سامنے لئیق شاہ سے یہ سب پوچھ رہا تھا جبکہ لئیق شاہ بغیر جھجک کے اس کے سوالوں کے جواب دیے جا رہا تھا۔ مگر... بجلی والے ذکر پر اسے پھر پل کے لیے چپ سی لگ گئی، زہرہ بانو کی نگاہیں اسی کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ اس نے واضح طور پر لئیق شاہ کے ماتھے پر کرب کی ایک سلوٹ سی بنتی ابھرتی دیکھی، وہ خود تجسس کا شکار ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے لئیق شاہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''ہاں! بجلی سے میرا تعلق واقعی بہت پرانا ہے... وہ میرا محسن ہے۔''

''ایک ہیجڑا... اور تمہارا محسن؟'' کمیل دادا اپنے لہجے میں استہزائیہ انداز کی حیرت سموتے ہوئے بولا تو لئیق شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں کہا۔

''کیوں کمیل دادا، کیا ایک ہیجڑا کسی انسان پر احسان نہیں کر سکتا؟ تم کیا صرف جسمانی طاقت کو ہی بہادری کا معیار سمجھتے ہو، اگر ایسا ہے تو پھر مجھے تمہاری عقل پر حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہے۔''

گفتگو کا موضوع دوسرا رخ اختیار کرنے لگا تو زہرہ نے مداخلت کرتے ہوئے کمیل دادا سے کہا۔ ''کمیل دادا! یہ لئیق شاہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

''نن... نہیں... بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ؟'' کمیل دادا کچھ گڑبڑا سا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ زہرہ بانو، لئیق شاہ کے ایک ہیجڑے کے ساتھ ''تعلق'' پر ضرور چونکیں گی اور اسی وقت بجلی کے بارے میں لئیق شاہ سے کوئی چبھتا ہوا سوال ضرور کریں گی لیکن یہ دیکھ کر وہ خود

اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کہ بیگم صاحبہ نے تو اُلٹا اسے ہی بُری طرح سے ٹوک دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کبیل دادا کسی بہانے وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا تو زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''کبیل دادا کی باتوں کا برا مت منانا، یہ منہ کا تلخ ہے مگر دل کا صاف آدمی ہے۔''

''میں جانتا ہوں زہرہ صاحبہ! اسی لیے میرے دل میں بھی اس کے لیے احترام اور عزت ہے۔'' لئیق شاہ تفہیمی انداز میں بولا۔

چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا تمہارے حقیقی ماں باپ اس دنیا میں نہیں ہیں؟'' زہرہ بانو کی بات نے لئیق شاہ کے اندر ایک ہوک سی جگادی۔

''یہی تو اصل دُکھ ہے میرا، زہرہ صاحبہ کہ مرنے والے پیاروں پر رو دھو کر صبر آ ہی جاتا ہے لیکن... جو جیتے جاگتے بچھڑ جائیں... وہ ساری عمر دُکھ کے مارے بے چین رکھتے ہیں، آج مجھے اپنے ماں باپ سے بچھڑے پندرہ برس بیت چکے ہیں... لیکن، میں آج بھی خود کو میلے کی بھیڑ میں گم ہوجانے والا خوف زدہ اور روتا ہوا ایک معصوم بچہ ہی سمجھتا ہوں، جو آج بھی لوگوں کی بھیڑ میں ہراساں اور پریشان، اپنے کھوئے ہوئے ماں باپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔'' یہ بتاتے ہوئے لئیق شاہ کا لہجہ غم زدہ سا ہو گیا۔ زہرہ بانو اسے اس قدر دُکھی پا کر خود بھی بے چین سی ہوگئی، اس کی طرف دیکھ کر ملائمت سے بولی۔

''تو پھر تم نے انہیں اب تک تلاش کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟''

''میرا تو ہر پل، ہر لمحہ ان کی تلاش میں ہی گزرتا ہے زہرہ صاحبہ!'' وہ ایک رنجیدہ سی سانس خارج کرکے بولا۔ ''لیکن ابھی تک مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے... میں آج بھی اپنے ماں باپ کو یاد کر کے تنہائیوں میں روتا ہوں... مجھے ان کی محبت، ان کا پیار ابھی تک یاد ہے۔ وہ دونوں مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، میں گویا ان کی آنکھوں کا تارا تھا، اکلوتا تھا، اس وقت میں شاید گیارہ، بارہ سال کا تھا کہ میں گھر میں ایک اور خوشی کی خبر سننے لگا... شاید میرا کوئی بھائی یا بہن بھی دنیا میں آنے والا تھا... لیکن اسی دنوں بدقسمتی سے...''

اچانک یہ سب بتاتے ہوئے لئیق شاہ کا دل بھر آیا۔ اپنے دُکھ بھرے ماضی اور اپنے بے انتہا محبت کرنے والے ماں باپ کو یاد کر کے وہ غم زدہ ہو گیا... اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ شاید اپنی آنکھوں کی نمی کو زہرہ بانو سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

لئیق شاہ کو اس قدر دُکھی اور غم زدہ دیکھ کر زہرہ بانو تڑپ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی اور دلاسا دینے والے انداز میں لئیق شاہ کے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپتھپایا اور بولی۔

''حوصلہ کرو لئیق! ایک انسان کے ساتھ ہی یہ سب کچھ ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے ہی یہ سب آزمائشیں آتی ہیں جس کے در پر وہی سُرخرو ہوتے ہیں جو اس کی آزمائش پر صبر و استقامت اختیار کرتے ہیں اور اس سے بہتری کے لیے دعا گو رہتے ہیں... انشاء اللہ ایک دن تم اپنی تلاش میں ضرور کامیاب رہو گے۔ پھر میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔''

لئیق شاہ خود کو سنبھال چکا تھا، اسی طرح سر جھکائے رنجیدگی سے بولا۔ ''ہاں زہرہ صاحبہ! ایک اسی سوہنے رب کا ہی تو آسرا ہے کہ میں ناامید نہیں ہوا ہوں۔''

پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد زہرہ بانو نے ہولے سے کہا۔ ''دیکھو لئیق! اپنا غم کہہ دینے سے آدھا رہ جاتا ہے، اور پھر اب تم مجھے بھی آج سے اپنی اس تلاش میں شامل سمجھو، میری خواہش ہے کہ تم مجھے اپنی یہ دُکھ بھری بپتا سناؤ، ایک سے دو بھلے کے مصداق، ممکن ہے تمہاری یہ داستان سن کر میرے ذہن میں کوئی ایسی بات آجائے جو تمہارے لیے معاون ثابت ہو؟'' زہرہ بانو کی بات سن کر لئیق شاہ نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا... پھر کچھ سوچنے لگا... اس کے چہرے پہ اس وقت ایک جوار بھاٹے کی سی کیفیت تھی... ایک اُبال تھا یا کوئی نامعلوم سی کشمکش... صاف نظر آتا تھا کہ وہ اندر سے کسی شدید دباؤ کا شکار ہو رہا ہے... وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''شاید مجھے اب اپنے بارے میں آپ کو حقیقت بتا دینی چاہیے میں خود بھی کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کم از کم آپ سے یہ سب نہ چھپاؤں لیکن مجھے ایسا کوئی موقع ہی نہیں ملا مگر آج میری غم رسیدہ تقدیر نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا۔ ہاں... اب میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا... سب بتا دوں گا کہ میری اصل حقیقت کیا ہے اور میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟''

زہرہ بانو کی نگاہیں لئیق شاہ کے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں وہ دل اندر سے پتے کی طرح لرز رہا تھا، جانے کیوں

زہرہ بانو کے دل میں ہزاروسوسے جنم لینے لگے اور وہ اس کی چاشنے کے لیے بے قراری ہوگئی... لئیق شاہ کا چہرہ الاؤ کے مانند دہکنے لگا تھا۔

وہ شاید اسے اپنی داستان دل سوز سنانے کے لیے مناسب الفاظ ہی نہیں بلکہ حوصلہ بھی ڈھونڈ رہا تھا۔

☆☆☆

''بستی پر دسمبر کی سرد اندھیری رات اُتری ہوئی تھی۔ ہر سو گہرا سناٹا طاری تھا۔ رات کے جانے کون سے پہر میری اچانک آنکھ کھلی تھی، اس روز تیز بارش بھی ہو رہی تھی۔ موسم بہت سرد تھا۔ میں اپنے کوٹھری نما کمرے میں ایک چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی، لالٹین کی ہلکی روشنی بھی دیواروں پر لرز رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اس چھوٹی سی کھڑکی کی طرف دیکھا جو میرے سر کے قریب ہی تھی، مختصر سے نیم پختہ صحن میں مجھے دو سائے آمنے سامنے کھڑے دکھائی دیے۔

''تاج دین! اس وقت تمہارا کیسے بلاوا آگیا؟ یہ رات اور یہ موسم دیکھ رہے ہو؟''

یہ میری ماں کی آواز تھی۔ وہ میرے باپ سے مخاطب تھی۔ پھر میں نے اپنے باپ کی آواز سنی، وہ میری ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''او... جھلیے! ایسا مت بولا کر... یہ بلاوا میرے افسروں کا بلاوا نہیں ہے۔ یہ تو میرے محبوب وطن کی پکار ہے... وہ مجھے بلاتا ہے... کہ آ... اے میری سرحدوں کے سپاہی... دشمنوں نے میری طرف میلی نظروں سے دیکھا ہے... اور... پھر بھلا مجھے کون روک سکتا ہے نویدہ؟ سچ کہوں تو تو بھی نہیں۔''

''نہیں تاجے! میں بھلا کیسے یہ دغا بازی کر سکتی ہوں... کہ تجھے نہ جانے دوں... میں تو بس... ویسے ہی۔'' میری ماں کا جی بھر آیا تھا... پھر میرا باپ چلا گیا۔

یہ سب میرے لیے نیا کب تھا؟ میں اکثر یہ دلگیر منظر اسی طرح پُرجوش مکالموں کے ساتھ دیکھا کرتا... انہی مکالموں میں کچھ ایسے معنی خیز جملے بھی ہوتے، جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ ہمارے گھر کوئی ننھا منا مہمان بھی آنے والا تھا۔ مجھے کچھ اتنی سمجھ نہیں تھی کہ یہ کون ''مہمان'' تھا؟ مگر ایک دن میں نے اس سلسلے میں اپنے ماں باپ کو گفتگو کرتے ہوئے سنا۔

''نویدہ! دعا کر رب سوہنا مجھے ایک اور بیٹا دے... پھر میرے دو بازو ہوں گے... پھر میں اپنے دونوں بیٹوں کو اس پاک وطن کا سپاہی بناؤں گا۔''

''تاجے! سچ پوچھے تو مجھے بیٹی کی خواہش ہے... پر... میں پھر بھی تیری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوہنے رب سے ایک اور بیٹے کی دعا کروں گی۔''

میرا باپ یہ بات سن کر خوش ہو گیا۔

اس وقت میری عمر گیارہ بارہ برس تھی، میں معصوم بچہ ہی تھا، دھندلا دھندلا سا مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ سیالکوٹ کے کسی سرحدی گاؤں میں رہتا تھا، گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا اور آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔

میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ ایک مخصوص وردی میں ہی دیکھا تھا، بس عید اور جمعے کی نماز میں ہی وہ وردی میں نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اسے سرحد کا سپاہی کہتے تھے، اور میرا باپ تھا بھی ایک بہادر اور دیانت دار سپاہی۔ پاس کے ایک سرحدی کیمپ میں اس کی ڈیوٹی ہوتی تھی، وہاں وہ بارڈر سیکیورٹی فورسز کی تھرڈ رجمنٹ کمپنی کی سرچنگ ونگ میں انچارج واچ مین تھا۔ میرے باپ کا پورا نام تاج دین شاہ تھا۔

بلاشبہ میرا باپ ایک بہادر اور وطن سے بے حد پیار کرنے والا ایک سچا جیالا سپاہی تھا۔ میں نے گاؤں کے اکثر لوگوں کو اپنے باپ کے بعض کارناموں کی تعریفیں کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔ گھر میں بھی وہ میری ماں کو سرحد پر ہونے والی کشمکش کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ اس نے کئی خطرناک اسمگلروں کا خود تعاقب کر کے انہیں گرفتار کروایا تھا۔ اکثر و بیشتر سرحد پار سے چوری چھپے داخل ہونے والے پڑوسی ملک بھارت کے جاسوسوں کو بھی پکڑنے میں اپنے افسروں کی مدد کی تھی۔ وہ مجھے بھی مستقبل میں اپنی طرح ایک وطن پرست اور بہادر سپاہی کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

کئی گمنام سرفروش سپاہیوں کی طرح میرا باپ بھی اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت اور ملک دشمن عناصر کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ایک دن نجانے کہاں چلا گیا... یا شاید گمنامی کی موت شہید ہو گیا۔ ان دنوں وطن عزیز پڑوسی ملک بھارت کے ساتھ تازہ رنجشوں سے گزر رہا تھا اور سرحدوں کی سختی کے ساتھ حفاظت اور کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔

اکثر بھارتی فوجیوں کی طرف سے بلا اشتعال فائرنگ کے واقعات بھی سننے میں آتے رہتے تھے اور لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کا بھی پاکستانی افواج منہ توڑ جواب دیتی تھی۔ یہ بھی انہی دنوں کا ایک واقعہ تھا جب میرا

باپ ڈیوٹی پر گیا تو پھر کبھی نہیں لوٹا۔

اُن کے افسروں کی زبانی سننے میں یہی آیا کہ وہ کسی دشمن جاسوس کے تعاقب میں سرحد پار کر گیا تھا۔ شنید تھی کہ وہ دشمن جاسوس ایک اہم ملکی راز لے اُڑا تھا۔ پھر اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں...

میری ماں غم سے نڈھال رہتی تھی، میں بھی باپ کو یاد کر کے اُداس ہو جاتا... انہی دنوں گاؤں میں میلہ لگا... ماں مجھے بھی لے گئی... ذرا دیر کو ہم ماں، بیٹا اپنا غم بھول گئے۔

وہیں میلے میں مجھے ایک عجیب سی شکل وصورت کا آدمی ملا... وہ میری طرف دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا تھا، میں بچہ ہی تھا، اس کے ساتھ ہیل گیا اور پھر نجانے کب میری ماں کا دھیان مجھ سے ہٹ گیا اور وہ عجیب صورت آدمی مجھے کھلونوں کے ایک اسٹال پر لے گیا، وہاں ایک لکڑی کا گھوڑا مجھے پسند تھا اور میلے میں آتے ہی میں نے ماں سے وہ دلانے کی فرمائش کی تھی مگر مہنگا ہونے کے باعث ماں نے مجھے ٹال دیا تھا اور میں اپنا دل مسوس کے رہ گیا تھا۔ وہ آدمی تب سے ہی مجھے جانچے ہوئے تھا اور ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔

اس نے مجھے لکڑی کا گھوڑا دلا دیا اور میں خوش ہو گیا مگر ڈر بھی لگا، اس آدمی سے نہیں بلکہ اپنی ماں سے، اگر اس نے میرے پاس یہ قیمتی گھوڑا دیکھ لیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا؟ یہی کہ یہ مجھے کسی اجنبی نے لے کر دیا ہے، وہ یقیناً مجھ پر غصہ ہوتی... مگر مجھ بدنصیب کو کیا معلوم تھا کہ میں یہ منحوس کھلونا پانے کے بعد اپنی ماں کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔

میں نے اس آدمی سے اپنی ماں کے پاس جانے کو کہا تو اس نے مجھے کوئی چیز کھانے کو دی اور بولا۔ ”یہ کھا لو، پھر تمہاری ماں کے پاس لے چلتا ہوں تمہیں۔“

وہ کوئی میٹھی گولی تھی، جسے کھانے کے بعد میں بے ہوش ہو گیا، اور جب ہوش آیا تو میری آنکھ بڑی ہی عجیب جگہ پہ کھلی، میں دنگ رہ گیا، بڑا عجیب اور گھٹا گھٹا ماحول تھا یہاں کا بلکہ یہ لوگ عجیب ہی نظر آرہے تھے، ان کی وضع قطع... مختلف ہی تھی۔ نہ یہ مرد دکھائی دیتے تھے نہ عورت... مجھے یاد آیا کہ میں نے گاؤں میں یا پھر شہر میں کہیں ان جیسے لوگ دیکھے ضرور تھے... انہیں ہیجڑا کہا جاتا تھا۔ اس وقت تو مجھے ہیجڑے کا مطلب بھی نہیں آتا تھا۔

میں پریشان بھی ہوا اور رونے بھی لگا... اور ”ماں... ماں“ پکارنے لگا۔ میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ میں رو رو کر ہلکان ہو گیا... اور پھر شاید بے ہوش ہو گیا۔

پھر جب مجھے ہوش آیا تو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا، میں کسی ایک جگہ پر، ایک مقام پر نہیں تھا... بلکہ چلتی ہوئی حالت میں تھا... ہاں، مجھے کسی سواری پر بٹھایا گیا تھا... جو آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی... اور میں ایک کجاوے نما کاٹھی کے اندر تھا، جس پر کپڑا چڑھا ہوا تھا، جیسے ڈولی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دی مگر قاصر رہا، چلانا چاہا، تو ناکامی ہوئی۔ میں رسن بستہ حالت میں تھا اور منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ معصوم بچہ ہی تھا میں اور وہ بھی اپنی ماں سے بچھڑا ہوا۔ ایسی ماں سے جس کا میں بہت پیارا اور لاڈلا تھا۔

ماں کو یاد کر کے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور میں گھٹی گھٹی آواز میں رونے اور سسکنے لگا، نجانے یہ کیسا سفر تھا اور کہاں کا سفر تھا جو بہت دیر سے جاری تھا۔ وقت کون سا تھا؟ کچھ اندازہ نہیں ہو پایا، کجاوے کی جگہ بہت تنگ اور محدود تھی... جس کے اندر اندھیرا زیادہ تھا اور روشنی کم۔

کافی دیر گزر گئی... میں روتے سسکتے پھر سو گیا... شاید اس میٹھی گولی کا اثر اب تک مجھ پر طاری تھا کہ طبیعت ست اور نڈھال سی ہو رہی تھی۔ ایک نشے کی سی حالت ہو رہی تھی میری۔ میں پھر سو گیا یا شاید میں دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

دوبارہ شاید بہت دیر بعد میری آنکھ کھلی تھی... میں نے خود کو ایک کوٹھری نما کمرے میں پایا، جس کی زمین ناہموار تھی، اس پر میلی سی دری بچھی ہوئی تھی۔ اب میں کہہ سکتا تھا کہ یہ وقت رات کا تھا۔ کیونکہ کمرے میں ایک بلب روشن تھا۔ بڑا گھٹا گھٹا سا ماحول محسوس ہو رہا تھا یہاں کا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے، منہ سے بھی کپڑا ہٹا دیا گیا تھا۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا... دروازہ باہر سے بند تھا۔

”دروازہ کھولو... مم... مجھے اپنی ماں کے پاس جانا ہے... دروازہ کھولو۔“ میں رونے اور چیخنے چلانے لگا... اسی وقت دروازہ کھل گیا، میں نے باہر بھاگنے کی کوشش چاہی لیکن مجھے کسی نے دبوچ لیا... اور ایک تھپڑ بھی میرے جڑ دیا... میں دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے دبوچ کر اسی جگہ دوبارہ دھکا دے دیا جہاں کچھ دیر پہلے میں پڑا تھا۔

”او لمڈے! اب اگر تو نے آواز نکالی تو گلے پر

تیرے یہ چھری پھیر دوں گا... سمجھا تو؟''

مجھے دبوچنے والے نے بڑے خونخوار لہجے میں مجھے دھمکایا، میں ڈر گیا، اس کی طرف دیکھا اور چونک پڑا، یہ وہی عجیب صورت آدمی تھا جس نے مجھے میری پیار کرنے والی ماں سے جدا کیا تھا... پہلی بار میرے دل میں اس گھٹ وَنے آدمی کے خلاف نفرت کی شدید لہر اُٹھی تھی۔

میں نے اس کی منت کی۔ ''مم... مجھے... مم... میری ماں کے پاس چھوڑ آؤ ناں؟ وہ میرے لیے بہت پریشان ہورہی ہوگی... دیکھو... تم... تم نے مجھے کاٹھ کا گھوڑا بھی تو لے کر دیا تھا ناں؟ تم اچھے ہو ناں۔'' میرے معصومانہ جملوں پر اس سنگ دل اور بے رحم انسان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اُلٹا اس نے مجھے مارے طیش کے بری طرح پیٹنا شروع کردیا۔ میں تکلیف کے مارے چلانے لگا۔ اسی وقت ایک اور آدمی اندر آیا، یہ بھی اسی کی طرح کا تھا، نہ مرد نہ عورت... یعنی ہیجوا۔ مگر مقابلتاً اس سے ذرا صحت مند تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھی سے چھڑاتے ہوئے بولا۔

''سکھ دیو! کیا مار ڈالے گا اس کو؟ پرے ہٹ، چھوڑ اسے۔''

مجھے پیٹنے والا سکھ دیو تھا۔ میں اس نام پر چونکے بنا نہ رہ سکا، کیونکہ یہ نام میرے لیے اجنبی ہی سا تھا، اگرچہ گاؤں میں اس نام کے کچھ لوگ رہتے تھے۔

اس مہربان آدمی کی مداخلت نے مجھے اس جلاد صفت آدمی کی مزید مار پیٹ سے بچالیا، میں سسکیاں لے کر رونے لگا۔ وہ مجھے پیار سے پچکارنے لگا... سکھ دیو کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک میری طرف پرطیش نظروں سے گھور رہا تھا... پھر اپنے ساتھی سے بولا۔

''ریکھا! اچھی طرح سمجھالے اس لمڈے کو، اگر دوبارہ اس نے رونا دھونا ڈالا تو میں اس کی کھال کھینچ لوں گا۔''

''ہاں! تو جا یہاں سے، میں اسے سمجھا دیتی ہوں۔''

ریکھا نامی اس مہربان عورت نے اس سے کہا۔ اب میں اسے ریکھا نام کے حوالے سے عورت ہی کہوں گا، بچے سے جو بھی پیار کی زبان میں بات کرے، بچہ اس کی جانب کھنچا ضرور ہے... مجھے بھی یہ ریکھا اچھی لگی تھی یا اچھا لگا تھا... وہ بھی انہی کے قبیل کی تھی مگر بہرحال اس نے مجھے اس سنگدل آدمی کی مار سے بچایا تھا۔

ریکھا مجھے پیار سے پچکارنے لگی... پھر جیسے مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو بنٹو...!

''میرا نام... لئیق ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''اب تجھے یہ نام بھلانا پڑے گا... تیرا نام اب بنٹو ہے۔'' اس نے کہا تو میں بچوں جیسی روایتی ضد پہ آگیا، برا مان کے بولا۔

''نہیں مجھے اپنا نام ہی اچھا لگتا ہے۔''

ریکھا اس بار سنجیدگی سے بولی۔ ''اگر تو اسی طرح ضد کرتا رہے گا تو پھر میں تجھے دوبارہ اسی سکھ دیو کے حوالے کردوں گی۔'' میں اس کی دھمکی سے ڈر گیا اور پھر اس کی منت سماجت کرتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

''نہیں... نہیں... مجھے اس کے حوالے مت کرنا، وہ بڑا ظالم انسان ہے، پہلے اس نے مجھے میٹھی گولی دے کر بہلایا پھر مجھے میری ماں سے دور کیا اور اب چالاکی سے یہاں لا کے مجھے مارتا بھی ہے... تم... تم... اچھی ہو ناں، اللہ کے واسطے مجھے میری ماں کے پاس چھوڑ آؤ ناں۔''

''پھر وہی باتیں شروع کردیں تم نے؟'' ریکھا نے پھر مجھے ٹوکا۔ میں اس کا چہرہ تکنے لگا، وہ مجھے سمجھاتے ہوئے آگے بولی۔

''دیکھ بنٹو! پہلی بات تو یہ سن لے تو... کہ اب یہی تیرا ٹھکانا ہے، اور مجھے اور سکھ دیو کو ہی اب تو اپنے ماں باپ سمجھے گا۔ یہاں ہر آنے والے کا شروع میں یہی نام ہوتا ہے... بعد میں بدل دیا جاتا ہے۔ تمہیں اب اپنی ماں اور اپنے گھر بار کو بھلانا ہوگا... اب یہی تمہارا گھر ہے، اور ہم تمہارے اپنے، ورنہ اگر تم نے پھر وہی پرانی رٹ شروع کردی تو میں تمہیں سکھ دیو کے حوالے کردوں گی... سمجھ گئے؟''

اس کا لہجہ بھی ایک دم بدل گیا تھا... میں چپ ہوگیا۔ اب یہ بھی مجھے بری لگنے لگی تھی۔ یہ سب ایک ہی تھے۔ اگلی بار وہ مجھ سے تحکمانہ لہجے میں بولی۔

''اب میری ایک بات غور سے سنو بنٹو! اور یاد بھی رکھو، کل تمہیں ہمارے سردار کے سامنے پیش کیا جائے گا... اور وہاں تمہیں کوئی شور شرابہ نہیں کرنا، ٹھیک ہے؟''

''کیوں؟ کیا سردار مجھے مارے گا؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ سکھ دیو سے زیادہ غصے والا آدمی ہے، وہ تمہیں جان سے بھی مار سکتا ہے۔ بس تم خاموش رہنا۔ اور وہ تم سے جو سوالات کرے اس کا ہاں میں ہی جواب دینا۔'' ریکھا بولی... میں اس کی بات سن کر اندر سے خوف زدہ ہوگیا۔ پتا نہیں ان کا سردار کون تھا، کیا تھا؟ مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ ضرور ان ہیجڑوں کا سردار ہی ہوگا۔

اس رات مجھے اسی کوٹھری میں ہی رکھا گیا تھا۔ پتا

نہیں مجھے کیا کھانے کو دیا گیا تھا جسے ہاتھ لگانے کو بھی میرا جی نہیں چاہا تھا۔ پانی تک نہیں پیا تھا میں نے۔ وہ رات میں نے بھوکا پیاسا سو کر گزار دی۔

اگلے دن میں سو کر جاگا بلکہ مجھے جگایا گیا تھا۔ یہ کوئی تیسرا فرد تھا اور جوان لڑکا سا تھا۔ رنگت کالی کلوٹی تھی، یہ بھی مجھے ہیجڑا ہی لگ رہا تھا، چھوٹا ہیجڑا... مگر اس کے چہرے کے نقش اچھے تھے... اس نے عورتوں والا ہی روایتی سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا، میں نے اس سے مصافحہ کیا تو وہ دوستانہ لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''میرا نام... راج ہے، آج سے تم اور میں دوست ہیں... ٹھیک ہے؟'' اس کی آواز عجیب آہنگ لیے ہوئے تھی۔ مجھے تو یہ بھی برا لگا تھا، مگر چونکہ عمر میں یہ مجھ سے چند سال ہی بڑا تھا اس لیے مجبوراً میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

''کیا تم بھی انہی جیسے ہو...؟ میرا مطلب ہے... آدھا مرد اور آدھی عورت؟''

وہ میری بات پر ہنسا پھر ایک تالی پیٹ کر زنانہ نما مردانہ آواز میں بولا۔ ''اس بستی میں تمہیں سب ہی ایسے لوگ ملیں گے۔''

''بستی؟ یہ کون سی بستی ہے؟ میں نے تو اپنے گاؤں میں کہیں بھی ہیجڑوں کی ایسی کوئی بستی نہیں دیکھی؟''

''یہ تمہارا گاؤں نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ میرا گاؤں نہیں ہے؟ تو پھر یہ کون سی جگہ ہے؟''

''تم اپنے گاؤں سے بہت دور، سرحد پار کی ایک بستی میں ہو۔'' اس نے جیسے میرے سامنے ایک بھیانک انکشاف کیا... میں پریشان ہو گیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''لل... لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ میرا تمہاری بستی میں بھلا کیا کام ہے؟ میں تو... میں تو... تم لوگوں جیسا نہیں ہوں۔''

''ہم جیسے نہیں ہو تو کیا ہوا پھر... بہت جلد تم بھی ہمارے جیسے بنا دیے جاؤ گے... یعنی ہانجڑو۔''

''ہانجڑو؟'' میں استفہامیہ انداز میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

اس وقت میں اس کی اس ہولناک بات کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا لہٰذا قدرے الجھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا تم جیسا کس طرح بن سکتا ہوں؟ میں تو میں تو...'' مجھ سے آگے بولا ہی نہیں گیا، وہ معنی خیز انداز میں ہنسا... وہ شاید میری ناسمجھی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ میری نقل اتارتے ہوئے بولا۔

''میں تو... میں تو... کیا؟'' پھر وہ اچانک خاموش ہو گیا اور بہ غور میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے لگا، اس دوران اس کی آنکھوں میں عجیب سی بھوکی چمک ہلکورے لے رہی تھی، جسے میں کوئی معنی نہیں دے سکا... تاہم اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بولا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟ کیا میں کوئی لڑکی ہوں...؟'' میں اس پر تھوڑا خفا ہوا۔

''تم بہت خوبصورت ہو... مجھے پورا یقین ہے کہ جب تم ہمارے جیسے بنا دیے جاؤ گے تو اور زیادہ حسین لگو گے اور سردار پچھو کو بھی خوب دولت کما کر دو گے۔''

میرے چھوٹے سے ذہن میں اس کی یہ بیہودہ بات کچھ سمجھ آئی کچھ نہ آسکی، تاہم میرے اندر ایک کھٹک سی ابھری تو میں اس کی طرف ناگواری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میں... عورتوں والے کپڑے پہن لوں گا تو تم لوگوں جیسا ہو جاؤں گا؟''

''صرف کپڑے پہننے سے یہ سب نہیں ہوتا... اس کے لیے تمہیں سب سے پہلے باقاعدہ ایک خدمی کے عمل سے گزارا جائے گا... اس کے بعد...''

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت ریکھا نامی ہیجڑا اندر داخل ہوا تھا اور ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد وہ لڑکے سے بولا۔ ''رمو! تم یہاں کیا اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے ہو؟ لے کر کیوں نہیں گئے اسے تم ابھی تک؟''

رمو نام کا وہ لڑکا گھبرا سا گیا۔ بولا۔ ''ابھی لیے جاتا ہوں ریکھا دیوی! چھما کر دو، میں اسے ذرا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''بس... بس... زیادہ ودی چلتر نہ کر میرے ساتھ... لے آ اسے ابھی۔'' ریکھا نے ہاتھ نچا کر رمو کی طرف دیکھتے ہوئے درشتی سے کہا اور واپس لوٹ گیا۔

''چل اوئے بھو... خالی پیلی میں ڈانٹ پڑوا دی۔ اب کیا سردار جی سے میری مار پڑوائے گا'' رمو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔

''نہیں پہلے مجھے بتاؤ تم مجھے سردار کے پاس کیوں لے جا رہے ہو؟ اور... اور... یہ خدمی کیا ہوتا ہے؟ تم... تم... میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں خوف زدہ سا ہونے لگا... وہ دانت پیس کر میری جانب بڑھا اور غصے سے بولا۔

’’زیادہ جیوٹ نہ بن... ورنہ ایسی درگت بنے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا... چل۔‘‘

میں رونے لگا۔ اور اس کے ہمراہ چل پڑا۔

میں اس لڑکے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا... مگر کم بخت ریکھا کی اچانک مداخلت کے باعث نہ پوچھ سکا۔

بہرحال، رمو مجھے اس کمرے سے لے کر نکلا تو ہم ایک نسبتاً بڑے کمرے سے گزرنے لگے، یہاں بھی کئی ایسے لوگ مجھے نظر آرہے تھے جنہوں نے رنگ برنگ کپڑے، جو زیادہ تر چینی کوٹ، بلاؤز اور ساڑیوں پر مشتمل تھے، پہنے ہوئے تھے، وہ سب عجیب اور بھدی آوازوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باتوں اور چہلوں میں مصروف تھے، اور سگریٹ، بیڑیاں پی رہے تھے، گاڑھے گاڑھے دھوئیں سے ماحول کثیف اور وحشت ناک سا ہو رہا تھا، کئی میری جانب بھی متوجہ ہوئے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر فحش اشارے کر رہے تھے، دو چار نے تو ورس میں تالیاں پیٹ کر میری طرف معنی خیز جملے بھی اچھال دیے۔

’’آئے ہائے... ذرا ادھر بھی ایک نظر ہو جاوے ہے، بانکا تو بڑا جیوٹ دکھائی پڑتا ہے۔‘‘

’’کیسا جیوٹ اور کہاں کا جیوٹ ری نجو! اب تو سب دھرا رہے جاوے ہے۔‘‘

’’رے رمو! اب تو ہی اسے تالی پیٹنا سکھلا دے یا ہمرے پاس چھوڑ دے... سب کچھ ایک ہی رات میں سکھلا دیں گے۔‘‘

ہال میں بے ہنگم قہقہے گونجنے لگے... مجھے اس گندے ماحول سے ہی وحشت ہونے لگی، میں ایک ناقابلِ بیان سی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں اسی وقت رمو کا ہاتھ جھٹک کر یہاں سے بھاگ کھڑا ہوں۔ اور ایک موقع پہ مجھے ایک ایسا دروازہ بھی نظر آ گیا... جو شاید باہر کی طرف ہی کھلتا تھا۔ میں نے رمو سے ہاتھ چھڑا کے بھاگنے کی کوشش چاہی تو میں اپنا ہاتھ رمو کی مضبوط گرفت سے نہ چھڑا سکا۔ میں نے اس کے ساتھ کھینچا تانی شروع کر دی مگر بے سود... وہ مجھے اسی طرح بڑے مطمئن انداز میں کھینچتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں لے آیا، جہاں میں نے چند اور گیم تیم اور مسٹنڈے ہیجڑوں کو دیکھا... ان میں سکھ دیو اور ریکھا بھی شامل تھے۔

یہ کمرا تو نسبتاً بہتر تھا مگر ماحول وہی تھا۔ سگریٹ اور عجیب سے تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی، کمرے کی دیواریں پختہ تھیں اور فرش پر قدرے صاف سی دری بچھی ہوئی تھی۔

سامنے کچھ عام سی کرسیاں دھری تھیں، ایک گینڈے جیسے جسے اور کالے رنگت کا موٹی موٹی ابلی ہوئی آنکھوں والا شخص ایک گدی پر بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں بڑے بڑے گول بالے لٹک رہے تھے، ہاتھ کی مٹھی میں موٹی سی بیڑی دبی ہوئی تھی، سر اس کا بالکل گنجا تھا، اور ناک موٹی تھی۔ اس نے جسم پر فقط ایک میلی سی صدری پہن رکھی تھی اور دھوتی باندھی ہوئی تھی۔

مجھے اسی کے سامنے رمو نے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

وہ ہیجڑوں کا سردار پنچھو ہی تھا... یہ میرا اندازہ تھا جو بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ وہ مجھے پہلے تو خاموشی سے گھورتا رہا اس کے بعد کرسی سے اٹھ کر میری جانب آیا اور مجھے بہت قریب سے گویا تولتی نظروں سے دیکھنے لگا، کئی ایک جگہ اس نے جیسے مجھے ٹھونک بجا کر بھی دیکھا... مجھے اس سے خوف سا آنے لگا۔ میں سہمی سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا تو کبھی اس سے نظریں چرا لیتا۔

’’ہوں...‘‘ اس کی بیل جیسی ایک بھکاری سی آواز ابھری، اس کے بعد وہ بڑے عجیب سے لہجے میں خود کلامی بڑبڑایا۔

’’بانکا تو جاندار دکھائی پڑتا ہے... وزن بھی سہہ جائے گا۔ اور ہمارے بہت کام آوے گا۔‘‘ یہ بکواس کرنے کے بعد وہ بدہیئت سا گروہ شخص دوبارہ اپنی کرسی کی طرف لوٹ گیا اور اس پر براجمان ہوتے ہی اس نے اپنی بھاری اور کھرکھراتی آواز میں قریب موجود سکھ دیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

’’آج رات اس کی خدمتی کی تیاری کرو۔‘‘

’’بہت بہتر مہاراج!‘‘ سکھ دیو نے فوراً مودبانہ انداز میں ایک عدد تالی پیٹ کر کہا۔

’’اس کا منتر ماس ہم خود اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔‘‘ ہیجڑوں کے سردار پنچھو نے کھرکھراتی آواز میں کہا... اور سب نے بہ یک آواز ’’بدھائی ہو... مہاراج کی بدھائی ہو‘‘ کہنا شروع کر دیا... اس کے بعد سکھ دیو نے ریکھا کو مخصوص اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھی اور مجھے اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے آئی۔

یہ رہائشی کمرا تھا۔ یہاں ایک بستر لگی چارپائی بچھی تھی اور دو کرسیوں کے علاوہ کپڑوں وغیرہ کی چھوٹی سی الماری بھی تھی۔

مجھے ریکھا نے چارپائی پر بٹھا دیا اور پوچھا۔ ’’تو نے کچھ کھایا پیا کیوں نہیں ہے ابھی تک؟‘‘

''مجھے بھوک نہیں تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہوگا تیرے لیے۔'' وہ بولی یا بولا۔

''تم لوگ آخر میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ یہ... یہ... شدھی کیا بلا ہے؟ آج رات میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟'' میں تنگ آئے ہوئے لہجے میں بولا۔ اس میں ڈر بھی تھا اور ایک نامعلوم ہراس بھی۔ ریکھا بولی۔

''اوئے بالکے! تیری عیاشیوں اور خوشیوں کے دن آنے والے ہیں، سردار نے تجھے پسند کرلیا ہے، اور جانتا ہے، ایک بار سردار چھو کسی پر مہربان ہوجائے تو اس کے سمجھو پوہ بارہ ہوگئے۔''

میرا جی چاہا اسی وقت اس کے سردار کو ایک موٹی سی گالی دے ڈالوں مگر ظاہر ہے میں ایسا نہیں کرسکتا تھا... کیونکہ میں تو خود ان کے رحم و کرم پہ تھا... مگر پھر بھی نجانے کیوں ایک نامعلوم سا ہولناک خیال مجھے بار بار پریشان سا کررہا تھا... ریکھا نے کہا۔

''میں تیرے لیے بھوجن لاتی ہوں، بھوکا رہنا صحیح نہیں ہوگا آج تیرا مہورت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہنسی تھی... پھر چلی گئی۔

اس کے کمرے سے جانے کے بعد میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا... اسے تھوڑا دھکیلا تو یک بارگی میرا دل خوشی کے مارے زور سے دھڑکا، وہ کھلا ہوا تھا۔ ریکھا کمرے سے باہر جاتے ہوئے یقیناً دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ میں نے پہلے دروازہ تھوڑا کھول کے باہر جھانکا اسی کمرے سے متصل وہ ہال کمرا تھا جہاں اور بھی لوگ (ہیجڑے) موجود تھے، مجھ میں باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوسکی... یہ مجھے بھاگتے ہوئے پکڑ سکتے تھے۔ میں وہیں دروازے سے لگا اس کی باریک متوازی جھری سے باہر دیکھتا رہا... اور پھر میرے اندر ایک جوار بھاٹا سا بیدار ہوا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یکدم دروازہ کھول کے باہر نکلا اور ایک دوسرے دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔ ہال میں یکدم شور مچ گیا۔ یہ شور کسی کو خبردار کرنے یا ''پکڑو... جانے نہ پائے'' جیسا نہیں تھا بلکہ استہزائیہ قہقہوں کا تھا... پھر جیسے ہال میں بلی چوہے کا کھیل شروع ہوگیا۔

کبھی کوئی میرے آگے آتا اور مجھے پکڑ کے دوسرے کی طرف دھکیل دیتا تو کبھی کوئی مجھے قہقہہ مار کے دبوچتا اور اپنے ساتھی کی طرف اُچھال دیتا۔ کچھ ہیجڑوں نے میرے ساتھ نازیبا حرکت بھی کی تو مجھے مارے شرم کے واپس اسی کمرے میں پناہ کے لیے لوٹنا پڑا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ریکھا ایک چھوٹے سے تھال نما ٹرے میں میرے لیے کھانے وغیرہ کا سامان لے آئی... مگر اس کے چہرے پہ برہمی کے آثار تھے۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اپنا منہ بسورے چپ بیٹھا رہا۔

''تو نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی؟''

''ہاں'' میں نے بلاخوف کہا۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ ''تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میرا تم لوگوں سے بھلا کیا تعلق ہے؟ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔''

ریکھا چند ثانیے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچے مجھے تکتی رہی پھر تھال ایک تپائی پہ رکھنے کے بعد مجھ سے تیز لہجے میں بولی۔

''اگر تمہاری اس حرکت کا سکھ دیو کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں مار مار کے اَدھ مُوا کرڈالے گا۔ کان کھول کر ایک بات سن لو... بچو! اب تمہارا یہی ٹھکانا ہے اور یہی گھر ہے... اب ہم ہی تمہارے ماں باپ، بہن اور بھائی ہیں۔ یہاں سے تم کہیں بھی بھاگ کر نہیں جاسکتے... اور چلے بھی گئے تو کدھر جاؤ گے؟ تم اس وقت اپنے ملک کی سرزمین سے کوسوں دور ہو... بھاگو گے تو تمہیں یہاں کی پولیس دھر لے گی... پاکستان کا جاسوس سمجھ کر ساری عمر کے لیے جیل میں ڈال دے گی... اس سے بہتر یہ نہیں ہے کہ ادھر ہی ہمارے پاس رہو۔'' وہ یہ کہنے کے بعد ذرا تھمی پھر قریب تپائی پہ رکھے کھانے کے تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''کھانا رکھا ہوا ہے۔ کھالو اور ادھر ہی آرام سے سوجانا... میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی... میں سسک پڑا اور اپنی ماں کو یاد کرنے لگا۔

میں بھی کیسا بدنصیب انسان تھا، پہلے باپ کا ساتھ چھوٹا اور اب ماں بھی بچھڑ گئی تھی۔ مجھے تو رہ رہ کر اپنی ماں کا خیال آرہا تھا... میری اس طرح اچانک گمشدگی سے اس غریب پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس بے چاری کا تو غم کے مارے برا حال ہورہا ہوگا... وہ تو بالکل ہی اکیلی ہوگئی ہوگی۔

مجھے اس رذیل آدمی... سکھ دیو پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔ یہی کمینہ شخص مجھے میری ماں سے جدا کرکے اتنی دور یہاں اس گندی جگہ پر لایا تھا۔ اور اب پتا نہیں آج رات میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ مجھے تو اس کا نامعلوم تصور بھی بھیانک سا معلوم ہونے لگا تھا... اور اس مردود ہیجڑوں کے سردار چھو بھارتی سے بھی مجھے خوف آنے لگا تھا۔

مجھے بھوک اور پیاس کا اب احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے قریب تپائی پر رکھے تھال کی طرف دیکھا، ایک

چھوٹی سی کٹوری میں کوئی ترکاری تھی... وہ پھلکے تھے، پانی کا ایک بڑا سا گلاس تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھانے کا جائزہ لیا... گلاس اٹھا کے پانی پیا... پھر کھانا زہر مار کرنے لگا اور باقی بچا کھچا پانی بھی پی لیا... اس کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے دروازے پر آہٹ کا احساس ہوا۔ میں یہی سمجھا کہ وہی منحوس ریکھا ہوگی... مگر میں ایک اجنبی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ذرا چونکا... وہ بھی ایک جوان ہیجڑا ہی تھا۔ دبلا پتلا سا... رنگت خاکستری تھی، چہرہ لمبوترا تھا۔ اس کے ایک کان میں بالا جھول رہا تھا... کپڑے رنگ برنگے سے پہن رکھے تھے۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کھانے کا تھال اٹھالیا، وہ شاید وہی لینے آیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے میری طرف دیکھ کر نچی آواز میں پوچھا۔

''کیا تم ہی وہ لڑکے ہو، جسے سکھ دیو سرحد پار سے اغوا کر کے لایا تھا؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے مختصراً کہا۔ پھر وہ خاموشی سے چلا گیا اور میں یونہی چپ بیٹھا رہا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ریکھا آگئی۔ وہ خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ''بنو! تو بڑا بھاگوان ہے رے... تیری شدھی کے سارے انتظام خود سردار کررہا ہے، سب یہی کہہ رہے ہیں کہ تو سردار کو بے حد پسند آگیا ہے۔''

اس کی بات پر ایک بار پھر میرے اندر کا نامعلوم خوف بیدار ہونے لگا۔ آخر ایسا میرے ساتھ کیا کیا جانے والا تھا؟، میں نے دل ہی دل میں اس پر اور اس کے سردار کچھو پر لعنت بھیجی اور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''آخر آج رات میرے ساتھ تم لوگ کیا کرنے والے ہو؟'' میرے اس سوال کو اس نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''تو اب ذرا آرام کرلے... شاید رات بھر تجھے آج جاگنا پڑے... چل شاباش بنو!''

یہ کہہ کر وہ خود بھی چارپائی پر لیٹ گئی اور وہیں اپنے قریب میرے لیٹنے کی جگہ بنا کر مجھے اشارے سے بلایا تو میں نے فوراً انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے نیند نہیں آرہی۔''

''ارے آجا! میرے تو ایک اشارے پر نجانے کتنے لوگ سونے کے لیے چلے آتے ہیں... آجا شاباش! میں تیرے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیروں گی تو کھڑی ہی تجھے نیند آجائے گی۔'' وہ اپنی ایک آنکھ کو معنی خیز انداز میں میچ کر بولی۔

میرا تو اس کے ساتھ سونے کے تصور سے جی متلانے لگا تھا۔ میں نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ مجھے ذرا دیر تک شاکی نظروں سے دیکھتی رہی اس کے بعد دوسری طرف کروٹ بدل کے سوگئی، اور تھوڑی دیر بعد ہی کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے، مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔ میرا تو اب ایک پل کے لیے بھی یہاں رکنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میرے پر نکل آئیں اور میں پھر سے اڑ کر اپنی پیاری ماں کی گود میں جا گروں۔

پتا نہیں آج رات مجھے کس تکلیف اور کس اذیت سے گزارا جانے والا تھا؟ ایسا کیا میرے ساتھ ہونے والا تھا...؟ اس کا نامعلوم تصور ہی مجھے ہولا سے دے رہا تھا۔

کچھ وقت اور گزرا تو مجھے نیند سی آنے لگی... مگر میں یہاں سے بھاگنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن فرار کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ایک نظر سامنے چارپائی پر بے سدھ سوئی ہوئی ریکھا کی طرف دیکھا... اور پھر اٹھ کر دوبارہ دروازے کی طرف آیا... ریکھا نے سونے سے پہلے دروازے کو اندر سے کنڈی لگادی تھی جو میں نے بے آواز کھول لی... اور دروازے کی موٹی جھری بنا کر باہر جھانکا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا... وہ ہال کمرا اب بالکل خالی تھا۔ میں نے اسے فرار ہونے کا موقع جانا اور کمرے سے نکل گیا... پھر دبے پاؤں ہال کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر پتا چلا کہ وہ باہر سے بند۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

میں ادھر اُدھر نظریں گھما کے دیکھنے لگا، اس ہال کمرے کے ساتھ اور بھی کئی کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے، جس کا مطلب تھا کہ اس ہال سے اور بھی کئی کمرے متصل تھے۔

اس وقت شاید سہ پہر کا وقت تھا، کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں اندر پڑ رہی تھیں، میں نے ان کا بھی جائزہ لیا مگر ان سب پر لوہے کی مضبوط سلاخیں نصب تھیں۔

اسی دوران مجھے کونے کی طرف ایک راستہ سا دکھائی دیا، میں اس طرف دبے پاؤں بڑھا... وہاں ہلکا اندھیرا تھا۔ میں اندر گھس گیا... مگر فوراً ہی اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آیا، وہاں انتہائی ناگوار بدبو تھی، جس سے میرا جی اُلٹنے لگا تھا... ناچار میں واپس کمرے میں آگیا۔

ریکھا سو کے جاگ اٹھی تھی اور بیڑی سلگا رہی

تھی... مجھے دیکھ کر طنزیہ بولی۔

"کیوں بنو! بھاگنے کا راستہ نہیں ملا کیا؟"

اس سمے مجھے وہ زہر لگی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

بیزری کا دھواں کمرے میں چکرانے لگا اور میرا سر بھی۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی... تھوڑی دیر اور گزری تو اچانک مجھے شور کی آواز سنائی دی۔ پتا چلا کہ ہال میں بے ہنگم سا ڈانس اور گانوں کی محفل سج گئی تھی... اس شور سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔

اسی وقت دروازہ دھڑ سے کھلا اور تین چار ہیجڑے بدمستیاں کرتے شور مچاتے، تالیاں بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور مجھے دبوچ کر ہال میں لے آئے۔ میں اس اچانک اُفتاد پر بری طرح گھبرا گیا۔ ہال میں روشنی کر دی گئی تھی، ریکھا بھی ان میں موجود تھی اور سکھ دیو بھی... اسے دیکھ کر میرا دل نفرت سے بھر گیا۔ ہیجڑوں نے بڑے بڑے تھال پکڑ رکھے تھے اور ان میں چراغ اور موم بتیاں جل رہی تھیں۔ مختلف رنگوں کی کٹوریاں بھی تھیں... اور نجانے کیا کچھ تھا۔ وہ رنگ میرے چہرے پر بھی مل رہے تھے، مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی، ڈھول پیٹے جا رہے تھے، اندرین گانے گا رہے تھے، ساز بھی تھے ان کے پاس، گویا ایک طوفانِ بدتمیزی تھا جو وہاں بپا تھا۔ کبھی کوئی مجھے کاندھے پہ بٹھاتا تو کبھی دوسرا اسے چھین کر مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیتا، حالانکہ میں اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا... منتیں تو میری بھیگ سی چکی تھیں۔

اسی دوران اچانک میری نگاہ ایک ہیجڑے پر پڑی جو اس بدرنگ سی محفل سے الگ دکھائی دے رہا تھا اور بغور میری طرف تکے جا رہا تھا۔ میں اسے پہچان رہا تھا، یہ وہی تھا جو ریکھا کے کمرے میں کھانے کے خالی برتن لینے آیا تھا اور اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو یہ مجھے ان لوگوں سے کچھ مختلف اور سنجیدہ مزاج کا لگا تھا... مگر اس وقت مجھے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ میں آ رہا تھا۔

بالآخر کافی دیر بعد یہ شور غوغا تھما، ساز اور باجے گاجے تھمے تو دماغ میرا بھی کچھ ٹھکانے پر آیا، پھر مجھے ریکھا نے تھام لیا اور اس کے ہمراہ سکھ دیو تھا، پیچھے باقی ہیجڑے، یہ لوگ مجھے سردار پھوبھورتی کے کمرے میں لے آئے۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے اپنی کالی موٹی بیل جیسی گردن سے ایک گیروے رنگ کا دھاگا سا اُتار کے میرے گلے میں پہنا دیا... اور پھر گمبھیر آواز میں بولا۔

"اسے اوپر لے چلو۔"

وہیں ایک کونے میں سیڑھی نظر آ رہی تھی، مجھے اس سے اُوپر لے جایا گیا۔ یہ بالکل سپاٹ کمرا سا نظر آتا تھا، اور خاصا بڑا بھی تھا، جہاں تھوڑا بہت ٹوٹا پھوٹا فرنیچر نظر آتا تھا، درمیان میں دری بچھی ہوئی تھی، اسی وقت دو ہیجڑے ایک تھرے نما تھال اُٹھائے آئے، ایک کے ہاتھ میں بڑا سا پانی کا لوٹا بھی تھا، پھر مجھے سکھ دیو اور ریکھا کے حوالے کر دیا گیا، یہ دونوں خبیث مجھے لیے کمرے کے وسط میں بچھی دری پر لے آئے، اور اس دوران سردار پھوبھی قریب آ گیا، ادھر خوف کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ پتا نہیں یہ شیطانی ٹولا میرے ساتھ کیا کھلواڑ کرنے والا تھا؟ میری اپنی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ ایک دو بار میں نے کمزوری آواز میں صدائے احتجاج بلند کی تھی مگر نقار خانے یعنی اس ہیجڑ خانے میں کون طوطی کی آواز سنتا؟

مجھے پہلے وہاں دری میں بٹھا دیا گیا تھا، اسی دوران ان دونوں ہیجڑوں نے پیتل کی تھال نما ٹرے دری پر رکھ دی اور پانی کا لوٹا بھی۔ میں نے سہمی سہمی نظروں سے اس طرف دیکھا... تھال میں دو تین چھوٹی کٹوریاں رکھی تھیں۔ ایک میں گھی تھا اور دوسری کٹوری میں تیل اور اس کے اندر سوئی دھاگا... تیسری کٹوری میں لیپ کی طرح کی کوئی دوا تھی... میں ان چیزوں کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا مگر جب دوسرے تھال پر میری نگاہ پڑی تو میں پورے جی جان سے لرز گیا۔

دوسرے تھال میں ایک تیز دھار استرا رکھا ہوا تھا... اور روئی کے پھائے سے بنا کے رکھے تھے۔ اس کے بعد مجھے سکھ دیو نے دبوچ کر دری پر پشت کے بل چت لٹا دیا... ریکھا نے میری ٹانگیں پکڑ لیں... سردار پھوبھورتی نے تھال پر سے استرا اُٹھالیا... جبکہ ایک اور ہیجڑے نے سوئی دھاگا... یہ سب لوگ میرے بالکل قریب ہو گئے تھے۔

"ی... ی... یہ کیا ہو رہا ہے... مم... مم... میں... میرے ساتھ...؟" میں نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

وہ سب مجھ پر جھک آئے تھے، ایسے میں ان سب کے چہرے مجھے انتہائی مکروہ نظر آ رہے تھے، ان پر شیطانیت اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں دہشت زدہ ہو گیا، حلق سوکھ کے کانٹا ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ خبیث لوگ میرا آپریشن کر رہے ہوں۔ اب مجھے ان کی اس حرکت کا

مطلب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ یہ جان کر کہ اب یہ رذیل صفت لوگ مجھے زبردستی اپنے جیسا بنانے پر تُلے ہوئے تھے... مگر کیوں... یہ تو پیدائشی ہوتے ہیں... جبکہ میں تو اچھا بھلا تھا۔ پھر یہ ظلم میرے ساتھ کیوں کیا جا رہا تھا؟

ریکھا میری شلوار کے ازار بند کی طرف ہاتھ بڑھانے لگی... جبکہ سردار بچھو ہاتھ میں استرا لے کر میری ٹانگوں کے قریب آ گیا۔ میں بری طرح مچلنے لگا۔

ٹھیک اسی وقت ہر سو اندھیرا پھیل گیا... شاید بجلی چلی گئی تھی... میں اور دہشت زدہ ہو گیا، کیونکہ یہ اندھیرا بھی میں ان کے شیطانی کھیل کا ایک حصہ ہی سمجھ رہا تھا، مگر ایسا نہیں تھا، شاید کسی خرابی کے باعث واقعی بجلی چلی گئی تھی، کیونکہ اسی وقت سردار بچھو کی جھلاہٹ بھری آواز اُبھری۔

''یہ کیا ہوا؟ اس کم بخت بجلی کو بھی ابھی جانا تھا... فوراً بتی کا انتظام کرو... ہم اب اس عمل کو بیچ میں اَدھورا نہیں چھوڑ سکتے۔''

ذرا ہی دیر بعد دو تین آئل لیمپ کا بندوبست کر دیا گیا۔ لیمپ کی روشنی میں مجھے یہ شیطانی عمل اور بھی زیادہ بھیانک محسوس ہونے لگا۔ میں چیخنے چلانے لگا... اسی وقت پھر جیسے کوئی معجزہ ہو گیا... اچانک... ''آگ... آگ'' کا شور مچ گیا... سارے تتر بتر ہونے لگے، عارضی طور پر اس عمل کو روکنا پڑ گیا۔ نیچے کہیں آگ لگ گئی تھی اور سب لوگ آگ بجھانے میں لگ گئے... جنہوں نے لیمپ تھامے ہوئے تھے، ان کے ادھر اُدھر ہونے سے وہاں پھر سے تاریکی چھا گئی تھی۔ مجھے ابھی تک سکھ دیو نے جکڑ رکھا تھا... اور پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی، اس نے ریکھا کو آواز دے کر مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ ریکھا مجھے نظر نہیں آ رہی تھی... مگر کوئی تھا جو مجھے اپنے ساتھ کھینچے لے جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا... اور ساتھ ہی دل ہی دل میں خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا کہ یہ بلا میرے سر سے ٹل گئی تھی۔ مگر کب تک؟ اس کا ابھی مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

ریکھا مجھے اپنے ساتھ تیز تیز قدموں سے لے جا رہی تھی، یوں لگتا تھا وہ خاصی عجلت میں ہو... اس پر مجھے اُلجھن آمیز حیرت بھی ہوئی... تاہم میں خاموش رہا۔ ہر طرف شور سا مچا ہوا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھلا ریکھا اب مجھے کہاں لے جا رہی تھی؟ نیچے تو آگ لگی ہوئی تھی؟ شاید اسے مجھے کسی اور جگہ لے جانے کا حکم ملا ہو؟

تھوڑی دیر بعد ہی مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ریکھا مجھے باہر لے آئی۔ باہر کی کھلی فضا میں سانس لینا مجھے بے حد خوش گوار لگا۔ بند ذہن میں تراوٹ سی اُترنے لگی اور میں بے حد سکون محسوس کرنے لگا... مگر میں سوچ رہا تھا کہ اب ریکھا مجھے کہاں لے جا کر بند کرنے والی تھی؟ پھر جلد ہی مجھ پر ایک خوشگوار انکشاف ہوا، اندھیرے کے باعث جسے ریکھا سمجھ رہا تھا وہ کوئی اور تھا... بلکہ کوئی اور بھی کون... یہ تو وہی تھا جو مجھے ان ہیجڑوں میں ذرا مختلف نظر آتا تھا... اور میرے بارے میں اس نے مجھ سے اس طرح استفسار بھی کیا تھا، جیسے میرے بارے میں پورا یقین کر لینا چاہتا ہو۔

''دیکھو بندو! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' وہ خاصی عجلت اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں تمہیں اس رذیل شیطانی ٹولے کے چنگل سے چھڑانا چاہتا ہوں۔'' پھر ایک نکڑ والی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بولا۔ ''وہ سامنے والی گلی دیکھ رہے ہو... اس کے بائیں جانب مڑ جانا۔ چار گھر چھوڑ کر ایک ٹاٹ جھولتے ہوئے دروازے والا گھر نظر آئے گا، اس کے دروازے پر دستک دینا، وہاں ایک عورت ہوگی، اس سے صرف اسی قدر کہنا کہ تمہیں بجلی نے بھیجا ہے، جاؤ اب ورنہ تمہیں یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں... میں فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔ جلد ہی مجھے گھر نظر آ گیا جہاں ٹاٹ جھول رہا تھا۔ میرا تو جی چاہا کہ یہاں بھی نہ رکوں... کیونکہ یہ جگہ بھی اس منحوس مقام سے زیادہ دور نہیں تھی، کیا خبر کہ پھر دھر لیا جاؤں؟ لیکن میرا دل نہیں مانا... اپنا ملک اپنا شہر ہوتا تو اور بات ہوتی۔

میں نے آگے بڑھ کر مذکورہ دروازے پر دستک دی، دروازہ کسی عورت نے ہی کھولا تھا، وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ جو مجھے ان جیسی محسوس نہیں ہوئی تھی، میں نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے بجلی نے بھیجا ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں سردار بچھو کا کوئی آدمی اِدھر نہ آن دھمکے۔

''او... تم وہی ہو۔'' وہ چونک کر بولی۔ اسے شاید پہلے سے بہت کچھ پتا تھا، کم از کم اس کے خود کلامیہ بڑبڑانے سے تو مجھے یہی لگا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اندر آ جاؤ، جلدی۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد خاصی... عجلت میں بولی۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے یہ سکون آمیز احساس ہوا کہ میں ایک مسلمان کے گھر میں تھا۔ یہ ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن والا گھر تھا۔ وہ مجھے کمرے

میں لے آئی۔ میں نے دیواروں پر آویزاں چند ایسے اسلامی طغرے دیکھے جو آیات کریمہ پر مشتمل تھے... اور ایک طرف مجھے جانماز اور تسبیح بھی رکھی نظر آئی تھی، اسی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ میں ایک مسلم گھرانے میں تھا۔

وہ مہربان عورت مجھے کمرے میں چارپائی پر بیٹھنے کا کہہ کر خود کمرے سے نکل گئی۔ کمرا صاف ستھرا تھا جہاں ایک ہی چارپائی تھی جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں ایک کرسی تھی، پانی کا ایک مٹکا تھا... اور کچھ تھوڑا بہت سامان وغیرہ۔ مجھے یہاں قدرے سکون ملا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ رہ رہ کر مجھے وہ ڈراؤنا منظریاد آرہا تھا، جب وہ شیطانی لفنگے میرے ساتھ ''شدھی'' کے نام پر بھیانک ظلم کرنے والے تھے... مگر عین وقت پر میں بال بال ان کے ذلیل عمل سے بچا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ عورت آگئی اور مجھے ابھی تک کھڑا... پاکر بولی۔ ''ارے! تم ابھی تک کھڑے ہو؟ بیٹھ جاؤ بیٹا!'' اس نے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو مجھے اس مہربان عورت میں اپنی ماں کا پیار محسوس ہوا اور بے اختیار مجھے اپنی ماں یاد آگئی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس عورت نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا... اور تب میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ ممتا بھرے لہجے میں میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''بس کر، میرے بچے! چپ ہوجا، مت رو، میں جانتی ہوں تجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔''

میں اس کی بات پر حیران رہ گیا اور اپنا رونا دھونا بھی بھلا بیٹھا۔ وہ میرے بارے میں جانتی تھی، کیسے؟ پھر مجھے دوبارہ اس شریف لفنگے... بجلی کا خیال آیا... ضرور اسی نے یہ سب بتایا ہوگا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ بجلی بھی اُنہی کا ساتھی تھا تو پھر میری اس طرح مدد کیوں کررہا تھا...؟

وہ مہربان عورت مجھے پیار کرتے ہوئے شیطانی ٹولے کو کوسنے لگی۔ ''اللہ غارت کرے ان بدبختوں کو جو اتنے پیارے اور معصوم کے ساتھ یہ ظلم کرنے لگے تھے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر نرمی سے بولی۔ ''بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟''

''لل... لئیق... لئیق شاہ۔''

''ماشاء اللہ... بہت پیارا نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولی پھر اس نے مجھ سے کھانے کا پوچھا، مجھے بھوک نہیں تھی،، مگر پھر بھی اس مہربان خاتون نے مجھے ایک گلاس میں گرم گرم دودھ لاکر دیا... ساتھ میں کچھ بسکٹ تھے۔ میں نے درمیان میں اس مہربان عورت سے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

''آ... آ... آپ میری مدد کریں گی؟ ہم... مجھے کسی طرح میری ماں کے پاس پہنچادیں... وہ میرے بنا غم سے نڈھال ہورہی ہوں گی؟'' وہ پیار سے مسکرا کے بولی۔

''ہاں... ہاں... کیوں نہیں لئیق بیٹا! ضرور، میں اور بجلی ضرور تمہاری مدد کریں گے... اور تمہیں تمہاری بدنصیب ماں کے پاس پہنچا کر دم لیں گے۔'' میں اس کی بات سن کر بے حد خوش ہوا، وہ مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

وہ مجھے تسلی دے کر کمرے سے باہر چلی گئی... تھوڑی دیر بعد لوٹی تو وہ کچھ فکرمند نظر آرہی تھی۔ میں نے بے چین ہوکر پوچھ لیا۔

''آپ... کچھ پریشان نظر آرہی ہیں؟ کیا مجھے یہاں بھی کوئی خطرہ ہے؟'' میرے لہجے میں ہلکا سا خوف بھی عود کر آیا تھا۔ وہ از رہِ تشفی مجھ سے بولی۔

''تم فکر نہ کرو بیٹا! اللہ آگے بھی خیر کرے گا... بس ذرا یہ گھر اس کنجر خانے کے قریب ہے ناں... اسی لیے تھوڑی فکر ستا رہی تھی کہ کہیں وہ شیطانی ٹولا تمہاری تلاش میں اِدھر ہی نہ نکل آئے۔'' میں اس کی یہ بات سن کر دوبارہ پریشان ہوگیا اور اس سے معصومانہ لہجے میں بولا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی یہاں سے کہیں دور چلا جاتا ہوں... آپ مجھے جانے دیں، آپ کا بہت شکریہ۔'' میری بات سن کر اس مہربان عورت نے بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لگالیا اور بولی۔

''میرے بچے! تو اس وقت رات میں کہاں اور کس کے پاس جائے گا؟ بھلا یہاں سرحد پار تیرا ہمارے سوا اور کون ہمدرد ہوگا؟ اور پھر وہ لوگ باہر تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

''لیکن مجھے ڈر ہے وہ لوگ اِدھر نہ آجائیں... وہ بہت ظالم ہیں، اگر میں دوبارہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تو اس بار وہ شاید مجھے زندہ ہی نہ چھوڑیں۔'' میری آواز میں خوف کا ارتعاش تھا۔

''فکر نہ کر، اللہ بہت بڑا ہے وہ تجھے ان ظالموں سے بچائے گا... اگر خدانخواستہ وہ یہاں تیری تلاش میں آئے بھی تو میں تجھے کہیں چھپادوں گی... ویسے مجھے نہیں لگتا کہ وہ یہاں آئیں گے، کیونکہ انہیں معلوم ہی ہے کہ یہ ان کی ساتھی

بجلی کی بہن کا گھر ہے۔"

"تت... کیا تم بھی ان کی ساتھی ہو؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"خدا نہ کرے کہ میں ان رذیلوں کی ساتھی ہوں... میں بجلی کی بات کررہی تھی۔ وہ بھی ان کا ساتھی ضرور ہے لیکن... وہ مسلمان ہے... نجانے کیسے وہ ان کے ساتھ آن ملا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بجلی بے چارہ بھی پیدائشی طور پر انہی جیسا ہے... مگر ان کی طرح برا نہیں ہے، مجھے اس نے منہ بولی بہن بنایا ہوا ہے۔ اس نے آج ہی مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ نامراد سکھ دیو... تمہیں سرحد پار سے اغوا کرکے یہاں لایا تھا، اور تمہیں بھی زبردستی..." اس نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں!... میرے ساتھ یہ لوگ گندا سلوک کرنے والے تھے... مگر میں بچ گیا۔"

"بے شک اللہ نے ہی تمہیں ان کے شر سے بچایا ہے، بیٹا!" وہ پیار سے ایک بار پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "ویسے بیٹا تمہیں اللہ کے شکر کے ساتھ بجلی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے، اسی نے عین وقت پر کوئی ایسی چال چلی ہوگی جس کے باعث تم ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے۔" مجھے اس نیک دل خاتون کی بات پر حیرت کا جھٹکا لگا، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آ... آپ کا مطلب ہے... کہ یہ سب بجلی نے کیا تھا؟"

"ہاں میرے بچے! یہ نیکی اسی نے کمائی ہوگی... کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کبھی بھی اس نامراد پھمو اور سکھ دیو... کو ان کے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔"

"لل... لیکن میں اب ان خطرناک لوگوں سے دور چلے جانا چاہتا ہوں... مم... میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں... نجانے میری جدائی کے غم میں اس بے چاری کا کیا حال ہورہا ہوگا؟"

"تم فکر نہیں کرو بیٹا!" وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "اللہ نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے وہ آگے بھی خیر کرے گا۔ میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ہوسکے تم یہاں سے نکل جاؤ مگر بیٹا! ابھی یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ تم سرحد پار ملک بھارت میں ہو؟"

"انڈیا میں؟" میں نے معصومیت سے استفسار کیا، کیونکہ اکثر میں اپنے باپ کے منہ سے اس ملک کا نام سنتا رہتا تھا۔

"ہاں بیٹے!" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "اب آگے کیا کرنا ہے، یہ تو بجلی ہی بتائے گا، مجھے اسی کا انتظار ہے۔"

"وہ کب آئے گا؟"

"کچھ پتا نہیں بیٹا! میرا خیال ہے کہ وہ موقع دیکھ کر ہی نکلے گا وہاں سے... اور شاید اب وہ صبح ہی آئے، تم ایسا کرو آرام کرلو... اور اب بالکل بے فکر ہو جاؤ۔"

میں واقعی تھکن محسوس کررہا تھا اور مجھے نیند بھی آرہی تھی۔ میں وہیں چارپائی پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی۔

پھر رات کے نجانے کس پہر اچانک میری آنکھ کھلی، کسی شدید قسم کی ہونے والی کھڑبڑ کے باعث ہی میری آنکھ کھلی تھی، اور جاگنے پر میں نے اپنی کھلی آنکھوں کے سامنے جو منظر دیکھا اس نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزہ دیا۔

میں نے تین مکروہ چہرے اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھے، یہ سردار پھمو، سکھ دیو اور ریکھا کے تھے، جبکہ باقی دو اور ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے جنہوں نے میری ہمدرد خاتون کو بری طرح دبوچا ہوا تھا بلکہ ایک نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ بھی رکھا ہوا تھا کہ وہ شور نہ مچا سکے۔ وہ بے چاری بری طرح دہشت زدہ دکھائی دے رہی تھی، ادھر سکھ دیو نے مجھے گریبان سے پکڑ کے چارپائی سے کھڑا کردیا، میں نے چیخنے کی کوشش چاہی تو اس نے میری گردن دبوچ لی اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "آواز بند رکھ اپنی بتو! ورنہ ادھر ہی تیرا کریا کرم کرڈالوں گا۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کے چپ ہورہا اور مارے خوف کے بری طرح لرزنے لگا۔ وہ مجھے دبوچے کھڑا رہا جبکہ سردار پھمو نے اپنی دھوتی کی ڈب سے ایک تیز دھار چاقو نکال لیا۔ میں دہشت زدہ رہ گیا اور یہی سمجھا کہ یہ مجھے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہوئے ہیں لیکن میں نے سردار پھمو کو اس مہربان عورت کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا۔

"بول! کدھر ہے تیرا یار بجلی؟" سردار پھمو نے چاقو اس عورت کی پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا تو وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"ہم... مجھے تو... نہیں معلوم۔"

"اچھا! تجھے نہیں معلوم...!" سردار بچھو ہولناک لہجے میں بولا۔ "تم دونوں نے چھپ چھپ کے بہت راستہ کھوٹا کیا ہے ہمرا۔ ہم بھی بریان (حیران) تھے کہ آخر کون ہے وہ جیوٹ جو اس طرح ہمارے شکار بھگا تا رہا، آج معلوم ہو ہی گیا... پر تو ہم اس سسرے بجلی کو ڈھونڈ لیں گے... مگر تیری اب چھٹی۔" یہ کہتے ہی اس بے رحم انسان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اس بے چاری کے پیٹ میں گھونپ دیا... مارے دہشت کے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ اس بدنصیب عورت کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ خون کا ایک فوارہ سردار بچھو کے چہرے اور سینے پر پڑا، جس کے باعث اس کا مکروہ چہرہ مزید بھیانک نظر آنے لگا۔

وہ عورت ابھی مری نہیں تھی، جان کنی کے عالم میں اس کے ساتھی کی گرفت میں تڑپ رہی تھی اور بھنچی بھنچی آواز میں چلانے کی کوشش کررہی تھی۔

"ابے سالے! اپنی ماں کے منہ پہ ہاتھ دھر۔" سردار بچھو نے اپنے ساتھی سے غرا کے کہا، جو عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی، سردار بچھو نے دوسرا وار کرکے اس عورت کو ہلاک کرکے چھوڑا، پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس سنگدل آدمی کی آنکھوں سے سفاکی مترشح تھی، وہ ایسے میں مجھے ایک قسائی کے روپ میں ہی نظر آرہا تھا... اسے اپنی طرف متوجہ پاکر میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں کہ اب میری بھی خیر نہیں۔

"کیوں ہوئے! دیکھ لیا اس سسری کا حشر، جی تو کرتا ہے کہ تیرا بھی یہی حشر کرڈالوں، پر کیا کریں، تو سالا اپنا اپنے من کو بھایا ہے کہ... پر یاد رکھ ہر بار ایسا نہ ہووے ہے... ورنہ اس سے بھی برا وہ حشر کروں گا... لے چلو اسے۔"

سردار بچھو نے آخر میں تحکمانہ کہا پھر اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ اس بدنصیب عورت کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے ساتھ... یہاں کی "صفائی" بھی کرڈالے۔

☆☆☆

میں ایک بار پھر ان شیطانی بنگڑوں کی قید میں آچکا تھا۔ مجھے اس مہربان اور ہمدرد عورت کے دردناک انجام پر بے حد دکھ تھا۔ میرے دل ودماغ پر ان لوگوں کی اب پوری طرح سے دہشت بیٹھ چکی تھی... جان گیا تھا کہ یہ بہت بے رحم اور خطرناک لوگ تھے، کسی کو بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالنے سے نہیں چوکتے تھے۔

پتا نہیں کیسے ان مردودوں کو بجلی اور اس عورت پر شبہ ہوگیا تھا کہ سب کچھ آن واحد میں پلٹ گیا تھا۔ میں اب یہاں دوہرے خوف کا شکار تھا۔ ایک خدشہ بجلی کا اور دوسرا ان خطرناک قاتل لوگوں کا بلکہ مجھے پہلا خوف زیادہ پریشان کیے ہوئے تھا۔ بقول اس عورت کے مجھے بجلی نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ تو وہ اب کہاں تھا؟ اگرچہ اب اس کا بھی بھانڈا پھوٹ ہی چکا تھا اور وہ یقیناً اپنی جان کے خوف سے کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں اب بھی یہ مایوسانہ سوال اُبھرا تھا کہ کیا اب بھی وہ میری مدد کرسکتا تھا؟ جبکہ وہ یہاں تھا بھی نہیں، اور کہاں تھا یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اب کون آتا میری مدد کو؟ مجھے مایوسی گھیرنے لگی۔ اور میں خوف کے مارے اندر ہی اندر ہلکان ہونے لگا۔

اس بار مجھے کسی قیدخانے جیسے کمرے میں ہی رکھا گیا تھا۔ ننگی اینٹوں والا فرش، سیلن زدہ دیواریں اور کمرے کا سائز بھی تنگ تھا، کھڑکی کوئی نہیں تھی، فقط روشندان تھا وہ بھی چھوٹا جس میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں، روشندان سے ہلکی روشنی آرہی تھی۔ اب پتا نہیں یہ صبح ہوتے سویرے کی تھی یا پھر اس قید خانے سے متصل کسی دوسرے روشن کمرے سے آرہی تھی۔ شکر ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے اور انہیں ہلا جلا کر اپنے ٹوٹتے جسم کی اینٹھن دور کرنے کے قابل تو تھا۔

کافی وقت اسی طرح خاموشی سے سرکتا ہوا بیت گیا... اور روشندان سے آنے والی کرنیں دھوپ کی شکل اختیار کرنے لگیں تو میں نے اندازہ لگایا کہ صبح ہوچکی تھی اور شاید دن بھی اچھی طرح نکل آیا تھا۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی، میں سہمی نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا... اسی لمحے دروازہ کھلا اور ریکھا اندر داخل ہوئی۔ اب اس کے چہرے پر جھوٹی ہمدردی یا محبت کے تاثرات بھی نہیں تھے، اس کے برعکس وہ خاصی غصے میں نظر آتی تھی۔ میں دیوار سے پشت لگائے بیٹھا ہوا تھا، اس نے چند قدم میرے قریب آکے مجھے بغور دیکھا اور بولی۔

"میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا آسان نہیں ہے مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب تم نے سردار بچھو کو بھی ناراض کردیا ہے۔ اب تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا کہ وہ کس قدر خطرناک ہے۔ مگر وہ تم پر مہربان ہے۔"

میں نے اس کی بکواس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر دوبارہ بولی۔ ''اب تمہیں سردار سے معافی مانگنا ہوگی... تم نے بجلی کے ساتھ مل کر یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا اور سب سے بڑا پاپ یہ بھی کر ڈالا کہ شدمی کا پاٹ خراب کیا، تم جانتے ہو اس کی کتنی بڑی سزا ہے، جو تمہیں ابھی ملنے والی ہے؟'' میں اس کی اس بات پر پھر ڈرنے لگا۔

''میں نے تو ایسا کوئی جرم نہیں کیا... اور بجلی کو تو میں جانتا تک نہیں ہوں... پتا نہیں اس نے کیسے اور کیوں یہ سب کیا اور مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔'' میں نے پہلی بار چالاکی سے کام لینے کی کوشش کی۔ تاکہ اپنے اوپر نازل ہونے والی کسی نئی سزا سے بچ سکوں۔

''جھوٹ مت بولو'' ریکھا برہمی سے بولی۔ ''بجلی نے تمہیں اپنے ساتھ ملا لیا ہوگا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں، ایسا کچھ نہیں تھا میرے اور اس کے درمیان'' میں پُرزور لہجے میں بولا۔

''اگر تم یہ بتا دو کہ اب بجلی کہاں ہے تو میں تمہاری سزا ٹالنے کی کوشش کروں گی۔ تمہیں پتا ہے، تمہیں سزا ابھی سکھ دیو دے گا، سردار کے حکم سے''... اس نے شاید مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اور واقعی میں سکھ دیو کے نام سے ہی کانپنے لگتا تھا... لہٰذا میں نے ریکھا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میری بات کا یقین کرو ریکھا! میں واقعی بجلی کو نہیں جانتا اور نہ ہی ہمارے بیچ پہلے سے کچھ ایسا طے تھا۔''

''وہ گیا کہاں ہے اب؟''

''مجھے نہیں پتا۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم'' ریکھا نے مجھے پُرتشکیک نظروں سے دیکھا۔ میں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے الجھن آمیز پُرسوچ نظروں سے دیکھتی رہی اس کے بعد واپس چلی گئی۔

ریکھا کے جانے کے بعد میں سوچتا رہ گیا۔ یہ یہاں کس مقصد کے لیے آئی تھی؟ کیا صرف بجلی کے بارے میں جاننے کے لیے؟ یعنی بجلی اس وقت ان کا اہم شکار تھا۔

میرے چھوٹے سے ذہن میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ بجلی مجھے ان ہیجڑوں کے خطرناک چنگل سے چھڑانے کے لیے، ایک بڑی بھیانک اور فاش غلطی کر بیٹھا تھا، جس کا کم از کم مجھے اس وقت احساس ہو گیا تھا جب اس مہربان عورت کے گھر میں اس کی پناہ میں تھا۔ مجھے اس وقت بھی یہی خوف کھائے جا رہا تھا کہ میں اس کنجر خانے سے فرار ہونے کے باوجود محفوظ نہیں ہوں... کیونکہ وہ جگہ یعنی اس عورت کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ سردار چھوو غیرہ کو کیسے بجلی پر شبہ ہوا؟ مزید یہ کہ انہوں نے اس عورت کے گھر رات کے آخری پہر چھاپا بھی بڑا کامیاب مارا تھا، اور وہ بے چاری میری ہمدرد عورت ان سفاک خونی درندوں کے ہاتھوں ماری گئی تھی... اور بجلی خود لاپتا تھا جبکہ میں دوبارہ قیدی بنا لیا گیا تھا۔ اب آگے کیا ہونے والا تھا میرے ساتھ یہ اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

ریکھا کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سکھ دیو آ گیا۔ وہ خاصا طیش میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں عجیب ساخت کا ہنٹر دبا ہوا تھا... جس پر کانٹے دار باریک کیلیں نصب تھیں۔ مارے خوف کے میری روح فنا ہونے لگی اور میں سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے شعلہ برساتی نظروں سے میری طرف گھورا اور پھر کمرے کی محدود فضا میں ایک زناٹے دار آواز ابھری۔ جس میں میری دل دوز چیخ بھی شامل تھی۔ کانٹے دار ہنٹر کی ایک ہی اذیت ناک ضرب نے جیسے میری جان نکال دی تھی۔

میری پشت پر سرخ خونی لکیر ابھر آئی تھی۔ جب اس نے ہنٹر واپس کھینچا تو میری قمیص بھی ایک جگہ سے پھٹ کر چیتھڑے کی صورت اس کے ہنٹر میں پھنس گئی... اس خبیث نے اسی پر بس نہ کیا اور ایک اور ضرب لگائی۔ اس بار بھی میں مارے اذیت کے حلق کے بل چیخا تھا... اس نے اسی طرح ''شپ شپ'' چار پانچ ہنٹر میرے جسم کے مختلف حصوں پر برسائے، یہاں تک کہ میں تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔

پتا نہیں کب اور کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا تھا مگر ہوش آنے کے بعد، ایک بار پھر مجھے اپنے زخموں سے ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ میری قمیص تار تار تھی اور چیتھڑوں کی صورت ہی نظر آرہی تھی۔ اس درندہ صفت سکھ دیو نے میرے جسم کے ہر حصے کو تختۂ مشق بنایا تھا۔ کمر، ٹانگیں، سینہ اور پیٹ، ہر جگہ سرخ لکیروں کا جال سا بن گیا تھا اور اب زخم سرد ہونے کے بعد، اس میں تکلیف اور جلن کا بھی احساس مزید بڑھنے لگا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں درد اور دکھن کے مارے کراہنے لگا۔ میں اپنے ریختہ زخمی وجود کو ہلانے جلانے سے بھی قاصر تھا... کہ ایک ذرا سی جنبش بھی مجھے اذیت ناک لگتی تھی۔ میں اوندھا سا، اسی طرح منہ کے بل ننگی اینٹوں والے فرش پر

پڑا تھا۔ اور شاید تھوڑی دیر بعد پھر ہوش و حواس سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو یکلخت مجھے یوں لگا کہ میں بینائی سے ہی محروم ہو گیا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے گھور تاریکی تھی۔ میں گھبرا کے بار بار اپنی آنکھیں جھپکنے لگا۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد کچھ تاریکی سے دید کو یارا ہوا تو احساس ہوا کہ رات ہو چکی تھی... کیونکہ کسی روزن سے ہلکی سی روشنی کی کرنیں اندر پڑ رہی تھیں۔ مجھے اندھیروں سے بھی وحشت ہونے لگی۔ میرا حلق پیاس کی شدت سے سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ میں نے پانی مانگنے کے لیے آواز نکالنا چاہی مگر ایک دردانگیز سی کراہ خارج ہو کے رہ گئی۔ میں اسی طرح منہ اور سینے کے بل پڑا اور لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ میری آنکھوں میں اب آنسو بھی آگئے تھے۔

انسان اپنی آنکھوں کا آخری منظر نہیں بھولتا اور مجھے بھی وہ یاد تھا جب میں اپنے گاؤں کے میلے میں... اپنی پیاری ماں کے ساتھ خوشی خوشی گھوم رہا تھا۔ اور پھر اچانک میں اس کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں سے دور ہو گیا اور یہاں اس جہنم کدے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا... روشنی کی ایک موٹی لکیر پھیلتی چلی گئی... اور قید خانہ روشن ہو گیا۔ آنے والا کون تھا؟ یہ ابھی میں ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پایا تھا مگر دل میں اب بھی یہی خوف جاگزیں تھا کہ کیا مجھے ایک بار پھر تختۂ مشق بنایا جانے والا تھا؟ کیا مجھ پر اب بھی ستم توڑنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا تھا؟

ہلکی چٹ کی آواز کمرے میں ابھری اور دوسرے ہی لمحے کمرا پوری طرح روشن ہو گیا۔ وہ دو افراد تھے۔ میں نے نیم باز آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا، ان میں ایک تو ریکھا تھی دوسرا اس کا کوئی ساتھی تھا، جس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھامے رکھا تھا... وہی میرے قریب آیا جبکہ ریکھا اپنی جگہ کھڑی رہی، قریب آنے والا اپنے ساتھ مرہم پٹی کا سامان لایا تھا، وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح پہلے میرے زخموں کا جائزہ لیتا رہا اس کے بعد اس نے اپنا ''کام'' شروع کر دیا۔

پہلے میری قمیص اُتار کر میرا اوپری جسم برہنہ کر دیا، اس کے بعد وہ میرے زخموں پہ کسی خاص دوا کا لیپ کرنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ساری دوا میرے زخموں پر مل دی، اس کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی پیالی میں مجھے کوئی تیز ذائقے والی دوا بھی پلا دی۔ اپنا کام ختم کر کے وہ کمرے سے چلا گیا، اب صرف ریکھا وہاں رہ گئی، کچھ دیر میری طرف تکتی رہی، پھر چند قدم میری جانب بڑھی اور بولی۔

''دیکھ لیا نا یہاں سے بھاگنے کا انجام... اب دوبارہ ایسی حرکت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔''

''تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے جانے دو... تم لوگ میرے ساتھ کیوں ایسا سلوک کر رہے ہو؟ میں نے آخر تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟'' میں نے روتے، سسکتے ہوئے اس کی منت کی تو وہ اسی طرح بے حسی سے بولی۔

''پھر وہی فضول بکواس۔ بھول جاؤ اپنا ماضی... اپنی ماں اپنا گاؤں... اب ہم ہی تمہارے سب کچھ ہیں... اور یہی تمہارا ٹھکانا ہے... سمجھے تم؟ اگر تم اس مردود بگی کے ساتھ مل کے ایسی حرکت نہ کرتے اور تمہاری شدھی ہو جاتی تو آج تم عیش کر رہے ہوتے۔''

''آخر تم لوگ کیوں میرے ساتھ یہ ظلم کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ کیوں مجھے اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو؟ میں... میں... ایسے ہی ٹھیک تو ہوں۔''

میرے معصومیت بھرے سوال کو ریکھا نے ایک شیطانی قہقہے میں اُڑا دیا... اور پھر میرے اوپر قدرے جھکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''ارے بھوا! ہم جیسا بننے میں آخر کیا برائی ہے؟ بہت دولت کمائے گا... لکشمی مہربان ہو جاوے گی تجھ پر، پھر تو ہمرا احسان مانے گا۔''

مجھے اس کی بات بری لگی تھی اس لیے میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ''مم... مجھے پیاس لگی ہے۔''

''ابھی جا کے بھیجتی ہوں اپنے بھوا کے لیے۔'' وہ مسکرا کے بولی اور لہراتی، بل کھاتی کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد میرے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ بھیجا گیا۔ مرہم پٹی اور دوا پینے کے بعد میری طبیعت کافی حد تک بحال ہو گئی تھی۔ ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو ایک بار پھر اندیشناک خیالات نے آن گھیرا... کل یہ خبیث لوگ میرے ساتھ پھر وہی مکروہ فعل کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔ اور اس بار مجھے بچانے والا کون تھا؟ جبکہ بگی خود مفرور تھا۔ میں ایک بار پھر پریشان کن خیالات کا شکار ہونے لگا۔ وقت بیتا جا رہا تھا، کمرے کی بتی بجھا دی گئی تھی، اندھیرے سے مجھے اور بھی وحشت ہو رہی تھی، میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، اور تھوڑا کمرے میں چلا پھرا بھی، دروازے کی طرف بھی گیا۔ میرا اوپری جسم برہنہ تھا...

میں نے بتی جلانے کی کوشش کی... مگر وہ نہیں جلی، شاید باہر سے ہی دانستہ اس کا کنکشن آف کردیا گیا تھا۔ دروازے کو میں نے باہر سے بند پایا۔ میں مایوس ہوکر واپس لوٹ آیا۔

رات زیادہ ہوگئی تھی... میں قید خانے کی سیلن زدہ دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر سستی طاری ہونے لگی مگر یہ نیند نہیں تھی، ایک بار پھر وہی ڈر اور خوف دل و دماغ کی آماجگاہ بننے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ دروازے توڑتا ہوا اس جہنم سے نکل جاؤں۔ بے بسی اور مایوسی انتہا کو چھونے لگی تو میں رونا شروع کردیتا۔

وہ شاید آدھی رات کا پہر تھا جب اچانک میں نیم غنودگی کے عالم میں چونکا۔ میں شاید کسی کھٹکے کی آواز پر چونکا تھا اور وہ آواز دروازے کی طرف سے ہی آئی تھی... میں اسی طرح فرش پر لیٹے لیٹے دم بہ خود نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا... اور پھر میں نے دیکھا بہت آہستگی سے دروازہ کھلا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ میں ڈر گیا... پتا نہیں یہ کون تھا؟

اندھیرے میں مجھے وہ کسی پُراسرار سائے کے مانند ہی دکھائی دیا تھا جو اب دبے پاؤں میری جانب بڑھ رہا تھا، اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کی طرف تکتا رہا... یہاں تک کے جب وہ میرے بالکل قریب آگیا تو میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''ت... کون...؟''

''ش... شش۔'' جواب میں اس پُراسرار سائے نے یہ اشارہ کیا۔ پھر میرے خاصے قریب آکے نہایت دھیمی آواز میں بولا۔ ''بچو! یہ میں ہوں... بجلی۔''

''ب... بجلی... بجلی بھائی'' بے اختیار میرے منہ سے مسرت بھرے انداز میں نکلا۔

''شش... آہستہ۔'' اس نے پھر مجھے تنبیہ کی۔ میرا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔

''خاموشی سے اُٹھ کر میرے ساتھ آؤ... خبردار! کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرنا ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی جان سے جاؤں گا۔'' وہ بولا۔

اس کے بعد وہ آگے تھا اور میں اس کے پیچھے... ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بجلی عادت کے مطابق تالی نہ بجادے... ورنہ مصیبت آجاتی۔

بہرحال شکر رہا... ہم خیریت سے باہر آگئے۔ وہ مجھے باہر تاریکی میں لیے آگے بڑھتا رہا۔ اس مہربان عورت کے گھر کے سامنے سے بھی ہم گزرے تھے... جسے دیکھ کر مجھے وہ نیک دل اور ہمدرد خاتون یاد آگئی تھی۔

بجلی مجھے لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا... یہاں تک کے ہم اس منحوس جگہ سے اچھی خاصی دور نکل آئے۔

یہ کوئی نیم صحرائی علاقہ تھا۔ یہاں چہار سُو تاریک سناٹے کا راج تھا۔ اریب قریب میں کچھ کچے گھروں کی بے ترتیب قطاریں، آڑے ترچھے ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ دور کہیں آوارہ جانوروں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آسمان صاف تھا، آخری راتوں کا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔

ایسے میں ایک جگہ پہ میں تھک کر رک گیا تو بجلی بھی رُک گیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گیا تھا کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں اس لیے رک گیا اور بولا۔ ''بچو! ہمارا زیادہ دیر یہاں رُکنا ٹھیک نہیں ہوگا، تھوڑا سستا لو تو آگے بڑھتے ہیں۔''

''میرا نام بچو نہیں، شفیق ہے... شفیق شاہ۔'' میں نے کہا۔ وہ شاید اندھیرے میں مسکرایا تھا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''سرحد پار۔''

''ہیں...!'' میں خوشی سے بولا۔ ''مگر کیا پیدل اتنا لمبا سفر کریں گے ہم؟''

''نہیں، یہاں سے تھوڑی دور ہمیں پیدل ہی چلنا پڑے گا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''آگے بنجاروں کا ایک قافلہ ملے گا... یہ راجھستانی، میگھواڑ اور کولی قبیلے سے تعلق رکھنے والے بنجارے ہیں... جو اپنے ایک مذہبی تہوار کے سلسلے میں راجھستان سے چولستان کے راستے پاکستان کی سرحد عبور کریں گے... ہم بھی ان میں شامل ہوجائیں گے۔''

مجھے اس کی بات سے تسلی ہوئی، پھر کچھ سوچ کے اس سے پوچھا۔

''بجلی بھائی! تم اس رات مجھے اس نیک دل عورت کے پاس چھوڑ کے کہاں چلے گئے تھے؟'' اور پھر میں نے اسے اس لرزہ خیز رات کے بارے میں بتایا، مگر اسے یہ سب پہلے ہی معلوم تھا، قدرے دُکھی لہجے میں بولا۔

''ہاں! مجھے پتا چل گیا تھا۔ بے چاری کوثر ان ظالموں کے ہاتھوں ماری گئی تھی اسی لیے میں بھی بھاگ گیا تھا، میں اس رات تمہیں فرار کروانے کے بعد وہاں سے غائب ہوتا تو مجھ پر شک کیا جاتا... کیونکہ اس وقت تمہاری ڈھونڈیا پڑی ہوئی تھی... مگر باوجود اس کے مجھ پر شبہ ہو ہی گیا... میرے پاس وقت ہی نہ تھا کہ میں پھر کچھ کرسکتا...

اسی لیے بھاگ کھڑا ہوا۔"

میں چپ ہو رہا... تھوڑی دیر بعد ہم پھر چل پڑے... اس کے بعد ہم مذکورہ قافلے سے جا ملے۔ بجلی ایک چلتا پرزہ تھا... پتا نہیں اس نے کیا چکر چلایا کہ ہم اس بنجاروں کے قافلے میں شامل ہو کر کامیابی سے سرحد پار کر کے چولستان اور پھر وہاں سے بہاولپور آ گئے۔ وہاں بجلی کے ساتھ مل کر میں نے اپنی ماں کی تلاش شروع کی۔ بجلی بے چارہ میری مدد کر رہا تھا مگر اچانک ایک موقع پر اس کا میرا ساتھ چھوٹ گیا... کسی بات پر اسے پولیس نے دھر لیا اور مجھے اسے چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ مگر بھاگتے وقت اس نے مجھے تاکید کی تھی، کہ میں سیدھا ملتان کے ایک نواحی علاقے سنے پنڈ کا رُخ کروں... وہاں اس کا کوئی جاننے والا رہتا تھا۔ بالآخر میں ملتان آ گیا اور سنے پنڈ کا رُخ کیا، لیکن بدقسمتی سے یہاں مجھے بجلی کا وہ جاننے والا نہ مل سکا مگر وہیں ایک بے اولاد جوڑے نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ کئی سالوں بعد کسی طرح بجلی بھی مجھ سے آن ملا۔ وہ اب بھی میری ماں کی تلاش میں پُرجوش تھا... مگر ہمیں ابھی تک کوئی کامیابی نہ ہو سکی تھی۔

یوں میرے ماہ و سال گزرتے رہے۔ اور وہیں میں پل بڑھ کر جوان ہوا۔

☆☆☆

لئیق شاہ اپنی عبرت اثر داستان سنانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ کمرے میں ایک رنجیدہ اور اُداس سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ لئیق شاہ کی آنکھوں میں نمی سی جھلک رہی تھی، اور زہرہ بانو کا چہرہ بھی دُکھ کی غمازی کر رہا تھا۔ پھر وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"بہت دُکھ ہوا، لئیق! تمہاری داستان سن کر، میں نہیں جانتی تھی کہ تمہارے دل میں اپنوں سے بچھڑنے کا کس قدر گہرا دُکھ ایک زخم کی طرح چھپا ہوا ہے، اچھا ہوا تم نے آج اپنے دُکھ کا اظہار کر دیا... اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اپنا درد بیان کر دینے سے وہ آدھا رہ جاتا ہے۔"

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں زہرہ صاحبہ... مگر بعض دُکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی، وقت کے ساتھ کسک بڑھتی ہی جاتی ہے۔ میں آج بھی اپنی ماں کو یاد کر کے تنہائیوں میں روتا ہوں... نجانے وہ اب کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ اور پتا نہیں وہ بے چاری زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔" لئیق شاہ نے یہ الفاظ دُکھ کے انتہائی احساس تلے ادا کیے تھے، لگتا تھا شاید وہ بھی اب تھک چکا تھا۔ زہرہ اسے ایک بار پھر آزردہ خاطر دیکھ کر تسلی آمیز لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"لئیق! تم نے بتایا تھا کہ تمہارا کوئی بھائی بھی انہی دنوں دنیا میں آنے والا تھا، جب تم اپنی ماں سے بچھڑے تھے؟"

"ہاں۔" لئیق شاہ نے مختصراً مگر دل گیر لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمہارے دل میں اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھنے اسے تلاش کرنے کی خواہش نہیں اُٹھتی؟"

"ہاں زہرہ صاحبہ! مجھے صرف اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے کی تمنا نہیں ہے، اپنے بھائی کو دیکھنے کی بھی شدید آرزو ہے۔ اور اپنے باپ کو بھی نہیں بھولا میں اب تک... لیکن، پتا نہیں تقدیر کو کیا منظور تھا کہ ایک پل جیسے کوئی کالی آندھی سی چلی تھی کہ ہم سب کسی تیز ہوا میں ٹوٹ کر بکھرنے والے ایک گھونسلے کی طرح... ان بے رحم ہواؤں کی زد میں آ کر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔"

یہ بتاتے ہوئے لئیق شاہ ایک بار پھر آزردہ ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اُترنے والی نمی بھی سوا ہونے لگی تھی۔

زہرہ بانو جانتی تھی کہ لئیق شاہ کس قدر مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر اس وقت وہ اسے کسی چھوٹے معصوم بچے کی طرح روتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اپنوں کے بچھڑنے کا غم ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بالکل ٹوٹ کے رہ جاتا ہے اور وہ بھی ٹوٹ رہا تھا۔ زہرہ بانو کو اس وقت یوں لگا جیسے لئیق شاہ ابھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا... ایسے میں اس نے لئیق شاہ کو تھام لیا... اپنا ایک بازو بڑی چاہت سے اس کے چوڑے شانے کے گرد یوں پھیلا دیا جیسے وہ اسے جو اندر ہی اندر غم کے ایک الاؤ تلے سلگ رہا تھا، اپنے شبنمی وجود کی ریشمی چھاؤں میں سمو لینا چاہتی ہو، اس کے سارے درد کا مداوا بن کے، وہ اس کے لیے ایک ایسی بارش بننا چاہتی ہو جو اس کے محبوب کے سارے غموں کو خار و خس کی طرح بہا کے لے جائے... یہاں تک کہ زہرہ بانو نے ہولے سے اپنے جیسے مرمریں بازو سے اسے سہارتے ہوئے اپنے قدرے قریب بھی کر لیا۔ ایسے میں لئیق شاہ، جس نے ایک مصلحت کی بنا پر اب تک اپنے اور زہرہ بانو کے بیچ ایک فاصلہ قائم کیے رکھا تھا، آج جیسے وہ فاصلہ بھی اسے ختم ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ آج خود اس کے تھکے وجود کو بھی جیسے ایک ایسے ہی سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جو ہر مصلحت، ہر پس و پیش سے مبرا ہو، اس نے بھی جیسے اب تک ایک جلتے بلکتے صحرا میں آبلہ پائی کا عذاب سہا

تھا تو آج وہ بھی ایک سکون کا متلاشی تھا۔ اپنوں سے دوری کے اس بحرِ غم میں اگر کوئی پرایا... جذبۂ دل کے پتواروں سے اپنے پن کی ناؤ لیے... اس سے ایک نئے رشتے کی، ایک تعلقِ خاطر کی آس میں ساحل کی آرزو کیے ہوئے تھا تو اسے اس کشتی کا سوار بن جانا چاہیے تھا۔

لئیق شاہ نے بھی بے اختیار اپنا چہرہ زہرہ بانو کی گھنیری زلفوں کی چھاؤں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

زہرہ بانو نے لئیق شاہ کے سامنے پورے خلوص کے ساتھ اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ آج سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ماں باپ کی تلاش میں اپنے ساتھ سمجھے۔

پھر اسی روز بیگم ولا میں زہرہ بانو نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کی ایک اہم میٹنگ کال کر ڈالی۔ جبکہ کمیل دادا کو ابھی اس میٹنگ کا اصل مقصد نہیں پتا تھا، وہ یہی سمجھا تھا کہ زہرہ بانو شاید اب کی بار چوہدری ممتاز سے آخری معرکے کی تیاری کرنا چاہتی تھیں۔

یہ اہم میٹنگ بیگم ولا کے کانفرنس روم میں منعقد کی گئی تھی، جو اوپری منزل میں تھی۔

شرکاء میں زہرہ بانو اور لئیق شاہ کے علاوہ کمیل دادا، یاسر، جہانگیرا اور دو اور ساتھی شامل تھے۔

جب زہرہ بانو نے میٹنگ کے اصل ایجنڈے کے بارے میں بتایا تو کمیل دادا کا منہ بن گیا، اور وہ اُکھڑا اُکھڑا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا، مگر چونکہ یہ ان کا حکم تھا، اسی لیے وہ طوعاً و کرہاً دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔

زیادہ تر زہرہ بانو اور یاسر، جہانگیرا نے ہی اس موضوع میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، جبکہ کمیل دادا اس میٹنگ کی کم و بیش ایک گھنٹے کی کارروائی میں خاموشی ہی اختیار کیے ہوئے تھا۔

زہرہ بانو سے اپنے اس مقرب خاص کارپرداز ساتھی کی عدم دلچسپی چھپی نہ رہ سکی، اس کی طرف ترچھی نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔ ”کمیل! تم نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا اب تک کہ لئیق شاہ کے اپنوں کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں کیا اقدامات اُٹھانے چاہیے؟“

کمیل دادا نے کچھ چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے پہلے تو ایک نظر قریب بیٹھے لئیق شاہ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بیگم صاحبہ! ہم اس وقت ایک خطرناک صورت حال کا شکار ہیں، دشمن ہر لحظہ ہماری گھات میں رہتے ہیں ایسے میں ایک بہت ہی پرانے معاملے میں اپنی ٹانگ پھنسانا نہ صرف غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا بلکہ خطرناک بھی، دشمن ہماری اس غفلت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔“

کمیل دادا کی بات قابلِ غور تھی لیکن یہاں معاملہ لئیق شاہ کا تھا، زہرہ بانو نے کمیل دادا کا لئیق شاہ کے معاملے کو پرانا کہنا اچھا نہیں لگا مگر وہ اپنی خفگی کے اظہار کی جرأت نہ کر سکی... تاہم ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”کمیل دادا! یہ معاملہ جتنا پرانا سہی اُتنا ہی ہمارے لیے اہم بھی ہے۔“

”یقیناً بیگم صاحبہ! ہونا بھی چاہیے۔“ کمیل دادا نے بظاہر مؤدبانہ کہا تھا مگر اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو لئیق شاہ اور زہرہ بانو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

زہرہ بانو نے دزدیدہ سی نگاہ لئیق شاہ کے چہرے پہ ڈالی۔ وہ آج لئیق شاہ والے اس اہم موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتی تھی اور ایک مربوط لائحہ عمل بھی ترتیب دینے کے موڈ میں تھی... لیکن وہ اپنے ایک اہم ترین اور گروہ میں اپنے نائب کی حیثیت رکھنے والے ساتھی کمیل دادا کی لئیق شاہ کے ”معاملے“ سے غیر دلچسپی کو بھی محسوس کر رہی تھی، اسی لیے اس نے سر دست میٹنگ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی برخاست کر دی۔ لیکن اس کے تھوڑی دیر بعد ہی اس نے تنہائی میں کمیل دادا کو ایک کمرے میں بلا لیا۔

”بیٹھو کمیل۔“ زہرہ بانو اس کے چہرے کی طرف بہ غور تکتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ”کمیل دادا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہوں گی؟“

اس کے صوفے پر براجمان ہونے کے بعد زہرہ بانو نے بہ دستور اس کی طرف گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا تو کمیل دادا کو ایک جھٹکا سا لگا، اور وہ قدرے حیرت اور شرمندگی کے ساتھ زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ بیگم صاحبہ؟ مجھے شرمندہ تو نہ کریں، آپ مالک ہیں ہماری، حکم کریں۔“

”نہیں کمیل! تم پچھلے کئی دنوں سے میرے اور بالخصوص لئیق شاہ سے متعلق، جس طرح اپنی جان پہ کھیل کر ہمارے کام آتے رہے ہو، اس نے میری نگاہوں میں تمہاری... قدر و قیمت اور بھی بڑھا دی ہے۔ میں کسی معاملے میں تمہاری رائے سے اختلاف کر کے تمہارا دل خود سے خراب نہیں کرنا چاہتی... اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو میں بھی

سمجھوں گی کہ میں اپنے ایک اہم اور سچے جاں نثار اور وفادار ساتھی کو کھو رہی ہوں، جو میں کبھی نہیں چاہوں گی۔"

زہرہ بانو یہ کہہ کر ذرا تھمی تو کمیل دادا کو اپنے سینے میں دھڑکتا دل رُکتا محسوس ہونے لگا۔

اپنے لیے بیگم صاحبہ کے یہ الفاظ اسے حیات بخش محسوس ہوتے تھے، وہ اندر سے فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھتا تھا۔ اگرچہ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن... نجانے کیوں اس بار اسے بیگم صاحبہ کا "درخواست گزار" لہجہ کچھ چبھتا ہوا بھی محسوس ہوا تھا، جیسے وہ اس کی کسی بات سے عاجز سی آگئی ہو... تاہم سنبھل کے بولا۔

"بیگم صاحبہ! میرے بارے میں آپ کے ایسے خیالات، بلاشبہ میرے لیے باعثِ فخر ہیں لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ میں آپ کے حکم کا غلام ہوں، میں مشورہ تو دے سکتا ہوں، لیکن اسے ماننے یا نہ ماننے کا اول و آخر اختیار آپ کا ہی ہوتا ہے۔"

"میں تم سے بالخصوص لئیق شاہ کے معاملے میں دو ٹوک بات کرنا چاہتی ہوں۔" زہرہ بانو نے جیسے گفتگو کو نپٹنے کی غرض سے کہا۔

"جی بیگم صاحبہ! میں سن رہا ہوں۔" وہ مؤدبانہ ہو کے بولا، مگر ساتھ اس کے دل و دماغ میں عجیب طرح کے خیالات بھی گردش کرنے لگے... ان میں یہ وسوسہ بھی جاگزیں تھا کہ کہیں بیگم صاحبہ کو لئیق شاہ کے سلسلے میں اس کی طرف سے کوئی شکایت یا سرد مہری تو نہیں محسوس ہوئی؟

زہرہ بانو نے ایک نگاہ کمیل دادا کے چہرے پہ ڈالی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی، کمیل دادا بھی اس کے احترام میں فوراً کھڑا ہونے لگا تھا، لیکن زہرہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کو کہا... کمیل دادا، اُلجھے اُلجھے چہرے کے ساتھ اب اپنی جگہ جیسے ٹک سا گیا، اور یک ٹک زہرہ بانو کے چہرے کی طرف تکنے لگا، جیسے وہ آج اس کے سامنے کوئی بڑا انکشاف کرنے جا رہی ہو۔

زہرہ بانو دھیرے دھیرے دیوار کی طرف آئی، جہاں ایک بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ وہ اس پینٹنگ کو چند ثانیے سوچتی نگاہوں سے تکتی رہی، جس میں مصور نے سوہنی ماہیوال کی مشہور لوک داستان کو رنگوں اور پینٹ کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں سوہنی کو دریا کی منہ زور لہروں کی زد میں دکھایا گیا تھا اور اس کا کچا گھڑا ٹوٹ چکا تھا... کینوس میں یہ لکھا تھا۔

"محبت کبھی نہیں مرتی۔"

بس... چند لمحوں کے لیے زہرہ بانو نے اس تصویر کو دیکھا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنا رخ کمیل دادا کی طرف پھیرا اور صوفے پر بیٹھا کمیل دادا ہنوز اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"کمیل دادا! تم سب میرے جاں نثار اور وفادار ساتھی ہو اور میں تم لوگوں کی باس ہوں، لیکن میں آج تمہیں یہ کہنے کا حق دیتی ہوں کہ کیا میں صرف باس ہوں؟ کیا ایک جیتی جاگتی عورت نہیں ہوں؟"

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کمیل دادا کی مردانہ اَنا نے اسے ایک زبردست دھچکا دیا... وہ جان گیا کہ باوجود کوشش اور دھیان کے اس سے کہیں پھر کوئی غلطی ہوگئی تھی، جس کے باعث آج بیگم صاحبہ کو اس قدر ٹوٹتے ہوئے، مجبور لہجے میں اس سے یہ کہنا پڑا تھا... گویا انہیں اس کی کسی بات پر یا اس کے کسی رویے پر دُکھ پہنچا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا کمیل؟" اسے اتھاہ خاموشی میں ڈوبے پا کر زہرہ بانو نے دوبارہ اپنا سوال دُہرایا تو وہ یکدم تھکے سے لہجے میں بولا۔

"بیگم صاحبہ! اس میں کیا شک ہے؟ آپ کے دونوں روپ ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہے کی گنجائش نہیں کہ آپ نے ہمارا بھی بڑا خیال رکھا ہے، ہمیں کبھی یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ ہم آپ کے زرخرید ہیں... آپ نے یہاں بیگم ولا میں ہم سب کے ساتھ ایک عزت اور وقار کے ساتھ جو معیار اور ماحول قائم کر رکھا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا بڑے اپنے چھوٹوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے کمیل دادا کو اپنی آواز، اپنا لہجہ کیا پورا وجود فرطِ جذبات سے لرزتا محسوس ہونے لگا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح ٹھٹک گیا... یہ دیکھ کر کہ بیگم صاحبہ کی کشادہ آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔ کمیل دادا کے ضمیر کو جیسے ایک تازیانہ لگا... وہ صوفے سے اُٹھا اور دل گیر سے لہجے میں یہ کہتے ہوئے "مجھے معاف کر دینا بیگم صاحبہ" آگے بڑھ کر زہرہ بانو کے قدموں میں گرنے لگا تھا کہ فوراً زہرہ نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر روک دیا اور بولی۔

"نہیں کمیل! مجھے اپنے ساتھیوں کا پورا احترام ہے، میں ان کی عزتِ نفس کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتی... تم اسی طرح میرے سامنے کھڑے ہو کر بات کرو۔"

کمیل دادا اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ سر جھکائے زہرہ بانو کے سامنے کھڑا ہو گیا، پھر بولا۔ ''بیگم صاحبہ! شاید مجھ سے لئیق شاہ کے معاملے میں پھر کوئی غلطی ہو گئی ہے، جس نے آپ کو آج اس قدر رنجیدہ خاطر کر دیا کہ مجھ جیسے کمین ملازم کے سامنے آپ کو... اپنے تحکمانہ لہجے سے جھک کر یہ سب کہنا پڑ رہا ہے۔''

کمیل دادا کی یہی زود فہمی، یہی فراست اور یہی ادا زہرہ بانو کو بہت پسند تھی... وہ اپنے دلنشیں لبوں پہ ایک حسین سی مسکراہٹ سجا کے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''بیگم صاحبہ! مجھے اب اور شرمندہ نہ کریں... م... میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔'' کمیل دادا نے اتنا ہی کہا تھا کہ زہرہ بانو بولی۔

''کمیل! میں لئیق شاہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

کمیل دادا کے اندر ایک زور کا چھناکا ہوا... لیکن پھر فوراً ہی سنبھل بھی گیا، بولا۔ ''اس سے بڑھ کر ہمارے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے بیگم صاحبہ...؟ ہم خود اس کا اہتمام کریں گے، آپ کا یہ فیصلہ یقیناً غلط نہیں ہو سکتا، آپ کی خوشی اس میں ہے تو ہم بھی خوش ہیں، خوب دھوم دھام سے ہم آپ کا اور لئیق شاہ کا دھیا کریں گے بیگم صاحبہ!''

زہرہ بانو سے یہ سب کہتے ہوئے کمیل دادا اندر ہی اندر نجانے کتنے امتحانوں سے گزر گیا۔

''تم اس رشتے پر خوش ہو ناں کمیل؟'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔

''میری کیا مجال ہے بیگم صاحبہ! آپ پھر مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔'' وہ گومگو سے لہجے میں بولا... اس وقت اس نے نجانے کس طرح اپنے دردِ نہاں کو چھپائے رکھا تھا... اور اب وہ زہرہ بانو سے بھی نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ تم لئیق شاہ سے کچھ مطمئن نہیں نظر آتے ہو... کیا بات ہے اکمی... مجھے بتاؤ گے نہیں؟''

اس کی بات پر کمیل دادا اندر سے ذرا سا گیا... بہ یک جرأت بولا۔ ''ن... نہیں بیگم صاحبہ! ایسا تو کچھ نہیں ہے۔''

زہرہ بانو نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس سے بولی۔ ''کمیل! لئیق شاہ اندر سے بہت دکھی ہے، کل اس نے مجھے اپنی ساری دکھ بھری داستان سنائی تھی... اسے اپنے پیاروں کی تلاش ہے، اور میں نہیں چاہتی کہ مجھ سے شادی کرتے وقت اس کے دل میں کوئی بوجھ ہو۔ کوئی دکھ ہو اسی لیے پہلے میں چاہتی ہوں کہ ہم سب مل کر اس کے پیاروں کا کھوج لگانے کی کوشش کریں... میری آج کی میٹنگ بلانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن تمہاری اس سلسلے میں لاتعلقی اور سرد مہری نے مجھے اندر سے ملول اور مایوس سا کر دیا تھا۔''

''ن... نہیں بیگم صاحبہ! ایسی بات نہیں تھی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ آپ کی ہی نہیں بلکہ اس وقت خود لئیق شاہ کی زندگی کو بھی خطرہ ہے... ہمیں کسی اضافی مہم میں سوچ سمجھ کر ہی پڑنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے کمیل دادا کو یوں لگا جیسے وہ منافقت سے کام لے رہا ہو... جھوٹ بول رہا ہو لیکن یہ ''جھوٹ'' کسی ایسے سچ سے بہتر تھا جس سے کسی کو آزار پہنچتا ہو... یہ نظریۂ ضرورت کے تحت بولنے والا وہ جھوٹ تھا جس میں ایک مصلحت پوشیدہ تھی۔

''ہم۔'' اس کی بات پر زہرہ بانو نے ایک گہری اور پرسوچ ہنکاری خارج کی... پھر بولی۔ ''تو کیا پھر جب تک ممتاز خان کا معاملہ حل نہ ہو... تو ہماری شادی بھی رکی رہے گی؟ میرا مطلب تھا... میں لئیق شاہ کو یہاں (بیگم ولا) سے جانے نہیں دینا چاہتی... نہیں کسی جوش میں آ کر وہ اس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''

''ایسے تو بیگم صاحبہ! بات پھر بھی وہی ہو جائے گی۔'' کمیل دادا بولا۔ ''لئیق شاہ کے ماں باپ اور بھائی کی تلاش میں بھی جانے کتنا عرصہ لگ جائے؟ اور پھر پتا نہیں وہ زندہ بھی ہوں یا نہیں... ہمیں بہرحال تصویر کے دونوں رخ دیکھنے چاہئیں بیگم صاحبہ!''

''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔'' زہرہ بانو سوچ میں پڑ گئی... پھر اس سے مستفسر ہوئی۔ ''تو پھر تمہارا اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟''

کمیل دادا کو اچانک یوں لگا جیسے بیگم صاحبہ نے اسے کسی بڑے امتحان میں ڈال دیا ہو... اپنی غلطی کا بھی ازالہ کرنا مقصود تھا اور بیگم صاحبہ کا دل بھی صاف کرنا تھا، لہٰذا اپنے دل پر بہت جبر کر کے اس نے زہرہ بانو کو یہی مشورہ دیا کہ اسے اور لئیق شاہ کو پہلے شادی کے بندھن میں بندھ جانا چاہیے۔

☆☆☆

بیگم ولا میں ایک خوشی کی لہری دوڑ گئی۔ زہرہ بانو اور لئیق شاہ کی شادی کی زور و شور سے تیاریاں کی جانے لگیں۔ ابھی شادی میں کچھ دن باقی تھے مگر ابھی سے ہی بیگم ولا کی عمارت کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا... باجے گاجے شروع کردیے گئے تھے۔ سب کے چہروں پہ خوشی تھی۔

کمیل دادا شاید وہ واحد فرد تھا جو بظاہر تو سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کررہا تھا مگر اندر سے وہ کتنا "خوش" تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ اگرچہ زہرہ بانو اور لئیق شاہ کی شادی کے انتظامات میں وہ ہی سب سے آگے تھا مگر اس کے اندر کے دکھ سے کوئی واقف نہ تھا (ماسوائے اس کے باپ منشی فضل دین کے، جو وہیں رہتا تھا اور شہر میں واقع زہرہ بانو کی ایک فلور مل سنبھالتا تھا)... ہنستے مسکراتے چہروں کے بیچ اپنا غم نہاں چھپا کے مسکرانا، بڑے دل و جگر کا کام ہوتا ہے اور کمیل دادا یہی کررہا تھا۔

خوشی کے اس موقع پر لئیق شاہ نے گاؤں سے اپنے دو پرانے دوستوں بجلی اور بختیار علی کو بھی چند روز پہلے ہی بلا لیا تھا...

موقع کی مناسبت سے زہرہ بانو بھی اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ رہنے لگی تھی اور خاصی حسین لگ رہی تھی... لئیق شاہ بھی بہترین شلوار سوٹ میں ملبوس رہتا اور خاصا خوبرو دکھائی دے رہا تھا... بلکہ یہ دونوں کیا، بیگم ولا کا ہر ملازم مرد یا عورت، رنگ برنگ پوشاکیں پہنے ہوئے تھا... جی کڑا کر کے کمیل دادا نے بھی اسی مناسبت سے لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

بیشتر ساتھیوں کا خیال تھا کہ شادی کی یہ عظیم تقریب شہر کے کسی بڑے میرج ہالز میں ہونی چاہیے اور خوب دھوم دھام سے ہونی چاہیے، لیکن کمیل دادا نے سیکیورٹی رسک کے حوالے سے ایسا کروانے سے انکار کردیا تھا... چونکہ زہرہ بانو نے اس تقریب کے سارے انتظامات کا مکمل اختیار کمیل دادا کے سپرد کر رکھا تھا، اور اسی کی مرضی پر سب چھوڑا ہوا تھا، لہٰذا کمیل دادا کا ارادہ بیگم ولا میں ہی شامیانے اور قناتیں لگوا کر اس تقریب کو منانے کا تھا۔ ساتھیوں نے پہلے تو کمیل دادا کی منتیں سماجتیں کیں، مگر وہ نہیں مانا تو انہوں نے زہرہ بانو سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر ڈالا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ خود زہرہ بانو کی بھی یہی خواہش تھی... مگر اس سلسلے میں وہ بھی خاموش رہی مگر من چلے ساتھی بھی بڑے کائیاں تھے، انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اس وقت بیگم ولا کی گویا "ہائر اتھارٹی" یعنی لئیق شاہ کے پاس سفارش کے لیے جا پہنچے۔ جبکہ حقیقت یہی تھی کہ خود لئیق شاہ باقاعدہ طور پر ایک برات کی صورت میں نکاح یا شادی والے دن اپنے گاؤں نئے پنڈ سے یہاں آنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں اس کے اور کمیل دادا کے درمیان چند روز پہلے خاصی بحث بھی ہوچکی تھی۔

لئیق شاہ شادی کے دن یہاں گاؤں سے برات لے کر آنا چاہتا تھا، جبکہ کمیل دادا اس سلسلے میں نئے پنڈ کو "ریڈ زون" قرار دے چکا تھا۔ وہ نئے پنڈ کو دشمنوں کا علاقہ کہتا تھا۔ اور اس میں خود لئیق شاہ کی جان کو زیادہ خطرہ تھا... بڑی مشکلوں سے لئیق شاہ اس بات پر راضی ہوا تھا کہ وہ نئے پنڈ جانے کے بجائے ادھر ہی یعنی بیگم ولا میں رہے گا۔

لہٰذا جب ساتھیوں نے اس سے بڑی پرزور فرمائش کی تو اس نے ان کی درخواست زہرہ بانو تک پہنچا دی۔ اسے تامل تھا... اس وقت کمیل دادا بھی وہاں موجود تھا۔

اس نے یہاں بھی جب وہی بات دہرائی تو لئیق شاہ نے کہا۔ "نئے پنڈ کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن کیا اب ہم یہاں شہر میں بھی دشمنوں سے ڈرتے پھریں گے؟ اور باہر نکلنا چھوڑ دیں گے؟"

زہرہ بانو کی حتی الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ کمیل دادا اور لئیق شاہ کے بیچ بحث و مباحثے والی صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔

لئیق شاہ کی بات پر کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "شاہ صاحب! ہم دشمنوں سے ڈرتے نہیں ہیں، لیکن بات موقع کی ہے، یہ ایک خوشی کا موقع ہے، یہ جتنا خیر و عافیت کے ساتھ بیت جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔"

لئیق شاہ کو اب "بیگم صاحبہ" کا شوہر ہونے کا درجہ ملنے والا تھا، اسی لیے اب کمیل دادا، اسے "شاہ صاحب" کہہ کر ہی مخاطب کرنے پر مجبور تھا۔

بہرحال زہرہ بانو کو ہی مداخلت کرنا پڑی اور اس نے اپنے ہونے والے شوہر لئیق شاہ کی بات مانی۔ کمیل دادا خاموش ہوگیا۔

میرج ہال بھی کمیل دادا نے ہی بک کرا دیا... مگر اسے اس پر تشویش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بیگم صاحبہ اس کا مشورہ ٹھکرا کے غلطی کررہی ہیں جبکہ لئیق شاہ کی ضد بھی یہی تھی۔

کمیل دادا کو اب سیکیورٹی کے معاملات پر نئے سرے سے غور کرنا پڑا۔ اس نے مسلح گارڈ تو پہلے ہی تشکیل

دے دیے تھے جو بیگم ولا کے گردو پیش میں کیے جانے والے تھے، لیکن اب اسے میرج ہال سے یہاں تک کی سیکیورٹی کے انتظامات بھی کرنا تھے۔

مجبوراً اسے ایک اور نیا پلان ترتیب دینا پڑا، اور نئی حکمت عملی بنانی پڑی جس کے مطابق اس نے مسلح افراد کا ایک اور اضافی دستہ مقرر کیا جو بہ ظاہر غیر مسلح ہی نظر آتے۔ جبکہ مسلح دستہ شادی والے روز ہوائی فائرنگ کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، اگرچہ انہیں بھی کمیل دادا نے سختی کے ساتھ یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ برائے نام ہی فائرنگ کریں گے، اور نیز زیادہ شور شرابے سے گریز ہی کیا جائے۔

پولیس سے مدد لینا فضول تھا... کمیل دادا پر بڑا پریشر تھا۔ ہال بک کروانے کے بعد ہی اس نے اپنے چند ساتھی خفیہ نگرانی کے لیے ہال کے گرد چھوڑ رکھے تھے، جو وہاں بہ ظاہر عام آدمیوں کی طرح سے گشت کرتے رہتے... اور رخصتی والے دن تک وہ وہاں کسی بھی مشکوک فرد کو دیکھتے ہی اسے گرفت میں لے کر بیگم ولا پہنچانے کی ہدایت پر عمل پیرا رہتے۔

کمیل دادا نے پوری تندہی کے ساتھ سیکیورٹی سے لے کر شادی کے تمام انتظام و انصرام تک انجام دیے تھے، لئیق شاہ سے رقابت کے باوجود کمیل دادا نے ان سارے معاملات میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی۔ یہاں تک کہ اس نے اس بات کا بھی دھیان رکھا تھا کہ اس کے کسی بھی رویے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہ ہونے پائے، جس سے بالخصوص بیگم صاحبہ کو اس کے کاموں میں کوئی کمی بیشی کی شکایت محسوس ہو۔

جس روز زہرہ بانو اور لئیق شاہ کا نکاح تھا، اس سے ایک دن پہلے کمیل دادا کے ساتھ نجانے کیا ہوا کہ... اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، آخر وہ بھی انسان تھا، ایک دھڑکتا ہوا ارمانوں بھرا دل وہ بھی رکھتا تھا۔

اس نے اپنے کمرے میں خود کو قید کر لیا... اس روز اس کا باپ منشی فضل دین بھی بیگم ولا میں ہی تھا اور چپ چپ نظروں سے اپنے بیٹے کو یہ سب کرتے اور اندر ہی اندر کڑھتے دیکھ رہا تھا۔

کمیل دادا اس روز اپنے باپ کے پاس بھی نہیں بیٹھا تھا۔ ساتھیوں سے اس نے بہانہ کر لیا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور ذرا آرام کرنا چاہتا ہے۔

وہ اپنے کمرے میں آ گیا مگر آرام کرنے نہیں بلکہ اپنا غم غلط کرنے... بیگم ولا میں شراب پر سختی سے پابندی تھی۔ مگر کمیل دادا نے کہیں سے ایک بوتل کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس نے آج تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ گاؤں میں دوستوں یاروں کو پیتے پلاتے دیکھتا رہا تھا، اور انہی کے اصرار پہ اس نے بھی تھوڑی بہت چکھ رکھی تھی، اس نے سن رکھا تھا کہ اسے پینے کے بعد انسان تھوڑی دیر کے لیے غم دنیا سے نجات حاصل کر لیتا ہے... اندر کا چھپا ہوا کرب کم ہو کے دب جاتا ہے۔

پہلے تو وہ بستر پہ نیم دراز سا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا... اس کے بعد وہ اٹھا اور میز کی جانب بڑھا، وہیں بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ اس نے فریج سے برف کی ٹکڑیاں نکالیں... اور کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا، بے دلی سے اس نے آئس کیوب کا باؤل میز پر رکھا، اور کرسی پہ بیٹھا بیٹھا سامنے میز کی وسط میں رکھی شراب کی بوتل کو تکتا رہا۔ کئی ثانیے اسی طرح شراب کی بوتل کو گھورتے ہوئے بیت گئے... اس کے اندر ایک طوفانی سی ہلچل مچی ہوئی تھی... دماغ جل رہا تھا، کرب کی ایک چنگاری تھی جو شعلے سے آگے بننے کو بے تاب تھی... اس کے بعد اس نے... آگے جھک کر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں کمیل...!“ اچانک ایک آواز اس کی سماعتوں میں گونجی... اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا... ”اس ام الخبائث کو ہاتھ لگانے سے پہلے اتنا سوچ لینا کمیل کہ پھر تم کہیں کے نہیں رہو گے... اس میں ایک بار ڈوبنے والا کبھی نہیں ابھرتا، اس گندے جوہڑ میں آغشتہ ہونے کے بعد تم اپنی محبت کو ہی نہیں بلکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ اب تک جو تمہارا معیاری تعلق ہے، وہ پراگندگی کا بھی شکار ہو سکتا ہے۔ اسی راستے سے واپس لوٹ جا کمیل!“

ضمیر کی اس آواز پر اس نے بوتل کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیا... پھر وہ کرسی سے اٹھا، بوتل اٹھائی اور اسے کھول کے سنک میں بہا دی۔

☆☆☆

زہرہ بانو کو دلہن بنایا جا چکا تھا۔ بیگم ولا میں جیسے چودھویں کا چاند نکل آیا تھا... جس کی ضوفشانی سے بیگم ولا بقعۂ نور بن گیا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ میں گانے گائے جا رہے تھے، ایک خوشی کا سماں تھا۔ بیگم ولا کی عمارت کو بھی سجایا گیا تھا۔

شہر میں کاروباری حوالے سے زہرہ بانو کے جو جان پہچان کے لوگ تھے، انہیں دعوت نامے تقسیم کیے جا چکے تھے۔

کمیل دادا نے بڑی سمجھداری اور ہوشیاری سے سیکیورٹی کا ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ مہمانوں پر کسی قسم کا

کوئی منفی اثر بھی نہ پڑنے پائے۔

نکاح ظہر کی نماز کے وقت پڑھوایا گیا... شام... ..... چھ بجے بیوٹیشن آ گئی.... وہ برائیڈل میک اپ کی ایکسپرٹ تھی۔ سات بجے اس نے زہرہ بانو کا میک اپ شروع کر دیا جو معروفیتش دو گھنٹے تک جاری رہا۔

زہرہ بانو اُوپری منزل پہ تھی، نچلی منزل پہ عتیق شاہ کو بھی اس کے ساتھی دولھا بنانے میں مصروف تھے۔

کبیل دادا بھی نیچے تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار اوپر جا رہا تھا۔ عتیق شاہ کو اس نے دولھے کے روپ میں دیکھا، جو خاصا خوبرو نظر آ رہا تھا... اس نے سرخ کام والی بلیک شیروانی پہن رکھی تھی، اور سر پہ ریڈ کلر کا کلاہ تھا، پیروں میں کھسے تھے۔ یہ لباس اس کے دراز قد پہ خوب جچ رہا تھا۔

وہاں سبھی نے موقع کی مناسبت سے اپنی اپنی تیاری کر رکھی تھی، فقط ایک کبیل دادا تھا... جس نے عام سا لباس پہن رکھا تھا... حالانکہ زہرہ بانو نے اسے بھی اچھی خاصی شاپنگ کروائی تھی، اور بہترین سوٹ لیا تھا اس کے لیے، مگر جانے کیا بات تھی کہ اس نے وہ لباس زیب تن کرنے کے بجائے عام سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی... وہ بھی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کے باعث بری طرح مسکی ہوئی تھی۔

اس کے باپ منشی فضل دین نے جو اپنے لختِ جگر کو اس حالت میں دیکھا تو اسے دکھ ہوا... بوڑھا باپ تھا، اپنے بیٹے کے دکھ سے اچھی طرح واقف تھا، مگر وہ اس موضوع پر اپنے بیٹے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، جانتا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، تاہم بولا۔

"پتر سہیل! تو بھی کچھ چنگی جی پوشاک پہن لیتا... ایسی لباس میں تو تو بوندلایا لگ رہا ہے۔" باپ کی بات پر کبیل دادا پھیکے سے انداز میں مسکرایا پھر بات بناتے ہوئے مختصر بولا۔

"کیا فائدہ ابا جی! کام کی بھاگ دوڑ میں سارا لباس خراب ہو جائے گا۔"

منشی فضل کو قطعاً یہ گوارا نہ تھا کہ بیگم ولا کے سب لوگوں نے نئے قیمتی لباس پہن رکھے تھے لیکن اس کا بیٹا، جسے بیگم ولا میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی وہ یوں... عام سے لباس میں نظر آئے، اگرچہ اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ نے اسے بھی موقع کی مناسبت سے نہایت قیمتی لباس خرید کر دیا تھا۔ وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد اس نے کسی ملازمہ کے ذریعے زہرہ بانو تک یہ خبر پہنچا دی کہ کبیل دادا ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔

اس وقت کبیل دادا نیچے ہی تھا، اُوپری منزل میں زہرہ بانو دلہن بنی بیٹھی تھی اور اوپر جانے کی کسی مرد کو سختی کے ساتھ ممانعت تھی۔ عتیق شاہ بھی نہیں، فقط کبیل دادا پر یہ پابندی نہیں تھی۔ زہرہ بانو نے تمام مشرقی اقدار کا خیال بھی رکھا تھا۔

"دادا! آپ کو اُوپر بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔"

نیچے آ کر ملازمہ نے کبیل دادا سے کہا تو یکبارگی کبیل دادا کا دل زور سے دھڑکا، تاہم فوراً ہی اس ملازمہ سے سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں؟ خیریت تو ہے ناں؟ کوئی پریشانی تو نہیں بیگم صاحبہ کو؟"

ملازمہ نے نفی میں سر ہلایا اور واپس لوٹ گئی۔

کبیل دادا سوچ میں پڑ گیا، حالانکہ اس پر اوپر جانے کی زہرہ بیگم نے پابندی نہیں لگائی تھی، لیکن وہ خود بھی اوپر جانے سے کترا رہا تھا... ایک شرم بھی آڑے آ رہی تھی اور... جھجک بھی۔ وہ کشمکش کا شکار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اس میں ابھی بیگم صاحبہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ واقعی اس وقت بوکھلایا ہوا تھا۔

اُوپری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اُوپری پورشن مکمل طور پر خواتین کے لیے مخصوص تھا، جو ملازمائیں تھیں وہ کبیل دادا کو دیکھ کر سلام کر رہی تھیں۔ خود کبیل دادا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

بیگم صاحبہ کے کمرے تک ایک ملازمہ نے ہی رہنمائی کی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ کبیل دادا دستک کے بعد اندر داخل ہوا۔ پہلے زہرہ بانو تک اس کی آمد کی اطلاع پہنچائی گئی، پھر جب وہ اندر داخل ہوا تو جیسے یکلخت اس کی سانسیں تھم گئیں، دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس کے بے نظروں کو سنبھالنا بھی ایک کارِ دشوار ہونے لگا۔ زہرہ بانو سامنے ہی ایک بڑے سے صوفے پر دلہن بنی بیٹھی تھی، اس نے سرخ گلاب رنگ کا گولڈن کڑھائی والا شرارہ پہن رکھا تھا، اسی رنگ کی آتشی قمیص تھی اور دوپٹہ... جو اس وقت تھوڑا سرکا ہوا تھا۔ پیروں میں گولڈن سینڈل تھے اور قریب اس کے ایسا ہی میچنگ پرس رکھا تھا۔ دلہن بنی زہرہ بانو کا حسن کسی ہیرے کی طرح ہی دمک رہا تھا۔

کمرے میں ایک سحر انگیز سا اور خوشبو بھرا طلسماتی ماحول بنا ہوا تھا، جس کی ہوش ربائی میں بیگم صاحبہ کی شان اور

سج دھج کو چار چاند لگ گئے تھے، اس کے دلکش اور حسین چہرے سے ایک وقار بھی جھلک رہا تھا۔

لاکھ احتیاط اور مرتبے کے پاس کے باوجود کمیل دادا جیسے اپنا آپ گم کر بیٹھا تھا۔ وہ تو اپنی پلکیں جھپکانا ہی بھلا بیٹھا تھا۔ تب پھر اسے زہرہ بانو کی مترنم آواز نے ہی چونکنے پر مجبور کیا۔

''کیسی لگ رہی ہوں میں... کمیل دادا؟''

کمیل دادا کیا جواب دیتا؟ ایسے تو خود کسی کے ہوش دلانے کی اس وقت ضرورت پیش آرہی تھی، مگر اس آواز نے اس کی محویت توڑی تو وہ از حد شرمندہ شرمندہ سا ہوا، اپنے دل کی حسرت آمیز کسک کو دباتے ہوئے فوراً بات بنائی۔

''ماشاء اللہ، بیگم صاحبہ! چشمِ بد دور... آپ بہت حسین لگ رہی ہیں، بہت خوبصورت... میری دل سے دعا ہے بیگم صاحبہ کہ آپ اور شاہ صاحب، زندگی کے اس نئے سفر پر ہر لحہ خوشیاں سمیٹتے رہیں۔'' کمیل دادا نے زہرہ بانو کو یہ دعا واقعی دل سے دی تھی۔ جس پر زہرہ نے بھی دھیرے سے زیر لب آمین کہا تھا۔

''یہ بتاؤ کمیل! لئیق شاہ کو تم نے دیکھا ہے؟ وہ کیسا لگ رہا ہے دولہا کے لباس میں؟'' زہرہ بانو نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تو وہ کھلے دل اور صاف گوئی سے بولا۔

''ماشاء اللہ، بیگم صاحبہ! وہ بھی بہت پیارا اور خوبرو لگ رہا ہے، بالکل شہزادہ، آپ کی اور شاہ صاحب کی جوڑی بہت پیاری لگے گی۔'' کمیل دادا نے کہا۔

اچانک زہرہ بانو نے خود سے ہٹ کر جب کمیل دادا پر توجہ دی تو بولی۔ ''یہ کیا کمیل! تم نے کوئی تیاری نہیں کی؟ وہی پرانا لباس پہنے ہوئے ہو؟''

کمیل دادا تھوڑا گھبرایا پھر بولا۔ ''ٹھ... ٹھیک ہی تو ہے یہ لباس بیگم صاحبہ! اچھا بھلا تو ہے'' اس کے الفاظ بے ربط سے تھے۔

''ہرگز نہیں، ابھی جاؤ اور اسی وقت وہ پینٹ کوٹ پہن کر آؤ، جلدی، یہ میرا حکم ہے۔'' زہرہ بانو نے تحکمانہ کہا اور کمیل دادا ایک گہری سانس خارج کر کے واپس لوٹ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور تیاری میں مصروف ہو گیا، ایک گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر خود کو قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

زہرہ بانو کے خصوصی طور پر خرید کردیے ہوئے، ہلکے اسکائی کلر کے بیش قیمت لارنس پول پینٹ کوٹ میں وہ خاصا وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بھیگے تھے اور پیشانی سے تھوڑے اُڑے اُڑے ہوئے تھے، رنگ سانولا تھا، قد دراز تھا، گھنی مونچھیں تھیں، چہرے پر ٹھہراؤ پن تھا۔

اس میں دوبارہ بیگم صاحبہ کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی اور کسی کام کے بہانے وہ اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔

بالآخر میرج ہال میں لئیق شاہ اور زہرہ بانو کو ساتھ بٹھا دیا گیا۔ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ پروفیشنل فوٹو گرافرز اس میرج برسی کی تصویریں اور ویڈیو البم بنانے میں مصروف تھے۔

کمیل دادا نے خود کو ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی چوکس کر رکھا تھا اور وہ خود بھی گاہے بگاہے اپنی خفیہ سیکیورٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔

لئیق شاہ کے ساتھ دلہن بنی بیٹھی زہرہ بانو کا دل مسرت بھری چٹکیاں لے رہا تھا۔ آج اس کا ایک خواب دیرینہ جیسے شرمندۂ تعبیر ہونے کو تھا، آج اس کا محبوب لئیق شاہ اس کے قریب... بہت قریب تھا، لیکن ابھی ارمانوں بھرے دلوں کی پیاس کو ایک ذرا وصلِ شبِ زفاف کی رات کا انتظار تھا۔ ایسی رات، جو مسرت کی ان گھڑیوں کو شادمانیوں سے لبریز کر دیتی ہے، ایک جانب اگر زہرہ بانو اپنی قسمت پر نازاں تھی تو دوسری طرف لئیق شاہ کے دل کی بھی یہی کیفیت تھی، اسے یہ سب ایک حسین خواب ہی کی صورت لگ رہا تھا، زہرہ بانو ایک حسین اپسرا کی صورت اس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، اور وہ اس کی قربت میں سرشار تھا۔

تقریب کا اختتام ہوا، پھولوں پتیوں کی برسات میں دولہا دلہن کی رخصتی ہونے لگی، کمیل دادا حرکت میں آ گیا، وہ سائے کی طرح اس جوڑے کے ساتھ اور کبھی آگے پیچھے ہو رہا تھا، اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا... اور وہ بار بار میرج ہال کے باہر اور آس پاس متعین اپنے مسلح محافظ ساتھیوں سے کلیئرنس کی رپورٹ بھی لے جا رہا تھا۔

ہال کے باہر نئے ماڈل کی ٹیوٹا کرولا، دولہا اور دلہن کو بیگم ہاؤس لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اسے بھی خوب سجایا گیا تھا۔

نو بیاہتا جوڑے کے ہال سے نکلنے سے پہلے کمیل دادا باہر نکلا اور ایک گہری نظر اطراف میں ڈالی یاسر اور جہانگیر کو اس نے کار کے قریب چوکس کھڑے رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔ آنے والے مہمانوں کی گاڑیاں سامنے قطار کی صورت کھڑی تھیں۔ کچھ لوٹ رہے تھے، بیشتر کھڑے دلچسپی سے دولہا دلہن کی رخصتی کا یہ آخری منظر دیکھنے میں محو تھے۔

زہرہ بانو اور لئیق شاہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے

ہوئے۔ میرج ہال کے گیٹ سے باہر نکلے، ایسے میں کبیل دادا النگر کے قریب ہوگیا۔۔۔ بہ ظاہر سب ٹھیک معلوم ہو رہا تھا، لیکن کبیل دادا بھول گیا تھا کہ سامنے قطار کی صورت کھڑی کاریں صرف آنے والے مہمانوں کی ہی نہیں ہوسکتیں۔ اور اس غلطی کا احساس کبیل دادا کو دیر سے ہوا۔

دولہا دلہن کو بیگم ولا لے جانے والی چمکتی دمکتی کار گیٹ کے مختصر قدمچوں کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر مہمانوں کی کھڑی کاروں میں شامل، نیلے رنگ کی ہنڈا اکارڈ جو قدرے قریب کھڑی تھی اور اس کے اندر تھوڑی دیر پہلے تک کوئی بیٹھا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔۔۔ اب اچانک اس کے اندر چار سر دکھائی دیے۔ یہ سب ڈھاٹا پوش تھے، ایک نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور باقی تینوں نے کھڑکی سے گنز نکال لیں، اسی وقت کبیل دادا کی نظر پڑی، ان کی طرف یاسر اور جہانگیر کی پیٹھ تھی، انہیں خبردار کرنے کا وقت نہ رہا تھا، نہ ہی کبیل دادا کے پاس اپنا پستول نکالنے کا، جو کرنا تھا، پل کے پل میں کرنا تھا اور وہ کبیل دادا نے کر ڈالا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا، اور دولہا دلہن کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کی کہ وہ فوری طور پر نشانے کی زد سے نکل جائیں، اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا، دھکا لگنے سے زہرہ بانو ہلکی چیخ کے ساتھ نیچے قدمچوں کی طرف لڑکھڑا گئی، اور گرتے ہی اپنی کار کی باڈی سے جا ٹکرائی، اسے اپنی کار کی آڑ میسر آگئی، مگر لئیق شاہ کو لڑکھڑانے میں دیر ہوئی، اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری، اور کبیل دادا کی وحشت بھری نظروں نے لئیق شاہ کو گولیوں سے چھلنی ہوکر گرتے دیکھا۔

دشمنوں کا نشانہ دولہا دلہن دونوں تھے مگر وہ صرف ایک کو ہی اپنی درندگی کا نشانہ بنا سکے، ان کی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک سفاکی اور بربریت کا یہ کھیل نہیں کھیل سکتے تھے۔۔۔ لہٰذا انہوں نے گاڑی آگے بڑھائی، یاسر اور جہانگیر بھی حرکت میں آچکے تھے۔ اور انہوں نے اس کار پر فائرنگ کی، جبکہ دشمن اپنے دفاع میں فائرنگ کرتے، راہِ فرار اختیار کرنے کی جستجو میں تھے، مگر یاسر اور جہانگیر نے ان پر جوابی فائرنگ کی اور دو دشمنوں کی کریہہ انگیز چیخیں بھی سنائی دیں۔۔۔ مگر بدقسمتی سے وہ دونوں بھی گولیوں کی زد میں آکر گرے، جبکہ کبیل دادا اپنا پستول نکالے پاگلوں کی طرح فائر کرتا۔۔۔ دشمنوں کی کار کے پیچھے لپکا۔

وہاں بڑبونگ مچ گئی۔ مہمان عورتوں بچوں کی چیخیں گونجنے لگیں۔۔۔

زہرہ بانو کا عروسی جوڑا مسک چکا تھا۔ وہ اپنی کار کی باڈی کے ساتھ جا لگی تھی اور ایسے میں اس کا محبوب لئیق شاہ گولیوں سے چھلنی ہوکر میرج ہال کے گیٹ سے لڑکھڑاتا ہوا سیدھا اس کے قریب، کچھ اس طرح گرا کہ اس کا سر زہرہ بانو کی گود میں تھا۔ اپنے محبوب کو اس طرح خون میں نہایا ہوا دیکھ کر زہرہ بانو کو جیسے سکتہ ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی کے رنگ میں اس کے محبوب، لئیق شاہ کا خون بھی شامل ہوگیا تھا اور رنگِ حنا جیسے رنگِ لہو میں بدل گیا تھا۔ زہرہ بانو کو یوں لگا جیسے قیامت آگئی ہو، زمین پھٹ گئی ہو، آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔

اس کے وجود کے ہی نہیں اس کی روح تک کے ٹکڑے کردیے گئے ہوں، یہ شدید دکھ اور کرب انگیزی کی آخری حد ہی تھی کہ باوجود کوشش کے زہرہ بانو کے سینے سے اٹھنے والی چیخ تھرتھرا کر وہیں اٹکی رہ گئی، اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں، پورا وجود روح سمیت دہل گیا تھا۔ ایک کپکپی اس پر طاری تھی۔

لئیق شاہ اس کی گود میں اپنا سر دیے کراہ رہا تھا، صاف نظر آتا تھا کہ وہ آخری سانسوں پہ تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر زہرہ بانو کی آنکھیں ہی جیسے لہو رنگ ہوگئیں۔۔۔ ایسے میں لئیق شاہ نے اپنا لرزتا ہوا ایک ہاتھ۔۔۔ اوپر اٹھانے کی ناکام کوشش کی، مگر زہرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے ہونٹ کپکپائے۔۔۔ اور وہ بھنچی بھنچی آواز میں زہرہ سے بس اتنا ہی کہہ پایا۔ ”ز۔۔۔ ز۔۔۔ ز۔۔۔ زہرہ! ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ ہمارا بس۔۔۔ بس۔۔۔ اتنا ہی ساتھ تھا۔۔۔ تت۔۔۔ تقدیر کو یہ۔۔۔ جو۔۔۔ مم۔۔۔ منظور۔۔۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ دکھ مت۔۔۔ کک۔۔۔ کرنا۔“

لئیق شاہ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور زہرہ بانو کا اندر جیسے لہولہان ہوگیا اور تب ہی اس کا غم آمیز سکتہ ٹوٹا، اس کے سینے کے پنجر میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی چیخ اس قدر زور سے آزاد ہوئی تھی کہ آس پاس کا ماحول بھی بری طرح تھرا اٹھا تھا۔ اس کے بعد آہیں تھیں، سسکیاں تھیں اور نہ ختم ہونے والا ایک دکھ تھا اور۔۔۔ زہرہ بانو تھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ضرورتِ زندگی

آصف ملک

یہ وصف کسی کسی میں ہوتا ہے کہ وہ وقت سے کبھی نہیں ڈرتے... خوف زدہ اور سرنگوں نہیں ہوتے... ہمیشہ سچائی... دیانت داری کا علم اٹھائے رہتے ہیں... وہ سخت زندگی گزارنے کا عادی تھا... ہر بات دوٹوک انداز میں کرتا تھا... جو خیال اس کے ذہن میں آجاتے، وہ اس کو ہر صورت کر گزرتا تھا... آسان سہل اور شہری زندگی سے دور پُرمشقت طرز زندگی کی ایک جھلک... جہاں ہر روز جینے کا سامنا کرنا پڑتا تھا...

انسان دوست اور انسان دشمن درندوں کے ٹکراؤ کا سنسنی خیز احوال...

جیمی اپنے گھر سے گھٹنوں کے بل باہر آیا۔ اسے گھر میں آنے یا باہر نکلنے کے لیے گھٹنوں کے بل رینگنا پڑتا تھا کیونکہ جیمی ایک اسکیمو تھا اور برف کے بنے گھر میں رہتا تھا۔ گول گنبد نما ساخت کے ان گھروں کو اگلو کہتے ہیں۔ کینیڈا کے انتہائی شمال میں اس جزیرے پر چند ہی اسکیمو گھرانے آباد رہ گئے تھے۔ ایک زمانے میں یہاں ان کی پوری بستی تھی۔ لیکن پھر خوراک اور دوسرے ذرائع کی قلت اور سب سے بڑھ کر جنوب میں آسائشوں نے بہت سارے اسکیموز کو

یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب یہاں صرف چند اسکیمو گھرانے باقی رہ گئے تھے، ان میں ایک جیمی کا گھر بھی تھا۔ قطب شمالی سے صرف بارہ سو میل جنوب میں اس جزیرے پر سارے سال برف جمی رہتی تھی۔

انسانوں کے علاوہ اس علاقے میں صرف لومڑیاں، برفانی ریچھ، بھیڑیے اور سمندری سیل مچھلیاں پائی جاتی تھیں۔ موسم گرما میں اولین سبزہ بھی اس جزیرے سے دو سو میل جنوب میں نظر آتا تھا۔ سال میں چھ مہینے رات ہوتی اور چھ مہینے کا دن ہوتا تھا۔ اسکیموز کی زندگی کا انحصار شکار پر تھا۔ وہ شکار سے خوراک، لباس اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں حاصل کرتے تھے۔ جیسے ہی سرما گزرتا اور رات ختم ہوتی، جیمی اور دوسرے اسکیموز شکار کے لیے تیار ہو جاتے۔ آنے والے چار مہینے تک وہ شکار کر کے باقی آٹھ مہینوں تک زندہ رہنے کا سامان جمع کرتے تھے۔ شکار کا سیزن مئی جون جولائی اور اگست میں ہوتا تھا۔

اگست کا وسط تھا اور جیمی اس سیزن میں آخری بار شکار پر جانے کی تیاری کر چکا تھا۔ اس بار وہ ایک حادثے کی وجہ سے صرف ایک بار شکار پر جا سکا تھا۔ اس دوران میں اس نے اچھا خاصا گوشت اور کھالیں حاصل کی تھیں پھر وہ بیمار پڑ گیا اور دوبارہ نہیں جا سکا۔ اب وہ صحت مند تھا اور اس نے اپنی سلیج اچھی طرح تیار کر لی تھی۔ وہ اس عزم کے ساتھ جا رہا تھا کہ اپنے خاندان کے لیے سرما کی خوراک کا بندوبست کر کے واپس آئے گا۔ اس کے پاس چھ صحت مند اور طاقتور کتے تھے جو سلیج کھینچتے تھے۔ اس علاقے میں جیمی جیسے کتے کسی کے پاس نہیں تھے۔ خاص طور سے اس کے کتوں کا سربراہ میگر اور اس کے بھائی ٹیگر کا جواب نہیں تھا۔ یہ وحشی نسل سے تھے، ان کا باپ بھیڑیا تھا۔ یہی وجہ تھی وہ کسی بھیڑیے کی طرح طاقتور اور چالاک تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ جیمی سے بہت محبت کرتے تھے۔

جیمی جوان تھا اور اس کی عمر ابھی تیس برس بھی نہیں ہوئی تھی۔ چھ سال پہلے اس نے ماریت سے شادی کر لی اور اب ماریت اس کی محبوب بیوی تھی۔ ان کی محبت کی نشانی ان کا پانچ سال کا بیٹا ایگت تھا۔ ایگت کے بعد اب تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھے لیکن دو دن پہلے ماریت نے جیمی کو پھر امید سے ہونے کی خبر دی تھی۔ اب وہ دونوں خوش تھے۔

''مجھے امید ہے میں اس بار خوب شکار کر کے لاؤں گا اور ہم سرما میں آنے والے مہمان کا اچھی طرح استقبال کر سکیں گے۔'' جیمی نے ماریت سے کہا تو وہ شرما گئی۔ اس نے جیمی کو رخصت کرتے وقت کی روایتی دعا دی۔

''میں چاہتی ہوں، تم حفاظت سے اور کامیاب گھر واپس آؤ۔''

جیمی کی سلیج میں کتے جوت دیے گئے تھے اور اس کے شکار کا سامان بھی تیار تھا۔ کتے سفر کے لیے بے چین تھے۔ سرما میں ان کو باہر نکلنے کا موقع کم ملتا تھا اور وہ زیادہ تر وقت سوتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے جسموں پر چربی کی موٹی تہ چڑھ گئی تھی۔ شکار کے سیزن میں ان کی چربی کی یہ تہ گھل جاتی۔ جیمی نے ایگت کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اس نے کہا۔

''جیمی میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''ابھی نہیں... جب تم بارہ سال کے ہو جاؤ گے تب میں تمہیں شکار پر لے جاؤں گا۔'' جیمی نے اسے گود سے اتارا اور سلیج پر سوار ہو کر کتوں کی رسی تھام لی۔ اس نے ماریت کی طرف دیکھا تو اس نے ہاتھ ہلا کر شوہر کو الوداع کیا۔ جیمی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان صاف تھا لیکن فطرت کے قریب رہنے والے یہ لوگ فطرت کو پہچانتے تھے۔ جیمی کی چھٹی حس نے کہا کہ اس بار سرما وقت سے پہلے آ جائے گا۔ اس نے رسی کو جھٹکا دیا تو بے تاب کتے اشارہ پاتے ہی دوڑ پڑے۔ کچھ دیر میں جیمی کی سلیج برفانی ٹیلوں کے پیچھے غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

طیارے میں وہ چار افراد تھے۔ پائلٹ جیمس روجر تھا، اس کی ساتھی پائلٹ مینی روجر اس کی بیوی بھی تھی۔ عام طور سے وہ جب سونا لے کر روانہ ہوتے تو طیارے میں یہی دو افراد ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت طیارے میں دو افراد اور تھے۔ یہ مائیکل کلون اور اس کا بھائی شارٹ کلون تھے۔ عرف عام میں مائیک اور شارٹی کہلانے والے دونوں بھائی امریکی اور مجرم تھے۔ جب امریکا میں ان کو اپنی آزادی خطرے میں نظر آنے لگی تو یہ بھاگ کر کینیڈا چلے آئے۔ یہاں ایک شاپنگ سینٹر میں مسلح ڈکیتی کے دوران میں وہ گرفتار ہو گئے۔ اس ڈکیتی میں ان کی فائرنگ سے ایک گاہک اور ایک سیلز گرل ہلاک ہو گئے تھے۔ عدالت نے جرم ثابت ہونے پر مائیک کو ستر برس اور شارٹی کو پچپن برس کی سزا سنائی تھی۔ مائیک سینتیس برس کا تھا اور شارٹی پینتیس برس کا، یعنی ان کے جیل سے زندہ رہا ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

وہ فرار کے موقع کی تلاش میں تھے۔ آخر انہوں نے ایک گارڈ کو خرید لیا۔ اپنے کچھ ہمدردوں کی مدد حاصل کی اور بالآخر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ خطرناک مجرموں کے لیے بنائی یہ جیل کینیڈا کے شمال میں ایک ویران علاقے میں تھی۔ یہاں ہر طرف پہاڑ، جنگل اور دریا تھے۔ جنہیں عبور کرنا آسان نہیں تھا۔ یہاں سرخ ریچھ، بھیڑیے اور سیاہ شیر جیسے خطرناک درندے پائے جاتے تھے۔ شاید اسی لیے یہاں جیل بنائی گئی تھی۔ اس کے باوجود مائیک اور شارٹی فرار ہونے میں کامیاب رہے اور پولیس کو دھوکا دینے کے لیے انہوں نے جنوب کے بجائے شمال کا رخ کیا تھا۔

وہ کئی مہینے شکاریوں کے ایک کیبن میں چھپے رہے اور قریبی جھیل سے مچھلیاں پکڑ کر کھاتے رہے۔ ان کا ارادہ کینیڈا سے نکل کر کسی اور ملک جانے کا تھا کیونکہ وہ یہاں پکڑے جاتے تو سیدھا جیل پہنچا دیے جاتے۔ دوسری صورت پھر جیل جانا نہیں چاہتے تھے۔ اتفاق سے کیبن میں موجود بعض رسائل سے انہیں اس سونے کی کان کا پتا چلا جو کیبن سے صرف دو سو میل شمال میں تھی اور یہاں سے ہر مہینے تین سو کلوگرام سونا نکالا جاتا تھا۔ یہ سونا طیارے کے ذریعے ٹورنٹو منتقل کیا جاتا تھا۔ اگر وہ یہ سونا حاصل کر لیتے تو ان کے پاس اتنی رقم آجاتی کہ وہ باقی زندگی عیش سے گزار سکتے تھے۔ انہوں نے سونا اڑانے کا فیصلہ کیا اور کان کی طرف روانہ ہو گئے۔

گولڈ مائنز نامی کمپنی کی ملکیت یہ کان کینیڈا کے انتہائی شمال مغربی صوبے یوکون کے شہر ڈاؤسن سے سو میل شمال میں تھی۔ یہاں سے ہر مہینے جو سونا کمپنی کے ہیڈ کوارٹر روانہ کیا جاتا تھا، اس کی مالیت تقریباً پندرہ ملین امریکی ڈالرز بنتی تھی۔ جیمس اور میگی دس سال سے سونا لے جانے کا کام کر رہے تھے۔ اس سرد ترین خطے میں طیارہ اڑانا آسان نہیں تھا جہاں درجۂ حرارت سارے سال نقطۂ انجماد سے نیچے رہتا تھا۔ بہر حال وہ خوش تھے کیونکہ ان کو اس کام کا اچھا معاوضہ ملتا تھا۔ جیمس اور میگی دونوں پائلٹ تھے لیکن میگی نائب کے طور پر کام کرتی تھی۔ دو انجنوں والا یہ چھوٹا طیارہ ان کی ملکیت تھا۔ وہ ایک کوریئر کمپنی چلا رہے تھے اور اسی طرح کا قیمتی سامان لے جاتے تھے۔ ان کی رہائش ٹورنٹو میں تھی۔

طیارے کے لیے کان کے پاس ایک چھوٹا سا رن وے بنایا گیا تھا۔ طیارہ اس پر اترتا تھا۔ دو انجن والا طیارہ چھوٹا لیکن لمبی پرواز کے لیے موزوں تھا۔ انہیں کان سے ٹورنٹو تک کوئی تین ہزار میل لمبی پرواز کرنا پڑتی اور اس میں کوئی سات گھنٹے کا وقت لگتا تھا۔ یعنی پورا ایک دن لگ جاتا تھا۔ برسوں سے سونا منتقل کیا جا رہا تھا اور کبھی کوئی غیر متوقع صورت حال پیش نہیں آئی تھی اس لیے کان کی انتظامیہ بھی سیکورٹی کے معاملے میں ڈھیلی ہو گئی تھی۔ سونے کی منتقلی صرف ایک گارڈ کی نگرانی میں ہوتی تھی اور وہ بھی طیارے کی پرواز سے پہلے واپس چلا جاتا تھا۔ میگی اور جیمس بھی سونے کی منتقلی کے فوراً بعد روانہ ہو جاتے تھے۔ مگر اس روز وہ ابھی طیارے کو رن وے پر لا رہے تھے کہ اچانک دو مسلح افراد رن وے پر طیارے کے سامنے آ گئے اور مجبوراً جیمس کو طیارہ روکنا پڑا۔ طیارہ رکتے ہی وہ اندر گھس آئے اور انہیں پرواز کا حکم دیا۔ جیمس نے حکم کی تعمیل کی۔ طیارہ بلند ہونے پر مائیک نے جیمس سے کہا۔ ”ہمیں سینٹ جونز تک جانا ہے۔“

جیمس یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ ”وہ تو کینیڈا کے انتہائی مشرقی سرے پر ہے۔ طیارے میں اتنا ایندھن نہیں ہے کہ وہاں تک جا سکے۔“

”بکواس مت کرو۔“ شارٹی غرایا۔ ”یہ فاصلہ تقریباً اتنا ہی ہے جتنا یہاں سے ٹورنٹو تک کا ہے۔“

جیمس جانتا تھا کہ اس کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ دونوں صورت سے چھٹے ہوئے مجرم دکھائی دے رہے تھے اور ان کے پاس شاٹ گنز تھیں۔

جیمس نے طیارے کا رخ موڑ دیا۔ اب وہ آرکٹک سرکل سے گزرتا سینٹ جونز کی طرف جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا سات گھنٹے سے پہلے ان کی تلاش شروع نہیں کی جائے گی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے طیارے کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ میگی خوف زدہ تھی لیکن اپنے اوسان بحال رکھے ہوئے تھی، اچانک اس نے کہا۔ ”تم دونوں جیل سے بھاگے ہوئے بھائی ہو نا؟“

شارٹی مسکرایا۔ ”تم نے خوب پہچانا خوب صورت خاتون! ممکن ہے منزل پر پہنچ کر ہم تم سے اپنا مزید تعارف کرائیں۔“

میگی سہم گئی۔ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ بہر حال ابھی وہ محفوظ تھی۔ وہ طیارے میں اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں پرواز کرتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ ابھی تک موسم ٹھیک تھا لیکن اچانک اس نے اپنا رنگ بدلا اور طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے اور چاروں طرف برف کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ شروع میں یہ جھکڑ ہلکے تھے لیکن دس منٹ کے اندر ان کی

شدت میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ وہ پرواز میں رکاوٹ ڈالنے لگے۔ ہواؤں کے تیز جھونکے بار بار طیارے کو دھکیل رہے تھے اور وہ سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

ان چاروں کی جان پر بن گئی تھی۔ اگر طیارہ کریش ہو جاتا تو ان کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ بچ جاتے تب بھی سرد ترین موسم اور بھوک ان کی جان لینے کے لیے کافی ہوتے طیارے کو رہ رہ کر جھٹکے لگ رہے تھے۔ جیمس اور میگی طیارے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن صاف لگ رہا تھا صورتِ حال ان کے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ مائیک نے چلا کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”طوفان شدید ہے شاید ہمیں کریش لینڈنگ کرنا پڑے۔“ جیمس نے جواب دیا۔ اسی لمحے طیارے کا ایک انجن بند ہو گیا۔ اب وہ ایک انجن کے سہارے پرواز کر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں تندی آتی جا رہی تھی۔ صاف موسم کی تلاش میں جیمس طیارے کو نیچے لے آیا لیکن نیچے صورت حال اور بھی خراب تھی، یہاں اُڑتی برف کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی وقت دوسرا انجن بھی جواب دے گیا اور طیارہ اب تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور کسی کو ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

جیمی بہت خوش تھا کیونکہ اس نے ایک ہفتے میں بہت اچھا شکار کر لیا تھا۔ اس نے دو بڑی فر سیل شکار کی تھیں اور کوئی ایک درجن عام سیل مچھیاں شکار کی تھیں۔ اس نے ان کا گوشت الگ کر لیا تھا اور کھال اتار لی تھی۔ یہ کھال اچھے داموں بک جاتی تھی۔ جبکہ گوشت اس کے خاندان اور کتوں کی خوراک کے طور پر کام آتا۔ لیکن ابھی اس نے کتوں کو زیادہ کھانے کو نہیں دیا تھا۔ وہ انہیں سیل کے بچے کچھے ٹکڑے کھلا رہا تھا اور باقی گوشت کھالوں میں باندھ باندھ کر محفوظ رکھ رہا تھا۔ گوشت کا وزن تین سو کلوگرام سے زیادہ ہو گیا تھا اور یہ اس کے گھر والوں کی چار مہینے کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔ اس لیے سرما آرام سے گزر جاتا۔ ممکن ہے اسے کچھ تنگی دیکھنا پڑتی لیکن یہ اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ اسکیموز سخت حالات میں بھی گزارا کر لیتے ہیں۔ کتے اس سے زیادہ وزن نہیں کھینچ سکتے تھے پھر موسم کے تیور بھی بدل رہے تھے اس لیے جیمی نے واپسی کا فیصلہ کیا۔

اس دن موسم خراب تھا اور برفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ درجہ حرارت گر گیا تھا لیکن وہ اور اس کے کتے محفوظ تھے۔ وہ اس درجہ حرارت کے عادی تھے۔ جیمی کے پاس سیل کی گرم ترین کھال سے بنا ایسا لباس تھا جو اسے منفی پچاس کی سردی میں بھی بچاتا تھا۔ واحد مشکل یہ تھی کہ ہوا کے ساتھ برف کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے اور دس قدم سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے وہ اپنے کتوں کو قابو کیے ہوئے تھا جو گھر واپسی کی خوشی میں تیزی سے دوڑنا چاہتے تھے۔ لیکن اس میں خطرہ تھا۔ سلیج اور کتے کسی ایسی دراڑ میں گر سکتے تھے جہاں سے نکلنا ان کے بس کی بات نہ ہوتی۔ کتوں کے بغیر نہ تو سلیج چل سکتی تھی اور نہ ہی وہ سفر کر سکتا تھا کیونکہ اس علاقے میں پیدل سفر بہت دشوار تھا۔ اسے زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت تھی۔ خوراک ساری سلیج پر تھی اس لیے وہ کسی حادثے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

جب جیمی پہلی بار شکار پر آیا تو اس کے باپ نے اسے جو پہلی چیز سکھائی وہ احتیاط تھی۔ اس نے جیمی سے کہا۔ ”یوں سمجھ لو یہاں ہر طرف موت گھات لگائے بیٹھی ہے اور ایک غلط قدم تمہیں یقینی موت کی طرف لے جا سکتا ہے اس لیے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔“

جیمی نے یہ بات اپنی گرہ سے باندھ لی تھی۔ وہ شکار کے دوران میں بہت محتاط ہو جاتا اور کوئی قدم بغیر سوچے سمجھے نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ سست روی سے سلیج چلا رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اسے گھر تک پہنچنے میں تاخیر ہو گی لیکن وہ گھر پہنچ جائے گا۔

اچانک ٹیگر جو کتوں میں سب سے آگے تھا، رک گیا اور ایک طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ جیمی چوکنا ہو گیا۔ ٹیگر کا انداز خطرے کو بھانپنے والا تھا۔ شاید اس طرف کوئی برفانی ریچھ تھا۔ بھیڑیے یہاں تک نہیں آتے تھے اور لومڑیاں اس کے لیے خطرہ نہیں تھیں، وہ تو خود کتوں سے بھاگتی تھیں ایسے میں صرف برفانی ریچھ رہ جاتا تھا جو ان کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتا تھا۔ جیمی اگرچہ بھالے کی مدد سے سیل کا شکار کرتا تھا لیکن اس کے پاس ایک رائفل بھی تھی اور یہ رائفل خاص طور سے ریچھ کے لیے تھی۔ اس نے اس رائفل کی مدد سے چھ برفانی ریچھ مارے تھے۔

جیمی نے جلدی سے سلیج میں رکھی رائفل اٹھائی اور اس طرف بڑھا جہاں منہ کر کے ٹیگر بھونک رہا تھا۔ باقی کتے خاموش کھڑے تھے۔ جیمی ذرا آگے آیا تو اسے برف کے ایک ٹیلے میں ایک عجیب سی چیز دھنسی نظر آئی۔ مزید آگے آنے پر واضح ہو گیا، وہ ایک طیارہ تھا۔ جیمی کے لیے طیارہ اجنبی چیز نہیں تھا، اس نے کئی بار اسے قریب سے دیکھا تھا۔

جنوب سے لوگ اسی میں بیٹھ کر ان کے جزیرے تک آتے تھے اور پھر آگے سلیج کی مدد سے سفر کرتے تھے۔ وہ بہت ساری چیزیں لاتے تھے اور یہاں سے نمونے لے کر جاتے تھے لیکن ان کا مقصد کیا ہوتا تھا، جیمی آج تک یہ بات نہیں سمجھ سکا تھا۔ طیارے کا اگلا حصہ مکمل طور پر برف میں غائب تھا اور اس کے پر اور پچھلا حصہ باہر تھے۔

اس نے بغیر چھوئے طیارے کا جائزہ لیا اور پھر بلند آواز سے بولا۔ ”کوئی اندر ہے؟“

طیارے کے ڈھانچے کو زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا، اس کا مطلب تھا، وہ پہلے نیچے اترا تھا اور پھر برف کے اس ٹیلے سے ٹکرایا تھا۔ جیمی نے اس کا دروازہ تلاش کیا اور اسے کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ جام تھا اس نے زور لگایا تو دروازہ یک دم نکل کر اس پر آ گرا۔ وہ ٹوٹ گیا تھا۔ جیمی نیچے گرا اور جب تک وہ سنبھل کر اٹھتا، اس نے ایک سفید فام آدمی کو اپنے سامنے دیکھا۔ اس نے شاٹ گن جیمی کے چہرے سے لگا رکھی تھی اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ جیمی کی ذرا سی حرکت پر اسے شوٹ کر دے گا۔ جیمی بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کی اندرونی حس نے بتایا کہ یہ اچھا شخص نہیں ہے اور اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میرا نام جیمی ہے، تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

یہ شارلی تھا اور مائیک نے باہر آ کر جیمی کی رائفل اپنے قبضے میں لے لی۔ جیمی نے رائفل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میری ہے۔“

مائیک نے شارلی کی طرف دیکھا۔ ”یہ چینی نظر آنے والا شخص کیا بکواس کر رہا ہے۔“

”یہ چینی نہیں ہے۔“ طیارے کی طرف سے میگی کی آواز آئی، وہ جیمس کو سہارا دے کر باہر لا رہی تھی۔ اس کا ایک بازو بے جان انداز میں لٹک رہا تھا۔ اس کے سر سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ البتہ میگی ٹھیک لگ رہی تھی۔

”اگر یہ چینی نہیں ہے تو پھر کون ہے؟“ مائیک نے پوچھا۔

”یہ اسکیمو ہے۔ یہ لوگ اسی علاقے میں رہتے ہیں۔“ میگی نے کہا۔ ”مجھے ان کی زبان کسی قدر آتی ہے۔“

”تب اس سے پوچھو ہم کہاں ہیں؟“

خوش قسمتی سے کریش جان لیوا ثابت نہیں ہوا تھا اور وہ سب بچ گئے تھے۔ صرف جیمس کسی قدر زخمی تھا۔ اس کے بازو پر چوٹ آئی تھی اور کوئی چیز سر پر لگی تھی جس سے کٹ آیا تھا۔ میگی باہر لا کر اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ پھر وہ اندر گئی اور میڈیکل کٹ نکال لائی.... اس دوران میں مائیک اور شارلی جیمی کی تلاشی لے رہے تھے۔ ان کو خدشہ تھا کہ اس کے بھاری بھرکم لباس میں کوئی اور ہتھیار نہ چھپا ہو۔ میگی، جیمس کی مرہم پٹی سے فارغ ہوئی تو اس نے جیمی سے اسکیمو کی زبان میں کہا۔

”تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

جیمی خوش ہوا، یہ عورت اس کی زبان بول رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ ”میں جیمی ہوں اور یہاں شکار کر کے واپس جا رہا ہوں۔“

”تمہاری بستی قریب ہے؟“ میگی خوش ہو گئی۔

”یہاں سے دو دن کی مسافت پر ہے۔“ جیمی نے بتایا۔

مائیک اور شارلی ان کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ مائیک نے کہا۔ ”یہ چینی کیا کہہ رہا ہے؟“

”یہ اسکیمو ہے۔“ میگی نے صحیح کی۔ ”یہ شکار پر نکلا تھا اور اس وقت واپس اپنے گھر جا رہا ہے۔“

”یہ جگہ آبادی کے قریب ہے۔“ مائیک نے کہا۔

”اس کا گھر یہاں سے دو دن کی مسافت پر ہے اور اسکیموز انتہائی شمال میں رہتے ہیں اس لیے کسی مہذب آبادی تک پہنچنے کے لیے ہمیں مزید سفر کرنا پڑے گا۔“

”بہرحال ہم بھوک اور سردی سے مرنے سے بچ گئے ہیں۔“ جیمس بولا۔ مرہم پٹی اور پین کلر لینے کے بعد اس کی تکلیف کم ہوئی تھی۔

”اس آدمی سے کہو میری رائفل واپس کر دے۔“ جیمی نے میگی سے کہا۔

”میں نہیں کہہ سکتی ہے، یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔“ میگی نے بتایا۔

”اچھا آدمی نہیں ہے؟“ جیمی نے اس کی بات دہرائی۔

”ہاں یہ ہمارے طیارے میں زبردستی گھس آیا اور ہمیں یہاں لے آیا۔“ میگی نے طیارے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”انہوں نے ہمیں بھی قیدی بنا لیا ہے۔“

جیمی پریشان ہو گیا۔ اگر یہ اچھے لوگ نہیں تھے تو اسے بھی نقصان پہنچا سکتے تھے، اس کی چھٹی حس نے پہلے ہی اشارہ دیا تھا۔ مائیک اور شارلی ایک طرف آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے شارلی نے کہا۔ ”طیارہ بے کار ہو گیا ہے اب ہمیں کسی دوسرے طریقے سے سینٹ جونز تک پہنچنا ہو گا۔“

ان دونوں بھائیوں کا ارادہ سینٹ جونز سے کوئی کشتی خرید کر اس کے ذریعے کینیڈا سے فرار ہونے کا تھا۔ کھلے سمندر کے ذریعے وہ کہیں بھی جاسکتے تھے۔ خشکی اور فضائی راستوں میں ان کے پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا۔ مائیک بولا۔ ''سب سے پہلے تو ہمیں یہ جاننا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔''

''اس سے پوچھو کہ یہ کینیڈا کا کون سا علاقہ ہے؟'' شارٹی نے میگی سے کہا۔ میگی نے یہی سوال جیمی سے کیا تو اس نے اپنے لباس سے چمڑے کا ایک پتلا سا ٹکڑا نکالا جس پر اس پورے علاقے کا ہاتھ سے بنا نقشہ تھا۔ اس نے نقشے پر انگلی رکھ کر ان کو بتایا کہ وہ اس وقت کہاں تھے۔ مائیک اور شارٹی نقشہ سمجھنے سے قاصر تھے لیکن جیمس اور میگی کا واسطہ آئے دن نقشوں سے ہی پڑتا رہتا تھا۔ وہ سمجھ گئے۔ میگی بتانے جارہی تھی کہ جیمس نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا اور اس نے کہا۔ ''یہ ہاتھ سے بنا نقشہ میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ہے۔''

جیمی کینیڈا کے ایک بڑے شمالی جزیرے بافن آئی لینڈ کے جنوب مشرقی سرے کے ساتھ ایک چھوٹے سے جزیرے پر رہتا تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں سارے سال برف جمی رہتی تھی اس لیے جزیرہ بظاہر بافن آئی لینڈ سے ملا ہوا تھا۔ بافن آئی لینڈ پر واحد شہر اقالوئٹ تھا جو جیمی کے گھر سے کوئی سو کلومیٹرز مغرب میں تھا اور سینٹ جونز یہاں سے پندرہ سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا۔ جیمس نے سرگوشی میں میگی سے کہا۔ ''ان لوگوں کو جتنا بے خبر رکھو، اتنا بہتر ہے۔ یہ سونا لوٹنے کی فکر میں ہیں۔''

میگی اس سے متفق تھی۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن سونے کی حفاظت ہماری ذمے داری نہیں ہے، ہماری پہلی ترجیح اپنی جان بچانا ہے۔''

''کیا یہ شخص ہماری کوئی مدد کرسکتا ہے؟'' جیمس نے جیمی کی طرف دیکھا۔

''اس سے رائفل چھین کر انہوں نے نہتا کر دیا ہے۔'' میگی مایوسی سے بولی۔ ''یہ اب خود ان کا قیدی ہے۔''

''اس سے یہ پوچھو اس کے پاس لازمی کتوں کی مدد سے کھینچی جانے والی سلیج ہوگی۔''

میگی نے جیمی سے سلیج کے بارے میں پوچھا تو اس نے سادگی سے بتادیا۔ ''ہاں ہے... وہ یہاں کچھ دور کھڑی ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے سمت بتائی۔

شارٹی طیارے کے دروازے کے پاس کھڑا ان لوگوں کی نگرانی کر رہا تھا، مائیک طیارے کے اندر گیا ہوا تھا۔ اس نے جیمی کو اشارہ کرتے دیکھا تو چونکتا ہوا گیا۔ اس نے میگی سے پوچھا۔ ''یہ اس طرف اشارہ کرکے کیا بتا رہا ہے؟''

میگی بوکھلا گئی۔ وہ ان لوگوں کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس اسکیمو کے پاس ایک سلیج ہے۔ اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''یہ... کہہ رہا ہے کہ ہمیں اس طرف جانا چاہیے۔''

شارٹی اس کے پاس آیا اور اچانک اس کا بازو اتنی سختی سے پکڑا کہ میگی کراہ کر رہ گئی۔ جیمس اپنی جگہ سے اٹھا تو شارٹی نے اس پر گن تان لی، وہ وہیں رک گیا۔ شارٹی نے غرا کر کہا۔ ''میری بات غور سے سنو، اگر تم نے یا تمہارے شوہر نے ہمیں کسی معاملے میں دھوکا دیا تو ہم تمہیں مارنے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں کریں گے۔''

میگی کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ وہ جانتی تھی یہ دونوں بھائی سفاک مجرم تھے اور پہلے ہی قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''ہم تم سے کوئی بات نہیں چھپا رہے ہیں۔''

جیمی خاموش کھڑا تھا، اس نے تسلیم کرلیا تھا کہ فی الحال وہ ان لوگوں کا قیدی بن گیا ہے، اس نے شارٹی کا رویہ دیکھ لیا تھا اب کسی شک کی گنجائش نہیں تھی۔ مائیک اندر سے سونے والے بکس لا رہا تھا یہ المونیم سے بنے مضبوط بکس تھے جو نمبروں والے تالے سے کھلتے تھے اور ہر بکس میں پچاس کلوگرام سونا موجود تھا۔ ایسے چھ بکس تھے۔ مائیک نے سارے بکس باہر نکال دیے اور شارٹی سے کہا۔ ''اتنا وزن کیسے اٹھائیں گے؟''

''ہم اسے یہاں چھپا کر جا بھی نہیں سکتے.... یہاں سوائے برف کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔''

''ہم سمندر کے اوپر جمی برف پر موجود ہیں۔'' میگی نے اسے بتایا۔ ''چند میٹرز کی موٹی برف تلے شمالی سمندر ہے۔''

مائیک اور شارٹی یہ سن کر پریشان ہوگئے۔ تین سو کلوگرام سونا اٹھا کر لے جانا ناممکن تھا۔ وہ پانچ افراد تھے اور ہر آدمی اگر پچاس کلوگرام بھی اٹھا لیتا تب بھی ایک بکس تو رہ جاتا پچاس کلوگرام وزن اٹھا کر برف پر چلنا ناممکن حد تک دشوار کام تھا۔ اچانک مائیک کو خیال آیا۔ اس نے میگی سے کہا۔ ''یہ خود کو شکاری کہتا ہے تو اس نے شکار کیا ہوا گوشت کس چیز پر رکھا ہے۔''

میگی کو مایوسی ہوئی۔ وہ جو بات ان سے چھپانا چاہ رہی تھی، سامنے آنے والی تھی، اس نے جیمی سے کہا۔ ''یہ تمہاری سلیج گاڑی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور انہیں پتا چل گیا تو یہ تمہاری رائفل کی طرح اس پر بھی قبضہ کرلیں گے۔''

''میری سلیج۔'' جیمی پریشان ہو گیا۔ ''اس پر تو گوشت اور شکار کی کھالیں لدی ہیں۔''

''یہ اس میں سونا لے جانا چاہتے ہیں۔'' میگی نے المونیم کے بکسوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہارا گوشت اور کھالیں یہیں پھینک دیں گے۔''

''تم اس سے کیا بات کررہی ہو؟'' مائیک نے شک سے کہا۔

میگی نے جھوٹ بولا۔ ''میں اس سے پوچھ رہی ہوں کہ اس کے پاس سفر کرنے کے لیے کوئی گاڑی ہے لیکن میری بات شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے اس کی زبان پوری طرح نہیں آتی ہے۔ بس تھوڑی بہت جانتی ہوں۔''

جیمی، میگی کی بات سمجھ گیا تھا اور اس نے سلیج کے بارے میں بات نہیں کی تھی لیکن ان کی بدقسمتی کہ عین اسی لمحے ٹیگر بھونکتا ہوا نمودار ہوا۔ جیمی کو یہاں آئے ہوئے دیر ہوگئی تھی اور وہ اسے تلاش کرتا آیا تھا۔ کتے کو دیکھ کر دونوں بھائی سمجھ گئے کہ جیمی کے پاس کتا گاڑی ہے۔ شارٹی نے غصے سے جیمی کی رائفل اس پر تان لی تھی اور بولا۔ ''تم چھپا رہے تھے کہ تمہارے پاس کتا گاڑی ہے۔''

ٹیگر، جیمی کے پاس آکر دم ہلانے لگا۔ ٹیگر کا گاڑی والا پٹا ایسا تھا کہ وہ خود کو کھول بھی سکتا تھا۔ جیمی خود اسے اس طرح باندھتا تھا۔ شارٹی کو رائفل تانتے دیکھ کر میگی نے جلدی سے کہا۔ ''اس نے چھپایا نہیں ہے، یہ میرا سوال نہیں سمجھ سکا۔ اسکیمو جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔''

شارٹی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ شاید جیمی کو گولی ہی ماردے گا لیکن مائیک نے اسے روک دیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ''سنو ہم ایک ویرانے میں ہیں اور یہاں کے بارے میں یہی ایک شخص جانتا ہے۔ اسے ماردیا تو ہم یہاں بھٹکتے رہ جائیں گے۔''

بات شارٹی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے میگی کے توسط سے جیمی کو حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ جائے اور سلیج گاڑی یہاں لے کر آئے۔ جیمی کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ شارٹی کی نگرانی میں سلیج گاڑی طیارے کے پاس لے آیا۔ مائیک نے گاڑی کا معائنہ کیا اور بولا۔ ''یہ چھوٹی ہے سونا لے جانے کے لیے یہ سارا کچرا ہٹانا ہوگا۔''

میگی نے جیمی کو یہ بات بتائی تو وہ پریشان ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ گوشت مجھے اور میرے خاندان کو سردی میں زندہ رکھے گا اگر میں اسے یہاں چھوڑ گیا تو میرا گھرانا اگلے گرما تک زندہ نہیں رہے گا۔''

میگی نے ترجمہ کیا تو شارٹی نے منہ بنایا۔ ''بکواس... اس سے کہو ہم اسے رقم دے جائیں گے اس سے یہ ڈھیر ساری خوراک خرید سکتا ہے۔''

''یہ لوگ صرف گوشت کھاتے ہیں اور وہ بھی صرف شکار کا۔'' میگی نے کہا تو مائیک نے اسے شٹ اپ ہونے کا حکم دیا۔ مائیک اور شارٹی نے کھالوں میں لپٹا گوشت سلیج گاڑی سے اتار کر پھینکنا شروع کردیا۔ جیمی مضطرب ہوکر آگے بڑھا تو شارٹی نے ایک بار پھر اس پر رائفل تان لی اور دانت پیس کر بولا۔

''لگتا ہے تم مرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں... نہیں۔'' میگی نے گھبرا کر جیمی کو روک لیا اور اس سے بولی۔ ''اس وقت ان کو مت روکو۔ ورنہ یہ تمہیں ماردیں گے اور پھر تمہارے بیوی بچے بے سہارا رہ جائیں گے۔''

جیمی کو بھی ماریت، ایگت اور اپنے ہونے والے بچے کا خیال آگیا تھا، وہ رک گیا اور بے بسی سے اپنی دو ہفتے کی محنت کو سلیج گاڑی سے باہر گرتے دیکھنے لگا۔ سلیج خالی کرکے مائیک اور شارٹی نے سونے کے بکس اس میں رکھے۔ سونے نے گوشت اور کھالوں کے مقابلے میں کم جگہ گھیری تھی لیکن وزن پورا ہوگیا تھا۔ کتے اس سے زیادہ وزن آسانی سے نہیں کھینچ سکتے تھے۔ اچانک جیمس نے کہا۔ ''ہم راستے میں کھائیں گے کیا؟''

طیارے میں کوئی خوراک نہیں تھی۔ مائیک نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں کچھ گوشت رکھ لینا چاہیے۔''

''یہ گوشت کون اٹھائے گا؟'' شارٹی نے نقطہ اٹھایا۔ ''ظاہر ہے ہم دونوں تو اٹھا نہیں سکتے۔''

جیمس زخمی تھا اور میگی عورت تھی اس لیے نظر انتخاب جیمی پر گئی۔ انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ اس میں چن کر اتنا گوشت نکال لے جو تین چار دن کے کھانے کے لیے کافی ہو۔ جیمی نے گوشت الگ کیا اور باقی گوشت کو کھالوں میں لپیٹ کر اس نے طیارے کے اندر رکھ دیا اور پھر

طیارے کا ٹوٹ جانے والا دروازہ بھی کسی طرح اس پر لگا دیا تھا تاکہ گوشت جانوروں سے محفوظ رہے اور وہ دوبارہ واپس آکر گوشت لے جائے۔ موسم کی کیفیت بتا رہی تھی کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اور شاید ایک ہفتے بعد اس علاقے میں شدید برفانی طوفانوں کا آغاز ہو جاتا۔

سونے کا وزن زیادہ تھا اور کتے بڑی مشکل سے گاڑی کھینچ رہے تھے۔ جیمی نے میگر کو بھی لگا دیا تھا۔ میگر شروع میں مائیک اور شارنی پر بھونک رہا تھا لیکن اب اس نے اپنے مالک کی دیکھا دیکھی ان کو قبول کر لیا تھا۔ جیمی نے گوشت بھی سنبھال رکھا تھا۔ ایسے میں اس کے لیے سلیج کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے گوشت بھی زیادہ لے لیا تھا۔ یہ تیس کلوگرام سے زیادہ تھا۔ مائیک اور شارنی سلیج کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میگی اور جیمس ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ خوش قسمتی سے ان سب کے پاس گرم لباس تھے ورنہ یہاں سردی بہت زیادہ تھی۔

ہواؤں کے جھکڑ اور برف کے ذرے رفتہ رفتہ تھمنے لگے اور موسم بہتر ہونے لگا۔ جیمس کی حالت بہتر ہوئی تو وہ خود چلنے لگا پھر اس نے جیمی سے سلیج کی رسیاں لے لیں۔ میگی نے اصرار کر کے جیمی سے کچھ گوشت لے لیا یوں اس کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تھا۔ جیمی اس پر اس کا شکر گزار تھا۔ میگی اس کے ساتھ چل رہی تھی اور وہ آپس میں بات کرتے جا رہے تھے۔ میگی نے اسے بتایا کہ وہ کیا کام کرتے تھے اور ان دونوں بھائیوں نے کیسے ان کا طیارہ اغوا کر لیا۔ جیمی کو تعجب ہوا کیونکہ ان کے معاشرے میں چوری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس نے سونے کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ جو دھات نہ تو اوزار بنانے کے کام آتی ہے اور نہ اس سے کوئی اور چیز بن سکتی ہے تو وہ اتنی قیمتی کیوں ہے کہ اس کے تھوڑے سے ٹکڑے کے لیے قتل تک کر جاتے ہیں۔ اس کے نزدیک سونے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

مائیک اور شارنی کتوں کے دائیں طرف ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور اس وقت وہ دھیمی آواز میں تبادلہ خیال بھی کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا محور یہ تین افراد تھے جو ان کے ساتھ تھے۔ وہ ان کے جرم سے واقف تھے۔ اگر وہ ان کے ساتھ مہذب دنیا تک پہنچ جاتے تو مائیک اور شارنی لازمی طور پر مشکل میں پڑ جاتے۔ ان کے بارے میں دونوں بھائیوں کی متفقہ رائے تھی کہ ان کا وجود ان کی آزادی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اختلاف اس بات پر تھا کہ ان سے کب چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ شارنی کا خیال تھا کہ یہ کام ابھی کر لیا جائے، وہ انہیں گولی مار کر یہیں چھوڑ جاتے اور ان کی لاشیں برف تلے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتیں۔ ان کے جرم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔ لیکن مائیک کا خیال تھا کہ پہلے انہیں کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہیے جہاں سے وہ آگے خود راستہ تلاش کر سکیں کیونکہ یہاں تو سارے راستے ایک جیسے تھے۔ پھر کتوں والی گاڑی چلانے کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے مائیک کا کہنا تھا کہ انہیں اس معاملے میں صبر سے کام لینا چاہیے۔ جلد بازی کر کے وہ خود کسی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ شارنی چھوٹا تھا اس لیے وہ مائیک کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ ویسے اس کی بے تابی کی ایک وجہ میگی بھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے جیمس اور جیمی کو مار کر وہ میگی کے حسن و جوانی سے لطف اندوز ہوں گے اور اس کے بعد اسے بھی اس کے شوہر کے پاس روانہ کر دیں گے۔

میگی کے ساتھ چلتا ہوا جیمی، مائیک اور شارنی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میگی سے کہا۔ ''اگر یہ سونا ان کے لیے اتنا قیمتی ہے تو یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

میگی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''یہ سچ ہے ان کی آنکھیں بتا رہی ہیں یہ ہمیں مار دیں گے۔ خاص طور سے لمبے بالوں والا ہمیں فوراً مار دینا چاہتا ہے۔ وہ جب مجھے اور تم دونوں کو دیکھتا ہے تو مجھے اس کی آنکھوں میں بھیڑیوں جیسی خون کی پیاس نظر آتی ہے۔ اس کی نیت تم پر بھی خراب ہے۔''

میگی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سادہ سا نظر آنے والا اسکیمو اندر سے اتنا تیز ہوگا۔ جو بات وہ محسوس کر رہی تھی اور جیمس نے محسوس نہیں کی تھی، وہ جیمی نے محسوس کر لی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تب یہ ہمیں مار کیوں نہیں دیتے؟''

''اس لیے کہ یہ اس علاقے سے ناواقف ہیں اگر یہ ہمیں مار دیں تو یہ خود بھٹکتے رہ جائیں گے۔'' جیمی نے اس بار بھی درست تجزیہ کیا تھا۔ ''جب یہ راستہ جان لیں گے تو ہمیں مار دیں گے۔''

''مجھ پر نیت کیوں خراب ہے؟''

''کیونکہ تم ایک خوب صورت عورت ہو۔'' جیمی نے سادگی سے کہا۔ ''اگر میں ان کو اپنے گھر لے گیا تو یہ میری بیوی بچے کو بھی مار دیں گے۔''

''تب ہم کیا کریں؟'' میگی نے پوچھا۔ جیمی خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

میگی پیچھے ہوئی اور سلیج سنبھالے جیمس کو جیمی سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔ یہ بات تو اس نے بھی محسوس کر لی تھی کہ مائیک شارٹی نامی یہ مجرم ان کو چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ جیمس نے میگی سے وہی سوال کیا۔

''اب ہم کیا کریں؟... ہم ان سے لڑ نہیں سکتے۔ ان کے پاس گنز ہیں، یہ ہمیں فوراً شوٹ کر دیں گے۔''

میگی نے سرگوشی کی۔ ''کیا ہم فرار نہیں ہو سکتے؟''

''فرار ہو کر ہم کہاں جا سکتے ہیں۔'' جیمس نے دور تک پھیلے برف زار کی طرف دیکھا۔ ''ہم راستہ نہیں جانتے اور ہمارے پاس خوراک بھی نہیں ہے۔''

ان میں سے کسی کے پاس ان مسائل کا حل نہیں تھا۔ دس گھنٹے سفر کے بعد ایک جگہ رک گئے۔ ان کے پاس گوشت پکانے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ سیل کا کچا گوشت ہی چبا چبا کر کھانے لگے۔ شروع میں میگی نے کھانے سے انکار کر دیا تھا لیکن پھر بھوک نے اسے مجبور کیا اور وہ کچا گوشت کھانے پر راضی ہو گئی۔ جیمی اس کا عادی تھا۔ اس نے میگی سے کہا۔

''سیل کا کچا گوشت زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔''

''لیکن اس سے بو آ رہی ہے۔'' میگی نے بڑی مشکل سے ایک ٹکڑا نگلنے کے بعد کہا۔

اسکیموز کے نزدیک یہ بدبو نہیں تھی۔ وہ شروع سے اس کے عادی تھے اور سیل کا کچا گوشت بھی رغبت سے کھاتے تھے۔ ان کے پاس آرام کرنے کے لیے خیمے یا سلیپنگ بیگز نہیں تھے اس لیے وہ سلیج گاڑی سے ٹکے سونے کی کوشش کرتے رہے۔ مائیک اور شارٹی باری باری جاگتے رہے تھے۔ انہوں نے چھ گھنٹے بعد ان لوگوں کو اٹھا دیا۔

''بہت آرام کر لیا اب سفر کرو۔'' شارٹی بولا۔ وہ دونوں جلد از جلد اس سرد جہنم سے نکل جانا چاہتے تھے۔ میگی اور جیمس اس قسم کی مشقت کے عادی نہیں تھے جبکہ جیمی کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ سفر کے دوران وہ بھی آرام کم کرتا تھا۔ لیکن اس نے میگی کے توسط سے کہا۔ ''کتوں کو آرام کی ضرورت ہے ورنہ یہ سلیج کھینچنے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''جہنم میں جائیں یہ کتے۔'' شارٹی غرایا۔ ''اگر کسی کتے نے حرام خوری کی تو میں اسے وہیں شوٹ کر دوں گا۔''

جب وہ رکے تھے تو جیمی نے کتوں کو بھی کچھ گوشت دیا تھا۔ مگر یہ ان کی مقررہ خوراک سے کم تھا اس لیے وہ بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے۔ جب جیمی ان کو گاڑی میں جوتنے لگا تو وہ کوں کوں کرتے اس سے مزید کھانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ جیمی اپنی زبان میں ان کو آہستہ آہستہ کچھ کہتا رہا اور ان کو پیار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ سفر کر رہے تھے۔ جیمس نے اس دوران میں رسیاں سنبھالنا سیکھ لیا تھا اور اب اسے اس کام میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

مائیک اور شارٹی کا خیال تھا کہ آج کے دن سفر کر کے اس جگہ کے پاس پہنچ جائیں گے جہاں جیمی رہتا ہے اور وہاں سے کوئی نہ کوئی راستہ کسی کینیڈین شہر کی طرف جاتا ہو گا۔ لیکن جب رات کا سماں ہونے لگا تو وہ بدستور برف زاروں میں تھے۔ دور دور تک کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ مائیک نے میگی سے کہا۔

''اس نے کہا تھا کہ ہم دو دن میں پہنچ جائیں گے لیکن ابھی تک اس کی بستی نہیں آئی ہے۔''

میگی نے یہی بات جیمی سے پوچھی تو اس نے کہا۔ ''موسم خراب ہے، سامنے سے ہوائیں چل رہی ہیں اس لیے ہماری رفتار تیز نہیں ہے۔''

میگی نے مائیک کو بتایا تو وہ جھنجلا گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''اس چینی سے کہہ دو اگر ہم کل تک اس کی بستی نہ پہنچے تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

میگی نے جیمی کی طرف داری کی۔ ''اس کا قصور نہیں ہے، تم اتنے وزنی سونے کے ساتھ سفر کر رہے ہو اس لیے کتے پوری رفتار سے نہیں چل پا رہے ہیں۔''

گزشتہ روز وہ اتنے بھوکے نہیں تھے پھر کچا گوشت کھانا آسان نہیں تھا لیکن اس روز چل چل کر ان کا بھوک سے برا حال ہو گیا تھا اور اس دن میگی نے بھی ٹھیک سے کھایا۔ جیمی نے کتوں کو بھی اچھا خاصا گوشت دیا تھا اور اب اس کے پاس دس کلوگرام سے بھی کم گوشت رہ گیا تھا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک دن اور چل سکتا تھا۔ میگی اور جیمس اس مشقت کے عادی نہیں تھے ان کے چہرے ستے گئے تھے اور ان کے پیر مستقل چلنے سے دکھنے لگے تھے، ان کے جوتے بھی برف پر چلنے والے نہیں تھے ان سے ٹھنڈ ان کے پیروں میں سرایت کر رہی تھی۔ گزشتہ دن بھی موسم ابر آلود رہا تھا اور تیسرے دن صبح سے دھند اور کہر چھا رہی تھی۔ برف کے ذرات ہوا کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ مائیک اور شارٹی کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کئی بار جیمی کو دھمکیاں دے چکے تھے۔

اس وقت میگی، جیمی کے ساتھ چل رہی تھی جب اس نے اچانک کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے جب یہ میرے

گھر تک پہنچ جائیں گے تو ہمیں مار دیں گے؟“

میگی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”امکان یہی ہے کیونکہ اگر انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا تو ہم پولیس کو ان کے بارے میں بتا دیں گے اور یہ پکڑے جائیں گے۔ یہ جیل سے بھاگے ہوئے لوگ ہیں۔ پہلے بھی قتل کر چکے ہیں اس لیے ان کے لیے اور قتل کوئی مشکل نہیں ہے۔“

جیمس بڑی مشکل سے سلیج کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پیروں میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ اچانک وہ گر پڑا۔ میگی دوڑ کر اس کے پاس آئی۔ ”جیمس کیا ہوا؟“

اس نے بے بسی سے میگی کی طرف دیکھا۔ ”میرے پیروں میں تکلیف ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔“

میگی نے احتیاط سے اس کا جوتا اتارا، پھر موزا اتارا تو اس کی سیاہ پڑتی انگلیاں سامنے آئیں۔ میگی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ یہ فراسٹ بائٹ کی علامت تھی۔ جیمس مایوس نظر آنے لگا۔ اس نے میگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے میرے پاؤں بیکار ہو گئے ہیں۔“

جیمی بھی جیمس کے پاؤں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے میگی سے کہا۔ ”اگر اسے فوری طور پر علاج نہ ملا تو اس کے پاؤں کی انگلیاں کاٹنی پڑیں گی۔“ اس نے چھو کر انگلیوں کے بارے میں بتایا۔

مائیک اور شارٹی بھی ان کی طرف آئے۔ شارٹی نے پوچھا۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“

”جیمس کے پاؤں میں فراسٹ بائٹ کا اثر آ رہا ہے۔“ میگی نے بتایا تو مائیک نے کہا۔

”اس کا یہی علاج ہے کہ ہم جلد از جلد اس چینی کے گھر پہنچ جائیں۔ یہاں اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔“

میگی نے جیمی سے التجا کی۔ ”پلیز ہمیں جلدی اپنے گھر لے چلو ورنہ اس کا پاؤں بے کار ہو جائے گا۔“

جیمی نے جواب نہیں دیا، اس کے بجائے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے میگی سے کہا۔ ”ہمیں سفر کرنا ہے۔“

میگی نے جیمس کو دوبارہ موزے اور جوتے پہنا دیے اور وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سنو اگر ہم جیمی کے گھر پہنچ گئے تو یہ ہمیں فوراً مار دیں گے۔“

یہ بات میگی بھی جانتی تھی لیکن وہ بے بس تھے۔ مائیک اور شارٹی کے رحم و کرم پر تھے اور اب فراسٹ بائٹ کا خطرہ بھی منڈلانے لگا تھا۔ خود میگی کے پیروں میں بھی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ جیمی، جیمس کے پاس آیا اور اس نے سیل کی فر جس میں گوشت رکھا تھا وہ رسیوں سے جیمس کے جوتوں پر باندھ دی اور میگی سے کہا۔ ”اب اس کے پیر گرم رہیں گے۔“

پھر اس نے میگی کے جوتوں کے تلوں پر سیل کے فر کے ٹکڑے لپیٹ دیے۔ اب اتنا فر نہیں تھا جو پورے جوتے پر لپیٹا جا سکتا۔ اس سے اتنا ہوا کہ برف سے پیروں تک آتی ٹھنڈک رک گئی تھی۔ وہ آنے والے چھ گھنٹے تک سفر کرتے رہے تھے۔ پھر رات کی سیاہی چھانے لگی۔ ابھی تک جیمی کی بستی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ مائیک اور شارٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ جیمس کی تکلیف کی وجہ سے جیمی سلیج گاڑی سنبھال رہا تھا۔ مائیک اور شارٹی آپس میں بات کر رہے تھے۔ شارٹی کچھ کہہ رہا تھا اور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ اچانک وہ جیمی کی طرف لپکا اور اس پر رائفل تان لی۔

”تم ہمیں دھوکا دے رہے ہو، اس ویرانے میں بھٹکا رہے ہو۔ اب تک تمہارا گھر کیوں نہیں آیا۔“

میگی جلدی سے ان کے قریب آ گئی، اس نے شارٹی کی بات جیمی کو سمجھائی۔ جیمی بولا۔ ”اس سے کہو میرا گھر ابھی دور ہے۔“

”اگر میں نے اسے یہ بات کہی تو یہ تمہیں گولی مار دے گا۔“

”اگر یہ مجھے گولی مارے گا تو کبھی اس ویرانے سے نہیں نکل سکے گا اور یہیں سردی اور بھوک سے مر جائے گا۔“

میگی نے شارٹی کو جیمی کا جواب دیا تو اس نے دانت پیس کر کہا۔ ”یہ کیا سمجھتا ہے ہم اس کی مدد کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔“ اس نے رائفل کا رخ جیمی کے سینے کی طرف کیا تھا کہ مائیک نے رائفل کی نال اوپر کر دی۔ شارٹی نے فائر کر دیا تھا لیکن گولی ہوا میں کہیں گئی تھی۔ مائیک نے کہا۔ ”جلد بازی مت کرو ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔“

شارٹی اب تک دانت پیس رہا تھا۔ اس نے مائیک سے کہا۔ ”تم نے ابھی اسے بچا لیا ہے لیکن یہ میرے ہاتھوں مرے گا۔“

”ہاں بعد میں۔“ مائیک نے وعدہ کیا۔ ”لیکن ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔“

میگی دم بخود کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ شارٹی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کہیں یہ اسے بتا نہ دے؟“

”یہ نہیں بتائے گی۔“ مائیک نے کہا۔ ”یہ اب ہمارے ساتھ رہے گی۔ کم آن بے بی اب تم سفر میں ہمارے ساتھ رہو گی۔“

تھانے دار صاحب نے سپاہیوں سے کہا۔ ''دیکھو، ابھی ابھی مخبر نے اطلاع دی ہے کہ اسٹریٹ نمبر سولہ اور مکان نمبر 420 میں اونچے پیمانے کا جوا ہورہا ہے۔ تم فوراً ایک بڑی نفری کے ہمراہ وہاں ریڈ کرو۔ چھاپا مارو اور جواریوں کو گرفتار کرکے لے آؤ۔''

سپاہی۔ ''لیکن سر......''

تھانے دار۔ ''سر، ور کچھ نہیں۔ فوراً حکم کی تعمیل ہونی چاہیے۔''

سپاہی۔ ''لیکن جناب....''

تھانے دار۔ ''جناب وناب کچھ نہیں۔ بس چھاپے کی تیاری کرو۔''

سپاہی۔ ''لیکن جناب، یہ کام حرام ہے۔''

تھانے دار۔ ''کیا مطلب؟''

سپاہی۔ ''جناب عالی! ٹی وی پر سردار یوسف نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ جوا حرام ہے اور جوئے خانے پر جانا بھی حرام ہے تو اب آپ خود سوچیے کہ ہم حرام جگہ جا کے کیوں اپنی روزی حرام کریں۔''

بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی بہاول پور

میگی ان کے ساتھ چلنے لگی تھی۔ وہ سلیج کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شام کی سیاہی کے ساتھ دھند بھی گہری ہوتی جارہی تھی۔ جیمی سلیج چلا رہا تھا اور جیمس اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مائیک اور شارٹی سلیج کو اپنے قبضے میں کرکے جیمی کی طرف سے مطمئن تھے۔ ویسے بھی ان کے خیال میں اس انسان نما مخلوق میں اتنی عقل نہیں تھی کہ وہ ان کے خلاف کوئی سازش کرسکتا۔ اس لیے وہ اس کی طرف سے بے پروا تھے۔ چلتے ہوئے مائیک نے پلٹ کر دیکھا تو اسے جیمی سلیج پر نظر نہیں آیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹ کر آیا اور جیمس سے پوچھا۔ ''یہ ایسکیمو کہاں ہے؟''

''وہ رفع حاجت کے لیے وہاں گیا ہے۔'' جیمس نے ایک طرف نظر آنے والے برف کے ٹیلوں کی طرف اشارہ کیا۔

مائیک تشویش زدہ ہوگیا۔ ''اس نے ہم سے کیوں نہیں پوچھا اور تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' جیمس بولا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

میگی بھی جیمس کے پاس آگئی۔ وہ اسے سہارا دینے لگی کیونکہ جیمس سے اب کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔ مائیک نے شارٹی کو بلایا اور کہا۔ ''ایسکیمو ان ٹیلوں کی طرف گیا ہے اسے دیکھو اور اگر کوئی شرارت کررہا ہو۔ تو شوٹ کردو۔''

شارٹی خوشی سے ٹیلوں کی طرف لپکا۔ مائیک نے سلیج روک دی تھی۔ شارٹی ٹیلوں کے درمیان جھانک رہا تھا۔ مائیک نے میگی سے کہا۔ ''تم یہیں رکو۔'' کہہ کر خود بھی ٹیلوں کی طرف بڑھا۔ شارٹی ان کے پیچھے غائب تھا پھر وہ ٹیلوں سے نمودار ہوا اور مائیک سے بولا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

مائیک پریشان ہوگیا۔ ''پھر کہاں جاسکتا ہے؟''

''میرا خیال ہے وہ فرار ہوگیا ہے۔'' شارٹی بولا۔

''نہیں وہ فرار نہیں ہوا وہ اپنی سلیج چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' مائیک بولا۔ ''وہ یہیں کہیں ہے، اسے تلاش کرو۔''

''اب وہ نظر آیا تو میں اسے گولی ماردوں گا۔''

''نہیں، اسے زندہ پکڑنا ہے وہی ہمیں اس برف زار سے نکال سکتا ہے اور تم فکر مت کرو ہم اسے ہی نہیں اس کے بیوی بچوں کو اس کے سامنے ماریں گے اور پھر ان لوگوں کو قتل کریں گے۔'' مائیک نے سفاکی سے کہا تو شارٹی خوش ہوگیا۔

''ہاں اس کی بیوی کو تو بھول گیا تھا۔ وہ بھی تو جوان ہو گی۔''

مائیک کو جیمی کی بیوی سے زیادہ اس کی فکر تھی، وہ واپس پلٹا تھا کہ فضا میں ایک عجیب سی ہوکتی ہوئی سیٹی نما آواز گونجی اور اس آواز کے گونجتے ہی کتے بری طرح بھڑک گئے تھے۔ خاص طور سے کتوں کے سربراہ میگر نے بھونکنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی کتے سلیج کو کھینچنے لگے۔ مائیک چلایا۔ ''وہ دیکھو کتے بھاگ رہے ہیں۔''

مائیک اور شارٹی سلیج کی طرف بھاگے۔ سلیج ایک ڈھلان پر رکی ہوئی تھی اس لیے جب کتوں نے اسے کھینچنا شروع کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ مائیک اور شارٹی برف میں اتنی تیزی سے نہیں دوڑ سکتے تھے لیکن سلیج میں ان کا سونا تھا اور وہ کسی صورت اسے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ شارٹی نے چلا کر مائیک سے کہا۔ ''تم ان لوگوں کو دیکھو، میں سلیج واپس لاتا ہوں۔''

مائیک رک گیا، اس دوران میں سلیج دھند میں غائب ہو رہی تھی اور پھر شارٹی بھی اسی دھند میں غائب ہوگیا۔ مائیک پلٹ کر آیا تو اس کا غصے سے برا حال تھا اس نے آتے ہی جیمس کو ٹھوکر ماری اور گرج کر بولا۔ ''تم نے سلیج روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔''

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میگی چلائی۔ اس نے مائیک کو روکنے کی کوشش کی۔ مائیک نے اس کے سنہری

بالوں کو پکڑ کر بے دردی سے اسے کھینچا اور اسے ایک طرف گرا دیا۔۔۔ وہ جیمس کو ٹھوکروں سے مار رہا تھا۔ میگی دوبارہ آئی تو اس نے اسے بھی مارا۔ ساتھ ساتھ وہ کہتا جا رہا تھا۔

''اگر سلیج۔۔۔ اور میرا سونا۔۔۔ نہیں ملا تو۔۔۔ میرا وعدہ ہے۔۔۔ تم دونوں کو۔۔۔ یہیں برف کی قبر میں۔۔۔ دفن کر کے جاؤں گا۔''

اس کی ٹھوکروں سے جیمس اور میگی کو چوٹیں آئی تھیں۔ جیمس کو بچانے کے لیے میگی اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس لیے زیادہ چوٹیں اسے برداشت کرنا پڑی تھیں۔ مائیک کا غصہ ذرا کم ہوا تو وہ پلٹ کر اس طرف گیا جس طرف سلیج غائب ہوئی تھی اور شارنی اس کے پیچھے گیا تھا۔ ابھی تک سلیج یا شارنی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ اسے تشویش ہونے لگی تھی۔ میگی اور جیمس خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے اگر مائیک کو سلیج نہ ملی تو وہ سچ مچ ان کو شوٹ کر سکتا ہے۔ جیمس نے آہستہ سے کہا۔

''یہ کیا چکر ہے؟''

''میرا خیال ہے جیمی کچھ کر رہا ہے۔ اسی نے سیٹی نما آواز سے کتوں کو سفر کرنے کا اشارہ کیا ہے۔''

''لیکن وہ خود کہاں ہے؟''

''شاید اسی طرف ہے جس طرف کتے گئے ہیں۔''

''وہ کتے اور سونا لے کر چلا جائے گا اور ہم ان کے رحم و کرم پر رہ جائیں گے۔'' جیمس نے تلخی سے کہا۔

''نہیں وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔'' میگی نے تردید کی۔ ''اگر اسے موقع ملا تو وہ ہماری مدد کے لیے ضرور آئے گا۔''

مائیک کچھ دور کھڑا ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کی جسمانی حرکات بتا رہی تھیں کہ اس کے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ سلیج اور شارنی کو غائب ہوئے آدھا گھنٹا ہونے والا تھا۔ مائیک کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والا ہو اور یہ فیصلہ یقیناً ان کی موت کا ہو سکتا تھا۔ وہ ان کو زندہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ جیمس نے میگی سے کہا۔ ''تم بھاگ جاؤ۔۔۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔'' میگی نے انکار کیا۔

''پلیز۔۔۔ ابھی یہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہے اور تمہارے پاس موقع ہے۔'' جیمس نے اصرار کیا۔ ''تم چپکے سے غائب ہو سکتی ہو۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔'' میگی نے اپنی بات دہرائی۔ ''اب دوبارہ یہ بات مت کہنا۔''

جیمس مایوس ہوا تھا۔ پیروں کی تکلیف کی وجہ سے اس کے لیے کھڑا ہونا بھی ممکن نہیں رہا تھا، بھاگنا تو ناممکن تھا لیکن میگی بھاگ سکتی تھی اور وہ اسے چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھی۔

اسی لمحے مائیک ان کی طرف آیا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔ میگی اسے دیکھتے ہی جان گئی کہ وہ کیا کرنے آیا ہے۔ اس نے اپنی شاٹ گن ان کی طرف سیدھی کی اور بولا۔ ''مرنے کو تیار ہو جاؤ۔''

میگی اب تک بہادری سے حالات کا سامنا کر رہی تھی لیکن موت کو سامنے دیکھ کر وہ سہم گئی اور جیمس کے پیچھے ہو گئی۔ جیمس نے حوصلے سے کہا۔ ''ہمیں مار کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پھر بھی تم مارنا ہی چاہتے ہو تو مجھے مارو۔ سلیج میری کوتاہی سے غائب ہوئی ہے۔ میگی تمہارے ساتھ تھی اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''مجھے افسوس ہے میں کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' مائیک نے شاٹ گن کی نال ذرا نیچے کی لیکن اس سے پہلے وہ گولی چلاتا۔ میگی اس کے عقب کی طرف دیکھ کر چلائی۔ ''سلیج۔۔۔ وہ دیکھو سلیج آ گئی ہے۔''

مائیک نے پلٹ کر دیکھا۔ دھند سے سلیج برآمد ہو رہی تھی اور اس کے پیچھے شارنی چلا آ رہا تھا۔ کتے پوری قوت لگا کر سلیج کو ڈھلان کے خلاف کھینچ رہے تھے۔ مائیک خوش ہوا لیکن اس نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے تمہارا سفر یہیں تک تھا۔ شاید اسکیمو بھی مارا گیا ہے لیکن مجھے امید ہے ہم راستہ تلاش کر لیں گے۔''

میگی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جیمی کا کہنا تھا کہ اس کے سوا کوئی اس علاقے میں راستہ تلاش نہیں کر سکتا۔''

''ممکن ہے۔'' مائیک بولا۔ ''لیکن ہم کوشش کریں گے۔''

کتے سلیج کھینچتے ہوئے ان کے پاس آ گئے تھے۔ عقب میں شارنی رسیاں سنبھالے ہوئے تھا۔ میگی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے عجیب لگا تھا کیونکہ شارنی نے ایک بار بھی سلیج کی رسیاں سنبھالنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس وقت وہ بڑی مہارت سے رسیاں سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے سلیج روکی اور اتر کر مائیک کی طرف آیا۔ مائیک نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ ''خوش ہو جاؤ تمہاری خواہش پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے، ان کو یہیں مار کر چھوڑنا ہے، چاہو تو تم مارنا چاہو گے۔''

میگی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ مائیک کی بات پر نہیں بلکہ شارنی کو قریب سے دیکھ کر۔ مائیک نے میگی کی حیرانی محسوس کر لی تھی اور اس نے پلٹ کر شارنی کو دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی شارنی نے سیل مچھلی کو شکار کرنے والے بھالے کا ڈنڈا گھما کر اس کے سر پر مارا۔ وار میں اتنی قوت تھی

کہ مائیک بے ہوش ہو کر اوندھے منہ برف پر جا گرا۔ اسی لمحے جیس نے بھی جیمی کو پہچان لیا تھا۔ وہ شارٹی کے لباس میں تھا۔ اسی وجہ سے مائیک دھوکا کھا گیا اور ایک بار دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا کہ آنے والا شارٹی ہے۔ میگی نے جھپٹ کر مائیک کی شاٹ گن لے لی۔ جیس بھی کھڑا ہو گیا تھا اس نے بے ہوش مائیک کا معائنہ کیا۔

''تم نے یہ کیسے کیا؟'' میگی نے جیمی سے پوچھا۔

''میں پیچھے سے غائب ہو کر آگے کی طرف گیا اور کتوں کو سیٹی بجا کر اپنی طرف بلا لیا۔''

''تم نے شارٹی کے ساتھ کیا کیا؟''

''وہی جو اس کے ساتھ کیا ہے۔'' جیمی نے مائیک کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ پیچھے بے ہوش پڑا ہے۔ میں نے اسے اپنے کپڑے پہنا دیے اور اس کے کپڑے خود پہن لیے۔''

جیس نے مائیک کے لباس کی تلاشی لے کر اس کے پاس موجود شاٹ گن کی اضافی گولیاں نکال لی تھیں۔ جیمی کے پاس شاٹ گن تھی اور جیمی کی رائفل بھی اس کے پاس تھی۔ جیمی نے اپنی رائفل حاصل کر لی تھی اور اس وقت سلیج گاڑی سے سونے کے بکس اتار رہا تھا۔ میگی اس کے پاس آئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''مجھے اپنے خاندان کے لیے خوراک لینی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں واپس جا کر گوشت لاؤں گا۔''

''میرے شوہر کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ اسے علاج کی ضرورت ہے۔'' میگی نے اس سے التجا کی۔ لیکن جیمی اس کی بات سنے بغیر بکس اتارنے میں مصروف رہا۔ اس نے اپنی رائفل حاصل کر لی تھی لیکن شارٹی کی شاٹ گن کہیں پھینک آیا تھا۔ میگی نے پوچھا۔

''اس وقت ہم کہاں ہیں؟''

''ہم اس جگہ سے دور نہیں ہیں جہاں تمہارا طیارہ گرا تھا۔'' جیمی نے کہا اور آخری بکس اتار کر برف پر رکھ دیا۔ ''موسم خراب ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے مجھے گوشت لے کر اپنے گھر جانا ہوگا ورنہ میرے گھر والے سرما میں بھوک سے مر جائیں گے۔''

''تم گوشت بعد میں بھی لے جا سکتے ہو، پہلے ہمیں لے چلو، جیس کو علاج کی ضرورت ہے۔''

جیمی نے سوچا اور بولا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے میں جیس کو سلیج پر بٹھا لوں گا لیکن پھر ہمیں گھر پہنچنے میں تین دن لگ سکتے ہیں۔''

میگی مایوس ہو گئی۔ ''تین دن... تب تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔ اس کے پاؤں کے زخم خراب ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے پھر پورے پیر کاٹنے پڑیں۔ پلیز تم گوشت بعد میں لے جانا۔''

جیمی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''اب وقت نہیں ہے شاید کل سے ہی بڑا طوفان آ جائے اور اس طوفان میں کوئی اس علاقے میں سفر نہیں کر سکتا ہے۔'' وہ سلیج پر سوار ہو گیا۔ ''میں آدھے دن میں گوشت لے کر واپس آ جاؤں گا پھر تمہیں لے چلوں گا۔''

''میری بات سنو...'' میگی نے کہنا چاہا لیکن جیمی نے اس سے پہلے ہی رسیوں کو جھٹکا دے کر آواز نکالی اور کتے دوڑ پڑے۔ اب سلیج پر صرف جیمی کا وزن تھا اس لیے ان کو کھینچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سلیج نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میگی کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ مائیک اور شارٹی سونے کے پیچھے انہیں قتل کرنا چاہ رہے تھے اور جیمی گوشت کی خاطر انہیں اس ویرانے میں چھوڑ گیا تھا۔ وہ جیس کے پاس آئی جو ایک طرف برف کی دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اسی لمحے مائیک کراہا تو میگی نے چوکنا ہو کر شاٹ گن سنبھال لی تھی۔ مائیک اٹھ گیا لیکن اس کے حواس قابو میں نہیں تھے۔ وہ سر جھٹکتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔ میگی کے ہاتھ میں شاٹ گن دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ معاملہ الٹ گیا ہے۔ میگی نے للکار کر کہا۔

''خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاؤ۔''

مائیک کھڑا رہا۔ ''وہ یقیناً اسیمو تھا اب وہ کہاں ہے؟''

''وہ گوشت لینے گیا ہے اور سونا یہ رہا۔'' میگی نے بکسوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سونا اب اسی جگہ رہ جائے گا جلد یہاں برف کے طوفان آئیں گے اور سونا ہمیشہ کے لیے ان میں غائب ہو جائے گا۔''

مائیک مایوس نظر آنے لگا۔ ''اس پاگل کے بچے کو سونے کی قیمت کا اندازہ نہیں ہے؟''

''اس کے نزدیک سونے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' میگی بولی۔ ''یہ بہت سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ خوراک، لباس اور چند ضروریات بس یہی ان کو درکار ہوتا ہے اور یہ ان کو اس ویرانے میں بھی مل جاتا ہے۔''

''اسے سونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ تمہیں بھی تو چھوڑ گیا ہے۔'' مائیک نے طنز کیا۔

میگی مایوس ہوئی۔ ''ہاں اس کے نزدیک ہم سے زیادہ اپنا خاندان اہم ہے۔ اگر وہ گوشت لے کر نہیں گیا تو آنے والے سرما میں اس کا گھر بھوکا رہے گا۔''

''بکواس۔'' مائیک نے حقارت سے کہا۔ ''ان بکسوں

میں موجود سونے کے بدلے وہ اتنا گوشت حاصل کر سکتا ہے جو وہ اور اس کا پورا قبیلہ ساری عمر کھاتا رہے تب بھی ختم نہ ہو۔"

میگی، جیمس کے پاس آگئی تھی۔ مائیک ایک طرف بیٹھ گیا۔اس دوران میں جیمی کے لباس میں ملبوس شارٹی بھی وہاں آگیا تھا۔ وہ جیمی کو گالیاں دے رہا تھا اور یہ جان کر اس کی گالیوں کی رفتار بڑھ گئی کہ جیمی ان کو یہاں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ شارٹی نے زہریلے لہجے میں میگی سے کہا۔ "تم نے دیکھا وہ ہم سے مختلف نہیں ہے اسے موقع ملا تو وہ تمہیں اور تمہارے شوہر کو یہاں مرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔"

"وہ گوشت لینے گیا ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ وہ جیمس کو سلیج پر لے جائے گا۔ لیکن اس میں تین دن لگ سکتے ہیں۔"

"اس کے پاؤں کا زخم خراب ہو رہا ہے۔" مائیک نے کچوکا لگانے والے انداز میں کہا۔ "تین دن بعد ممکن ہے اس کے دونوں پاؤں کاٹنا پڑیں یا ممکن ہے ٹانگیں ہی کاٹنا پڑیں۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔" میگی بولی۔

"اچھا میں بکواس کرتا ہوں ذرا جیمس کے جوتے اتار کر دیکھو تمہیں خود پتا چل جائے گا۔"

میگی نے غصے سے بے قابو ہو کر شارٹی کی طرف شاٹ گن اٹھائی تھی لیکن جیمس نے اسے روک لیا۔ "بولنے دو اسے، ویسے یہ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔"

شارٹی ہنسا۔ "اس ویرانے میں تم کب تک ہمیں ایک گن کے سہارے روک کر رکھو گی۔ مجھے امید ہے مرنے سے پہلے میں تمہارے حسن سے لطف اندوز ضرور ہو سکوں گا۔"

اس بار تو میگی نے شارٹی کو مار ہی دیا تھا اگر جیمس ہاتھ مار کر شاٹ گن کا رخ اوپر نہ کرتا تو گولی شارٹی کو لگتی۔ وہ بچ گیا تھا اور اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ تیزی سے میگی کی طرف لپکا اور اس سے شاٹ گن چھیننے کی کوشش کی۔ اس دوران میں وہ گن کو دوبارہ لوڈ کرنا چاہ رہی تھی۔ میگی نے شارٹی کے پیٹ میں گھٹنا مارا وہ کراہ کر جھکا لیکن شاٹ گن نہیں چھوڑی۔ میگی کمزور عورت تھی وہ زیادہ دیر شارٹی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی جبکہ مائیک بھی اس کی مدد کو آنے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے شارٹی کامیاب ہوتا، ایک فائر ہوا اور گولی شارٹی کے پیروں کے قریب برف پر لگی۔ انہوں نے چونک کر دیکھا جیمی اپنی رائفل سمیت موجود تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر شارٹی جلدی سے پیچھے ہو گیا۔ میگی نے شاٹ گن لوڈ کر لی اور جیمی سے پوچھا۔

"تم کب آئے؟"

"میں آگیا ہوں، پہلے میں تمہیں گھر تک پہنچاؤں گا، اس کے بعد گوشت لے کر جاؤں گا۔ میں سلیج لاتا ہوں۔"

جیمی سلیج لینے چلا گیا اور میگی نے دونوں بھائیوں پر شاٹ گن تان لی۔ وہ اب بالکل شریف بنے ہوئے تھے، ان کو معلوم تھا اس بار کوئی حرکت کی تو جیمس انہیں نہیں بچ پائے گا۔ جیمی سلیج لے آیا اور اس نے احتیاط سے جیمس کو اٹھا کر اس میں لٹا دیا اور اسے کھالوں سے ڈھک دیا۔ اس کے اشارے پر میگی بھی سلیج میں آگئی۔ مائیک اور شارٹی انہیں دیکھ رہے تھے۔ میگی نے جیمی سے پوچھا۔ "ان کا کیا کرنا ہے؟"

"ان سے کہو یہ سلیج کے نشان پر چلتے رہیں کل تک یہ نشان رہیں گے اور جہاں نشان ختم ہو جائیں یہ وہیں رک جائیں میں دو دن میں آکر انہیں لے جاؤں گا۔"

میگی نے انہیں یہ بات بتائی تو شارٹی بولا۔ "یہ بکتا ہے، ہمیں مرنے کے لیے یہاں چھوڑ کر جا رہا ہے۔"

"میری خواہش ہے ایسا ہی ہو۔" میگی سرد لہجے میں بولی۔ "لیکن یہ جھوٹ نہیں بولتا ہے اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کے کہنے پر عمل کرو یہ آکر تمہیں بچا لے گا۔ ویسے بھی اسے گوشت لینے کے لیے واپس تو آنا ہے۔"

جیمی نے سلیج آگے بڑھا دی تھی۔ مائیک اور شارٹی اس کے نقش قدم پر چل پڑے، ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سلیج پر وزن تھا لیکن کتے پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ جیمی نے دو دن کا سفر ایک دن میں طے کر لیا تھا۔ جزیرے پر پہنچ کر اس نے جیمس کو اپنے اگلو میں رکھا اور اس کے لیے مقامی طبیب بلوایا جو فراسٹ بائٹ کے علاج کا ماہر تھا اس وقت تک جیمس کی انگلیاں بالکل سیاہ ہو گئی تھیں اور اگر وہ کسی اسپتال میں ہوتا تو ڈاکٹر اس کی انگلیاں کاٹ دیتے لیکن مقامی طبیب نے جڑی بوٹیوں کو پانی میں ابال کر جیمس کے پاؤں اس کے نیم گرم پانی میں ڈال کر رکھے۔ دو دن تک یہ علاج جاری رہا اور اس کے بعد جیمس کے پاؤں کی حالت بہتر ہونے لگی تھی۔

جیمی اپنی بستی کے کچھ افراد کو لے کر گوشت اور مائیک، شارٹی کو لانے کے لیے روانہ ہوا تھا ساتھ ہی ایک آدمی کو اقالوئٹ روانہ کیا تھا تاکہ وہ جیمس کے لیے طبی مدد لائے اور وہاں انتظامیہ کو مفرور مجرموں اور سونے کے بارے میں بتائے۔ دو دن بعد جیمی گوشت، سونے اور دونوں بھائیوں کو لے آیا تھا۔ اسی دن ایک ریسکیو ہیلی کاپٹر آکر ان سب کو لے گیا۔ اقالوئٹ کے ہیلی پیڈ پر جیمس کے لیے ایمبولینس انتظار کر رہی تھی اور دونوں مجرم بھائیوں کے لیے پولیس منتظر تھی۔

قسمت کے کھیل میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، بازی کس کے حق میں جائے گی... کون فتح اور کس کے حصے میں شکست کا طوق لہرائے گا... مغرب کی آزاد فضائیں بچوں کو نفسیاتی طور پر وقت سے پہلے ہی وہ کچھ سکھا دیتی ہیں... جن کو سمجھنے کے لیے یہ عمر ناکافی ہوتی ہے...

نامعلوم گولی

سکندر سلیم

معصوم ذہنوں کو پراگندہ کردینے والے عاقبت نااندیشوں کی زہریلی سازش

ایک دفعہ میں نے بار کی مالکن میری سے پوچھا تھا کہ اس نے اپنے بار کا اتنا خوفناک نام کیوں رکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ لوگوں کو ایسی جگہ چاہیے جہاں وہ نصف شب کو مدہوش ہو کر ایک بے جان لاش کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں اور انہیں صبح چار بجے بھی گھر جانے کا راستہ تلاش کرنا مشکل ہو جائے۔ اس کا کہنا درست تھا اور مجھے اس کا اندازہ تب ہوا جب میں نے صبح ساڑھے تین بجے کے قریب بار میں قدم رکھا۔

''فوگی۔'' وہ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''بہت عمدہ سوٹ پہن رکھا ہے۔''

وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ میں اکثر اس بار میں جایا کرتا تھا۔ اس وقت میں نے بہت عمدہ شارک اسکن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اچھے کپڑے ہمیشہ سے ہی میری کمزوری ہیں اور میری کمائی کا بیشتر حصہ ان پر خرچ ہو جاتا ہے۔

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بالکل نیا ہے۔''

''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتی ہوں؟''

''مجھے کریگی سے ملنا ہے۔''

میری نے کچن کی طرف رخ کرتے ہوئے آواز لگائی۔ ''اوٹو۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ اس کا قد کم از کم ساڑھے چھ فٹ تھا اور اس نے انتہائی گندا ایپرن پہن رکھا تھا۔

''میں تمہاری بیٹی کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ تیزی سے میری طرف بڑھا جیسے مجھ پر حملہ کر دے گا لیکن میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔

''تمہاری سابقہ بیوی کے بوائے فرینڈ کا نام جوائے ہے؟'' میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر کہا۔ ''اس نے تمہاری بیٹی کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اچھی طرح مزہ چکھا دیا اور اس کی ناک توڑ دی۔''

اوٹو مسکرایا۔ اس کے مکروہ چہرے پر یہ مسکراہٹ بالکل اچھی نہیں لگی۔ ''وہ میری بیٹی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟''

''ضرب بہت شدید تھی۔ تمہاری سابقہ بیوی کوما میں اور اس کا بوائے فرینڈ مردہ خانے میں ہے جبکہ لنڈا غائب ہے۔''

اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اس کی جگہ اضطراب نے لے لی۔ اس کا چہرہ ایک ایسی دیوار کی طرح نظر آنے لگا جو زلزلہ میں ڈھے گئی ہو۔

میں نے سر ہلایا اور اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرے پہلے سوال کا جواب ہے۔''

''کیا؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھ میں آنسو آگئے تھے۔

''تم نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے؟'' میں نے وضاحت کی۔ ''یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

''تمہیں اسے تلاش کرنا چاہیے فوگی۔'' اوٹو نے کہا۔

''میں جانتا ہوں اور اسے ضرور تلاش کروں گا۔''

''وہ صرف دس سال کی ہے۔'' اوٹو اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''وہ حال ہی میں گیارہ سال کی ہوگئی ہے۔''

''کیا؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت جھلک رہی تھی۔

''میرے پاس پورا ریکارڈ ہے۔'' میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنے دفتر میں یہی کام کرتے ہیں۔''

میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ ریاست فلوریڈا نے بچوں کے تحفظ کے لیے 'چائلڈ پروٹیکشن سروسز' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی اور میں اس کا کرتا دھرتا تھا۔ اس حوالے سے مجھے تمام بچوں کا ریکارڈ رکھنا پڑتا تھا اور اسی لیے مجھے لنڈا کریگی کی صحیح عمر معلوم تھی۔

''فوگی اسے تلاش کرلے گا۔'' میری نے ہمدردانہ لہجے میں اوٹو سے کہا۔

''اوہ میرے خدا۔'' اوٹو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اپنے آپ پر قابو رکھو۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں وہ کہاں جاسکتی ہے؟''

''ممکن ہے کہ وہ ایمایا ایلا نامی کسی لڑکی کے ساتھ ہو۔'' اوٹو نے کہا۔ ''مجھے اس کا نام ٹھیک طرح سے معلوم نہیں لیکن وہ اسکول میں اس کی بہترین دوست ہے۔''

''ضروری نہیں کہ وہ اس کے پاس ہی گئی ہو۔''

''تم اپنی سابقہ بیوی سے کیوں نہیں پوچھتے اوٹو؟'' میری نے کہا۔

''نہیں۔'' وہ غصے سے بولا۔

''دیکھو، اسکول کھلنے میں ابھی پانچ چھ گھنٹے باقی ہیں۔ تبھی لنڈا کی بہترین دوست کے بارے میں معلوم ہوسکے گا اور میں اتنی دیر انتظار کرنا نہیں چاہتا۔ میں تمہاری سابقہ بیوی سے پوچھ سکتا تھا لیکن وہ کوما میں ہے اور پولیس مجھے اس تک نہیں جانے دے گی لہٰذا میں تم پر ہی انحصار کر رہا ہوں۔ اپنے ذہن پر زور دو۔ شاید کچھ یاد آجائے۔''

''صبر کرو۔'' وہ اسٹول سے چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس ایک نمبر ہے۔''

وہ تیزی سے کچن میں گیا اور چند سیکنڈ بعد ہی واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا کاغذ کا ٹکڑا تھا۔

''لنڈا نے ایک مرتبہ مجھے اس نمبر پر فون کرنے کے

لیے کہا تھا۔'' اس کے لہجے میں ہلکا ہلکا جوش نمایاں تھا۔
''جب وہ سمر کیمپ سے گھر واپس آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس وقت اسی لڑکی ایلا کے پاس ٹھہری ہوگی۔''
میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ کا ٹکڑا لے لیا۔ مجھے میری سے کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے خود ہی بار کے کاؤنٹر پر رکھا ہوا فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ نمبر ڈائل کیا اور انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر تک کوئی جواب نہیں آیا، تب میں نے دوبارہ بلکہ سہ بارہ وہ نمبر ملایا۔ بالآخر مجھے کامیابی ہو گئی۔ دوسری طرف سے کسی نے غصے بھری آواز میں جواب دیا۔
''رات کے اس پہر تم کیا بات کرنا چاہتے ہو؟''
''میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں چائلڈ پروٹیکٹو سروس کے لیے کام کرتا ہوں اور لنڈا کو تلاش کر رہا ہوں۔''
یہ سنتے ہی وہ عورت خاموش ہو گئی اور قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''تم کون بول رہے ہو؟''
''میرا نام جان والٹر ہے اور میں ریاست کے لیے کام کرتا ہوں۔ لنڈا لاپتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری بیٹی کو اس کا اتا پتا معلوم ہوگا۔''
اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے فوراً ملنا ہے۔ کیا تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتا سکتی ہو؟''
''ہاں لکھو۔'' وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''تین سو ساسی۔ میپل اسٹریٹ۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''
''شیلو گرینو۔'' میں نے بار کا نام لیتے ہوئے کہا۔
''تم وہاں سے پیدل بھی آسکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میں پورچ کی لائٹ آن کر دیتی ہوں۔''
مجھے وہاں تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔ اس پورے بلاک میں وہی ایک مکان تھا جس کے پورچ کی لائٹ جل رہی تھی۔ گھنٹی بجانے پر ایک عورت دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس نے ٹی شرٹ اور ہاف پینٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے گھر میں کتا تو نہیں ہے؟''
''وہ تمہیں نہیں کاٹے گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''سب یہی کہتے ہیں لیکن میں ایک دفعہ بھگت چکا ہوں اور دوبارہ ایسا نہیں چاہتا لہٰذا اپنے کتے کو اسی جگہ پر رکھو کہ وہ مجھ پر حملہ آور نہ ہو سکے۔''
''وہ نہیں کاٹتا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔
میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ ''لنڈا یہاں ہے یا نہیں؟''
''نہیں۔'' اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا پھر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''تم پیو گے؟''
''میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''البتہ کام کے دوران کسی قسم کا نشہ کرنا پسند نہیں کرتا لیکن تم لنڈا کو جانتی تو ہوگی؟''
''یقیناً۔'' وہ بولی۔ ''وہ ایوا کی بہترین دوست ہے۔''
''اچھا تو اس کا نام ایما یا ایلا نہیں ایوا ہے۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ تمہاری چھوٹی بہن ہے؟''
''وہ میری بیٹی ہے۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''تم نے اسے میری چھوٹی بہن کیسے سمجھ لیا؟''
''کیونکہ تم کسی طرح بھی دس گیارہ سالہ بچی کی ماں نہیں لگتیں۔ تم خاصی دلکش اور جوان ہو اور میرے اندازے کے مطابق تمہاری عمر زیادہ سے زیادہ پچیس برس ہوگی۔''
اس کی آنکھیں پھیل گئیں جیسے اس نے کوئی حسین خواب دیکھ لیا ہو۔ پھر اس نے ایک اور کش لیا اور بولی۔ ''میں سولہ سال کی عمر میں ماں بن گئی تھی۔ تم اندر آجاؤ۔ میں کتے کو باندھ کر آتی ہوں۔''
گھر کی اندرونی حالت باہر سے بھی زیادہ خراب تھی۔ جگہ جگہ پرانے اخبارات و رسائل کے ڈھیر، پیزا کے ڈبے اور پلاسٹک کی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ان چیزوں کے درمیان سے راستہ بناتے لونگ روم تک پہنچے تو وہ ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بیٹھ جاؤ۔''
میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور بولا۔ ''نہیں شکریہ۔ تمہارا نام کیا ہے؟''
''میرا نام جان کر کیا کرو گے؟''
''ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا نام فوگی ہے۔ تمہیں کس نام سے پکاروں؟''
''ایلنس۔''
''بہت خوب، اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری بیٹی ایوا اور اس کی دوست لنڈا اس وقت کہاں ہیں؟''
ایلنس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔

’’تمہارے بچے تنہا ہوگی؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’بہت اچھی بات ہے۔‘‘ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ’’ہونے بھی نہیں چاہئیں۔ ایوا گیارہ سال کی ہے لیکن تیس سال کی عورت کی طرح سمجھتی ہے جیسے اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اس کے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔‘‘

’’شاید اس کے پاس گھڑی نہ ہو۔‘‘ میں نے مذاق میں کہا تا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

’’اچھا مذاق ہے۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔‘‘

اچانک ہی ایک عجیب سی آواز آئی جو میں نے اس سے پہلے زندگی میں نہیں سنی تھی۔ ایگنس اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا دل باہر آ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ کرتا، گولیاں چلنے کی آواز آئی اور لونگ روم کی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ گولیاں کہاں گئیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ مجھے نہیں لگی۔

دوسرے ہی لمحے میں اپنا براؤننگ نائن ایم ایم نکال چکا تھا اور ایگنس فرش پر گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک شارٹ گن نظر آ رہی تھی۔

’’یہ سب کیا ہے؟‘‘ میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ شاید میرے سابق شوہر کی حرکت ہے۔‘‘ وہ آہستہ سے بولی۔ ’’وہ ہر وقت مسلح رہتا ہے اور اکثر میرے گھر پر فائرنگ کرتا رہتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔‘‘

’’تمہارے ہاتھ میں یہ شارٹ گن کہاں سے آئی؟‘‘ میں نے اس سے پوچھا۔

’’یہ!‘‘ اس نے شارٹ گن کی طرف ایسے دیکھا جیسے اسے علم ہی نہ ہو کہ اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ ’’میرے پاس ہر کمرے میں اس طرح کا ہتھیار ہے اور تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی بہت ہی قدیم زمانے کی چیز لگ رہی ہے۔‘‘

’’یہ براؤننگ ہے اور اسے جنگِ عظیم دوم میں استعمال کیا گیا تھا۔‘‘

’’واقعی؟‘‘ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور اس نے کہا۔ ’’ذرا باہر نظر دوڑاؤ۔ شاید تمہیں ایک چھوٹے قد کا سفید فام نظر آ جائے۔ وہ عموماً قمیص نہیں پہنتا اور اس کے سر پر ایک ٹوپی ہوتی ہے۔‘‘

میں نے ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باہر اس حلیے کا کوئی شخص نظر نہیں آیا البتہ ایک عمدہ قسم کی ٹاؤن کار گھر کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

’’کیا تمہارے پاس لنکن کار ہے؟‘‘ میں نے ایگنس سے پوچھا۔

’’میرے پاس؟‘‘ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ’’کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟‘‘

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ایک طویل قامت شخص کار کی پسنجر سیٹ سے باہر آیا اور مکان کی طرف دیکھنے لگا۔

’’کیا تمہارا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا چل رہا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کیا؟‘‘ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور باہر جھانکنے لگی۔ جیسے ہی اس آدمی کی نظر ایگنس پر پڑی، اس نے رائفل نشانے پر رکھی اور اس سے پہلے کہ وہ ایک اور فائر کرتا، ایگنس نے صوفے پر چھلانگ لگائی اور اس کی شارٹ گن سے یکے بعد دیگرے دو شعلے نکلے اور کار میں ڈینٹ پڑ گئے۔ شاید وہ شخص بھی تھوڑا سا زخمی ہوا۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ کسی نے اسے کار کے اندر گھسیٹ لیا اور لمحوں میں ہی وہ گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

’’تم اسے جانتی ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ وہ غصے سے بولی۔ ’’لیکن کار میں بیٹھا ہوا شخص بالکل وہی تھا جس نے ایک ہفتے قبل اسکول جاتے ہوئے ایوا اور لنڈا کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔‘‘

’’تمہیں پولیس کو بتانا چاہیے تھا۔‘‘

’’میں نے انہیں بتایا تھا۔‘‘ وہ مشتعل ہوتے ہوئے بولی۔

’’اگر ایسی رپورٹ ہوتی تو وہ میرے دفتر میں ضرور آتی۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تمہارا پولیس سے کیا تعلق ہے؟‘‘ وہ مجھے مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔

’’میں چائلڈ پروٹیکٹو سروسز کے لیے کام کرتا ہوں اور اسی سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ لنڈا کا پتا ہے اور شاید خطرے میں بھی ہے۔‘‘ میں نے باہر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ’’کیا پولیس والے یہاں آئے تھے اور انہوں نے تم سے کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں کچھ پوچھ

تھا؟''

''نہیں۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔'' میں نے اپنی ناک مسلتے ہوئے کہا۔

''اس سے بھی زیادہ عجیب یہ کہ وہ کتیا کا بچہ میری گولی سے کیوں نہیں مرا؟''

''اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ یہ اس کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ بہرحال تم نے اسے نہیں مارا۔ اس جیکٹ کی وجہ سے وہ بچ گیا۔''

''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟''

''اس کے جسم سے خون نہیں نکلا۔'' میں نے اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں چند کام کرنا ہیں۔ سب سے پہلے مجھے گھر کا عقبی دروازہ دکھاؤ۔ کہیں کوئی شخص وہاں سے گھر کی نگرانی تو نہیں کر رہا۔ دوسرے یہ کہ اپنے کتے کو کھلا چھوڑ دو۔ کہیں وہ لوگ واپس نہ آجائیں اور تیسری بات یہ کہ ایمبولینس کے لیے فون کرو اور انہیں بتاؤ کہ تمہیں گولی لگی ہے۔''

''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' وہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس کار کا پتا لگانا ہے کہ وہ کس کی ملکیت ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا پیچھا کرنا ہے جنہوں نے تمہاری بیٹی کو تنگ کیا اور مجھ پر گولی چلائی پھر میں لنڈا کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ اگر وہ مل گئی تو اسے اس کے باپ کے حوالے کر دوں گا اور ممکن ہے کہ اس تلاش کے نتیجے میں ایوا بھی مل جائے۔''

''میں دوبارہ پوچھ رہی ہوں کہ تم کون ہو؟'' اس نے مجھے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ جو نشہ وہ کر رہی تھی، اس کا اثر دماغ پر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''اپنے آپ کو سنبھالو ایلفس۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تمہاری لڑکی لاپتا ہے اور تمہارے گھر پر ابھی ابھی گولی چلائی گئی ہے۔ اس کیفیت سے باہر آؤ اور مجھے بتاؤ کہ عقبی دروازہ کدھر ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے جانے کے بعد کتے کو کھول دوں گی اور ایمبولینس کے لیے فون بھی کر دوں گی لیکن میں انہیں کیوں بلاؤں؟''

''تم پولیس والوں کے سوالات کا جواب نہیں دے

ایک سردار کا پیٹ خراب ہو گیا۔ ڈاکٹر کے پاس گیا، لوگوں کی موجودگی میں کچھ یوں حال بتانے لگا۔

سردار: ڈاکٹر صاحب! صبح سے نیٹ ورک خراب ہے، مسڈ کال پہ مسڈ کال آرہی ہے، آؤٹ گوئنگ بالکل فری ہے، طرح طرح کی رنگ ٹونز بجتی ہیں، پیٹ میں بیلنس بالکل نہیں ٹھہرتا، جتنا لوڈ کرو سب ختم۔''

ڈاکٹر (ہنستے ہوئے): ''یہ دوا لے جائیں، سم (SIM) بلاک ہو جائے گی۔''

سکتیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اور ہمیں ان لوگوں کو دور رکھنے کے لیے سائرن کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اپنے بازو پر بھی نظر ڈال لو۔''

اس نے بازو کی طرف دیکھا۔ وہاں خون نظر آرہا تھا۔ وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ دراصل کھڑکی کے شیشے کا ٹکڑا لگا ہے لیکن تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ تم تو شاک میں تھیں۔ تم انہیں یہی بتاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ''عقبی دروازے کا راستہ کچن سے جاتا ہے لیکن تم اس کار کو کیسے تلاش کرو گے؟''

''میں نے اس کا نمبر نوٹ کر لیا ہے۔ ویسے بھی مجھے کاروں کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔''

میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ کاروں کے بارے میں میری معلومات بے حد وسیع تھیں کیونکہ ماضی میں کاریں چوری کرنا میرا پیشہ تھا اور بروکلین میں مجھ سے بڑا کار چور کوئی نہیں تھا۔ اس دوران میں صرف دو مرتبہ پکڑا گیا لیکن دوسری مرتبہ بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ میں نے ایک ایسی کار چرائی جس کی پچھلی سیٹ پر ایک بچی لیٹی ہوئی تھی۔ بچی کی ماں کی رپورٹ پر پولیس فوراً ہی حرکت میں آگئی اور میں پکڑا گیا۔ کار چوری کا جرم اتنا سنگین نہیں تھا لیکن مجھ پر بچی کے اغوا کا الزام لگ گیا۔ جیل سے رہائی پانے کے بعد میرے لیے اس شہر میں رہنا ممکن نہیں تھا لہٰذا فلوریڈا آگیا اور یہاں قسمت کی خوبی سے ایک ایسی سرکاری ملازمت مل گئی جس کا میں

قطعی اہل نہیں تھا لیکن مجھے یہ کام پسند آیا اور اب میں ہر وقت بچوں کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتا ہوں۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور یہاں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا مشکل نہ تھا جس کے پاس اتنی عمدہ کار ہو۔ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے میں ہر قسم کی تحقیقات کرنے کا مجاز تھا۔ اس لیے مجھے موٹر رجسٹریشن آفس تک رسائی میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ ایلکس کے گھر سے نکلنے کے ایک گھنٹے بعد ہی میں کار کے مالک کا نام جاننے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ ایک قدیم ریڈ انڈین ڈیوڈ وائٹ ڈنگ تھا جس کے قبیلے کے بیشتر افراد بھوک اور بیماری کی تاب نہ لا کر مر کھپ گئے تھے یا پھر اوکلوہاما چلے گئے تھے۔ وائٹ ڈنگ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کی چھوڑی ہوئی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اس جگہ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں زیر زمین تیل کے ذخائر ہیں چنانچہ اس نے وہ زمین ایک نئی آئل کمپنی کو بیچ کر ڈھیر ساری دولت کمائی اور اس پیسے کو مختلف کاروبار میں لگا دیا۔ اب وہ ایک دولت مند کاروباری شخص تھا۔

میری نظر میں وہ ایک مشتبہ شخص تھا۔ جس نے صرف ایلکس کے مکان پر ہی گولی نہیں چلائی بلکہ ایک روز پہلے لنڈا کے گھر کے باہر جو واقعہ پیش آیا اس میں بھی اسی شخص کا ہاتھ ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں ایک شخص مارا گیا اور لنڈا کی ماں کوما میں چلی گئی۔ میری اگلی منزل وہ ٹریلر پارک تھا جہاں لنڈا ایشتر وقت رہا کرتی تھی۔ رات بھر بارش ہونے کے بعد سورج نکل آیا تھا۔ میں نے ایلومینیم کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک عورت پولیسٹر کا نائٹ گاؤن اور بیس بال کیپ پہنے برآمد ہوئی اور قدرے نرم لہجے میں بولی۔ ”کیا بات ہے؟“

”امید ہے کہ میں نے تمہاری نیند خراب نہیں کی ہو گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے پڑوس میں ہونے والے واقعے کی تحقیقات کر رہا ہوں جس میں جوائے نیکس مارا گیا اور تم نے ہی پولیس کو اطلاع دی تھی۔“

”اور پولیس آئی بھی تھی۔“ اس نے مجھے مطلع کیا۔

”میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ کیا ہوا۔ اب تم جاؤ، ابھی تو صبح بھی نہیں ہوئی۔“

”میڈم! میرا تعلق چائلڈ پروٹیکٹو سروسز سے ہے اور ہم لنڈا کو تلاش کر رہے ہیں۔“

اس عورت کے چہرے پر نرمی کے آثار نمایاں ہوئے اور بولی۔ ”تم لنڈا کو تلاش کر رہے ہو؟“

”پولیس کا کہنا ہے کہ اس نے جوائے پر گولی چلائی تھی۔“

”اس نے گولی نہیں چلائی۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا اور اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ ٹریلر کے اندر ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

”اس کی ماں بہت گندی عورت ہے۔“ اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ”وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتی ہے۔ البتہ لنڈا اس سے بہت مختلف ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور سگریٹ پینے لگی۔

”ان لوگوں کے بارے میں کچھ اور بتا سکتی ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ ہمیشہ کی طرح چیخ چلا رہے تھے پھر اس کے بعد گولیاں چلنے کی آواز آئی۔“

”لیکن پولیس والوں کا خیال ہے کہ جوائے نے لنڈا کو لے جانے کی کوشش کی تھی۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”یہ بڑی قابلِ نفرت بات ہے۔ وہ تو صرف دس سال کی ہے۔“

”گیارہ سال۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”تو تم نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”کیا بتاتی، یہی کہ جوائے اسے تنگ کر رہا تھا۔ میں نہیں مان سکتی۔“

”لیکن انہوں نے تو مجھے یہی بتایا تھا۔“ میں نے اپنا ہونٹ دباتے ہوئے کہا۔

”وہ غلط کہہ رہے ہیں کیونکہ جوائے کو گولی لگنے سے پہلے ہی لنڈا یہاں سے جا چکی تھی۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اپنی دوست ایوا کے ساتھ عقبی راستے سے جا رہی تھی۔“

”تم ایوا کو جانتی ہو؟“

”میں اس پارک میں ہونے والی ہر بات جانتی ہوں۔“ اس نے مجھے بتایا۔ ”کیونکہ مجھے گیس کی بیماری ہے اور میرے پاس علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس لیے میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ سوائے اس کے کہ یہاں بیٹھ کر دوسرے لوگوں کی باتیں سنوں۔“

اس نے پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے بولی۔ ”لنڈا کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا اور وہ دونوں فائرنگ ہونے سے پہلے چلی گئی تھیں۔“

"میرا اندازہ ہے کہ تم نے بھی فائرنگ ہوتے نہیں دیکھی ہوگی۔"

"جیسے ہی فائرنگ شروع ہوئی، میں چھلانگ لگا کر بستر کے پیچھے چلی گئی کیونکہ میں ایسی جگہ پر گولی کا نشانہ نہیں بننا چاہتی۔"

"کیا تم نے اپنے کانوں سے کوئی خاص بات سنی تھی۔ شاید تمہیں کچھ اندازہ ہو کہ جوائے کو کس نے گولی ماری؟"

"میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ کسی نے اسے رائفل سے نشانہ بنایا تھا۔" وہ غنودگی کے عالم میں بولی۔ "اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اگر یہاں سے چلے جاؤ۔ میری دوا کا وقت ہوگیا ہے۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر ٹریلر سے باہر آگیا۔ سات قدم کے فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں جوائے ٹیس کو مارا گیا تھا۔ وہاں کافی خون جما ہوا تھا اور اس جگہ بڑی بے ترتیبی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہاں لڑائی ہوئی ہو۔ میرے ذہن میں کئی سوالات جنم لے رہے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ پولیس والوں نے میرے دفتر فون کر کے یہ کیوں کہا کہ لنڈا نے جوائے پر گولی چلائی کیونکہ اس نے اسے ہراساں کیا تھا اور اگر یہ سچ نہیں تھا تو انہوں نے مجھے اس معاملے میں کیوں ملوث کیا؟ اس کا جواب یہ ہوسکتا تھا کہ وہ لنڈا کو تلاش کرنے میں میری مدد چاہ رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں اپنے کام میں بہت اچھا ہوں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس والے لنڈا کو کیوں تلاش کر رہے تھے۔ اسے گرفتار کر کے انہیں کیا حاصل ہوتا جبکہ اس نے جوائے پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میں نے ٹریلر کے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ دیواروں میں گولیوں کے دو سوراخ نظر آئے۔ پڑوس والی عورت کا اندازہ درست تھا۔ وہ گولیاں رائفل سے ہی چلائی گئی تھیں۔ اب مجھے میڈیکل آفیسر سے مل کر جوائے کی لاش دیکھنا تھی تاکہ اس بات کا یقین ہوجائے لیکن اس کے لیے مجھے انتظار کرنا پڑتا۔ مجھے یوں لگا کہ ایک بار پھر ایوا کی ماں کے پاس جانا ہوگا۔

ایگنس کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی پہلا سوال کیا۔ "ایمبولینس آئی تھی؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "انہوں نے مجھے ابتدائی طبی امداد دی اور پوچھا کہ کیا میں اسپتال جانا چاہتی ہوں لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میری دیکھ بھال اہلِ خانہ کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے یہاں اپنی بیٹی کے لیے رہنا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میرے پاس کچھ خبریں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایوا اور لنڈا ایک ساتھ کہیں چلی گئی ہوں؟"

وہ چند لمحے ساکت بیٹھی رہی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اوہ، اب میں سمجھی۔ اس نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ مجھے اگلے روز فون کرے گی۔ تب مجھے اس کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔"

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں جا سکتی ہیں؟"

"ہاں۔" مجھے ایسا لگا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ "میرا ایک سوتیلا بھائی ہے شکاگو میں، مائیکل۔ اس نے دو سال پہلے وہاں کتابوں کی دکان کھولی تھی۔ ایوا اس سے بہت محبت کرتی ہے اور وہ بھی اسے اتنا ہی چاہتا ہے۔"

"اس کا پورا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مائیکل پاول۔"

"میں اسے فون کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں مشکل سے نکال سکوں۔ میرا خیال ہے تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تب میں نے پوچھا۔ "تم ڈیوڈ وائٹ ونگ کو کیسے جانتی ہو؟"

"یہ کون ہے؟"

"یہ وہی شخص ہے جس کی کار تمہارے گھر کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور عین ممکن ہے کہ جوائے ٹیس پر لنڈا نے نہیں بلکہ اس شخص نے گولی چلائی ہو۔"

"ہاں۔" وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔ "میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ لنڈا نے یہ کام کیا ہوگا۔"

"لہٰذا اب مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ ڈیوڈ وائٹ ونگ، جوائے کو کیوں مارنا چاہتا تھا۔ اگر یہ ثابت ہوگیا تو لنڈا اس الزام سے بری ہوجائے گی۔"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ٹونی! میں تمہیں اپنے سوتیلے بھائی کا نمبر دے دوں گی لیکن تمہیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہ پیسے والے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر کسی ریڈ انڈین کے پاس پیسا آجائے تو وہ ایک خطرناک سانپ کی طرح ہوتا ہے۔ وہ کہیں بھی جا سکتا ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ تمہارے پیچھے لگ گیا تو تمہارے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔"

☆☆☆

بیس منٹ بعد میں مردہ خانے میں تھا۔ البرٹ دروازے کے ساتھ ہی ایک لوہے کی میز پر بیٹھا اسپورٹس میگزین پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’فوتی! تم جوائے نکیس سے ملنے آئے ہو؟‘‘

’’ہاں، یہ بتاؤ کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی؟‘‘

’’کسی وجہ سے اسے سر بمہر بند کر دیا گیا ہے۔‘‘ اس نے مجھے بتایا۔ ’’لیکن اس سے پہلے مجھے رپورٹ پر ایک نظر ڈالنے کا موقع مل گیا۔‘‘

’’پہلے تو یہ بتاؤ کہ اسے بند کیوں کیا گیا اور دوسرے یہ کہ تم نے اس پر نظر کیوں ڈالی؟‘‘

’’کسی پولیس والے نے ڈاکٹر ولسن کو دھمکی دی تھی۔ اس سے مجھے کہا گیا کہ اس رپورٹ کو سیل کر دوں۔ اب رہا یہ سوال کہ میں نے وہ رپورٹ کیوں دیکھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی ڈاکٹر ولسن کو دھمکی دے لہٰذا میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہیے اس رپورٹ میں ایسی کیا خاص بات ہے اور پھر مجھے تمہارا بھی خیال تھا کہ شاید تم اس سلسلے میں میرے پاس آؤ۔‘‘

’’میں؟‘‘ میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں یہاں آؤں گا۔‘‘

’’شاید تم جانتے ہو کہ مجھے نفسیات سے دلچسپی ہے۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’ساتھ ہی اس پولیس والے نے بھی تمہاری آمد کا امکان ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے پہلے میں یہ رپورٹ تالے میں بند کر دوں۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے درمیان ایک مفاہمت ہے۔‘‘

’’پھر تم نے اس رپورٹ میں کیا دیکھا؟‘‘ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

’’کوئی بھی شخص اس رپورٹ کو دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ جوائے کو اس کے اپنے پستول سے بہت قریب سے گولی ماری گئی۔ لگتا ہے کہ مارنے والا اس سے قد میں چھوٹا تھا۔‘‘

’’مثلاً کوئی بچہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے لیکن جس فائل کو میں نے تالے میں بند کیا۔ اس میں ڈاکٹر ولسن نے کچھ اور لکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جوائے کو غالباً سو فٹ کے فاصلے سے رائفل کا نشانہ بنایا گیا۔‘‘

اس کا مطلب ہے کہ ڈیوڈ وائٹ ونگ کے کسی آدمی نے جوائے کو گولی ماری لیکن اس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر لنڈا پر اس قتل کا الزام عائد کر دیا۔

’’شکریہ البرٹ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہیں اندازہ نہیں کہ اس سے مزید کتنے سوالات سامنے آتے ہیں۔‘‘

’’واقعی زندگی کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

لفٹ کی طرف جاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اپنے اصل مقصد سے ہٹتا جا رہا ہوں۔ مجھے سب سے پہلے لنڈا کو تلاش کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شہر سے باہر چلی جائے یا اسے مار دیا جائے۔

اس علاقے سے نکلنے کے چند ہی راستے تھے۔ یہاں ایک پرائیویٹ ہوائی اڈا بھی تھا لیکن ایک غریب نوعمر لڑکی وہاں سے نہیں جا سکتی تھی۔ ان لڑکیوں کے پاس دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ بس کے ذریعے سفر کرتیں لیکن اس قصبے میں کوئی مخصوص بس اسٹیشن نہیں تھا لہٰذا بس ڈرائیور کسی مسافر کو اسٹاپ پر کھڑا دیکھ کر بس روک لیا کرتے تھے۔ چنانچہ میں بھی اسٹاپ کی طرف چل دیا۔ مجھے امید تھی کہ قصبے سے باہر جانے والی پہلی بس ابھی یہاں سے نہیں گزری ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ لڑکیاں کسی جگہ چھپ کر بس کے آنے کا انتظار کر رہی ہوں گی..... چنانچہ میں نے بھی اسٹاپ پر پہنچ کر ایک بے صبرے مسافر کی طرح اداکاری شروع کر دی۔ بار بار گھڑی پر نظر ڈالتا اور میری نظریں سڑک پر جم جاتیں۔ کچھ دیر بعد بس آتی نظر آئی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ ادھر ادھر نہ دیکھوں۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک شیڈ کے پیچھے سے دو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں کوک کی بوتلیں تھیں اور ان میں سے ایک نے درمیانے سائز کا بیگ سنبھالا ہوا تھا۔

ان لڑکیوں نے کوک ختم کی اور بوتلیں ڈسٹ بن میں پھینکنے کے بعد آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں پھر ان میں سے ایک مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ’’ہے مسٹر! کیا تم جانتے ہو کہ ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے یا ہم بس میں سوار ہونے کے بعد بھی ٹکٹ خرید سکتے ہیں؟‘‘

میں ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ’’تم بس میں سوار ہونے کے بعد ٹکٹ خرید سکتی ہو۔ میرے پاس بھی ٹکٹ نہیں ہے۔‘‘

یہ سن کر وہ دونوں لڑکیاں مطمئن نظر آنے لگیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اگلا قدم کیا اٹھانا چاہیے کہ ایک عمارت کے عقب سے نیلے رنگ کی نکن کار کسی مال گاڑی کی طرح

چنگھاڑتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ میں سوچے سمجھے بغیر درمیان میں آگیا اور اس سے پہلے کہ کار رکتی، میں نے اپنا پستول نکال لیا۔ کار سے ایک گوریلا ٹائپ طویل قامت شخص رائفل ہاتھ میں لیے باہر آیا اور مجھے وہاں دیکھ کر تھوڑا سا پریشان ہوگیا۔

''اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا۔'' میں نے اس شخص پر نظریں جماتے ہوئے ان لڑکیوں سے کہا۔ ''یہ شخص تمہیں مارنا چاہتا ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ شخص میرا نشانہ لیتا یا میں اس پر فائر کرتا۔ ایک پٹاخا جیسی آواز آئی اور گوریلے کی سیدھی ٹانگ زخمی ہوگئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''اب میری باری ہے۔''

میں نے گھوم کر اس شخص کی دوسری ٹانگ اور اس کے بازو کو نشانہ بنایا جس میں اس نے رائفل پکڑی ہوئی تھی۔ وہ شخص زمین پر گر گیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر سڑک پر جاگری۔

میں نے اس لڑکی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ''تم یقیناً لنڈا کرچی ہو۔''

''اور تم فوگی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں جانتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس گاڑی کے شیشے بلٹ پروف ہیں۔''

اس نے اپنے پستول سے ونڈ شیلڈ پر فائر کیا۔ اس پر کوئی خراش تک نہیں آئی۔

''ٹھیک ہے۔ میں جو جاننا چاہ رہا تھا، وہ معلوم ہو گیا۔'' میں نے اپنے پستول کا رخ کار کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ کار میں کون ہے؟''

''نہیں لیکن انہوں نے ایک ہفتے پہلے ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''اس میں ڈیوڈ وائٹ ونگ ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس کے دماغ میں کیا ہے؟''

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''خدا غارت کرے جوائے نیکس کو، اسی نے یہ رقم ہتھیائی ہوگی۔''

''ہاں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور ہمیں یہ رقم مسز وائٹ ونگ کو واپس کردینی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ وہ

رقم اس بیگ میں موجود ہے۔''

اس لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔

''سارا جھگڑا اسی رقم کا ہے۔ وہ جوائے کو مارنا چاہ رہا تھا اور تم پر الزام لگا دیا پھر مجھے بھی اس میں ملوث کر دیا گیا کہ تمہیں تلاش کروں۔ ایوا کے گھر پر فائرنگ ہوئی اور نہ جانے ابھی کیا ہونا باقی ہے۔ تمہیں یہ رقم اس کے حوالے کر دینی چاہیے۔''

''لیکن۔'' لنڈا بولی۔ ''مجھے اور ایوا کو ان پیسوں کی ضرورت ہے۔''

''یہ بیگ مجھے دے دو۔'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے میرا کام کرنے دو۔ تم چاہو تو اب بھی کتابوں کی دکان میں کام کرنے کے لیے شکاگو جا سکتی ہو۔''

ان دونوں نے لمحہ بھر کے لیے سرگوشی کی لیکن انہیں زیادہ وقت نہیں ملا۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی کا دروازہ کھلنا شروع ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی اس لڑکی سے بیگ چھینا اور کار کی طرف بڑھنے لگا۔

''مسٹر وائٹ ونگ۔'' میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ ''جو تم چاہتے ہو وہ میرے پاس ہے۔ تمہیں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ لڑکیاں اس رقم کو جوائے ٹیس سے دور رکھنا چاہ رہی تھیں تاکہ تمہارے حوالے کر سکیں۔''

یہ کہہ کر میں نے وہ بیگ اچھال دیا جو کار سے چند فٹ کے فاصلے پر گرا۔ کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بہت لمبا ریڈ انڈین باہر آیا۔ اس نے بہترین قسم کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔

''مسٹر فوگی!'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا تھا کہ تمہارا تعاقب کرنا فائدے مند ہوگا جبکہ تم بھی اس رقم کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔''

''تمہارا خیال غلط ہے۔ میں صرف اس لڑکی کو تلاش کر رہا تھا۔''

''اور اسی لڑکی کے پاس یہ رقم تھی۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ آئندہ ان لڑکیوں کو تمہاری جانب سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔''

اس نے جواب دینے کے بجائے آواز لگائی۔

''برنارڈ۔''

ایک نسبتاً چھوٹے قد کا ریڈ انڈین کار سے باہر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیگ کھولا اور رقم چیک کی، پھر اس نے ایک کاغذ کے تھیلے میں وہ نوٹ ڈالے اور مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے وہ تھیلا لے کر کار میں بیٹھ گیا۔

''جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔'' وائٹ ونگ بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں ان لڑکیوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ کار کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

''ان لڑکیوں نے جوائے سے تمہاری رقم حاصل کی جو تم تک پہنچ گئی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''انہیں کچھ انعام ملنا چاہیے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھ پر پستول تان کر کچھ حاصل کر سکو گے۔'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

میں نے فوراً ہی اپنا پستول جیب میں رکھ لیا اور بولا۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہ رہا ہوں کہ تم ان لڑکیوں کی کچھ مدد کرو تاکہ یہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ ویسے بھی تمہیں ان پیسوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں، تم ویسے ہی بہت مال دار ہو۔''

''یہ رقم میری نہیں ہے مسٹر فوگی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ مجھے فلوریڈا کے ایک سینیٹر کو پہنچانی ہے تاکہ اس ڈیل کے نتیجے میں میرے خاندان والوں کا بھلا ہو جائے جو دلدلی علاقے میں فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر تم سڑک پر پڑے ہوئے بیگ کو کھول کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ برنارڈ نے ان لڑکیوں کے لیے کچھ پیسے چھوڑ دیے ہیں تاکہ یہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔''

یہ کہہ کر وہ فوراً ہی وہاں سے چل دیا۔ میں نے سڑک پر پڑا ہوا بیگ اٹھایا۔ اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں دو سو ڈالر رکھے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں یہ رقم ایوا اور لنڈا کے سفری اخراجات اور دیگر ضروریات کے لیے کافی تھی۔ میں نے سوچا کہ ان لڑکیوں کو شکاگو جانے دوں یا نہیں پھر خیال آیا کہ ان کے حق میں وہاں جانا ہی بہتر ہوگا۔

☆☆☆

دوسرے روز شام کے وقت میں میری کے بار میں گیا تاکہ کریپی کو بتا سکوں کہ اس کی بیٹی خیریت سے ہے۔ وہ منگل کا روز تھا اور وہاں تقریباً ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں بار کاؤنٹر کے ساتھ ہی ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ میری نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''تم ابھی تک وہی سوٹ پہنے ہوئے ہو؟''

''گھر جانے کا موقع ہی نہیں ملا کہ لباس تبدیل

کرتا۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’کربچی کہاں ہے۔ اس کے لیے میرے پاس خبر ہے۔‘‘

’’وہ کچن میں ہوگا۔‘‘ میری بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ’’لیکن اگر تمہیں خبر چاہیے تو یہ دیکھو، ہمارے سیاست داں کیا کررہے ہیں؟‘‘

یہ کہہ کر اس نے اخبار میری جانب اچھال دیا۔ صفحہ اول پر نمایاں سرخی تھی۔ ’’سینیٹر لوئس پر رشوت لینے کا الزام۔‘‘ تفصیل کے مطابق ایک معزز شہری ڈیوڈ وائٹ ونگ نے الزام لگایا ہے کہ سینیٹر نے اس سے ولدنی علاقے میں تیل نکالنے کے حقوق کے عوض رشوت طلب کی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے حکام کو ثبوت بھی فراہم کردیے۔ اسی اخبار کے صفحہ نمبر نو پر ایک اور چھوٹی سی خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایک گمنام شخص نے سی نول قبیلہ کی کونسل کو ایک بھاری رقم عطیہ کے طور پر دی ہے تاکہ اسے ولدنی علاقے میں رہنے والے اس قبیلے کے لوگوں میں تقسیم کردیا جائے۔

’’تم اس بارے میں کیا جانتی ہو؟‘‘ میں نے میری سے پوچھا۔

’’اس سے زیادہ کچھ نہیں جو اخبار میں لکھا ہے۔‘‘ اس نے مجھے مارٹینی کا گلاس دیتے ہوئے کہا پھر کچن کی طرف منہ کرکے آواز لگائی۔ ’’اونو۔‘‘

کربچی کچن کے دروازے پر نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے پُرجوش آواز میں بولا۔ ’’ٹونی۔‘‘

’’تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے اسے ساری تفصیل بتادی۔

’’تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔‘‘ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’وہ مردود جوائے ٹیکس کسی امیر شخص وائٹ ونگ کے لیے کام کررہا تھا۔‘‘

’’تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’مجھے پولیس والوں نے بتایا تھا۔ جوائے پکا جواری تھا۔ اسی نے وائٹ ونگ کی رقم چرائی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بیگ میں کتنے پیسے ہیں۔ پولیس والوں کا خیال ہے کہ وائٹ ونگ کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اگر لنڈا کو اغوا کرلیا جائے تو اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرکے وہ رقم حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ جوائے، لنڈا کی خبرگیری کے لیے اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔‘‘

’’اسے لنڈا کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے۔‘‘ میری بولی۔ ’’وہ اپنی دوست انیوا کے ہمراہ اشنا گو پہنچ گئی ہے۔‘‘

’’تم جانتے ہو۔ یہ وہی لڑکی ہے جس کا میں نے تمہیں نمبر دیا تھا۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو میری بولی۔ ’’وہ دونوں وہاں انیوا کے سوتیلے ماموں کے پاس ہیں جن کی کتابوں کی دکان ہے۔‘‘

اونو کے چہرے کی مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے غائب ہوگئی اور وہ بولا۔ ’’مجھے اپنی بچی بہت یاد آرہی ہے۔‘‘

’’تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، کم از کم وہ اپنی ماں کے پاس نہیں ہے۔‘‘

’’پھر بھی میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی دوسری جگہ رہے۔‘‘ اونو منہ بناتے ہوئے بولا۔

’’اسے پوری بات بتاؤ اونو۔‘‘ میری نے کہا۔

’’ہاں، یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا۔‘‘ اونو کربچی پُرجوش لہجے میں بولا۔ ’’جس رات جوائے کو گولی لگی، وہ پوری طرح نشے میں تھا۔ اس نے میری سابقہ بیوی سے پیسوں کے لیے لڑائی کی۔ لنڈا نے ان کی باتیں سن لیں اور وہ رقم کا بیگ لے کر گھر سے باہر چلی گئی۔ غالباً جوائے چوری کا مال میری بیوی کے پاس رکھوانے آیا تھا۔‘‘

اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ جب جوائے کو گولی لگی تو وہ قصبے سے باہر جانے کے لیے نکل چکی تھی۔ جوائے کو کسی رائفل سے نشانہ بنایا گیا۔ لنڈا نے اسے قتل نہیں کیا۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ میری سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولی۔ ’’لنڈا نے ایسا نہیں کیا۔‘‘

وہ دونوں بہت خوش نظر آرہے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ انہیں اپنی جیب میں رکھی ہوئی رپورٹ دکھاتا۔ میرے دوست ایبرٹ نے بالآخر جوائے کی پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ کی نقل حاصل کرلی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ جوائے ٹیکس پر پہلا فائر ایک چھوٹے ریوالور سے ہوا جس کے بعد اسے رائفل سے نشانہ بنایا گیا۔ اس کی موت گولی لگنے سے واقع ہوئی لیکن رپورٹ میں یہ واضح نہیں تھا کہ وہ گولی کس ہتھیار سے چلائی گئی تھی۔ یہاں بھی وائٹ ونگ کی دولت کام آئی جس کی چمک سے متاثر ہوکر پولیس والوں نے اصل رپورٹ دبادی۔ اس طرح وائٹ ونگ اپنے آدمیوں کو بچانے میں کامیاب ہوگیا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا فائدہ لنڈا کو بھی ہوسکتا ہے۔

▲▲

وہ تینوں مضبوط جسامت والے گھوڑوں پر سوار تھے۔ گھوڑوں کی تھکی چال اور ان کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت طویل سفر کر کے آ رہے ہیں اور ان کا سفر ابھی تمام نہیں ہوا کیونکہ وہ ابھی صحرا اور پہاڑوں کے وسط میں تھے۔ ان کے گھوڑوں پر کئی تھیلے لدے ہوئے تھے۔ شاید وہ تینوں سے مال تجارت لے کر آ رہے تھے۔ ایک طویل مسافت کے بعد وہ زیزا نامی اس بستی تک پہنچے تھے جو اب [illegible] تھے۔ اس صحرائی بستی میں زیادہ تر مکان کچی مٹی اور گھاس کی چھتوں والے تھے۔ بستی کے وسط میں بے شمار خیمے بھی تھے۔ وہ اس کے بیرونی حصے میں رکے۔ گاسپر نے تھکے ہوئے انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ہم یہاں قیام کریں گے۔ ہمارے گھوڑوں کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔“

”گھوڑے تھکے ہوئے ہیں۔“ میسٹر نے اس سے اتفاق کیا۔ ”اور انسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ظاہر ہے، ہم بھی تھکے ہوئے ہیں۔“ گاسپر نے اعتراف کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہاں ہم محفوظ رہیں گے۔“

”ہاں، ہم محفوظ رہیں گے۔“ اس بار بالتھر نے اتفاق کیا۔ ”لیکن سونے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ سونا محفوظ ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ہمارے پاس سونا ہے۔“ گاسپر نے جواب دیا اور مغرب کے کنارے تک پہنچ جانے والے سورج کی طرف دیکھا۔

سورج کی طرف دیکھنے کے لیے اس نے آنکھوں کے سامنے چھجا بنایا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد رات ہو جائے گی۔ دور سامنے دور تک صحرا پھیلا ہوا تھا جس میں مزید کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ بستی کے آغاز میں ایک اصطبل تھا جہاں باہر سے آنے والے مسافروں کے گھوڑے رکھے جاتے تھے۔ ایک نوجوان اصطبل سے باہر آیا اور ان کے گھوڑے دیکھے۔ وہ مضبوط اور سخت جان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”زیزا میں خوش آمدید... کیا تم لوگ کہیں دور سے آ رہے ہو؟“

”پورے ایک مہینے کی مسافت سے۔“ گاسپر نے اپنی مخصوص دیہاتی زبان میں کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟“

”مجھے راموتھ کہتے ہیں سر۔“

”تمہارے لیے ایک سونے کا سکہ ہوگا راموتھ... ہمارے گھوڑوں کو خوب اچھی طرح کھلاؤ پلاؤ اور ان کی دیکھ بھال کرو تاکہ یہ ایک اور طویل سفر کے لیے تیار ہو جائیں۔“

”تم کس طرف سفر کر رہے ہو؟“

”مغرب کی طرف۔“ گاسپر نے جواب دیا لیکن وہ ہچکچایا۔

جب نوجوان ان کے گھوڑے لے گیا تو بالتھر نے اس سے کہا۔ ”میں خوش نہیں ہوں گاسپر! تم نے اس لڑکے کو سمت بتا دی۔ ٹھیک ہے تم ہمارے راہنما ہو لیکن اس سونے

میمونہ عزیز

وارداتیں کرنے والے نوجوان کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ ان کی آخری واردات بھی ہوسکتی ہے... پرانے ماحول میں رچی بسی کہانی جس کے کردار نڈر ہونے کے ساتھ سفاک بھی تھے...

مغرب سے منجھے ہوئے مصنف کی
سوغات... دلیری و ہمت کا مظاہرہ

کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں رکنے کے بجائے رات کو سفر کرنا چاہیے۔''

لیکن گاسپر مزید سفر کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ ''میرے دوست! صحرا رات کو بہت سرد ہو جاتا ہے۔ ہمیں صبح ہونے تک یہیں رکنا چاہیے۔''

اس سفر میں گاسپر ان کا سربراہ تھا اور اس کا فیصلہ حتمی مانا جاتا تھا اس لیے جب اس نے فیصلہ سنا دیا تو میلشر اور بالتھزر نے اسے تسلیم کر لیا۔ وہ سامان لے کر اس میدان کی طرف چلے گئے جو آنے والے مسافروں کے لیے مخصوص تھا اور وہ وہاں اپنے خیمے لگا سکتے تھے۔ وہ چلے گئے تو گاسپر خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔ یہ بہت طویل سفر تھا اور ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ گاسپر نے زندگی میں کبھی اتنا طویل سفر نہیں کیا تھا۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ وہ اب تک محفوظ تھے، انہیں کسی نے لوٹنے اور قتل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے سفر کا کچھ حصہ باقی تھا۔

اس بستی کے مکانات بتا رہے تھے کہ اس کے باسی اصل میں خانہ بدوش ہیں اور ان کو جہاں پانی مل جائے، وہ وہاں قیام کر لیتے تھے اور وہ اس وقت تک قیام کرتے تھے جب تک پانی میسر ہوتا۔ وہ ابھی اس بستی کا معائنہ کر رہا تھا کہ ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے مخصوص صحرائی لباس پہن رکھا تھا اور کمر سے تلوار باندھ رکھی تھی۔ ''خوش آمدید مسافر۔'' اس نے کہا۔ ''میں نیوار ہوں۔ میرا تعلق شمالی قبائل سے ہے۔''

''میرا نام گاسپر ہے اور میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ مشرق کی طرف سے آیا ہوں۔''

''اوہ، تب یہ یقیناً بہت طویل سفر ہوگا کیونکہ مشرق کی طرف دو ہفتے کی مسافت تک کوئی بستی نہیں ہے۔''

''ہاں لیکن ہماری منزل مغرب میں ہے۔''

''کیا تم نے پہلے اس راستے پر سفر کیا ہے؟''

''نہیں، یہ پہلا موقع ہے۔'' گاسپر نے سادگی سے جواب دیا۔ ''ہم پورے ایک مہینے بعد کسی بستی میں رکے ہیں۔''

نیوار نے اپنی ۔۔۔ داڑھی کو تھپتھپایا اور بولا۔ ''تب تو تمہیں یہاں ہونے والی تفریح میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔''

''کیسی تفریح؟''

''جب اندھیرا ہوگا تو یہاں کنوئیں کے ساتھ والے میدان میں کھیل تماشے ہوں گے۔ تم چاہو تو کھیل میں حصہ لے سکتے ہو۔'' اس کا انداز ترغیب دینے والا تھا۔

''مجھے اور میرے ساتھیوں کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' گاسپر نے جواب دیا۔

''تم ایک بار حصہ لے کر تو دیکھو۔'' نیوار نے اصرار کیا۔ ''یہاں راتوں میں آگ روشن کی جاتی ہے اور اس کے آس پاس کھیل ہوتے ہیں۔''

گاسپر نے ایک لمحے اس شخص کی پیش کش پر غور کیا۔ وہ جس طرح اچانک نمودار ہوا تھا، اسی طرح اچانک واپس چلا گیا۔ گاسپر کنوئیں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے کنارے اینٹوں سے بلند کیے گئے تھے اور چاروں طرف پکا چبوترا تھا۔ کنوئیں کو لکڑی کے گول بنے ہوئے تختوں سے بند کیا گیا تھا تاکہ کنوئیں میں ریت نہ جا سکے۔ اس کے اوپر چرخی اور رسی لگی تھی۔ رسی حرکت کر رہی تھی جیسے ابھی کسی نے کنوئیں سے پانی نکالا ہو۔ پانی کی مہک بتا رہی تھی کہ کنوئیں میں صاف ستھرا اور میٹھا پانی ہے۔

گاسپر نے دوسری طرف دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکی اپنے نازک شانوں پر مٹی سے بنا ایک بھاری مرتبان اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاسپر نے سورج کی ڈوبتی روشنی میں دیکھا، لڑکی کے رخسار جیسے آٹے کو دودھ اور شہد سے گوندھ کر بنائے گئے تھے اور اس کے سرخی مائل بال اس کی اوڑھنی سے جھانک رہے تھے۔ لڑکی نے مقامی طرز کا ڈھیلا لباس پہن رکھا تھا لیکن اس میں بھی اس کی نازک بدنی نمایاں تھی۔ بہت مہک نقوش کے ساتھ وہ صحرائی حسن کا شاہکار تھی۔ اسے دیکھ کر گاسپر ساکت رہ گیا۔ لڑکی کو اس کی موجودگی کا احساس ذرا دیر سے ہوا۔ اس نے گاسپر کو دیکھا تو ڈر کر اچھل پڑی۔ اس کے ہاتھ سے مرتبان چھوٹا اور نیچے پتھروں پر گر کر ٹوٹ گیا۔ مرتبان کا پانی اچھل کر لڑکی پر آیا اور اس کا لباس بھیگ گیا۔ مرتبان کا حشر دیکھ کر وہ روہانسی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''ننھی خاتون۔'' گاسپر نے اسے تسلی دی۔ ''مرتبان ٹوٹ گیا تو کوئی بات نہیں۔''

لڑکی نے اپنی بڑی براؤن آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کا خوف زدہ تاثر بتا رہا تھا کہ وہ اسے اجنبی جان کر ڈر گئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''مجھ سے مرتبان ٹوٹ گیا ہے، اب میرا باپ مجھے مارے گا۔''

''اس کے لیے سونے کا ایک سکہ ہے۔'' گاسپر نے ایک سونے کا سکہ نکال کر اسے تھما دیا۔ ''اپنے باپ کو بتا دینا کہ گاسپر نام کا ایک اجنبی تم سے ٹکرا گیا تھا اور اس نے جار توڑ دیا۔''

''یہ سچ نہیں ہے۔''

''لیکن یہ تو سچ ہے کہ میں گاسپر ہوں۔ ننھی خاتون! تم

کون ہو؟"

"تھینشا۔" اس نے اپنا نام بتایا۔ "میں نیوار کی بیٹی ہوں۔"

"میں ابھی تمہارے باپ سے ملا ہوں اور تم بہت پیاری سی لڑکی ہو۔" گاسپر نے اسے تسلی دینے کے انداز میں کہا لیکن اس کے الفاظ نے تھینشا کو ڈرا دیا اور وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ گاسپر کنوئیں سے واپس آیا تو میلشر سرائے کے صحن میں اپنا خیمہ کھڑا کر چکا تھا اور اس وقت ایک پتھر سے ٹیک لگائے آرام کر رہا تھا۔ ان کا سامان اور گھوڑے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ گاسپر نے جلدی سے پوچھا۔

"سونا کہاں ہے؟"

"وہ محفوظ ہے۔" بالتھر نے جواب دیا۔ "وہ گھوڑوں کی خوراک کے بیجوں والے تھیلے کی گہرائی میں رکھا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، خوشبو اور دوسری چیزیں کہاں ہیں؟"

"خیمے میں ہمارے رسد کے سامان کے ساتھ ہیں۔ کوئی انہیں چرا نہیں سکتا۔"

میلشر بولا۔ "اگر کسی نے اسے چھیڑا تو اس کی خوشبو فوراً ہمیں خبردار کر دے گی۔"

بالتھر نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ کنوئیں کے پاس کوئی کھیل ہونے والا ہے؟"

بالتھر کھیلوں کا شوقین تھا، خاص طور سے ان کھیلوں کا جن میں رقم لگائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس سفر کے دوران اسے اپنا شوق پورا کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جب اس نے سنا کہ یہاں رات کو کھیل ہوتے ہیں تو وہ بے تاب ہو گیا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" گاسپر نے جواب دیا۔ "لیکن وہ ہمارے لیے نہیں ہے۔"

بالتھر نے معصومیت سے کہا۔ "ہم اس میں حصہ نہیں لے سکتے لیکن اسے دیکھ تو سکتے ہیں؟"

گاسپر نے رضامندی ظاہر کی۔ "ٹھیک ہے۔"

سورج ڈوبنے والا تھا۔ انہوں نے خیمے میں اپنا سامان ترتیب سے رکھا۔ گاسپر نے مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ روشن کر لیا تھا۔ سارے کام نمٹا کر وہ آرام کرنے لگے۔ گاسپر سو جانا چاہتا تھا لیکن وہ میلشر اور خاص طور سے بالتھر کی وجہ سے جاگتا رہا۔ سورج غروب ہو گیا۔ رات پوری طرح چھا گئی اور زیزا کے لوگ اپنے جھونپڑوں اور خیموں سے نکل کر کنوئیں کے قریب میدان میں جمع ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ ساز بھی بجا رہے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر بالتھر اور میلشر بے تاب ہو گئے۔ اس لیے گاسپر کو بھی اٹھنا پڑا اور وہ تینوں بھی مقامی لوگوں میں شامل ہو گئے۔

گاسپر اور میلشر قریب بیٹھے تھے لیکن بالتھر ان سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا تھا۔ اس وقت گاسپر نے توجہ نہیں دی تھی۔ میدان کے وسط میں ایک بڑا سا الاؤ جلا دیا گیا تھا۔ رات ہوتے ہی صحرا کی جانب سے تیز ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی اس لیے الاؤ سے اٹھنے والی حرارت اچھی لگ رہی تھی۔ وہاں جمع ہونے والے نوجوانوں کی ایک ٹولی بانسری جیسا ساز بجا رہی تھی اور ایک شخص دونوں پیروں کے درمیان چھوٹا سا ڈھول رکھ کر اسے ایک خاص ڈھنگ سے بجا رہا تھا۔ محفل رفتہ رفتہ گرم ہوتی جا رہی تھی۔ گاسپر نے دیکھا کہ اس محفل میں عورتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یعنی یہ لوگ اپنی عورتوں کو باہر لانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مرد اپنی اپنی پسند کے مشروب لائے تھے اور آپس میں بات کرتے ہوئے انہیں نوش کر رہے تھے۔

گاسپر نے جو کی شراب بیچنے والے سے ایک کٹورا لیا۔ تب اس نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جس کی جلد پر جھریاں پڑی تھیں اور اس کے دانت گر چکے تھے لیکن اپنے طویل قد اور باوقار نقوش کی وجہ سے وہ کوئی معزز شخص لگ رہا تھا۔ گاسپر کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے تعارف کرایا۔ "مجھے ڈیبون کہتے ہیں۔" وہ گاسپر کے برابر میں بیٹھا تھا پھر دوسروں کی طرح اس نے بھی وہی سوال کیا۔ "تم مشرق کی طرف سے آئے ہو؟"

"ہاں، پارس سے۔"

بوڑھا ڈیبون حیران ہوا۔ "یہ تو طویل سفر ہے آخر تم نے اتنا طویل سفر کیوں کیا؟"

گاسپر اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "بالکل صحرا کے وسط میں تم لوگ کس طرح آباد ہو؟"

"ہم صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔" ڈیبون نے ہاتھ سے بستی کی طرف اشارہ کیا۔ "تم نے دیکھا ہوگا، یہ جگہ چاروں طرف سے نیچے ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو ہر طرف کا پانی اس بستی کی طرف آتا ہے اور ہمارے کنوئیں کبھی خشک نہیں ہوتے۔"

"کیا ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا؟"

بوڑھے ڈیبون نے سر ہلایا۔ "ایک بار ایسا ہوا تھا، یہ بہت پرانی بات ہے۔ کم سے کم بھی تین صدی پرانی۔ اس علاقے میں برسوں بارش نہیں ہوئی تھی، تب ہمارے کنوئیں خشک ہو گئے اور ہمیں یہاں سے جانا پڑا تھا۔ لیکن چند سال بعد ہمارے آباؤ اجداد واپس لوٹ آئے تھے۔ اس کے بعد

سے ہمیں یہاں سے کبھی نہیں جانا پڑا۔"

"تمہارا روزگار کیا ہے؟"

"ہمارا بنیادی کام مویشی چرانا ہے۔ لیکن ہم یہاں سے گزرنے والے قافلوں کی خدمت کرکے بھی کماتے ہیں۔"

اسی لمحے گاسپر ایک گروہ کی طرف متوجہ ہوا جو زمین کے ایک صاف ستھرے ٹکڑے پر چھوٹے، صاف اور چکنے پتھر سے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ گاسپر نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کس قسم کا کھیل کھیل رہے ہیں؟"

"دوسری بہت ساری چیزوں کی طرح ہم نے یہ کھیل بھی مصریوں سے سیکھا ہے۔" بوڑھا آدمی اس کی طرف جھکا اور قریب آگیا۔ "کچھ لوگ اسے ماگس کہتے ہیں۔"

"میں نے مصری کھیلوں کو دیکھا ہے۔ لیکن اتنی بات ہے، ماگس میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

بوڑھا ذیبون ہنسا۔ "اس کا مطلب ہے تمہیں جوئے کے کھیلوں سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"مجھے سچائی سے زیادہ دلچسپی ہے۔" گاسپر نے جواب دیا۔

"سچائی صرف ایک احساس کا نام ہے۔" ذیبون نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "بعض اوقات سچائی اس طرح نہیں ہوتی جس طرح ہم اسے محسوس کررہے ہوتے ہیں۔"

اسی وقت گاسپر نے محسوس کیا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا تو سامنے نیوار تن کر کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گاسپر کی طرف اشارہ کررہا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ اس کی کمر سے بندھی تلوار کے دستے پر تھا۔ اس نے کڑے لہجے میں کہا۔ "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں گاسپر۔"

گاسپر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ میری بیٹی تھمینشا کا ہے۔ وہ کنواری ہے اور بیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ تم نے آج اسے کنوئیں کے پاس ایک سونے کا سکہ دیا ہے؟" نیوار کا لہجہ الزام دینے والا تھا۔

"ہاں دیا ہے۔" گاسپر نے بے پروائی سے کہا۔ "کیونکہ میرا خیال ہے اس سے ٹوٹنے والے پانی کے برتن کا ذمے دار میں تھا اور میں نے اس کی تلافی کے لیے اسے سکہ دیا۔"

گاسپر کا جواب مطمئن کرنے والا تھا لیکن نیوار مطمئن نہیں ہوا۔ "کوئی اجنبی تھمینشا سے نہیں مل سکتا۔ تمہیں آج کی رات ہی زیزا چھوڑنا ہوگا۔"

"ہم صبح چلے جائیں گے۔" گاسپر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

یہ سنتے ہی نیوار نے اپنی تلوار کھینچ لی۔ گاسپر نہتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس لباس میں کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار تھا، تب بھی اسے نکالنے کا موقع نہیں تھا۔ لیکن وہ نیوار سے کہیں زیادہ مضبوط اور چست ضرور تھا۔ اس سے پہلے کہ نیوار اس پر وار کرتا، اس نے آگے بڑھ کر اس کا تلوار والا ہاتھ گرفت میں لے لیا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہے تھے۔ نیوار نے کوشش کی کہ اپنا ہاتھ چھڑا سکے۔ گاسپر نے اس کی کوشش ناکام بنادی اور اس کی تلوار چھین کر ایک طرف پھینک دی۔ نیوار آپے سے باہر ہوگیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاسپر کو قتل کردے۔ لوگ ان کے گرد کھڑے ہوگئے تھے مگر کسی نے مداخلت نہیں کی۔ نیوار اپنی تلوار تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن درمیان میں گاسپر موجود تھا۔ نیوار جان گیا تھا کہ وہ زور آزمائی میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے باوجود وہ لڑائی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اچانک مجمع کو چیرتی تھمینشا وہاں آئی اور اس نے چلا کر اپنے باپ سے کہا۔ "اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اسے کچھ مت کہو۔"

"تم خاموش رہو۔" نیوار گرجا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی تلوار حاصل نہیں کرسکے گا تو اس نے لپک کر جلتی آگ سے ایک لکڑی اٹھا کر گاسپر کی طرف اچھالی۔ لیکن وہ غلطی سے کہیں اور جا گری۔ فوراً ہی ایک جھونپڑے کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کوئی چلایا۔

"اصطبل... میں آگ لگ گئی ہے۔"

یہ سنتے ہی گاسپر فکرمند ہوگیا کیونکہ ان کے گھوڑے بھی اصطبل میں تھے۔ پھر اس نے دیکھا کہ راموتھ گھوڑوں کو بچانے کے لیے بھاگا تھا اور دیگر لوگ کنوئیں سے پانی نکال نکال کر آگ پر ڈالنے لگے۔ راموتھ گھوڑوں کو باہر لے آیا، وہ محفوظ رہے۔ صحرا کی طرف سے چلتی تیز ہوا آگ کے شعلوں کو بھڑکا رہی تھی اور جب تک زیزا کے لوگ آگ بجھاتے، اصطبل میں موجود اچھی خاصی خوراک اور دوسرا سامان جل کر تباہ ہوگیا تھا۔ اس حادثے کی وجہ سے کچھ دیر کے لیے افراتفری مچی تھی لیکن جب آگ بجھ گئی تو رفتہ رفتہ سب معمول پر آنے لگا۔ ساز بجانے والے اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے تھے اور پتھروں سے جو کھیلنے والے بھی اپنی ٹولیوں میں آگئے تھے۔ افراتفری میں جو ہار رہے تھے، وہ موقع سے

فائدہ اٹھا کر رقم دیے بغیر فرار ہوگئے تھے اور اب ان کا اصرار تھا کہ کھیل دوبارہ سے شروع ہوگا۔ اس پر پھر جھگڑے ہوئے لیکن تصفیہ کرانے والوں نے صلح کرادی اور کھیل نئے سرے سے آغاز ہوگیا۔

کاسپر اپنے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا۔ حادثے کے بعد وہ اسے نظر نہیں آئے تھے۔ وہ ہجوم میں ان کو تلاش کررہا تھا۔ بالآخر اسے میلشر مل گیا۔ وہ ڈیبون کے پاس بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈیبون نے نیوار کے رویے پر معذرت کی۔ "نیوار ایک خودپسند شخص ہے۔ ورا سے یہاں کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔"

"میرا خیال ہے وہ غصے کا تیز ہے۔" کاسپر نے نرمی سے کہا۔ "بہرحال، میرا اب اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں کچھ دیر پہلے ہونے والا واقعہ بھول چکا ہوں۔"

ڈیبون خوش ہوگیا۔ "کاسپر! تم درحقیقت ایک اچھے آدمی ہو۔"

کاسپر، میلشر کو ایک طرف لے گیا اور پوچھا۔ "تم نے بالتھر کو دیکھا ہے؟"

"نہیں، ہنگامے سے پہلے میں نے اسے دیکھا تھا لیکن ہنگامے کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔"

"ہمیں اس کو تلاش کرنا ہوگا۔" کاسپر فکرمند ہوگیا۔ "کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گیا ہو۔ ہم اس بستی میں پہلی بار آئے ہیں اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

میلشر نے کہا۔ "اگر وہ کسی مشکل میں پڑا ہے تو اس کا ذمے دار بھی وہ خود ہی ہے کیونکہ اسے کوئی زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔"

کاسپر جانتا تھا کہ میلشر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کوئی بالتھر کو زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا لیکن اسے تلاش تو کرنا تھا۔ وہ دونوں اس کی تلاش میں نکلے۔ وہ جھونپڑوں اور خیموں کے درمیان اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کاسپر سامنے آنے والے ہر شخص سے بالتھر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ بالآخر ایک شخص نے ان کی مدد کی اور بالتھر انہیں خیموں کی ایک قطار کے عقب میں مقامی سواروں کے ساتھ پتھروں والا مصری کھیل کھیلتا ہوا مل گیا۔ وہ کھیل میں پوری طرح شامل تھا اور اس کے سامنے سونے کا ایک سکہ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والے تمام مقامی نوجوان تھے۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" کاسپر گرج کر بولا۔ تو بالتھر کے ساتھ کھیلنے والے تمام نوجوان اٹھ کر فرار ہوگئے۔ صرف بالتھر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک قسم کا کھیل ہے۔"

"ہمارا مقصد کسی بھی کھیل سے زیادہ اہم ہے۔" کاسپر نے اسے گھورا۔ "تم اس وقت کہاں تھے جب نیوار نے مجھے تقریباً قتل کردیا تھا۔"

"وہ مشکل پسند آدمی لگتا ہے۔" بالتھر نے اپنی داڑھی کھجائی۔ "میں اس سفر میں اس وقت تک اطمینان محسوس نہیں کروں گا جب تک ہمارے عقب میں زیزار ہے گا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکے گا اس لیے میں سکون سے بیٹھا رہا۔"

"ہمیں اپنے خیموں کی طرف جانا چاہیے جہاں ہمارا سونا موجود ہے۔" کاسپر نے کہا۔

"ہاں، ہم زیادہ دیر خیمے کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔" میلشر بھی بولا تو بالتھر کو مجبوراً ان سے اتفاق کرنا پڑا۔ اسے بہت عرصے بعد کھیلنے کا موقع ملا تھا اور اس کا دل ابھی کھیل میں اٹکا ہوا تھا۔ کاسپر نے اس سے کہا۔ "جب ہم کامیاب واپس پہنچ جائیں گے تو یقیناً تمہیں کھیلنے کے لیے بہت وقت اور رقم ملے گی۔"

میلشر ہنسنے لگا۔ "تب تک صبر کرو دوست۔"

وہ چلتے ہوئے اصطبل کے پاس سے گزرے۔ اس کی عمارت مکمل طور پر جل گئی تھی اور مٹی کی دیواریں تک سیاہ ہوگئی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے دوبارہ تعمیر کرنا پڑے گا۔ راموتھ نے ان کے گھوڑے لے جاکر کہیں اور باندھ دیے تھے۔ میلشر نے کاسپر سے کہا۔ "ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔ ایک رات میں اتنے واقعات کافی ہیں۔"

"بالکل۔" خلافِ توقع بالتھر نے میلشر کی حمایت کی۔

"ایسا ہی ہوگا۔ ہمیں ایک رات سے زیادہ رکنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

وہ چلتے ہوئے اصطبل کے پاس سے ہوکر اپنے خیموں کی طرف جارہے تھے۔ بوڑھا ڈیبون انہیں راستے میں مل گیا۔ انہیں دیکھ کر وہ پاس آیا اور اس نے کاسپر سے کہا۔ "جو ہوا یہ تمہارا اور نیوار کا قصور ہے۔ اس کی سزا بستی والوں کو کیوں ملے۔ اصطبل ان کی روزی کا ذریعہ ہے۔"

کاسپر نے سوچا اور سر ہلایا۔ "یہ درست ہے معزز ڈیبون! میں کل یہیں رکوں گا اور اس اصطبل کو دوبارہ تعمیر کروں گا۔"

ڈیون نے احتراماً اپنا سر جھکایا اور خوش ہو کر بولا۔

''یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

گاسپر نے کہا۔ ''اصل قصور وار تو نیوار ہے۔ اسے کیا کرنا ہوگا؟''

ڈیون نے اپنا لبادہ درست کیا اور بولا۔ ''وہ اصطبل کی دوبارہ تعمیر کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔''

''یہ بہتر ہوگا۔'' گاسپر نے کہا۔ بوڑھا ڈیون اس کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ بانتھر اور میلشر اس وقت خاموش رہے تھے لیکن بوڑھے کے جانے کے بعد بانتھر نے کہا۔

''اگر کل ہم یہاں رکے تو پورے ایک دن تاخیر ہو جائے گی۔''

گاسپر نے تجویز دی۔ ''ہم رات میں سفر کر کے دن کی تلافی کرلیں گے اور رات کے سفر کی تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔''

ان کا خیال تھا کہ آج کے لیے واقعات کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن ابھی ان کے لیے ایک غیر متوقع واقعہ موجود تھا۔ میلشر نے خیمے کا پردہ ہٹایا اور وہیں منجمد ہوگیا۔ گاسپر نے اسے عقب سے دھکا دیا تو وہ اندر گیا اور تب گاسپر نے مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ کی روشنی میں دیکھا۔ نیوار کی لڑکی تھمینشا ان کے خیمے میں تھیلوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاسپر نے اس سے کہا۔ ''ننھی خاتون! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارا باپ مجھے قتل کر دے یا خود میرے ہاتھوں مارا جائے۔''

''مجھے یہیں رہنے دو۔'' اس نے التجا کی۔ ''مجھے چھپا لو ورنہ میرا باپ مجھے مار دے گا۔ اس نے ابھی بھی مجھے بہت مارا ہے۔ مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے۔''

''خطرہ تو ہمارے لیے ہے اگر اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا۔'' میلشر بولا۔ ''لڑکی! تم یہاں سے چلی جاؤ اس سے پہلے کہ تمہارا باپ تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں آ جائے۔''

''ذرا رکنا۔'' گاسپر نے میلشر سے کہا اور لیمپ لڑکی کے قریب کیا۔ اس کے چہرے اور بازوؤں پر مار کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ ''اس کے باپ نے سچ مچ اسے مارا ہے۔''

''یہ یہاں نہیں رہ سکتی۔'' میلشر نے سختی سے کہا اور تھمینشا کا بازو پکڑا تو وہ سسک کر رونے لگی۔ اس نے مچل کر کہا۔

''اگر میرے باپ کو معلوم ہوگیا کہ میں پناہ کے لیے تمہارے پاس آئی ہوں تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' گاسپر نے میلشر سے کہا۔ لڑکی کو روتا دیکھ کر وہ بھی نرم پڑ گیا اور اس نے لڑکی کا بازو چھوڑ دیا۔ گاسپر نے تھمینشا کو تسلی دی۔ ''ٹھیک ہے، ہم تمہیں واپس نہیں بھیج رہے۔''

''لیکن ہم اسے یہاں بھی نہیں رکھ سکتے۔'' بانتھر تشویش سے بولا۔ ''اگر اس کا باپ اسے تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا تو ہم اسے کہیں چھپا بھی نہیں سکتے۔''

''اگر یہ ہمارے خیمے سے مل گئی تو تم سوچ سکتے ہو ہم کتنی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔'' میلشر نے کہا۔

''لیکن ہم اسے یہاں سے دھکے دے کر نکال بھی نہیں سکتے۔'' گاسپر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

اس کے جانے کا سن کر تھمینشا سہم گئی۔ اس نے جلدی سے گاسپر کا بازو پکڑ لیا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

گاسپر نے اسے تسلی دی۔ ''تم یہاں میلشر اور بانتھر کے ساتھ رکو، میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

گاسپر بوڑھے ڈیون کو تلاش کرتا ہوا اس کے پاس گیا اور اسے بتایا۔ ''اپنے باپ کی مار سے ڈر کر تھمینشا ہمارے خیمے میں چھپ گئی تھی، وہ اب بھی وہیں ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟''

''شکر ہے وہ تمہارے پاس ہے، اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔'' بوڑھے ڈیون نے کہا۔ ''میری بیٹی اور اس کا شوہر تھمینشا کو اپنے پاس پناہ دینے پر راضی ہیں لیکن تھمینشا اس سے پہلے غائب ہوگئی۔ تم نے میرے پاس آ کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''

''تب میرے ساتھ چلو اور اسے اپنی تحویل میں لے لو اور یہ بھی دیکھ لو کہ ہم نے اسے چھوا تک نہیں ہے۔ اس کے چہرے اور بازوؤں پر مار کے نشانات ہیں لیکن یہ اس کے باپ کا کام ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' ڈیون نے کہا۔ ''نیوار کے بارے میں سب جانتے ہیں اور جب وہ اپنی بیٹی کو پیٹ رہا تھا تو بہت سارے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔''

گاسپر، ڈیون کو لے کر اپنے خیمے میں آیا جہاں تھمینشا موجود تھی۔ یوں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ گاسپر اور اس کے ساتھیوں نے تھمینشا کو ڈیون کے حوالے کر دیا اور وہ اسے اپنی بیٹی کے پاس لے گیا۔ جب وہ واپس خیمے میں آئے تو بانتھر نے ایک بار پھر اگلے دن یہاں رکنے کے ارادے سے اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اصطبل کی تباہی

میں کسی صورت ان کا ہاتھ نہیں ہے اس لیے اس کی دوبارہ تعمیر ان کی ذمے داری نہیں بنتی۔ جب کہ گاسپر کا کہنا تھا کہ کچھ نہ کچھ ذمے داری ان پر بھی آتی ہے اور ویسے بھی وہ بوڑھے ڈیجون کو زبان دے چکا ہے۔ بالتھر اور میلشر اس سے اختلاف رکھتے تھے۔ وہ کچھ دیر بحث کرتے رہے لیکن پھر انہیں نیند آگئی۔ صحرا کی طرف سے چلنے والی ہوا مزید سرد ہوگئی تھی لیکن ان کے آس پاس آگ جل رہی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ مدھم پڑتی چلی گئی۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو الاؤ میں انگارے اور راکھ باقی رہ گئی تھی۔ اگلی صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ گاسپر کو بالتھر نے ہلایا اور بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”گاسپر! اٹھ جاؤ، کسی نے ہمارا سونا چرالیا ہے۔“

گاسپر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے... کیا تم ابھی تک نیند میں ہو؟“

”نہیں۔“ بالتھر بے چارگی سے بولا۔ ”تم دیکھ سکتے ہو، بیجوں کا تھیلا کھلا ہوا ہے اور سونا غائب ہے۔“

میلشر ایک طرف ساکت بیٹھا تھا۔ اس کی کیفیت اس کے چہرے سے ظاہر تھی کیونکہ حفاظت کی ذمے داری اس کی بھی تھی۔ گاسپر جلدی سے اٹھا اور اس نے دیکھا کہ واقعی سونا غائب ہے۔ بیجوں والا چرمی تھیلا کھلا ہوا تھا اور اس میں صرف بیج تھے۔ خیمے میں ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ کوئی زبردستی داخل ہوا ہے اور ان کا باقی سامان بھی کسی نے نہیں چھوا تھا، گاسپر نے سوالیہ نظروں سے بالتھر کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

”جب ہم سو رہے تھے تو کوئی چور آیا اور سونا چرا کر لے گیا۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا۔“ میلشر بولا۔ ”ہم سو رہے تھے تو چور کس طرح خیمے میں داخل ہوا؟“

صبح سب سے پہلے میلشر اٹھا تھا اور اس نے سونا غائب پایا تھا پھر اس نے بالتھر کو اٹھایا اور اس نے گاسپر کو جگایا۔ ان تینوں کے لیٹنے کے بعد خیمے میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ کوئی باہر سے اندر آتا اور سونا نکال کر لے جاتا۔ گاسپر نے اس سے اتفاق کیا۔ ”ہماری موجودگی میں یہ ناممکن ہے۔ چور نے اس وقت اپنا کام دکھایا جب ہم یہاں نہیں تھے۔ کھیل دیکھنے گئے تھے یا پھر جب تھمنشا کو واپس کرنے گئے تھے۔ اس وقت چور نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور سونا لے کر فرار ہوگیا۔“

”خوشبوؤں اور دوسری چیزوں کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ بالتھر نے پوچھا۔ میلشر نے جواب دیا۔

”ان کو چھوا بھی نہیں گیا ہے۔“

”یعنی صرف سونا غائب ہے۔“ گاسپر نے اپنی داڑھی کھجائی۔

”بالکل... اور چور کو معلوم تھا کہ اسے سونا کہاں ملے گا۔“ میلشر بولا۔ ”اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں ہے۔ باقی ہر چیز ویسے ہی رکھی ہے جیسے پہلے رکھی تھی۔“

”یہ کام کون کرسکتا ہے؟“ گاسپر نے پوچھا۔

”نرگی۔“ اچانک بالتھر نے کہا۔ ”وہ یہاں تھی اور شاید سونا تلاش کرنے آئی تھی۔ اس نے سونا پالیا تھا۔“

”ممکن ہے۔“ گاسپر بولا۔ ”لیکن میں ذاتی طور پر اس بات پر یقین نہیں کرسکتا۔ وہ بچی معصوم لڑکی ہے۔“

”ہمیں آج روانہ بھی ہونا ہے۔“ بالتھر نے اسے یاد دلایا۔

”ہم زیزا سے نہیں جاسکتے جب تک ہمارا سونا نہ مل جائے۔“ میلشر بولا۔ ”اگر سونا نہیں ملا تو تم دونوں سمجھ سکتے ہو ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔“

”سکون سے میرے دوست! ہم اصطبل کی تعمیر کے دوران اس مسئلے کو بھی دیکھتے ہیں۔ ابھی ہمارے پاس بہت وقت ہے۔“ گاسپر نے کہا۔

بالتھر بھنی ہوئی مکئی اور چنے نکالنے لگا۔ انہوں نے اس سے ناشتا کیا اور خیمے سے نکل آئے۔ جب وہ اصطبل والی جگہ پہنچے تو وہاں پہلے سے ایک چھوٹا سا ہجوم جمع تھا۔ نیوار درمیان میں کھڑا تقریر کرنے کے انداز میں لوگوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے ان تینوں کو دیکھا تو ایک لمحے کو رکا اور پھر اپنی انگلی گاسپر کی طرف اٹھائی۔ ”تم نے میری بچی کو غائب کیا ہے۔ میں تم سے انتقام لوں گا۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو، تمہاری بچی محفوظ ہے۔“ گاسپر نے سکون سے کہا۔ ”ڈیجون اور اس کے خاندان کے پاس۔“

یہ سن کر نیوار خاموش ہوگیا جیسے اسے جواب نہیں سوجھ رہا ہو۔ میلشر نے آہستہ سے گاسپر سے کہا۔ ”اگر یہ اپنی بچی کے لیے اتنا ہی فکرمند تھا تو رات کو ہمارے پاس کیوں نہیں آیا؟“

میلشر کی بات قابل غور تھی۔ بالتھر نے کہا۔ ”یا ممکن ہے آیا ہو اور ہمارا سونا چرا کر لے گیا ہو۔“

”ہمیں مفروضات پر بات نہیں کرنی چاہیے جب تک کوئی واضح بات سامنے نہ آجائے۔“ گاسپر نے مشورہ دیا۔ ”اس سے ہمارا ذہن الجھ جائے گا اور ہم اس سے ٹھیک طرح سے کام نہیں لے سکیں گے۔“

وہ آہستہ بات کر رہے تھے اس لیے نیوار یا کسی اور

نے ان کی گفتگو نہیں سنی تھی۔ اس دوران میں بوڑھا ڈیمون آگیا۔ تھینیشا اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس نے باپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا۔ ڈیمون نے اعلان کیا۔ ”ہمارے مسافر مہمانوں نے خیر سگالی کے طور پر اصطبل کی تعمیر میں ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کی تعمیر کے تمام اخراجات نیوار برداشت کرے گا۔“

یہ سن کر وہاں موجود لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ ان میں راموتھ بھی شامل تھا۔ لیکن وہ تعمیر کے کام میں شامل نہیں تھا، اس کا اصل کام گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ گاسپر نے ڈیمون اور اس کے ساتھیوں کو پرشین تعمیراتی تکنیک سمجھائی۔ تعمیر کے لیے سامان آگیا تھا اور اس کی مدد سے اصطبل کی دوبارہ تعمیر شروع ہوگئی۔ نیوار وہاں موجود رہا لیکن گاسپر نے اسے نظر انداز کردیا تھا۔ وہ اس سے بات کرکے کوئی نیا تنازع کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جلد ہی انہوں نے اصطبل کی دیواریں اٹھا دیں اور اس پر چھت ڈالنے کا کام شروع کردیا۔ میلشر اور بالتھر بھی اس کام میں شریک رہے۔ کام کے دوران میں وقفہ آیا تو بالتھر پانی کے لیے کنوئیں کی طرف گیا۔ میلشر نے سرگوشی میں گاسپر سے کہا۔

”ممکن ہے سونا ہمارے ساتھی نے چرایا ہو۔ کل اسے پتھروں والے کھیل میں جو نقصان ہوا ہے، وہ اس طرح سے اس کی تلافی کرنا چاہتا ہو۔“

گاسپر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں کسی پر شبہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے بالتھر بے قصور ہے جس طرح مجھے معلوم ہے کہ تم بے قصور ہو۔ پھر جب رات کو ہم نے تلاش کیا تو سونے کے سکے اس کے سامنے پڑے تھے۔ وہ جیت رہا تھا، ہار نہیں رہا تھا۔“

”تب ہم اپنا سونا کس طرح واپس حاصل کریں؟“ میلشر نے بے بسی سے کہا۔ ”میرا ذہن کام نہیں کررہا ہے۔“

گاسپر نے سکون سے کہا۔ ”اس کے لیے ہمیں اپنی عقل استعمال کرنی ہوگی۔ ہم عقل رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے اس کی مدد سے ہم چور تک پہنچ جائیں گے۔“

”لیکن ہمارے پاس چور کا کوئی نشان یا ثبوت نہیں ہے اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا ہے۔“

”بعض اوقات نشان یا ثبوت کا نہ ہونا ہی ثبوت ہوتا ہے۔“

بالتھر پانی لے کر واپس آگیا اور انہوں نے اس سے پانی لے کر اپنی پیاس بجھائی۔ وہ پہر میں بستی والوں کی طرف سے ان کے لیے کھانا مہیا کیا گیا تھا۔ بہت دنوں بعد انہوں نے تازہ گوشت، پنیر اور دہی استعمال کیا۔ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو تھینیشا ان کے پاس آئی۔ ”میں تم لوگوں کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”بوڑھے ڈیمون نے میرے باپ سے بات کی ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے پھر کبھی نہیں مارے گا۔ اب میں اس کے پاس واپس چلی گئی ہوں۔“

”یہ تو اچھا ہوا نیک خاتون۔“ گاسپر نے اس سے کہا۔ ”تمہارا باپ ظالم سہی لیکن وہ تمہارا باپ ہے... اور شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔“

لڑکی واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بالتھر نے کہا۔ ”سنو، ہمیں سونے کی بازیابی کے لیے ڈیمون سے بات کرنی چاہیے۔“

”نہیں، اس صورت میں بات کھل جائے گی۔“ میلشر نے مخالفت کی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں سونا چھپانا تھا اور وہ چوری ہوچکا ہے۔“ بالتھر نے اصرار کیا۔

گاسپر نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر بعد ڈیمون ان کے پاس آیا۔ ”تم لوگوں نے اصطبل کی تعمیر کے لیے جو کام کیا ہے ہم اس کا صلہ کس طرح ادا کرسکتے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ گاسپر کچھ کہتا بالتھر پھٹ پڑا۔ ”اگر تم ہمارے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو ہمارا چوری ہوجانے والا سونا واپس دلا دو۔“

ڈیمون حیران ہوگیا۔ ”سونا... چوری ہوجانے والا سونا؟“

”وہ ہمارے خیمے سے چوری ہوا ہے۔“ بالتھر نے گاسپر کے روکنے سے پہلے کہہ دیا۔ ڈیمون بولا۔

”یہاں کوئی چور نہیں ہے۔“

”ایک چور ہے۔“ بالتھر نے اصرار کیا۔

بالتھر کے لہجے نے بوڑھے ڈیمون کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ ”اس صورت میں میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہم تمہارا سونا تلاش کریں گے۔“

”نہیں... نہیں۔“ گاسپر نے کہا۔ ”ہم اسے خود تلاش کریں گے۔“

”وہ کیسے؟“

”چور نیک ہمارے ہاتھ آگیا تو سونا خود بخود مل جائے گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ بوڑھے ڈیمون نے کہا۔ ”تم

اچھے انسان ہو اور میں تمہاری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

اس دوران میں گاسپر نے سوچ لیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اس نے کہا۔ "تم ہمارے گھوڑے منگوا دو۔ ہم پہلے یہ ظاہر کریں گے کہ یہاں سے جا رہے تھے۔"

جب ڈیبون ان کے گھوڑے لینے چلا گیا تو گاسپر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "تم سامان سمیٹنا شروع کر دو تاکہ وہ بھی ایسا سمجھے کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

باتھر سامان سمیٹنے لگا۔ میلشر نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ چور کون ہو سکتا ہے۔ اس میں بہت سارے ممکنات ہیں، لڑکی بھی چور ہو سکتی ہے، اس کا باپ چور ہو سکتا ہے یا کوئی کھلاڑی بھی ہمارا سونا چرا سکتا ہے۔"

"ڈیبون بھی چور ہو سکتا ہے۔" باتھر نے طنزیہ انداز میں اضافہ کیا۔ "بہت سارے لوگ مشکوک ہیں۔"

"یہ جاننے کے لیے ہمیں ایک اورکل کی ضرورت ہے۔" گاسپر نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے، ہم رومنوں کی طرح جانور مار کر شگون لیں اور چور پکڑ لیں؟" میلشر نے پوچھا۔ رومنوں میں رواج تھا کہ وہ کسی جرم کا سراغ لگانے کے لیے اپنے مندروں میں جانوروں کی قربانی دیتے تھے اور اس سے شگون لیتے تھے۔ وہ اسے اورکل کہتے تھے۔

گاسپر نے کہا۔ "میرا اورکل ایک زندہ جانور ہے۔" اس نے راموتھ کی طرف دیکھا جو ان کے گھوڑے لا رہا تھا۔ "میرا گھوڑا بتائے گا کہ سونا کس کے پاس ہے۔"

"تمہارا گھوڑا؟" باتھر ہنسا۔ "ایک احمق جانور بتائے گا کہ ہمارا سونا کس نے چرایا ہے؟"

"ہاں، یہ احمق جانور بتائے گا کہ سونا کس نے چرایا ہے۔" گاسپر نے یقین سے کہا۔

جب راموتھ نے ان کے گھوڑے ان کے حوالے کیے اور گاسپر نے اسے طے شدہ معاوضے میں سونے کا سکہ دیا تو وہ خوش نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ سکہ اس کی خدمت کے معاوضے سے کہیں زیادہ تھا۔ راموتھ کے جانے کے بعد گاسپر نے اپنے گھوڑے کو کاٹھی پر رکھے کچھ سیب دیے جو اس نے سب کے سب کھا لیے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں نے دیکھا، یہ کتنا بھوکا ہے۔"

"اس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟" میلشر نے پوچھا۔

"اس نے مجھے بتایا ہے کہ سونا راموتھ نے چرایا ہے۔" گاسپر بولا تو میلشر اور باتھر دونوں اچھل پڑے۔ پھر وہ باہر بھاگے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے انہوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے کھینچ کر قصبے تک لے آئے۔ وہ شور مچا رہا تھا۔ اس کا شور سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ آنے والوں میں نیوار بھی تھا۔ اس نے اعتراض کیا۔

"تم نے ہماری بستی کے ایک آدمی کو کیوں پکڑا ہے؟"

"اس نے ہمارا سونا چرایا ہے۔" باتھر نے اعلان کیا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" راموتھ چلایا۔ "میں نے سونا نہیں چرایا۔"

"اس کا چہرہ دیکھو۔" میلشر نے لوگوں سے کہا۔ "یہ ایک جھوٹے اور چور کا چہرہ ہے۔"

"مجھے چھوڑ دو۔" راموتھ نے مزاحمت جاری رکھی۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اسی نے سونا چرایا ہے؟" نیوار نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "یا تو ثبوت پیش کرو ورنہ اسے چھوڑ دو۔"

اسی لمحے گاسپر قصبے سے برآمد ہوا اور اس نے کہا۔ "میں ثبوت دوں گا لیکن پہلے ڈیبون کو یہاں بلایا جائے۔ وہ اس بستی کا سربراہ ہے اور اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ چوری شدہ سونا واپس دلانے میں ہماری مدد کرے گا۔"

کچھ لوگ ڈیبون کو بلانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ڈیبون وہاں موجود تھا۔ اس نے راموتھ کی طرف دیکھا اور گاسپر سے پوچھا۔ "تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ چور راموتھ ہے؟"

"یہ بات مجھے میرے گھوڑے نے بتائی ہے۔"

ڈیبون حیران رہ گیا۔ "گھوڑے نے کیسے بتائی ہے؟"

"وہ بھوکا ہے۔" گاسپر نے وضاحت کی۔ "جب ہم نے اپنے گھوڑے راموتھ کے سپرد کیے تو اس نے انہیں کھانے کو کچھ نہیں دیا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس اس وقت بھی اصطبل میں چارہ اور بیج تھے۔ یہ بچت کرنا چاہتا تھا حالانکہ یہ اس کام کا ہم سے معاوضہ بھی لے رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ہمارے گھوڑوں کو کھانے کو کچھ نہیں دیا۔ یقیناً یہ یوں کرتا ہوگا کہ جب تک مسافر اپنے گھوڑے اس سے لینے آتے ہوں گے تو یہ ان کو اس وقت کچھ کھانے کو دیتا ہوگا۔"

"تب اس نے تمہارے گھوڑوں کو کھانے کو کچھ دیا ہوگا۔" نیوار نے کہا۔

"اگر یہ دے دیتا تو چرانا بے کار ہوتا لیکن یہ اپنی خسیس

طبیعت کی وجہ سے پکڑا گیا۔ ہوا یہ کہ کل اصطبل میں آگ لگ گئی اور وہاں گھوڑوں کے لیے رکھا سارا چارا جل گیا۔ بچت کرنے کے لیے اس نے پہلے بھی گھوڑوں کو کچھ نہیں دیا تھا اور جب چارا اور بیج جل گئے تو اس کے پاس ان کو کھلانے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ تب اس نے سوچا کہ ہمارے پاس گھوڑوں کے لیے جو بیج ہیں، ان میں سے کچھ نکال لے اور جب میں اور میسٹر اپنے ساتھی باتھر کی تلاش میں گئے تھے تو اس وقت یہ ہمارے خیمے میں آیا اور اس نے بیجوں والا تھیلا کھولا۔"

"یعنی یہ بیجوں کی تلاش میں گیا تھا اور اسے سونا مل گیا؟" ڈیون نے کہا۔ "اسے کیسے پتا چلا کہ تھیلے میں سونا ہے؟"

"تھیلے کے وزن کی وجہ سے۔" گاسپر نے جواب دیا۔ "جب اس نے تھیلے کو معمول سے زیادہ وزنی پایا ہوگا تو اسے شک ہوا اور اس نے درمیان میں دیکھا تو اسے سونا مل گیا اور اس نے خاموشی سے سونا نکالا اور ہمارے خیمے سے چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد تھیلا ہمارے خیمے میں آگئی۔ اس کے چکر میں ہمیں اپنے سونے کا دھیان نہیں رہا اور ہم اسے دیکھے بغیر سو گئے۔ صبح جب میرے ساتھی نے سونا دیکھنا چاہا تو وہ غائب تھا۔"

ڈیون اور دوسرے لوگ اب قائل نظر آرہے تھے لیکن پھر بھی پورا یقین نہیں تھا۔ راموتھ بولا۔ "تم کہتے ہو کہ میں تھیلے سے بیج لینے گیا تھا، تب میں نے سونے کے ساتھ بیج کیوں نہیں لیے؟"

"اس لیے کہ اس طرح تم فوری پکڑ میں آجاتے۔ ہمارے تھیلے سے بیج صرف تم لے سکتے تھے، ہمارے گھوڑوں کے لیے اور کسی کو بیج چرانے کی ضرورت نہیں ہے۔" گاسپر بولا۔ "لیکن تم پکڑے بھی اسی وجہ سے گئے ہو کیونکہ تم نے بیج نہیں چرائے اور ہمارے گھوڑوں کو بھوکا رکھا۔"

راموتھ کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے کہا۔ "یہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم نے صرف ایک داستان بنا کر سنا دی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ثبوت بھی مل جائے گا اگر معزز ڈیون تمہارے گھر کی تلاشی لیں۔ مجھے یقین ہے کہ سونا تم نے اپنے گھر میں کہیں چھپا رکھا ہوگا۔"

اس بار راموتھ نے ہار مان لی اور گھگیا کر بولا۔ "مجھے معاف کردو، میں لالچ میں آگیا تھا۔"

کچھ ہی دیر میں ڈیون نے ان کے ہمراہ راموتھ کے جھونپڑے میں زمین کھود کر چھپایا گیا سونا برآمد کرلیا۔ ڈیون نے سونے کا تھیلا گاسپر کے حوالے کیا اور بولا۔ "دیکھ لو، تمہارا سونا پورا ہے؟"

"ہاں، یہ پورا ہے۔" گاسپر نے جواب دیا۔ "شاید راموتھ کو موقع نہیں ملا کہ وہ اس میں سے کچھ نکال سکے۔"

"شکر ہے ہماری بستی پر آنے والا داغ صاف ہو گیا۔" ڈیون نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر غضب ناک ہو کر بولا۔ "اس چور کو ہم ایسی سزا دیں گے کہ آئندہ اس بستی کا کوئی فرد چوری کا سوچے گا بھی نہیں۔"

گاسپر، باتھر اور میسٹر اپنا سونا لے کر خیمے میں واپس آگئے۔ باتھر سونے کو دوبارہ بیجوں کے تھیلے میں رکھ کر اسے بند کرنے لگا۔ میسٹر نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "تم بہت عقل مند آدمی ہو۔"

"نہیں، سب عقل مند ہوتے ہیں لیکن اسے استعمال کوئی کوئی کرتا ہے۔" گاسپر نے متانت سے کہا۔ "اب ہمیں جلد از جلد سفر کا آغاز کردینا چاہیے۔"

"ہاں، آج کل رات جلدی ہوجاتی ہے اور شام ہونے والی ہے۔" میسٹر نے کہا تو گاسپر مسکرایا۔

"تمہیں رات میں سفر کرنا پسند ہے، ہم ستاروں کی روشنی میں سفر کریں گے۔"

جب وہ اپنا سامان باندھ کر نکلے تو ڈیون کنوئیں پر انہیں رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ میرا وعدہ ہے، راموتھ کو سزا ملے گی۔"

"اسے معاف کردو۔" گاسپر نے سفارش کی۔

ڈیون نے کچھ نہیں کہا، شاید وہ راموتھ کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اسے کچھ نہ کچھ سزا دینا چاہتا تھا تاکہ اس کی بستی کے دوسرے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ وہ کسی مسافر کی چیز چرانے سے گریز کریں۔ گاسپر کی سفارش کا جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ "کیا تم لوگ مغرب کی طرف جارہے ہو؟"

"ہاں، ہم ایک بادشاہ کے ملازم ہیں اور اس نے خیرسگالی کے طور ہمیں کچھ تحفے اور چیزیں دے کر مغرب کے ایک بادشاہ کے پاس بھیجا ہے۔"

"تمہارا سفر بہ خیر گزرے۔" ڈیون نے انہیں دعا دی تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور صحرا کی طرف بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد صحرا کے یہ مسافر صحرا میں غائب ہو چکے تھے، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

دولت کے لیے کھیلے جانے والے کھیل کے ڈرامائی موڑ سرورق کا پہلا رنگ

سفاک مجرم

سلیم فاروقی

زندگی تو انسان پر کس قدر مہربان ہے لیکن انسان زندگی سے کس قدر بیگانہ ہے... وہ اپنے لیے ہلاکت کے سامان خود پیدا کرلیتا ہے۔ تمام آفتیں اور مصیبتیں اسی ذی روح کی عنایت کردہ ہوتی ہیں۔ لالچ اور ہوس پرور لوگ کس طرح اپنی تسکین کی خاطر آگ و لہو سے دوستی نبھاتے ہیں... اس دوستی میں وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کون اپنا ہے اور کون پرایا... وہ صرف عیش کے میں دولت کے انبار سے اپنا رشتہ نبھاتے ہیں...

وہ دن ہی میرے لیے خراب تھا۔ صبح میں نے مائرہ سے وعدہ کیا تھا کہ آج ہم کھانا کہیں باہر کھائیں گے۔ اس دن ہماری شادی کی دوسری سالگرہ تھی اور اتفاق سے مجھے یاد بھی تھا۔

شام کو چار بجے کے قریب باس نے میٹنگ طلب کرلی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب میرا جلد گھر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ میں دس بجے کے قریب گھر پہنچا تو مائرہ موجود نہیں تھی۔ میں نے اسے پہلے تو پورے گھر میں تلاش

گیا، پھر میں لان کی طرف نکل گیا کہ مائرہ اکثر ناراضی کی صورت میں لان میں جا بیٹھتی تھی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں اسے آوازیں بھی دے رہا تھا مگر وہ گھر میں کہیں موجود نہیں تھی۔

میں نے سیل فون پر اس کا نمبر ملایا، دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد مجھے مائرہ کی سرد آواز سنائی دی۔ ''جی فرمایئے؟''

مجھے شدید طیش آیا لیکن میں برداشت کر گیا اور خود پر قابو پا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مائرہ! تم کہاں ہو؟''

''میں امی کے گھر ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''تم مجھے بتا تو دیتیں کہ تم وہاں ہو۔ میں تمہیں یہاں تلاش کر رہا ہوں۔''

اسی وقت سیل فون پر میری ساس کی آواز ابھری۔ ''بے پروائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کمال، تم اتنے ہی مصروف تھے تو تم نے شادی کیوں کی تھی؟''

اپنی ساس کے جلے کٹے لہجے پر مجھے بھی ایک دم غصہ آ گیا۔ میری ساس ان لوگوں میں سے تھیں جو گھر کو بنانے کے بجائے اسے بگاڑنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ مجھے شروع ہی سے ان سے چڑ تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ فون مائرہ کو دیں۔''

''مائرہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔''

ان کے اس جملے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور میں بھنا کر بولا۔ ''اوکے، پھر اسے ہمیشہ وہیں رکھیں۔'' میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ آج آفس میں لنچ بھی نہیں کیا تھا پھر میٹنگ کے چکر میں مجھے چائے تک پینے کی فرصت نہیں ملی تھی۔

میں نے کچن کا رخ کیا لیکن وہاں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فریج میں ڈبل روٹی اور انڈے موجود تھے لیکن میں اس وقت کچھ بھی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے گاڑی نکالی اور روانہ ہو گیا۔ پہلے میں ڈٹ کر کھانا چاہتا تھا۔

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ مطلع تو صبح سے ابر آلود تھا لیکن ایسی موسلا دھار بارش کی توقع نہیں تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین دیکھے بغیر سیل فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو کامی!'' دوسری طرف سے روبی کی آواز آئی۔ ''کہاں ہو؟''

''میں اس وقت ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں کال بیک کرتا ہوں۔''

''اوکے، میں انتظار کروں گی۔'' یہ کہہ کر روبی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

یونیورسٹی میں روبی مجھ سے ایک سال جونیئر تھی۔ وہیں ہماری دوستی ہوئی تھی۔ وہیں محبت پروان چڑھی تھی۔ میں کراچی میں تمہارا بتا تھا، میری فیملی لاڑکانہ میں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی میں روبی سے شادی کر لوں گا لیکن ہوا وہی جو عموماً ہوتا ہے۔ اماں نے بہت پہلے میری خالہ زاد مائرہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ میں نے اماں کے فیصلے کی شدید مخالفت کی۔ چیخا چلایا لیکن اماں نے اپنے مرنے کی دھمکی دے کر مجھے مجبور کر دیا۔ روبی دلبرداشتہ ہو کر امریکا چلی گئی۔ اس کی فیملی امریکا میں سیٹل تھی۔

بابا نے مجھے زمینیں سنبھالنے کا مشورہ دیا لیکن مجھے زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے گاؤں جانے سے انکار کر دیا اور کراچی کی ایک فرم میں ملازمت کر لی۔ مائرہ کے گھر والے کراچی ہی میں رہتے تھے۔

میری شادی کے ایک سال بعد روبی امریکا سے لوٹ آئی۔ اسے دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ ترو تازہ اور دلکش شخصیت کی مالک روبی بالکل مرجھا کر رہ گئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتی تھی اور اس نے اب تک شادی بھی نہیں کی تھی۔

مائرہ بھی ہماری محبت سے واقف تھی۔ وہ بات بات پر مجھ پر شک کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس سے بے وفائی کر رہا ہوں۔ میں نے بارہا اسے یقین دلایا تھا کہ اب روبی صرف میری دوست ہے۔ اس کے علاوہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مائرہ نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔

میں نے اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکی اور بارش سے بچتا ہوا تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

میں کھانا کھا کے فارغ ہوا ہی تھا اور کافی پی رہا تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر روبی کا نام دیکھ کر میں نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو کامی! گھر پہنچ گئے؟'' روبی نے پوچھا۔

''ارے یار کیسا گھر؟ میں اس وقت گولڈن گرل میں ہوں۔ کھانا کھانے آیا تھا، بس نکلنے ہی والا ہوں۔''

”تم ریسٹورنٹ میں کھانا کیوں کھا رہے ہو؟ کیا مائرہ بھی تمہارے ساتھ ہے؟“

”نہیں بھئی وہ اپنی امی کے گھر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا بات ہے کامی! تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ میں تو تمہارے سینٹس اور آواز سے ہی بھانپ جاتی ہوں۔“

”ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

”کوئی بات تو ضرور ہے۔“ روبی نے کہا۔ ”تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟“

”میں نے کہا نا کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس مائرہ سے جھگڑا ہو گیا ہے۔“

اس کے استفسار پر میں نے اسے بتا دیا کہ کشیدگی کی وجہ کیا ہے ورنہ وہ میری جان نہیں چھوڑتی۔

”زیادہ ٹینشن مت لو۔“ روبی نے کہا۔ ”گھر جاؤ اور سکون سے سو جاؤ۔ میں ابھی آجاتی لیکن اس وقت میرا آنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”نہیں، تم زحمت مت کرو۔ اس وقت یوں بھی شدید بارش ہو رہی ہے، خدا حافظ۔“ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کافی پینے کے بعد میں کافی دیر تک بارش کو دیکھتا رہا۔ ریسٹورنٹ کی دیوار شیشے کی تھی۔ شیشے پر بارش کے قطرے پڑ رہے تھے اور میرے دل میں ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔

میں ایک بجے کے قریب ریسٹورنٹ سے باہر نکلا۔ بارش کا زور ابھی تک ٹوٹا نہیں تھا۔ اپنی گاڑی تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے بھیگ گئے۔

سڑکوں پر پانی کھڑا ہو گیا تھا اور ہر طرف جل تھل کا سماں تھا۔ کراچی میں بارش رحمت کے بجائے زحمت ہوتی ہے۔ سڑکوں پر اتنا پانی کھڑا ہو جاتا ہے کہ سڑک نظر ہی نہیں آتی ہے۔ بس اندازے سے ڈرائیونگ کرنا پڑتی ہے۔

سڑک کے کنارے کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے مالکان بےبسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

میں بہت محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ مائرہ کال کر رہی تھی۔ میں نے سیل فون پسنجر سیٹ پر اچھال دیا۔ گھنٹی بج بج کر ختم ہو گئی۔ دو منٹ بعد پھر گھنٹی بجی۔ میں نے پھر اسکرین پر نظر ڈالی، مائرہ کا نام اسکرین پر نظر آیا تو میں نے پھر کال ریسیو نہیں کی۔

کچھ وقفے کے بعد پھر گھنٹی بجی۔ میں بری طرح جھنجلا گیا۔ وہ کال مائرہ ہی کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگا لیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”ہیلو۔“

”تم میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے؟“

”تمہاری امی نے تو فرمایا تھا کہ مائرہ بات نہیں کرنا چاہتی، پھر...“

”کمال! میری امی تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں۔“

”میں اس وقت رشتوں پر بحث کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور تم نے اس وقت فون کیوں کیا ہے؟“

”تم اس وقت گھر میں تو نہیں ہو؟“

”ہاں، میں گھر سے باہر ہوں، کھانا کھانے نکلا تھا۔“

”کیوں زینت نے کھانا نہیں بنایا؟“ زینت ہماری ملازمہ تھی۔

”نہیں، سرور نے صبح ہی مجھ سے چھٹی لے لی تھی۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”وہ زینت کو لے کر حیدرآباد گیا ہے۔“

”اور ان دونوں نے مجھے بتانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔“ مائرہ بھنا کر بولی۔

”تم ان کے جانے سے پہلے ہی نکل گئی ہو گی۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ان دونوں سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گی۔“ مائرہ نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ بتاؤ اس وقت تمہارے ساتھ کون ہے؟“

”اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”کون ہو سکتا ہے میرے ساتھ؟“

”مجھ سے جھوٹ مت بولو کمال۔“ مائرہ پھر چیخی۔ ”میں جانتی ہوں، اس وقت وہ چڑیل بھی تمہارے ساتھ ہے۔“

”تمہارے اعصاب پر وہ چڑیل سوار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس وہم کا تو میرے پاس کوئی علاج ہی نہیں ہے۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ مائرہ چیخ کر بولی۔

”اپنا لہجہ درست کرو۔ میں ایسے لہجے کا عادی نہیں ہوں، سمجھیں اور میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔“

”تم... خود کو سمجھتے کیا ہو گھٹیا آدمی؟“ مائرہ حلق پھاڑ کر دہاڑی تھی۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور موبائل پسنجر سیٹ کی طرف اچھالا ہی تھا کہ سامنے سے میرے چہرے پر کسی

گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی پڑی۔ کوئی گاڑی بہت تیزی سے میری طرف آرہی تھی۔ میں حواس باختہ ہوگیا یا تو گاڑی کا ڈرائیور نشے میں تھا یا پھر گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ مجھے مزید کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے غیر شعوری طور پر بریک دبا دیا تھا۔ پھر زوردار دھما کا ہوا اور سب کچھ گڈمڈ ہوگیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ بس مجھے وہ دھماکا یاد تھا۔ شاید میں مر گیا تھا لیکن... چند منٹ بعد احساس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

جب حواس مزید بحال ہوئے تو مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ میرے جسم کا نچلا حصہ کسی وزنی چیز کے نیچے دبا ہوا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں اپنے پیروں کو حرکت دے سکتا تھا لیکن وزن کی وجہ سے اٹھنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ میرے اردگرد بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ بارش کا زور تھم چکا تھا لیکن ہلکی ہلکی بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔ میرے نزدیک سے اِکّا دُکّا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

اچانک میں پوری قوت سے چیخا۔ ''ہیلپ... ہیلپ... مجھے بچاؤ۔'' مجھے اس سناٹے میں اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی یا پھر پانی بہنے کی مخصوص آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ شاید حادثے کے باعث میرا خون بہہ رہا تھا۔

اچانک مجھے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے مدد کے لیے چیخنا چاہا لیکن حلق سے آواز ہی نہیں نکل سکی۔ پھر میرے چہرے پر تیز روشنی پڑی۔ مجھے ایسا لگا جیسے گاڑی کا ڈرائیور مجھے کچلتا ہوا گزر جائے گا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''ارے یار! یہ تو ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ یہ بندہ شاید مر گیا ہے۔'' وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

میں نے جسم کی پوری قوت لگا کر چیخنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ ''بچاؤ... بچاؤ۔''

''ارے، یہ تو زندہ ہے۔'' وہ شخص بڑبڑایا۔ پھر وہ مجھ پر جھک گیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں مجھے کسی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی ہمت کرو جوان... ہم تمہارے کو نکالتا ہے۔''

مجھ پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں کسی گاڑی کی عقبی سیٹ پر پڑا تھا اور گاڑی تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔

پھر میری آنکھ اسپتال کے کمرے میں کھلی۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ میری بائیں جانب اسٹینڈ میں خون کا بیگ لٹک رہا تھا۔ دائیں جانب اسپتال کی سفید یونیفارم میں ایک نرس کھڑی تھی۔ وہ اسٹینڈ پر لگی ڈرپ میں انجکشن کے ذریعے کوئی دوا ملا رہی تھی۔

میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ میں نے نحیف آواز میں کہا۔ ''پ... پا... نی...''

نرس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر مسکرا کر بولی۔ ''تھینکس گاڈ! آپ کو ہوش آگیا۔'' اس نے مجھے سہارا دے کر چند گھونٹ پانی پلایا۔ پھر مجھے احتیاط سے لٹا کر تیزی سے چلی گئی اور ڈاکٹر کو بلا لائی۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آپ کے ایک پاؤں میں فریکچر ہوا ہے۔ سر پر چوٹ لگی ہے۔ چوٹ تو معمولی ہے لیکن آپ کا خون بہت بہہ گیا ہے۔ اگر آپ مزید پندرہ بیس منٹ تک وہاں پڑے ہوتے تو آپ کی جان جا سکتی تھی۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' میں نے نحیف لہجے میں کہا۔

''شکریہ تو ان صاحب کا ادا کریں جو آپ کو یہاں لائے تھے۔''

''میں ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو آپ کو یہاں چھوڑ کر اسی وقت چلے گئے تھے، ہاں جاتے جاتے اسپتال کے اخراجات اور اپنا سیل نمبر چھوڑ گئے ہیں۔''

''مجھے سیل نمبر بتائیے۔ میں ٹیلی فون پر اُن کا شکریہ ادا کردوں۔''

''پہلے آپ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے تاکہ انہیں انفارم کیا جاسکے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے سوچا کہ انہیں مائرہ کا سیل نمبر دے دوں لیکن پھر میں نے بابا سائیں کا نام اور سیل نمبر بتا دیا۔ ان کا سیل نمبر تو مجھے زبانی یاد تھا۔

بابا سائیں کا نام سن کر ڈاکٹر چونک اٹھا۔ ''آپ سردار جمال خان کے بیٹے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر مسکرا کر نحیف لہجے میں بولا۔ ''آپ حیران کیوں ہیں ڈاکٹر؟ کیا سردار جمال خان کا بیٹا کسی حادثے کا شکار نہیں ہوسکتا؟''

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "حیرت تو مجھے اس بات پر ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی ڈرائیور ہے نہ باڈی گارڈ۔"

"میں انہی سب بکھیڑوں سے بچنے کے لیے کراچی میں رہتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

☆☆☆

"وہ کون فرشتہ تھا جو تمہیں بروقت اسپتال لے آیا؟" بابا سائیں نے کہا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی گوٹھ سے یہاں پہنچے تھے۔

"اس کا ایڈریس ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود ہے بابا سائیں۔" میں نے کہا۔

"ایڈریس اور سیل نمبر دونوں غلط ہیں۔" بابا سائیں نے جواب دیا۔ "وہ کوئی ایسا خدا ترس آدمی تھا جو خود کو ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"میں اسے پہچان لوں گا بابا سائیں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ مجھے نہیں نظر آیا، میں اس کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔"

"مائرہ کہاں ہے؟" بابا سائیں نے اچانک پوچھا۔

"مائرہ اپنے گھر گئی تھی۔ اسے تو میرے ایکسیڈنٹ کی اطلاع بھی نہیں ہے۔"

"کیا حماقت کی بات کر رہے ہو کامی؟" بابا سائیں نے کہا۔ "وہ لوٹ کے گھر تو آئی ہوگی؟ کیا سرور اور اس کی بیوی زینت نے اسے نہیں بتایا ہوگا؟"

"وہ گھر آئی ہی نہیں ہوگی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا پھر میں نے بابا سائیں کو ساری بات بتادی۔

"مائرہ تو خیر ہے ہی بے وقوف اور جذباتی۔" بابا سائیں نے کہا۔ "افسوس تو مجھے تمہاری خالہ کے رویّے پر ہے۔" پھر وہ طویل سانس لے کر بولے۔ "تم ابھی کچھ مت سوچو، اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔"

"آپ نے شاید اماں اور ماروی کو میرے ایکسیڈنٹ کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"ہاں، میں نے جان بوجھ کر ان دونوں کو نہیں بتایا ورنہ وہ تو کسی قیمت پر گوٹھ میں نہ رکتیں۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ مائرہ اور خالہ جان اندر داخل ہوئیں۔ مائرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن خالہ جان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ انہیں دیکھ کر میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"تم نے اتنی دور سے اپنے بابا سائیں کو بلا لیا، ہمیں کانوں کان خبر نہ ہونے دی؟" خالہ جان نے تیز لہجے میں کہا۔

"یہ گھر نہیں، اسپتال ہے ساجدہ۔" بابا سائیں نے درشت لہجے میں کہا۔ "کامی کا حال پوچھنے کے بجائے آپ اپنے شکوے لے کر بیٹھ گئیں۔"

اسی وقت روبی بھی وہاں آگئی۔ وہ بابا سائیں کو دیکھ کر ٹھٹکی پھر پُر اعتماد انداز میں آگے بڑھی اور اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "السلام علیکم ایوری باڈی؟"

"وعلیکم السلام۔" بابا سائیں نے جواب دیا۔ "کیسی ہو بیٹا؟"

"آئی ایم فائن انکل! آپ کیسے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

روبی میرے نزدیک آئی اور سرگوشی میں بولی۔ "تم کیسے ہو کامی؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" مائرہ نے درشت لہجے میں روبی سے پوچھا۔

"میں کامی کو دیکھنے آئی ہوں۔"

"ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری... اب تم یہاں سے..."

"مائرہ!" بابا سائیں نے درشت لہجے میں کہا۔ "اُن کے اس لہجے سے تو میں بھی کانپ اٹھتا تھا۔ "یہ کیا حرکت ہے، یہ بات کرنے کا کون سا انداز ہے؟"

"بابا سائیں! اس سے کہیے کہ یہاں سے دفع ہو جائے۔" مائرہ نے چیخ کر کہا۔

"اپنی آواز نیچی رکھو۔" بابا سائیں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "یہ اسپتال ہے، گھر نہیں ہے۔"

"تو پھر میں ہی چلی جاتی ہوں۔" مائرہ نے انتہائی گستاخی سے کہا اور خالہ جان سے بولی۔ "چلیں امی۔"

خالہ جان تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھیں۔ وہ ایک دم کھڑی ہو گئیں۔

مائرہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہیل پٹختے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

"ٹھہرو مائرہ!" بابا سائیں نے کہا۔

مائرہ ان کی بات سنی ان سنی کر کے نکل گئی۔

بابا سائیں کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ مارے غصے کے کانپنے لگے۔ مائرہ کی جگہ کوئی اور یہ حرکت کرتا تو وہ زندہ نہ رہتا۔ بابا سائیں کی درشت آواز سے بڑے بڑوں پر لرزہ

طاری ہو جاتا تھا۔ اسپتال نہ ہوتا تو بابا سائیں نہ جانے کیا کرتے۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا، پھر وہ سخت لہجے میں بولے۔ ''کامی! اب مائرہ اس وقت اس گھر میں آئے گی جب میں اجازت دوں گا۔ وہ میری آواز پر نہیں رکی... میری... سردار جمال خان کی آواز پر نہیں رکی، میں دیکھتا ہوں یہ کتنے بڑے باپ کی بیٹی ہے۔''

☆☆☆

''بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا۔'' اماں نے کہا۔

اماں اور ماروی دوسرے ہی دن کراچی آگئی تھیں۔ مجھے اسپتال سے گھر آئے ہوئے ایک مہینا ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ دو مہینے گزارنے کے بعد اب اماں اور ماروی واپس جا رہی تھیں۔ بابا سائیں بھی گوٹھ سے کئی مرتبہ کراچی آچکے تھے۔ اماں نے سر توڑ کوشش کی کہ وہ کسی طرح مائرہ کو معاف کر دیں لیکن میں جانتا تھا کہ بابا سائیں اپنی توہین کسی بھی صورت برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مائرہ کو آنے کی اجازت نہیں دی۔

''بھیا!'' ماروی نے کہا۔ ''آپ بھی ہمارے ساتھ گوٹھ چلیں۔''

''میں ضرور چلتا ماروی گڑیا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی تو یہاں کا سارا کام ہی پڑا ہوا ہے۔ اگلے مہینے وقت ملا تو میں ضرور آؤں گا۔''

اماں مجھے ڈھیروں ہدایات دے کر رخصت ہوئیں کہ گاڑی چلانے میں احتیاط کرنا، وقت پر کھانا کھانا، نیند پوری کرنا وغیرہ۔

وہ سرور اور زینت کو بھی خصوصی ہدایات دے گئی تھیں۔

شام کو روبی آگئی۔ وہ اب اکثر گھر بھی آجاتی تھی۔

میں اسے رخصت کرنے باہر تک گیا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ مجھے ایک شخص دکھائی دیا۔ اس کی صورت مجھے کچھ شناسا سی لگی۔ وہ سڑک پار کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے میری جان بچائی تھی۔ میں اس کی طرف بھاگا۔ اس وقت تک وہ سڑک پار کر چکا تھا۔ میں نے بھی بھاگ کر سڑک پار کی۔ وہ آدمی پرانی سی ایک گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

میں نے اسے آواز دی۔ ''سنیے۔''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

''السلام علیکم۔'' میں نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے مجھے سرد نظروں سے گھورا۔ حلیے سے وہ مجھے کوئی مکینک یا پلمبر لگ رہا تھا۔ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''سر! آپ مجھے پہچانے نہیں؟''

''کیوں، تم کیا قائداعظم ہے جو میں تیرے کو پہچانوں گا۔''

''سر! میں کمال ہوں... ابھی تین مہینے پہلے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ آپ نے میری جان بچائی تھی، مجھے اسپتال پہنچایا تھا۔''

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ''ہاں، ابھی میں تیرے کو پہچان گیا۔ ابھی تیرا کیا حال ہے؟ ایک دم فٹ لگ رہا ہے میرے کو۔''

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں سر، میں نے کئی دفعہ آپ کو کال فون کیا لیکن آپ نے شاید اپنا نمبر بدل لیا ہے۔''

''فون کیوں کر رہا تھا میرے کو؟''

''سر! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔''

''ارے، اس کا کیا ضرورت ہے جوان، بس تمہارا جان بچ گیا۔ ابھی لائف کو انجوائے کرو۔''

''سر! میں یہاں نزدیک ہی رہتا ہوں۔ اگر آپ ڈنر میرے ساتھ کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''آئیے نا۔''

''بس تم نے بول دیا، سمجھو ہم نے ڈنر کر لیا۔'' اس نے کہا۔ ''ہم لوگ کے پاس ابھی اتنا ٹیم نہیں ہے جوان، پھر کبھی آئے گا۔''

''سر پلیز!'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کم سے کم ایک کپ چائے ہی پی لیں۔''

اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور بیزاری کے آثار تھے۔ ''بولا نا، ابھی ٹیم نہیں ہے۔''

''سر، پلیز! آئیں نا۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بہت اپنائیت اور اصرار سے کہا۔

''ابھی تم میرے کو... سر، سر بولتا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے کو آج تک کسی نے سر نہیں بولا۔''

میں زبردستی اسے گھر لے آیا اور سرور سے چائے لانے کو کہا۔

''سر! جب آپ کا نمبر غلط تھا تو آپ کا نام بھی اکرام علی نہیں ہوگا۔''

''میرا نام اکرام علی کیوں نہیں ہو سکتا؟'' اس نے

کہا۔ ”ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں۔“ اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”میرا نام دلاور خان ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنا نام غلط لکھوایا۔ یہ نہیں سمجھنا کہ میں بہت شریف آدمی ہوں اور چھپ کر دوسروں کا ہیلپ کرتا ہوں۔ میں نے تو اس لیے اپنا نام غلط لکھوایا تھا کہ بعد میں پولیس کا کوئی لفڑا نہیں ہووے۔“

اس دوران میں سرور چائے اور بسکٹ وغیرہ کی ٹرالی لے آیا۔ اس نے جلدی جلدی چائے پینا شروع کردی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔

”دلاور صاحب!“ میں نے کہا۔ ”یہ بسکٹ بھی لیں نا۔“

”ہاں۔“ اس نے کہا اور ایک بسکٹ بھی اٹھا لیا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”دلاور بھائی! میں آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری جان بچائی ورنہ...“

”بس۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ابھی یہ شکریہ شکریہ بس کرو۔“

”دلاور صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اگر کبھی آپ کو میری ضرورت پڑے تو مجھے آپ کے کام آکر بہت خوشی ہو گی۔“

دلاور چائے پی کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”تو... تو میرے کام آئے گا... تو؟“

”آپ آزما کر دیکھ لیجیے گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”اچھا۔“ اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”چل ٹھیک ہے۔ اب ہم جاؤں؟“

”جی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔ ابھی آپ کو میرے ساتھ ڈنر بھی کرنا ہے۔“

اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ میرا سر سہلا کر چلا گیا۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے۔ میں کھانا کھا کر ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

اچانک اطلاعی گھنٹی بجی اور بجتی چلی گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی گھنٹی پر انگلی رکھنے کے بعد بھول گیا ہے۔ مجھے ایسے جاہل قسم کے لوگوں سے چڑ ہے۔ اس سے پہلے کہ سرور گیٹ تک جاتا، میں خود ہی بھناتا کر گیٹ کھولنے چل دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ آنے والے کو بے نقط سناؤں گا۔

میں نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولا تو دلاور لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتا، میں نے اسے سنبھال لیا۔ بمشکل تمام میں اس کا بھاری بھرکم وجود سنبھالے ہوئے تھا۔

”دلاور بھائی! آپ ٹھیک تو ہیں۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟“

”میں زخمی ہوں۔“ دلاور نے بمشکل تمام کہا۔

میں اسے سہارا دے کر اندر لایا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ اس کی شرٹ ایک طرف سے خون میں تر تھی۔ اس کا خون میری سفید بے داغ شرٹ پر لگ گیا تھا۔

”آپ زخمی کیسے ہوئے دلاور بھائی؟“

”سائٹ پر مزدوروں کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں... ٹھیکے دار ہوں بیچ بچاؤ کراتے ہوئے مجھے گولی لگ گئی۔“

”گولی لگ گئی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں... تیرے کو گولی کا مطلب نہیں پتا، بلٹ... بلٹ لگی ہے ادھر...“ اس نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے سینے پر دائیں جانب زخم کا نشان تھا۔ اس میں سے اس وقت بھی ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔

سرور بھی وہیں آ گیا تھا اور حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”سرور۔“ میں نے کہا۔ ”گاڑی نکالو لیکن پہلے پولیس کو ٹیلی فون کر دو۔“

”نہیں۔“ دلاور غرا کر بولا۔ ”پولیس کو ٹیلی فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس الٹا مجھے ہی پکڑ لے گی۔“

”لیکن دلاور بھائی! یہ پولیس کیس ہے۔ میں آپ کو اسپتال بھی نہیں لے جا سکتا۔“

”تو تو بہت بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔“ اس نے نحیف لہجے میں کہا۔ ”سر! مجھے آپ کے کام آکر خوشی ہو گی۔“ اس نے طنزیہ انداز میں میری نقل اتاری، پھر وہ صوفے پر لیٹ گیا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنے فیملی ڈاکٹر کا خیال آیا۔ میں دلاور کو وہاں لے جا سکتا تھا۔ لیکن وہ انتہائی اصول پسند آدمی تھا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود نہ صرف پولیس کو اطلاع دے دیتا بلکہ بابا سائیں کو بھی بلا لیتا۔ اچانک مجھے اپنے دوست ڈاکٹر شاہد کا خیال آیا۔ وہ اسکول میں میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ اس سے میری اچھی دوستی تھی۔ وہ اکثر میرے گھر بھی آ جاتا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت رات کے بارہ بجے

تھے۔ مجھے یقین تھا کہ شاہد ابھی سویا نہیں ہوگا۔ میں نے سیل فون نکال کر اس کا نمبر ملایا۔ اس نے دوسری ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھالیا۔ ''ہاں کمال! خیریت تو ہے؟''

''یار! ایک پرابلم ہے۔ میرے ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ میں اسے تمہارے پاس لارہا ہوں۔''

''یار، تم اسے اسپتال لے جاؤ... یہ مت سمجھنا کہ میں انکار کررہا ہوں لیکن...''

''یار! وہ اسپتال جانے کو تیار نہیں ہے۔''

''اچھا سمجھا۔'' شاہد نے طویل سانس لی۔ ''اس نے اپنی گاڑی سے کسی کو زخمی کردیا ہوگا اور اب اسپتال جانے سے گھبرا رہا ہوگا۔ او کے، تم اسے یہاں لے آؤ۔''

''دلاور بھائی اٹھیں۔'' میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

''کمال! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟'' شاہد نے کہا۔ اس نے ابھی ابھی دلاور کا معائنہ کیا تھا۔ ''کہ وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا ہے۔ اسے گولی لگی ہے اور یہ پولیس کیس ہے۔''

''اس لیے تو تمہارے پاس لایا ہوں۔''

''یہ ہے کون؟ تمہارے گاؤں کا کوئی آدمی ہے؟''

''نہیں یار، یہ وہی ہے جس نے میری جان بچائی تھی۔ مجھے اسپتال پہنچایا تھا۔''

شاہد نے طویل سانس لی اور بولا۔ ''ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کمال، گولی ابھی اس کے جسم میں ہے۔ میں گولی نکال دوں گا۔ اس کا خون بہت ضائع ہوگیا ہے۔ اگر یہ مرگیا تو میری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، تم گولی نکالو۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں اس کا بلڈ سیمپل دے رہا ہوں۔ تم کراس میچ کرواکے اس کے لیے بلڈ کا بندوبست کرو۔''

اس نے دلاور کا بلڈ سیمپل مجھے دیا اور بولا۔ ''ابھی فوراً بلڈ لے آؤ۔ میں بلڈ بینک میں فون کردیتا ہوں۔ وہاں میرے جاننے والے ہیں۔'' میں جانے لگا تو وہ بولا۔ ''اور یہ شرٹ اتاردو... اس پر بھی خون کے دھبے لگے ہیں۔''

''میں پہلے بلڈ لے آؤں۔'' میں نے کہا اور باہر کی طرف نکلا۔

بلڈ کے دو بیگ لینے کے بعد میں پھر شاہد کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے گھر ہی کے ایک پورشن میں کلینک بھی تھا۔

شاہد نے کوئی باقاعدہ آپریشن تھیٹر تو بنایا نہیں تھا، ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں وہ مریضوں کا معائنہ کرتا تھا۔

شاہد نے دلاور کو بے ہوشی کا انجکشن دینا چاہا تو اس نے انکار کردیا۔ شاہد نے اس کے جسم میں پیوست گولی نکالی اور مجھ سے بولا۔ ''شکر ہے کہ گولی سے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس نے دلاور کے زخم کی ڈریسنگ کرکے اسے بلڈ لگا دیا اور خود ڈرائنگ روم میں آبیٹھا۔ اس نے الیکٹرک کیتلی پر کافی بنائی اور مجھے دے کر بولا۔ ''کمال! مجھے یہ اچھا آدمی نہیں لگ رہا ہے۔ اس کے جسم اور ہاتھوں پر زخموں کے بہت سے نشانات ہیں۔ اب تم فوراً اس سے پیچھا چھڑاؤ۔''

دو بجے تک شاہد فارغ ہوچکا تھا۔ میں نے اسے پیسے دینا چاہے تو اس نے جھلا کر کہا۔ ''اس سے بہتر ہے کہ تم میرے سر پر دو جوتے مارلو۔ اب تم مجھے اس طرح ذلیل کرو گے۔'' وہ انگریزی میں بولا۔ ''اس بندے سے پہلی فرصت میں اپنی جان چھڑاؤ۔ بس سمجھ لو یہی میری فیس ہے۔''

دلاور نقی سے مسکرا کر بولا۔ ''ہم تو خود بھی ادھر رکنا نہیں چاہتا ہوں، دوسرا بات یہ کہ ہم لوگ کا دھندا ایسا ہے کہ ہم بھی کسی پر اعتبار نہیں کرتا ہے اور... انگریزی بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑا بہت انگریزی تو ہم بھی سمجھ لیتا ہوں۔''

شاہد شرمندہ ہوگیا۔ اس سے زیادہ مجھے شرمندگی محسوس ہورہی تھی۔

''چلو، ابھی نکلو ادھر سے۔'' دلاور نے کہا۔

اسے گاڑی میں بٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''آپ کہاں جائیں گے؟''

''مجھے گلستان جوہر تک چھوڑ دے۔'' اس نے کہا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے جسم پر اب بھی وہی خون آلود شرٹ تھی۔ اس پر خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔

گلستان جوہر فلیٹوں کا جنگل ہے۔ ایک کثیر المنزلہ عمارت کے سامنے اس نے گاڑی رکوائی اور بولا۔ ''ابھی تو جا، یا میں تیرے کو تھینک یو بھی بولوں... تھینک یو۔'' اس نے حسب عادت میرا سر سہلایا اور بلڈنگ کی طرف بڑھا۔

''دلاور صاحب! آپ کس فلور پر رہتے ہیں۔ یہاں لفٹ تو ہے نا؟''

''میں پانچویں مالے پر رہتا ہوں... اور ادھر لفٹ نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔

اب اصولاً تو مجھے وہاں سے چلا جانا چاہیے تھا لیکن مجھے اب بھی دلاور کی فکر تھی۔ وہ اس حالت میں پانچویں فلور تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں؟ اسے فلیٹ کے دروازے تک چھوڑنا چاہیے تھا۔ میں گاڑی سے باہر آ گیا اور سوچا کہ میں خود دلاور کے پیچھے جاؤں لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس بلاک میں رہتا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے اسے بائیں طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس طرف دو بلاک تھے۔ دلاور ان ہی میں سے کسی بلاک میں گیا ہوگا۔

میں اندازہ لگا کر پہلے بلاک میں چلا گیا۔ گلستان جوہر میں بہت اچھے فلیٹ بھی ہیں لیکن وہ کمپلیکس انتہائی گندہ تھا۔ لفٹ تو دو دو تھیں لیکن شاید کافی عرصے سے خراب پڑی تھیں۔ زینے میں تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے اس لیے وہاں مکمل خاموشی تھی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں پر جگہ جگہ پان کے دھبے تھے۔ دیواریں بھی بہت گندی تھیں۔ ان پر بھی پان کی پچکاریوں کے نشانات تھے۔ زینے میں سیلن بھی تھی اور عجیب سی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں دو فلور چڑھ گیا۔ لیکن مجھے کسی بھی فلیٹ میں روشنی نظر نہیں آئی۔

میں پانچویں فلور پر پہنچا تو وہاں بھی مکمل تاریکی اور سناٹا تھا۔ میں نے جھنجلا کر سوچا کہ دلاور ضرور دوسرے بلاک میں گیا ہوگا۔ میں فضول میں یہاں خوار ہو رہا ہوں اور مجھے بھلا ضرورت ہی کیا تھی یہاں آنے کی؟ دلاور نے جو احسان مجھ پر کیا تھا، میں نے اس سے کہیں زیادہ اس کا بدلہ چکا دیا تھا۔ اب میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟

میں واپسی کے لیے پلٹا تو مجھے ایک فلیٹ سے فائر کی آواز آئی پھر کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ کوریڈور میں دائیں جانب کا تیسرا فلیٹ تھا۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھا۔

کوئی انتہائی کرخت آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''حرام زادے! تو کیا سمجھتا ہے تو بھائی کو اتنی آسانی سے مار دے گا... بھائی کو دو گولیاں لگی ہیں اور وہ اسپتال میں ہے۔ تجھے تو اسپتال جانا بھی نصیب نہیں ہوگا۔ تیری لاش یہیں پڑی سڑتی رہے گی۔ مجھے صرف اتنا بتا دے کہ تجھ سے کس نے کہا تھا کہ تو بھائی کو گولی مار دے؟''

''جس نے بھی کہا تھا، وہ تم لوگ کا دوست تو نہیں ہو سکتا۔'' مجھے دلاور کی آواز سنائی دی۔

''اس کا نام بتا۔'' اس نے شاید دلاور کو تھپڑ مارا تھا۔

''کتنے پیسے دیے تھے اس نے؟''

''ابھی اس نے صرف تین پرسنٹ دیا ہے... باقی پیسا کام ہونے کے بعد اور کام تو ابھی ہوا نہیں۔''

''الو کے پٹھے۔'' وہی غراتی ہوئی آواز آئی۔ ''کام تو میں تیرا تمام کروں گا۔ بس تو ایک دفعہ اس آدمی کا نام بتا دے جس نے تجھے استعمال کیا ہے۔''

''یہ ایسے نہیں بتائے گا بھائی۔'' ایک دوسری آواز آئی۔ ''اسے یہاں سے لے چلو۔''

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔

اندر کا منظر میری توقع کے عین مطابق تھا۔ دلاور فرش پر پڑا تھا اور اس کے زخم سے پھر خون بہنے لگا تھا۔

میرے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ میں نے اچانک دہاڑ کر کہا۔ ''ہینڈز اپ! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ تم لوگ اپنے ہتھیار پھینکو اور اوندھے منہ لیٹ جاؤ، جلدی کرو۔''

وہ تعداد میں چار تھے۔ انہوں نے اپنی گنز پھینکیں اور فوراً اوندھے منہ لیٹ گئے۔ وہ اپنے حلیوں سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔

انہوں نے جو ہی گنز پھینکیں، دلاور نے جھپٹ کر وہ گنز سمیٹ لیں۔ ان میں سے دو اس نے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑس لیں اور دو کے میگزین خالی کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ پھر اس نے اس شخص کو زوردار لات رسید کی جو اس سے سوال جواب کر رہا تھا۔

''تو بہت پچھتائے گا دلاور۔'' وہ شخص لات کھا کر بولا۔

''بکواس بند کر تیری...'' دلاور نے اسے ایک غلیظ گالی دی۔ ''ابھی ہم لوگ چاہے تو تم سب کا کھوپڑی اڑا سکتا ہے لیکن ہم ایسا کرے گا نہیں۔ ابھی ہم لوگ جا رہا ہے۔ زیادہ شور شرابا نہیں کرنا۔'' ان میں سے ایک شخص نے اٹھ کر دلاور پر جھپٹنا چاہا لیکن دلاور نے اس پر فائر کر دیا۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دلاور نے اس پر نہیں بلکہ ہوا میں فائر کیا تھا پھر وہ محتاط انداز میں فلیٹ سے باہر نکلا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ باہر نکل آیا۔ اس نے پھرتی سے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی اور مجھ سے بولا۔ ''باہر بھاگ۔''

ہم دونوں باہر کی طرف بھاگے۔ میں ایک ایک

چھلانگ میں دو دو سیڑھیاں اترتا ہوا باہر آ گیا۔ حیرت تو مجھے دلاور پر تھی۔ وہ بہت سخت جان تھا۔ اتنا زخمی ہونے کے باوجود وہ بہت پھرتی سے نیچے پہنچا تھا۔

اسی وقت مجھے ہلکا سا ایک دھماکا سنائی دیا۔

"ان لوگوں نے دروازہ توڑ دیا ہے۔" دلاور بولا۔

"جلدی نکل یہاں سے۔" میں بھاگ کر اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ دلاور بھی بھاگ کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور چیخ کر بولا۔ "ابھی نکل یہاں سے ورنہ وہ لوگ ہم دونوں کو ختم کر دیں گے۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

دلاور پیچھے دیکھ رہا تھا۔ وہ چیخ کر بولا۔ "کمال گاڑی بھگا۔ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔"

میں نے اسپیڈ مزید بڑھا دی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ میں دیوانہ وار گاڑی دوڑا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رات کے اس پہر یوں ڈرائیونگ کرنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت ہر گاڑی والا یہی سمجھتا ہے کہ سڑک سنسان ہے۔ یوں گاڑیوں میں بعض اوقات خوفناک تصادم ہو جاتا ہے۔ ایسے تصادم میں دونوں میں سے کوئی گاڑی والا بھی نہیں بچتا بس اس وقت مجبوری تھی اگر میں رفتار کم کرتا تو پیچھے آنے والوں کی گولیوں کا شکار ہو جاتا۔ وہ کم بخت اب میری گاڑی پر فائرنگ بھی کر رہے تھے اور اس مرتبہ فائرنگ کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ گولی جب گاڑی کے کسی حصے سے ٹکراتی تو ہلکی سی آواز آتی تھی۔

"اڑے تم کیا کر رہا ہے، کیا تمہیں ڈرائیونگ نہیں آتی۔ گاڑی کو اسپیڈ دیو۔" دلاور غرا کر بولا۔

"اور کتنی اسپیڈ دوں۔" میں جھنجلا کر بولا۔ "یہ کوئی سپر ہائی وے نہیں ہے پھر بھی میں سو اور ایک سو دس کی اسپیڈ سے چل رہا ہوں۔"

میں تعاقب کرنے والوں کو ڈاج دینے کے چکر میں تھا۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے مجھے ایک زیر تعمیر بنگلا نظر آیا۔ اس پر ابھی تک گیٹ نہیں لگا تھا۔ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر گاڑی اس طرف دوڑا دی اور گیٹ سے کچھ فاصلے پر باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ دو منٹ بعد مجھے دوسری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ گاڑی تیز رفتاری سے گزر گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا، پھر دلاور سے بولا۔ "آپ مجھے جب تک سچ نہیں بتائیں گے، میں آپ کی مدد کیسے کروں گا؟"

"تو چلا گیا تھا، پھر پلٹ کر کیوں آیا؟"

"میرا خیال تھا کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے آپ عجیب دار ہیں نہ آپ بچ بچاؤ کراتے ہوئے زخمی ہوئے ہیں۔"

"ہاں، میں کرائے کا قاتل ہوں، ٹارگٹ کلر۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم کرائے کے قاتل ہو؟" میں نے پہلی دفعہ اسے تم کہہ کر پکارا۔

"ہاں، میں کرائے کا قاتل ہوں اور پیسا لے کر کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں۔"

"پھر تم نے میری جان کیوں بچائی؟ مرنے دیا ہوتا مجھے؟"

"یہی تو ساری خرابی ہے۔ اس ٹیم پتا نہیں ہم لوگ کو کون سا کیڑے نے کاٹا تھا کہ تیری جان بچالیا۔"

"تم اندر سے بُرے آدمی نہیں ہو دلاور۔" میں نے کہا۔ "بس...."

"ابھی اپنا یہ لیکچر بند کر اور مجھے کسی جگہ چھوڑ دے۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکا کر کہا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی۔ اچانک زوردار دھماکا ہوا اور گاڑی رک گئی۔

"شٹ۔" میں دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ دلاور گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ آگے بلاکس کا ایک ڈھیر تھا۔ جھنجلاہٹ اور جلد بازی میں مجھے وہ ڈھیر نظر نہیں آیا اور گاڑی اس سے ٹکرا گئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں گاڑی کا جائزہ لیا۔ اس کا ریڈی ایٹر ٹوٹ گیا تھا اور پانی بہہ کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" دلاور نے پوچھا۔

"گاڑی کا ریڈی ایٹر ٹوٹ گیا۔" میں نے کہا۔ "اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔" پھر میں نے کہا۔ "اس وقت ہم صفورا گوٹھ کے پاس ہیں۔ ممکن ہے مین روڈ سے کوئی سواری مل جائے۔ چلو اترو۔"

دلاور بمشکل تمام اترا۔ اس کا زخم دوبارہ کھل گیا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے گاڑی کی ڈگی سے گاڑی صاف کرنے والا کپڑا نکالا اور وہ دلاور کے سینے پر باندھ دیا تاکہ اس کا خون رک جائے۔ پھر ہم گرتے پڑتے مین روڈ کی طرف چل دیے۔

میں نے سوچا کہ میں اپنے کسی دوست کو بلاؤں لیکن میں اپنے کسی دوست کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا

تھا۔ ہر آدمی تو ڈاکٹر شاہد نہیں ہوتا۔ ان میں سے کوئی پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا پھر مجھے روبی کا خیال آیا۔ اس وقت وہی میری مدد کر سکتی تھی۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور روبی کا نمبر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ ظاہر ہے کہ روبی اس وقت گہری نیند میں ہوگی۔ میں مایوس ہو کر سلسلہ منقطع کرنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے روبی نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو!'' اس کی غنودہ آواز سنائی دی۔

''سوری روبی! اس وقت تمہیں ڈسٹرب کر رہا ہوں، میں...''

''کامی!'' روبی کی غنودگی ایک دم غائب ہو گئی۔ ''آر یو آل رائٹ؟''

''ہاں روبی، میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن معمولی سی ایک پرابلم ہے۔''

''کیسی پرابلم؟'' روبی نے پوچھا۔

''میری گاڑی کا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور...''

''وہاٹ؟'' روبی چیخ کر بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''ہاں بولو۔''

''کیا تم اس وقت صفورا گوٹھ تک آسکتی ہو؟''

''صفورا گوٹھ؟'' روبی نے چونک کر پوچھا۔ ''تم وہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تم یہاں آسکتی ہو یا نہیں؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اچھا، میں آرہی ہوں۔'' روبی نے طویل سانس لے کر کہا۔

''سنو، اپنے ساتھ میری ٹی شرٹ لے آنا، وہ جو میں نے کچھ دن پہلے تمہارے گھر چھوڑ دی تھی۔''

پرابلم کیا ہے کمال؟'' روبی نے جھنجلا کر کہا۔ ''تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟''

''یہاں آؤ گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''بس تم جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اب کس کو فون کر دیا؟'' دلاور نے کہا۔

''کسی نہ کسی کو تو کرنا ہی تھا۔ میں ساری رات تو یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''تو واپس کیوں آیا تھا؟'' دلاور نے جھنجلا کر کہا۔ ''ابھی آیا تھا تو برداشت کر یا مرنے دیتا مجھے۔''

''ہاں واقعی مجھے نہیں آنا چاہیے تھا لیکن... میں تمہیں مرنے بھی تو نہیں دے سکتا۔''

''تو کرتا کیا ہے، پڑھتا ہے؟''

''میں پڑھ چکا ہوں۔ اب جاب کرتا ہوں۔''

''شادی ہو گیا تیرا؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تیری گھر والی تو بہت پریشان ہوگی۔'' اس نے کہا۔

''میری گھر والی آج کل گھر میں نہیں ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ، تم نے کس کے کہنے پر قتل کیا ہے؟''

''کام پورا کدھر ہوا۔ بچ گیا سور کا بچہ۔'' دلاور نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر اپنا سیل فون نکال کر نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ''ہاں، پیسا کب دے گا... میں نے تو اپنا کام کر دیا... وہ نہیں مرا تو میں کیا کروں؟... ٹھیک ہے ہم ایک بار پھر ٹرائی کرتا ہوں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

''پھر کیسے ٹرائی کرو گے؟'' میں نے کہا۔ ''تمہارا شکار تو اس وقت کراچی کے سب سے بڑے اسپتال میں ہے۔ وہاں کی سیکیورٹی بہت زبردست ہے۔ پھر اب تو وہاں پولیس بھی ہوگی اور زخمی آدمی کے اپنے لوگ بھی ہوں گے۔''

''سب کو دیکھ لے گا۔'' دلاور نے کہا۔

اسی وقت مین روڈ پر ایک گاڑی آکر رکی۔ دلاور.... چونک اٹھا۔ میں روبی کی گاڑی پہچان چکا تھا اس لیے دلاور کا ہاتھ تھپتھپایا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

میں گاڑی کے نزدیک پہنچا تو روبی نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو کامی؟''

''ٹی شرٹ لائی ہو میری؟''

''ہاں، لائی ہوں۔'' اس نے ٹی شرٹ میرے حوالے کر دی۔

سردی سے بچنے کے لیے روبی نے گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ میں نے اس کی شال بھی کھینچ لی اور واپس وہیں چلا گیا جہاں دلاور بیٹھا تھا۔ میں نے ٹی شرٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنی شرٹ اتار کر یہ پہن لو ورنہ پولیس نے اگر دیکھ لیا تو مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ یہ لو شال، یہ بھی

اوپر سے لپیٹ لو، آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے اور تمہارے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے۔'' پھر میں نے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے پیسے نکالنے لگا۔

''او۔'' دلاور نے مجھے ٹوکا۔ ''یہ پیسا دینا! اپنے پاس رکھ... میرے پاس پیسا ہے۔''

''او کے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں چلتا ہوں، بیسٹ آف لک۔''

میں اسے فٹ پاتھ پر چھوڑ کے روبی کے نزدیک آیا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

روبی نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کون تھا یہ؟''

''تم ایک بات بتاؤ۔'' میں نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی تمہاری جان بچائے اور پھر خود اس کی جان خطرے میں ہو تو تم کیا کرو گی؟''

''میں اس کی ہیلپ کروں گی بلکہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا کروں گی۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو... کہیں... یہ وہ آدمی تو نہیں جس نے اسپتال پہنچا کر تمہاری جان بچائی تھی؟''

''ہاں، یہ وہی ہے اور اب اس کی جان خطرے میں ہے۔''

''اور تم اسے یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ لیے۔''

''میں نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے روبی۔'' میں نے کہا۔

''کیا خاک کیا ہے۔'' روبی چڑ کر بولی۔ ''اس کی جان تو اب بھی خطرے میں ہے۔''

''گاڑی واپس موڑ دو۔'' میں نے اچانک کہا۔ دلاور کو تنہا چھوڑتے ہوئے میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ وہ بُرا آدمی تھا، قاتل تھا لیکن مجھے تو اس نے ایک نئی زندگی دی تھی۔ بے شک زندگی دینے والا تو اللہ ہے لیکن ذریعہ تو وہی بنا تھا۔

ہم بہت برق رفتاری سے وہاں پہنچے۔ دلاور وہاں نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر مجھے کچھ انسانی ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا ہوں۔

میں نے دور ہی سے دلاور کو پہچان لیا۔ چند آدمی اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

''گاڑی وہیں لے چلو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

روبی نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی اور ان لوگوں کے سر پر جا پہنچی۔ مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ لوگ دلاور کو زندہ پکڑنا چاہ رہے ہیں۔

گاڑی دیکھتے ہی انہوں نے پے در پے... تین فائر گاڑی پر کر دیے، ایک گولی بونٹ سے ٹکرائی اور بقیہ دو اچٹتی ہوئی چھت پر لگیں۔

گاڑی ریورس کرو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ وہ لوگ دلاور کو زندہ پکڑنا چاہتے تھے، ہماری زندگی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

روبی نے گاڑی ریورس کرنے کے بجائے انتہائی تیز رفتاری سے ان لوگوں کی طرف بڑھا دی۔ لینڈ کروزر جیسی بھاری بھرکم گاڑی یوں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ لوگ بری طرح بوکھلا گئے اور پلٹ کر بھاگے لیکن وہ گاڑی سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتے تھے۔ دوسرے ہی لمحے دو کے جسم گاڑی سے ٹکرائے اور وہ ہوا میں اچھل گئے۔ روبی نے پھر گاڑی ریورس کی اور اس کا رخ بقیہ دو افراد کی طرف کر دیا۔ وہ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ فائر کرنا ہی بھول گئے اور دلاور کو چھوڑ کر دوڑ لگا دی۔ دلاور اچھل کر گاڑی کی عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ روبی نے گولی کی سی رفتار سے گاڑی وہاں سے نکال لی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ دلاور نے جاتے جاتے فائر کر کے اس کے دو ٹائر فلیٹ کر دیے۔

''تیری بیوی تو بہت زبردست ہے یار۔'' دلاور نے کہا۔

نروس

ایک حادثے کے نتیجے میں مجھے حال ہی میں اسپتال داخل ہونا پڑا۔ آپریشن سے نصف گھنٹا قبل سرجن میرے پاس آ کر پوچھنے لگا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔

میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''نروس۔''

''اوہ۔'' اس نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ''میری صورت حال بھی تم سے مختلف نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں ہی آپریشن سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

”یہ میری بیوی نہیں ہے، بال بال بچ گئی میری بیوی بننے سے۔“ میں نے کہا۔

”ابھی تم لوگ کدھر جارہے ہو؟“ دلاور نے پوچھا۔ اس بھاگ دوڑ اور اچھل کود سے اس کا زخم پھر رسنے لگا تھا۔

”تمہیں کہاں جانا ہے؟“ روبی نے پوچھا۔

”مجھے سپر ہائی وے پر چھوڑ دو۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں کراچی سے باہر نکل جاؤں گا۔“

☆☆☆

میں آفس سے واپس آیا تو بابا سائیں کی پراڈو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ بابا سائیں سے ملاقات ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ میں جب ایکسیڈنٹ کے بعد گھر واپس آیا تھا تو بابا سائیں سے ملاقات ہوئی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوا تو سرور نے بتایا کہ بابا سائیں ابھی بیڈروم میں ہیں۔

”ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ میں نے سرور سے پوچھا۔

”صاحب! ان کی طبیعت تو ٹھیک تھی لیکن سفر سے انہیں کچھ تھکن ہو گئی تھی اس لیے وہ سو گئے تھے۔“

میں نے بابا سائیں کے کمرے میں جھانکا تو وہ جاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”آؤ کامی! آج تم نے بہت دیر لگا دی۔“

”جی بابا سائیں! آج کل کام کچھ زیادہ ہی ہے۔ اماں اور مادری ٹھیک ہیں؟“

”ہاں بیٹا! وہ دونوں ٹھیک ہیں۔“ بابا سائیں نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک دے کر سرور اندر آیا۔ وہ چائے کی ٹرالی لے کر آیا تھا۔ وہ ٹرالی میرے سامنے رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”کامی! میں نے اس مرتبہ اپنے حلقے سے ایم این اے کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”بابا سائیں! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ نے کون سی پارٹی جوائن کی ہے؟“

بابا سائیں مسکرائے اور بولے۔ ”کامی بیٹا! مجھے بھلا کوئی پارٹی جوائن کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن جیت کر دکھاؤں گا۔ اگر یاسین شاہ زندہ ہوتا تو مقابلہ ذرا سخت ہوتا۔ اس کے مرنے کے بعد تو کوئی میرے مقابلے پر آ ہی نہیں سکتا۔“

”بابا سائیں! آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ کون یاسین شاہ؟“ میں نے پوچھا۔

”تم شاہ جی کو نہیں جانتے؟“ بابا سائیں نے کہا۔

”اچھا اچھا، وہ کب مرا بابا سائیں؟“

”لگتا ہے آج کل تم نے اخبار پڑھنا اور ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ پچھلے ہفتے کسی ٹارگٹ کلر نے اسے گولی مار دی تھی۔“

ان کی بات پر میں بری طرح چونکا۔

”ہاں اس شخص کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کامی جس نے تمہیں اسپتال پہنچایا تھا؟“

”ابھی تک تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

پھر وہ موضوع بدل کر بولے۔ ”تم صبح سے رات تک مصروف رہتے ہو۔ تمہیں آخر آفس میں کتنا کام کرنا پڑتا ہے؟“

”سب کچھ میں ہی کرتا ہوں بابا سائیں۔“ میں نے کہا۔ ”شیرازی صاحب تو دس پندرہ دن میں ایک دفعہ آفس آتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس کاروبار کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی بابا سائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کامی بیٹا! دوسروں کے لیے اتنی محنت کرنے سے بہتر نہیں ہے کہ یہ محنت اپنے لیے کی جائے؟“

”جی لیکن میں سمجھا نہیں بابا سائیں۔“

”اگر تم یہ کاروبار اپنے طور پر کرو تو ایسا ممکن ہے۔ تم زمینداری اور جاگیرداری نہیں کرنا چاہتے تو اپنا کاروبار ہی اسٹیبلش کر لو۔“

بابا سائیں کی بات مناسب تھی، میں نے کہا۔ ”اس کے لیے بہت سرمایہ چاہیے بابا سائیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، میں سرمایہ نہیں لگا سکتا؟ کامی بیٹا! تم کاروبار شروع کرو، میں اس میں پیسا لگا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے بابا سائیں، میں شیرازی صاحب سے بات کروں گا۔“

”ہاں، وہ مائرہ کو جا کر لے آنا۔“

میں نے بابا سائیں کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ”بابا سائیں! اس نے آپ سے گستاخی کی ہے۔ میں اسے نہیں لاؤں گا۔ اس دن کے بعد تو اس نے ایک بار بھی مجھے ٹیلی فون تک نہیں کیا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اسے لے آؤں؟“

''بیٹا! غصہ تو مجھے بھی بہت تھا لیکن وہ اس گھر کی بہو ہے۔ عزت ہے ہماری، میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔''

''لیکن بابا سائیں، میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے۔ میں اسے لے کر نہیں آؤں گا۔''

''کامی!'' بابا سائیں اتنی زور سے چیخے کہ ان کی آواز پورے گھر میں گونج کر رہ گئی۔ ''تو میرے سامنے زبان درازی کر رہا ہے۔ میرے حکم سے انکار کر رہا ہے۔ پھر کس منہ سے مائرہ کو قصوروار سمجھ رہا ہے۔ اس نے بھی تو یہی کچھ کیا تھا۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ''جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔''

میں غصے میں بھرا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ مائرہ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ خالو جان کی زمینیں ہماری زمینوں سے بھی زیادہ تھیں۔ وہ اکلوتی تھی اور وسیع و عریض جائیداد کی مالک تھی۔ شاید اسی لیے وہ دوسروں کی تحقیر کرتی تھی۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ وہ بہت حسین بھی تھی اور اسے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ شاید میں اسے برداشت کر ہی لیتا لیکن روبی کا وجود اس کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ میں نے اسے کئی دفعہ سمجھایا تھا کہ روبی اب صرف میری دوست ہے، اس کے علاوہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس کی کھوپڑی میں یہ بات آتی ہی نہیں تھی۔

اب بابا جان کا حکم تھا تو اسے لے کر آنا تھا۔ اپنے تمام تر غرور اور تکبر کے باوجود مائرہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اسی نے خالہ جان کو مجبور کیا اور انہوں نے اماں کی خوشامد کی، یوں میری شادی مائرہ سے ہوئی تھی۔

بابا سائیں کا حکم تھا اس لیے میں مائرہ کے گھر جا پہنچا۔ وہ گھر کیا تھا، اچھا خاصا محل تھا۔ وہاں کے سب نوکر مجھے پہچانتے تھے۔ میں ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا سیدھا مائرہ کے بیڈروم میں پہنچا۔ وہ شاید کچھ دیر پہلے نہا کر نکلی تھی اور اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہیئر ڈرائیر سے اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو خشک کر رہی تھی۔

آئینے میں میرا عکس دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھی۔ اس نے ڈرائیر ایک طرف پھینکا اور میری طرف گھوم گئی پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اب تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

میں اس کی بات پر سنگ کر رہ گیا۔ میں نے خود پر قابو پا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

''مجھے لینے آئے ہو؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے باپ نے تو وہاں میرا داخلہ بند کر دیا ہے اور تم...''

''مائرہ!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''بابا سائیں ہی نے مجھ سے کہا ہے کہ مائرہ کو لے کر آؤ۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' مائرہ نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا باپ اگر جاگیردار ہے تو گری پڑی میں بھی نہیں ہوں۔''

''تمیز سے بات کرو مائرہ۔'' میں بپھر گیا۔

''میں بدتمیز ہوں تو مجھے لینے کیوں آئے ہو، میں نے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گی تو پھر نہیں جاؤں گی۔''

''تو پھر ہمیشہ یہاں بیٹھی رہو۔'' میں نے بپھر کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

بابا سائیں شاید میرے انتظار میں برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہوا کامی! مائرہ کہاں ہے؟''

''اس نے آنے سے انکار کر دیا۔''

''ارے بے وقوف اسے منا کر لاتا، عورت کو منانا کون سا مشکل ہے۔''

''بابا سائیں! وہ آپ کا ذکر بھی بہت حقارت سے کر رہی تھی۔ میں اسے نہیں لاؤں گا، طلاق دے دوں گا اُسے۔''

بابا سائیں نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ میرے رخسار جلنے لگے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی دفعہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولے۔ ''طلاق کا لفظ ہمارے خاندان میں گالی ہے۔ آئندہ یہ لفظ زبان پر مت لانا۔'' پھر وہ آہستہ سے بولے۔ ''بیٹا! تم اور مائرہ دونوں جذباتی ہو، میں خود تجھے وہاں لے کر جاؤں گا۔''

''بابا سائیں! وہ آپ کو بھی بے عزت کر دے گی اور یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس کی ماں کے سامنے اس سے بات کروں گا۔''

میں بابا جان کو کیسے بتاتا کہ سارے فساد کی جڑ تو خالہ جان تھیں۔ مائرہ ان ہی کی شہ پر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بابا سائیں، مائرہ کے گھر جانے کو تیار ہو گئے۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بابا سائیں کے سامنے مجبور تھا۔

بابا سائیں کی پراڈو دیکھ کر چوکیدار نے فوراً گیٹ کھول دیا۔

ہم گاڑی سے اتر کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

تھوڑی دیر بعد خالہ جان بھی وہاں آ گئیں۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں سلام کیا۔ انہوں نے بہت سپاٹ اور سرد لہجے میں میرے سلام کا جواب دیا پھر بابا سائیں سے بولیں۔ ”کیسے آنا ہوا اڈا؟“

”میں اپنی بہو کو لینے آیا ہوں۔“ بابا سائیں نے کہا۔

”وہ نہیں جائے گی۔“ خالہ جان نے سخت لہجے میں کہا۔

”بچوں جیسی باتیں مت کرو ساجدہ۔“ بابا سائیں نے کہا۔ ”ذرا مائرہ کو یہاں بلاؤ۔“

”میں نے کہا نا کہ وہ اب نہیں جائے گی۔“ پھر وہ مجھ سے بولیں۔ ”کمال! بہتر ہے کہ تم اسے طلاق دے دو۔“

”ساجدہ!“ بابا سائیں نے بپھر کر کہا۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”اڈا! میں کورٹ میں جا کر خاندان کی عزت اچھالنا نہیں چاہتی اس لیے...“

”تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہو، میں تم سے پھر بات کروں گا۔“

”آپ ایک سال بعد بھی بات کریں گے تو میں یہی جواب دوں گی۔ اب آپ لوگ میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دیں۔“

”خالہ جان، میں...“

”خاموش رہو کمال۔“ بابا سائیں نے مجھے بولنے سے روک دیا اور غصے میں وہاں سے باہر نکل گئے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ہم گھر پہنچے تو ایک بری خبر میری منتظر تھی۔ میرے چاچو کو نامعلوم افراد نے گولیاں مار کے ہلاک کر دیا تھا۔

ہم فوراً ہی گوٹھ کے لیے روانہ ہو گئے۔

چاچو شاہ زیب، بابا سائیں سے تقریباً سولہ سال چھوٹے تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ میرے ایک ہی چچا تھے اور اب وہ بھی نہیں رہے تھے۔ بابا سائیں غم سے نڈھال تھے۔ انہوں نے چاچو کو بچوں کی طرح پالا تھا۔ چاچو کی موت کے بعد یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ انہوں نے اپنے حصے کی ساری جائداد میرے نام کر دی تھی۔ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ نہ جانے کیوں انہوں نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔

اس موقع پر روبی بھی گوٹھ آ گئی تھی۔ مارویٰ کی تو اس سے بہت بنتی تھی۔ اماں البتہ اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ روبی نے ان کی بھانجی کا حق مار لیا تھا۔

چاچو کی موت کے بعد میں پھر کراچی آ گیا۔ بابا سائیں گوٹھ میں تھے۔

اس صبح چھ بجے کے قریب ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی سے میری آنکھ کھل گئی۔ دوسری طرف مائرہ کا ملازم تھا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ ادی مائرہ اور بڑی ادی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں گوٹھ سے واپس آ رہی تھیں کہ جامشورو کے نزدیک ان کی گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سائیں، میں حیدرآباد کے لیاقت اسپتال میں ادی کے ساتھ ہی تھا۔“

”مائرہ اور خالہ جان کیسی ہیں؟“

”سائیں! اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ ملازم نے روتے ہوئے کہا۔

”اچھا، میں حیدرآباد پہنچ رہا ہوں۔“

میں نے ٹیلی فون رکھ کے بابا سائیں کو ایکسیڈنٹ کی اطلاع دی اور خود اسی وقت حیدرآباد روانہ ہو گیا۔

حیدرآباد پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ خالہ جان اور مائرہ تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئی تھیں۔ اسپتال پہنچ کر ڈرائیور بھی مر گیا۔ صرف ان کا ملازم جان محمد زندہ بچا تھا۔ وہ بھی بری طرح زخمی تھا لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

تھوڑی دیر بعد اماں اور بابا سائیں بھی حیدرآباد پہنچ گئے۔ اماں تو غم سے نڈھال تھیں۔ بابا سائیں بھی غم زدہ تھے۔ ہم خالہ جان اور مائرہ کی میت لے کر گاؤں آ گئے۔

ان کی تدفین کے چار دن بعد میں کراچی آ گیا۔ اب قانون کی رو سے مائرہ کی تمام زمین، جائداد مجھے مل گئی کہ میں ہی اس کا قانونی وارث تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی دولت کا کروں گا کیا؟ سیکڑوں ایکڑ زرعی اراضی تو بابا سائیں کی بھی تھی۔ پھر اتنی ہی چاچو کی تھی جو اب میرے نام ہو چکی تھی۔ اس سے زیادہ زمینیں اور جائداد خالہ جان کی تھیں جن کی وارث مائرہ تھی۔ اب وہ جائداد بھی مجھے مل چکی تھی۔

دولت اب میرے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔ چاچو کی موت کے بعد تو میں نے جاب بھی چھوڑ دی تھی اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے میں نے ایک این جی او بنالی تھی۔ اس رفاہی کام میں روبی بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے اماں کو ٹیلی فون پر اطلاع دینے کے بجائے

خود گوٹھ جانا مناسب سمجھا۔

وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ بابا سائیں نے ماروی کی شادی طے کردی ہے اور اگلے مہینے اس کی شادی ہے۔

یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ اماں کو ماروی کی بہت فکر تھی۔

میں نے اماں کو بتایا کہ میں روبی سے شادی کررہا ہوں۔

''ہاں بیٹا!'' اماں نے کہا۔ ''تو خاموشی سے شادی کرلے۔ اپنے بابا سائیں کو بعد میں بتانا۔''

''کیوں اماں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹا! تیرے بابا سائیں تیری شادی اپنے ایک ماموں زاد ابراہیم کی بیٹی سے کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیوں اماں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا خاص بات ہے اس میں؟''

''اس میں خاص بات صرف یہ ہے کہ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔'' اماں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''نہیں چاہیے مجھے کسی بڑے باپ کی بیٹی۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے کراچی پہنچ کر روبی کو گھر بلایا اور بغیر کسی تمہید کے اس سے کہا۔ ''روبی! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''یہ بات تم پوچھ رہے ہو کامی؟'' روبی نے کہا۔ ''میں تو کب سے اس جملے کا انتظار کررہی تھی۔''

''تو پھر ہم شادی کررہے ہیں۔ آج شام۔'' میں نے کہا۔

''اتنی جلدی؟'' روبی نے ہنس کر پوچھا۔

''ہاں، مجھے اتنی ہی جلدی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے والدین سے بات کرلو۔''

''انہوں نے تو بہت پہلے مجھے اجازت دے دی تھی۔ میں ایک دفعہ پھر ان سے بات کرلوں گی۔''

میں نے اپنے اور روبی کے چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں روبی سے نکاح کرلیا اور وہ دلہن بن کر میرے گھر آگئی۔

میں اب مائرہ کے محل نما گھر میں شفٹ ہوگیا تھا۔ وہ گھر اب میری ہی ملکیت تھا۔ میں وہاں شفٹ نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن بابا سائیں کو اپنے بنگلے کی ضرورت تھی۔

روبی سے شادی کے ایک ہفتے بعد ہم لوگ بابا سائیں سے ملنے گوٹھ روانہ ہوگئے۔ اصل مقصد تو بابا سائیں کو اطلاع دینا تھا۔

گوٹھ پہنچتے پہنچتے ہمیں شام ہوگئی۔ بابا سائیں زمینوں پر تھے اور دوسرے دن آنے والے تھے۔

اماں مجھے اور روبی کو دیکھ کر خوش ہوگئیں اور بولیں۔

''اچھا ہوا تم آگئے۔ میں ابھی تمہیں ٹیلی فون کرنے ہی والی تھی۔ اگلے ہفتے ماروی کا نکاح ہے اور دو مہینے بعد اس کی رخصتی ہے۔''

یہ خبر سن کر روبی بھی خوش ہوگئی اور اماں سے بولی۔

''اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ماروی کی شادی کا سب انتظام میں کروں گی۔''

روبی اس سے پہلے ایک دفعہ گوٹھ آچکی تھی لیکن اسے زیادہ دن رہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ماروی اسے حویلی دکھانے لے گئی۔

دوسرے دن بابا سائیں آگئے۔ وہ جیسے ہی حویلی کے صحن میں داخل ہوئے۔ ان کی نظر روبی پر پڑی جو ماروی سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔

بابا سائیں کچھ دیر اسے گھورتے رہے، پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ماروی یا روبی کو ان کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔

میں اماں کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد بابا سائیں بھی وہیں آگئے اور درشت لہجے میں بولے۔ ''یہ روبی یہاں کیوں آئی ہے؟''

''اسے میں لایا ہوں بابا سائیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب تم اتنے خودسر اور گستاخ ہوگئے ہو کہ غیر عورتوں کو حویلی میں بھی لانے لگے ہو اور بہت ڈھٹائی سے اس کا اعتراف بھی کررہے ہو۔''

''روبی غیر تو نہیں ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''برسوں سے ہمارے گھر آتی رہی ہے۔''

''گھر آنے سے کیا ہوتا ہے، ہے تو وہ غیر ہی۔''

''وہ غیر نہیں ہے بابا سائیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ میری بیوی ہے۔''

بابا سائیں یوں اچھلے جیسے ان کا پاؤں دہکتے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔ وہ غراتے ہوئے بولے۔ ''بیوی! تم نے شادی کب کی ہے اس سے؟''

''میں نے پچھلے ہفتے شادی کی ہے بابا سائیں۔'' میں نے کہا۔

''کس کی اجازت سے؟'' بابا سائیں کا پارا چڑھتا

جا رہا تھا۔

''مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے بابا سائیں۔''

''ہمارا خاندان ایسی شادیوں کو نہیں مانتا۔'' بابا سائیں بری طرح چیخے۔

''خاندان نہ مانے، میں تو مانتا ہوں۔''

''بکواس بند کرکاکی۔'' بابا سائیں پھر چیخے اور نکل جا یہاں سے۔ مجھے تجھ جیسے ناخلف بیٹے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اتنا غصہ مت کریں سائیں۔'' اماں نے کہا۔

''تم چپ رہو۔'' انہوں نے اماں کو بری طرح جھڑک دیا۔ ''میں ابراہیم بھائی کو زبان دے چکا ہوں۔ میری تو عزت خاک میں مل گئی نا؟''

''بابا سائیں! آپ کو مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔ آپ نے...''

''تو بکواس بند کر اور ابھی یہاں سے نکل جا۔''

میں بھی غصے میں اٹھا اور روبی سے کہا کہ چلنے کی تیاری کرو، ہم ابھی اور اسی وقت کراچی کے لیے نکل رہے ہیں۔

روبی نے جلدی جلدی میرا اور اپنا سامان پیک کیا اور ہم لوگ اسی وقت گھر سے باہر نکل گئے۔

میں گاڑی میں بیٹھ رہا تھا تو بابا سائیں کا ایک گارڈ میرے پاس آیا اور بولا۔ ''سائیں! آپ اس راستے سے مت جایئے گا جس سے ہمیشہ جاتے ہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''سائیں! اس راستے پر خطرہ ہے۔'' گارڈ نے آہستہ سے کہا۔

''کیسا خطرہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سائیں، ولی محمد اِدھر آرہا ہے۔'' پھر وہ اسے سنانے کو بولا۔ ''سائیں! ہوا، پانی، آئل میں نے سب کچھ چیک کرلیا ہے۔''

میں نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور گارڈ کو دے دیے، پھر میں نے کچھ نوٹ ولی محمد کو بھی دیے اور روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے اچانک میری نظر عقبی نشست پر پڑی۔ وہاں ایک رائفل اور ماؤزر رکھا ہوا تھا۔

میں نے روبی سے کہا۔ ''رائفل کو گاڑی کے پائیدان میں ڈال دو اور ماؤزر ڈیش بورڈ میں رکھ دو۔''

''ان ہتھیاروں کی کیا ضرورت ہے کاکی۔'' روبی نے پوچھا۔

''ابھی لمبا سفر ہے، ہتھیار تو ہونا چاہیے نا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

میں نے کراچی کے بجائے گاڑی کا رخ سکھر کی طرف موڑ دیا۔

''یہ ہم کراچی تو نہیں جارہے ہیں؟'' روبی نے پوچھا۔

''ہاں، ہم فی الحال کراچی نہیں جارہے ہیں بلکہ لاہور کی طرف جارہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہاں مجھے کچھ کام ہے۔'' میں نے روبی کو گارڈ کی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ ہمارے لیے خطرہ ہے۔

گارڈ کو یہ بتانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ مجھے کس سے اور کس نوعیت کا خطرہ تھا۔

ہم بہ عافیت شکارپور سے گزر گئے۔

وہاں ایک جگہ رک کر میں نے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور سڑک کے کنارے ایک چھپّر ہوٹل میں چائے پی تھی۔

پھر ہم وہاں سے سکھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ نیشنل ہائی وے پر معمول کے مطابق ٹریفک تھا۔ بس کوفت مجھے ان ٹرک والوں سے ہوتی تھی جو سامنے سے آتے ہوئے راستہ دیتے تھے نہ پیچھے والی گاڑی کو اوورٹیک کرنے کا موقع دیتے تھے۔ وہ سڑک کا اچھا خاصا حصہ گھیر کر چلتے تھے۔ میں ہائی وے پر ہمیشہ کسی ٹرک کے پیچھے چلتا تھا۔ وہ ٹرک خود ہی میرے لیے راستہ بناتا تھا۔ ہاں اگر اس کی رفتار بہت کم ہوجاتی تھی تو مجبوراً مجھے اس ٹرک کو اوورٹیک کرنا پڑتا تھا۔

میں نے کچھ دیر پہلے اسی قسم کے سست رفتار اور اوورلوڈ ٹرک کو بہت مشکل سے اوورٹیک کیا تھا۔ پیچھے اچانک ایک ڈبل کیبن پک اپ نمودار ہوئی۔ میں نے عقبی شیشے میں اس کا جائزہ لیا۔ اس کا ڈرائیور بہت عجلت میں لگتا تھا۔ وہ بہت بے تابی سے جاہلوں کی طرح ہارن دے رہا تھا۔ میں نے رفتار کچھ بڑھا دی۔ وہ پھر میرے سر پر آگیا اور ہارن دینے لگا۔

''اسے راستہ کیوں نہیں دیتے کاکی؟'' روبی نے کہا۔ ''ہارن بجا بجا کر دماغ خراب کردیا ہے۔''

میں نے زیرِلب اسے برا بھلا کہتے ہوئے لینڈ کروزر کو بائیں طرف کاٹا۔

ڈبل کیبن والا زنانے سے آگے نکل گیا۔ وہ شاید کوئی

بڑا وڈیرا یا کوئی سیاسی لیڈر تھا کیونکہ ڈبل کیبن پک اپ کے عقبی حصے میں چار مسلح گارڈز بھی موجود تھے۔

"اونہہ، شو آف لوگ۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "یہ پوری سڑک کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتے ہیں۔" پک اپ کے ڈرائیور کو بھی مجھے اوورٹیک کرنے کی جلدی تھی۔ وہ اب اس رفتار سے میرے آگے آگے چل رہا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک گارڈ نے اپنے شانے سے رائفل اتاری تو مجھے ایک دم خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے ایک دم بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔۔۔ میری لینڈ کروزر تھوڑی سی لہرائی۔ اسی وقت ڈبل کیبن پک اپ سے فائر ہوا۔ اچانک فاصلہ بڑھنے اور گاڑی لہرانے سے فائر کرنے والے کا نشانہ چوک گیا اور گولی گاڑی کے بونٹ سے اچٹتی ہوئی نکل گئی۔

میں نے اچانک پورے بریک لگا دیے۔ گاڑی کچھ دور گھسٹنے کے بعد رک گئی۔ میرے پیچھے ایک کوسٹر تھی۔ اس کے ڈرائیور نے مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری گاڑی کو بچایا اور مجھے گالیاں دیتا ہوا میرے نزدیک سے گزر گیا۔ اب ڈبل کیبن پک اپ اور میری گاڑی کے درمیان وہ کوسٹر تھی۔

یہ سب چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

میں نے تیزی سے پیچھے ہاتھ ڈال کر رائفل اٹھائی اور ڈیش بورڈ سے ماؤزر نکال کر گاڑی سے باہر کود گیا۔ میں نے روبی کو بھی گاڑی سے جمپ لگانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ وہ میرے مقابلے میں نسبتاً محفوظ تھی۔ کیونکہ دائیں جانب کو وہی تھی۔ اس طرف کھائی اور خاصی بلند خودرو جھاڑیاں تھیں۔ وہ خطرہ محسوس کر کے بہت تیزی سے ان جھاڑیوں میں گھس گئی۔ میں یہ سب کچھ اپنی گاڑی کے نیچے سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں بھی تیزی سے گاڑی کی پشت پر گیا اور خودرو جھاڑیوں میں گھس گیا۔ روبی مجھ سے کچھ فاصلے پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

مجھے جھاڑیوں کی اوٹ سے ڈبل کیبن پک اپ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بھی رک چکی تھی اور اس میں سوار مسلح افراد نیچے اتر کر محتاط انداز میں ہماری گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے رائفل اٹھا کر سب سے آگے والے شخص کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی ایک کربناک چیخ گونجی اور وہ شخص ڈھیر ہو گیا۔ باقی دو آدمی ایک دم زمین پر گر گئے لیکن وہ بے وقوف اب بھی میرے نشانے کی زد میں تھے۔ میں سڑک سے کچھ نشیب میں تھا۔

میں نے دوسرے آدمی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ فضا میں پھر ایک دفعہ کربناک چیخ گونج کر رہ گئی۔ اسی وقت فضا میں سائرن کی آواز گونجی تو وہ لوگ اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر گاڑی کی طرف بھاگے اور چشم زدن میں وہاں سے فرار ہو گئے۔

ان کے فرار کے بعد میں بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ سائرن کی آواز اب بہت تیز ہو گئی تھی۔

میں گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ پولیس کی ایک پٹرول کار میرے نزدیک آ گئی۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر نے گردن باہر نکال کر پوچھا۔ "سب خیریت تو ہے سر! میں نے ابھی فائرنگ کی آواز سنی تھی۔"

"ہاں، ایک ڈبل کیبن پک اپ سے مجھ پر فائرنگ کی گئی تھی۔"

"آپ ذرا گاڑی سے نیچے آئیں گے؟" سب انسپکٹر نے کہا۔

"میں تو گاڑی سے نیچے آ جاؤں گا لیکن آپ کو فوری طور پر اس ڈبل کیبن پک اپ کا پیچھا کرنا چاہیے۔ وہ لوگ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔"

"آپ ہمیں مت سکھائیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" سب انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں جھنجلا کر نیچے اتر آیا۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" انسپکٹر نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"میں لاڑکانہ سے آ رہا ہوں۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"آپ لاڑکانہ میں رہتے ہیں؟" سب انسپکٹر نے یوں پوچھا جیسے لاڑکانہ میں رہنا جرم ہو۔

"ہاں، میں لاڑکانہ میں رہتا ہوں۔ میرا نام کمال خان ہے اور ولدیت سردار جمال خان۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اور کچھ پوچھنا ہو تو وہ بھی پوچھ لیں۔"

"آپ سردار صاحب کے بیٹے ہیں؟" سب انسپکٹر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے تو میں اپنا قومی شناختی کارڈ دکھاؤں؟"

"سوری سر۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔"

"میں تو چلا جاؤں گا آفیسر۔" میں نے طنزیہ لہجے میں

کہا۔ ''کیا آپ اس ڈبل کیبن پک اپ کا پیچھا کرنے کی زحمت کریں گے؟''

''میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں اور آگے والی پٹرول کار کو اطلاع بھی دے دیتا ہوں۔ آپ نے گاڑی کا نمبر تو نوٹ نہیں کیا ہوگا؟''

''میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا۔'' روبی نے پہلی دفعہ اس گفتگو میں حصہ لیا پھر اس نے سب انسپکٹر کو وہ نمبر لکھوا بھی دیا۔

پولیس کی گاڑی فوراً ہی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ پولیس آفیسر اس واردات کے بارے میں پہلے سے باخبر تھا۔'' میں نے کہا۔ ''نہ تو اس نے مجھ سے یہ پوچھا کہ فائرنگ سے آپ کو یا گاڑی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا، اگر فائرنگ ہوئی تھی تو گولیاں کہاں لگیں۔ وہ تو میرا نام سن کر بوکھلا گیا۔ شاید اسے یہ نہیں بتایا گیا ہوگا کہ سردار جمال خان کے بیٹے پر حملہ کرنا ہے۔''

میں نے گاڑی کا رخ دوبارہ کراچی کی طرف موڑ دیا اور پھر ہم بغیر کسی مداخلت کے کراچی پہنچ گئے۔

میں جب فریش ہو کر کھانے کی میز پر بیٹھا تو روبی نے مجھ سے کہا۔ ''کامی! یہ حملہ ہم پر کون کرا سکتا ہے؟''

''یہ بابا سائیں کا کوئی سیاسی حریف ہو سکتا ہے یا پھر وہ پرانے دشمن جنہوں نے میرے چاچو کو قتل کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن ان کی تم سے کیا دشمنی ہے؟'' روبی نے کہا۔

''تم نے ساری زندگی امریکا میں گزاری ہے اس لیے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا کہ میری ان سے کیا دشمنی ہے؟''

''اٹی وی، اب تم اپنی سیکیورٹی کا بندوبست کرلو۔''

''میں بھی ان گھٹیا سوچ والے نودولتیوں اور سیاست دانوں جیسا بن جاؤں جو گارڈز رکھنا فخر سمجھتے ہیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''لیکن تم یہ سب شوقیہ نہیں کرو گے بلکہ ضرورتاً کرو گے۔'' روبی نے کہا۔

''اوکے، میں کسی سیکیورٹی ایجنسی سے بات کروں گا۔'' میں نے اسے ٹالنے کو کہا۔

دو دن سکون سے گزر گئے۔ میں اور روبی اپنی این جی او میں مصروف تھے۔

رات کو کھانے کے بعد روبی نے فکرمندی سے کہا۔

''کامی! ابھی تک بابا سائیں کی طرف سے ہمیں کوئی چیک موصول نہیں ہوا ہے۔ اگر وہ واقعی اپنی ضد کے پکے ہیں تو اب ہمیں کوئی پیسا نہیں بھیجیں گے۔ ہمیں سروائیو کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کہیں جاب کرلوں۔ تم بھی جاب کر سکتے ہو۔''

اس کی بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور میں ہنستا ہی چلا گیا۔

وہ برا مان کر بولی۔ ''اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ہنسنے کی بات یہ ہے کہ تم عام عورتوں سے بہت مختلف ہو۔ عورتیں تو اپنے شوہر کی ایک ایک پائی پر نظر رکھتی ہیں۔ تم نے تو کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میری آمدنی کیا ہے؟ بینک بیلنس کتنا ہے؟''

''میں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' روبی نے کہا۔ ''میں تو اب بھی نہ پوچھتی لیکن ہم اتنا بڑا کام کر رہے ہیں، اس کے لیے ہمیں پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی نا۔''

''دیکھو روبی! اول تو بابا سائیں ایسا کریں گے نہیں، وہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ یقیناً اپنی مصروفیات میں مجھے چیک بھجوانا بھول گئے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''یہاں بھی میں عام عورتوں سے مختلف انداز میں سوچ رہی ہوں۔ جہاں تک میں بابا سائیں کو سمجھ سکی ہوں، وہ بہت ضدی اور انا پرست انسان ہیں۔ وہ اب تمہیں ایک روپیا بھی نہیں دیں گے۔''

''چلو، تھوڑی دیر کے لیے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے باوجود مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جتنی زمینیں اور جائداد بابا سائیں کی ہیں، اتنی ہی زمینیں چاچو کی بھی ہیں۔ وہ اپنی پوری جائداد میرے نام کر گئے ہیں۔''

''مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔'' روبی نے کہا۔

''تم میں پیسے کی ہوس نہیں ہے ورنہ تم اس بات سے ضرور باخبر ہوتیں۔ دوسری بات یہ کہ بابا سائیں کی جاگیر سے کہیں بڑی جاگیر مائرہ کی تھی۔ وہ بھی اب قانونی طور پر میری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے خود اتنی دولت سے وحشت ہوتی ہے اس لیے میں نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔''

میری وضاحت سے روبی مطمئن ہوگئی۔

ہماری این جی او نہ صرف کراچی میں بلکہ پورے سندھ میں فعال تھی۔ میں کراچی میں ایک بہت بڑا اور جدید اسپتال بنا رہا تھا۔ اس میں غریبوں کے لیے ہر قسم کے علاج

معالجے کی سہولیات بالکل مفت ہوتیں۔ اس کے علاوہ میں نے کراچی میں ایک بہت بڑے اقامتی پروجیکٹ کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ اس پروجیکٹ میں کم آمدنی والے افراد کو فری اور متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے بہت کم قیمت فلیٹس تھے۔ کراچی اور سندھ کے مختلف علاقوں میں تقریباً پچاس معیاری تعلیمی ادارے بنانے کا منصوبہ بھی تھا۔ ان اسکولوں میں غریب بچوں کے لیے تعلیم، یونیفارم اور کتابوں کی سہولیات بھی مفت فراہم کرنے کا انتظام تھا۔

میں اور روبی اس دن تھرپارکر کی طرف جانے والے تھے۔ وہاں کے لوگوں کا بنیادی مسئلہ تھا پانی۔ حکومت نے وہاں پانی کے کچھ پلانٹس لگائے تو تھے لیکن ان میں سے اِکّادُکّا ہی کام کر رہے تھے۔ اب دو یا تین پلانٹ تو وہاں کی آبادی کی ضروریات پوری نہیں کرسکتے تھے۔

مجھے کچھ ضروری کام نمٹانا تھے اس لیے میں نے روبی سے کہہ کر تم پیکنگ کرلو اور ضرورت کی تمام چیزیں گاڑی میں رکھوا دینا۔ میں ابھی آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔ تم اس وقت تک تیار ہوجانا۔"

"کیا ہم اتنے لمبے سفر پر اکیلے ہی جائیں گے؟" روبی نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتی ہو، میں اپنے ساتھ کوئی فوج لے جاؤں؟"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں تو..."

"تم پریشان مت ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں نے ایک سیکیورٹی کمپنی کی سروسز حاصل کرلی ہیں۔ اس کے گارڈز ہمارے ساتھ جائیں گے۔ وہ لوگ ابھی آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔

☆☆☆

میں واپس آیا تو گیٹ پر سیکیورٹی کمپنی کا بھیجا ہوا گارڈ موجود تھا۔ اس نے مجھے فوجی انداز میں سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔

میں گاڑی سے اتر کر اندر داخل ہوا تو روبی گھر میں موجود نہیں تھی۔ میں نے سرور سے روبی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ ابھی کسی ضروری کام سے مارکیٹ تک گئی ہیں۔

"اکیلی گئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی صاحب۔" سرور نے جواب دیا۔

مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور روبی کو کال کرنے لگا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ میں پریشان ہوگیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے روبی اپنا سیل فون گھر میں بھول گئی ہو۔ یہی سوچ کر میں بیڈ روم میں آیا اور وہاں کی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف روبی تھی اور بہت حواس باختہ تھی۔

"کیا بات ہے روبی! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"کامی! ابھی کچھ دیر پہلے بائیک پر سوار دو لڑکوں نے میری گاڑی پر فائرنگ کی ہے۔ میری زندگی تھی کہ میں بچ گئی۔ میں نے اچانک بریک لگا دیے تھے اس لیے ان کی گولیاں نشانے پر نہیں لگیں۔ میں نے دیکھا، وہ آگے جا کر پھر پلٹ کر واپس آرہے تھے۔ میں گاڑی سے باہر نکلی اور بھاگ کر ایک شاپنگ مال میں گھس گئی۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں اس وقت کلاسک شاپنگ مال میں ہوں۔" روبی نے کہا۔

"تم وہیں ٹھہرو، میں آرہا ہوں۔"

میں تقریباً بھاگتا ہوا باہر نکلا اور سیکیورٹی گارڈز سے کہا۔ "میری بیوی اس وقت خطرے میں ہے۔ آیئے میرے ساتھ چلیں۔"

سیکیورٹی کے چاق و چوبند جوان جھپٹ کر اپنی گاڑی میں بیٹھے۔ اس وقت تک میری گاڑی گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔

میں شاپنگ مال کے نزدیک پہنچا تو سڑک کے کنارے مجھے روبی کی گاڑی دکھائی دی۔ میں نے اپنی گاڑی پارکنگ میں چھوڑی اور خود بھاگتا ہوا شاپنگ مال میں داخل ہوا۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ سیکیورٹی گارڈز میرے پیچھے آئے ہیں یا نہیں؟

مجھے دیکھ کر روبی ایک دکان سے نکل آئی۔ وہ کچھ پریشان ضرور تھی لیکن خوف زدہ نہیں تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو روبی؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں جب ہی تو تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔" روبی خفیف انداز میں مسکرا کر بولی۔

"مجھے کال کرنے کے ساتھ ساتھ تم پولیس کو بھی کال کرتیں۔" میں نے کہا۔

"تم سے پہلے میں نے پولیس کو کال کی تھی لیکن اب تک ان کا کوئی پتا نہیں ہے۔" پھر وہ چونک کر بولی۔ "کیا سب کچھ یہیں پوچھ لیں گے، چلیں گھر چلیں۔"

''مجھے بھی پولیس کا انتظار تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اب انتظار کرنا بے سود ہے۔ ان کے پاس وہی روایتی بہانے ہوں گے کہ پولیس وین موجود نہیں تھی یا اگر موجود تھی تو خراب تھی یا تھانے میں نفری نہیں تھی۔ چلو، گھر چلو۔''
سیکیورٹی کمپنی کے چاروں گارڈز میرے عقب میں موجود تھے۔
میں نے ایک گارڈ سے کہا کہ تم میڈم کی گاڑی لے کر آؤ، پھر میں ان کے ساتھ گھر آ گیا۔
مجھے اب واقعی پریشانی شروع ہو گئی تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو روبی کی جان لینا چاہتے تھے۔ روبی کی ذات سے کسی کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؟ میں نے روبی سے پوچھا۔
''تم نے حملہ آوروں کے چہرے دیکھے تھے؟''
''نہیں، وہ دونوں ہیلمٹ میں تھے۔'' روبی نے جواب دیا۔
''ایسا کون ہو سکتا ہے جس سے تمہاری دشمنی ہو؟'' میں نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔
میں نے تھر پارکر کا پروگرام کینسل کر دیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد سیکیورٹی کمپنی کا سینئر گارڈ میرے پاس آیا اور بولا۔ ''سر! ابھی ابھی کیپٹن صاحب نے مجھے کال کی تھی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ تم لوگ اس وقت کہاں تک پہنچے ہو؟'' کیپٹن اس کا باس تھا جو اپنی سیکیورٹی ایجنسی چلا رہا تھا۔
''کہاں پہنچے ہو کا مطلب؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔
''کیا اب مجھے تمہارے باس سے وضاحت کرنا پڑے گی کہ میں کہاں ہوں اور اگر کراچی میں ہوں تو کیوں ہوں؟''
''یہ بات نہیں ہے سر۔'' گارڈ نے جواب دیا۔ ''وہ اصل میں...''
''ایک منٹ۔'' میں نے کہا۔ ''میں پہلے تمہارے باس سے بات کروں گا۔''
''او کے سر!'' گارڈ نے کہا۔
میرے پاس کیپٹن ارشد کا سیل نمبر موجود تھا۔ میں نے سیل فون پر اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔
''السلام علیکم۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''کیپٹن ارشد بول رہا ہوں۔''
''وعلیکم السلام، کیپٹن صاحب! میں کمال بول رہا ہوں۔''
''جی سر، میں پہچان گیا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔
''مجھے ایک بات بتائیں کیپٹن صاحب!'' میں نے کہا۔ ''جو لوگ آپ کی سروسز حاصل کرتے ہیں، کیا انہیں اپنے ڈیلی شیڈول سے آگاہ کرنا ضروری ہوتا ہے؟''
''سر! ضروری تو نہیں ہوتا لیکن ہم کلائنٹس کی بہتری کے خیال سے ان کی مصروفیات سے باخبر رہتے ہیں۔''
''او کے۔'' میں نے کہا۔ اس صورت میں مجھے آپ کی سروسز کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کے گارڈز کو واپس بھیج رہا ہوں۔ اپنے Dews کے لیے مجھے بل بھیج دیجیے گا۔'' پھر میں گارڈ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ لوگ واپس چلے جائیں۔''
''او کے سر۔'' گارڈ نے مؤدب لہجے میں کہا اور واپس چلا گیا۔
کراچی میں بیسیوں سیکیورٹی ایجنسیز ہیں.... ان میں سے کچھ تو اپنی کارکردگی کے باعث نمایاں تھیں۔ میں اب کسی دوسری ایجنسی کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا۔
میں دوبارہ لاؤنج میں آ گیا۔ روبی ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سرور کافی بنا لایا۔ اس وقت مجھے کافی کی ضرورت بھی تھی۔
میں نے روبی کو نہیں بتایا کہ میں نے سیکیورٹی گارڈز کو واپس بھیج دیا ہے۔

☆☆☆

میں سونے کے لیے جا چکا تھا اور بیڈ پر لیٹا ہی تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''اس وقت کون آ گیا؟'' روبی نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا جو ایک بجا رہی تھی۔ ''میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
میں لاؤنج کی طرف جا رہا تھا کہ سرور آ گیا اور بولا۔ ''صاحب! کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''
''کون ہیں، تم نے نام نہیں پوچھا؟''
''پوچھا تھا لیکن انہوں نے بتایا نہیں۔''
''اچھا، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں ابھی کپڑے بدل کر آتا ہوں۔'' میں اس وقت ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں تھا۔ میں نے کپڑے بدلنے کے بجائے ان پر صرف نائٹ گاؤن پہن لیا۔
''کون ہے کمال؟''
''میرا ایک دوست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا تھا کہ روبی کسی اجنبی کی آمد کے بارے میں سنے اور تجسس میں مبتلا ہو کر میرے پیچھے دوڑی آئے۔
میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو آنے والا میری

طرف پشت کیے دیوار پر لگی ہوئی قیمتی پینٹنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''جی فرمائیے۔'' میں نے کہا۔

اجنبی نے مڑ کر دیکھا تو مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ وہ دلاور تھا۔ وہی دلاور جس نے پیسے لے کر شاہ جی کو قتل کیا تھا۔

میں آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گیا۔ وہ بھی بہت گرم جوشی سے ملا۔

''یہ صرف تمہارے دوست نہیں ہیں۔'' پیچھے سے روبی کی آواز آئی تو میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے دلاور کو سلام کیا اور میرے برابر میں بیٹھ گئی۔

''ہاں دلاور بھائی! اب بتاؤ، کیسے ہو اور کہاں رہے اتنے دنوں؟''

اسی وقت سرور کافی، بسکٹ، ڈرائی فروٹس وغیرہ لے کر آ گیا۔

دلاور کافی پیتے ہوئے کچھ سوچتا رہا پھر اچانک بولا۔ ''یار! تو نے تو ہم لوگ کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ تو اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے۔''

''بڑے باپ کا بیٹا ہونا میرے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ بات تو جب ہے کہ آدمی خود بڑا ہو اور لوگ اسے اچھے نام سے یاد کریں۔''

''ابھی اگر تم مائنڈ نہ کرے تو ہم ایک بات بولے؟''

''ارے دلاور بھائی! میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا، بولو۔''

''بات بہت کڑوا ہے پر سچ ہے۔'' دلاور نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اب بول بھی چکو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تمہارا باپ جتنا بڑا آدمی ہے، اس سے بھی ہنڈرڈ پرسنٹ زیادہ گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔'' دلاور نے سنجیدگی سے کہا۔

''واٹ؟'' ''تم ہوش میں تو ہو، یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں جھپٹ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر گن نکال لی۔ ''تم میری ہی چھت کے نیچے بیٹھ کر میرے .. باپ کو گالیاں دے رہے ہو۔ مجھ سے معافی مانگو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

دلاور اسی طرح بے خوفی سے بیٹھا رہا اور بولا۔ ''کمال صاحب! سچائی بہت کڑوی ہوتی ہے۔ میں نے اسی لیے کہا تھا کہ...''

''شٹ اپ۔'' میں نے چیخ کر کہا اور اپنی گن لوڈ کر لی۔

''زیادہ جوش میں مت آؤ کمال صاحب! میں ابھی پروف دے دوں گا اپنی بات کا۔'' اس نے کہا اور جیب سے سیل فون نکال لیا۔

''تم چاہے جس کو بھی بیل فون کرو لیکن میں تمہیں زندہ نہیں جانے دوں گا۔'' میں نے بپھر کر کہا۔

دلاور اس دوران میں نمبر ملا چکا تھا اور اس نے شاید سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا تھا۔

''ہوں، اب کیا ہے؟'' دوسری طرف سے بابا سائیں کی آواز آئی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔

دلاور نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے اور روبی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔ ''صاحب! کام تو ہوا ہے لیکن ہم لوگ سے ایک Mistake ہو گیا۔''

''تم ہمیشہ Mistake کرتے ہو دلاور، اگر روبی زندہ بچ گئی تو میں تمہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔''

''بات یہ نہیں ہے صاحب! ہم نے روبی پر فائر کیا تھا لیکن آپ کا بیٹا ایک دم سامنے آ گیا۔ گولی اس کے سینے میں لگ گیا تھا لیکن...''

''لوگ کے پٹھے! اسے ہر قیمت پر ہلاک کرنا ہے۔ کمال کے مرنے کے بعد تو اس کی پوری جائداد روبی کو مل جائے گی۔ میں تجھے دس لاکھ کے بجائے بیس لاکھ روپے دوں گا۔ تو کسی طرح روبی کو مار دے۔''

''آپ نے پوری بات نہیں سنا صاحب، ہم نے روبی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔''

''تو اسے مار کیوں نہیں دیتا؟''

''نہیں صاحب! پہلے ہمیں پورا پیسا چاہیے۔'' دلاور نے کہا۔ ''آپ نے شاہ جی کو قتل کرایا تو ہمیں پورا پیسا نہیں دیا۔ پھر اپنے بھائی کو قتل کرایا، اس کا پیسا بھی پورا نہیں دیا۔ مائزہ اور اس کی ماں کا قتل کرایا، وہ پیسا بھی ابھی تک پھنسا ہوا ہے۔ ابھی ہم لوگ تمہاری بات کا کیسے یقین کرے صاحب؟''

''میں تیری ایک ایک پائی چکا دوں گا، تو روبی کو مار دے۔''

''روبی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے صاحب! آپ یہاں آ کر اس سے بات کر لو اور ہمارا پیسا بھی لیتے آؤ، کیش لانا، ہم لوگ جانتا ہے کہ آپ ابھی ادھر کراچی میں ہو، واپس نہیں گیا ہو، جلدی آؤ۔ ہم لوگ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

''تو کیا پاگل ہو گیا ہے؟'' بابا سائیں دہاڑے۔

''جلدی آؤ صاحب ورنہ یہ روبی ہم سے ڈیل کرنا چاہتا ہے۔ آپ کی طرف ہمارا جتنا پیسا نکلتا ہے، یہ ہمیں دینے کو تیار ہے۔ اگر تم آدھے گھنٹے کے اندر یہاں نہیں پہنچا تو ہم روبی کو لے کر چلا جائے گا۔''

''اچھا ہوا اس بند کر، میں آرہا ہوں۔''

''کیش لے کر آنا صاحب، اور کوئی ہوشیاری مت دکھانا، اس بنگلے کے چاروں طرف ہم لوگ کا آدمی موجود ہے۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ہاتھ پیر شل ہو رہے تھے اور میں یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ ابھی میں نے جو کچھ سنا وہ بابا سائیں نے خود کہا ہے۔ وہ دولت کے لیے اتنے گر گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ہی سگے بھائی کو قتل کروا دیا۔ شاہ جی کو بھی انہوں نے قتل کروایا تھا، مائرہ اور اس کی ماں کے خون سے بھی ان کے ہاتھ رنگین تھے، صرف دولت کی خاطر اب وہ روبی کو قتل کرانا چاہتے تھے۔ وہ دولت کی ہوس میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ انہیں میری موت کا بھی افسوس نہیں تھا۔ انہیں فکر تھی تو بس یہ کہ روبی مر جائے ورنہ میرے حصے کی پوری جائداد کی وارث وہی ہوگی۔ ایسی بھی کیا دولت کی ہوس کہ انسان اپنے پیاروں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ لیکن ان کے لیے ہم پیارے نہیں تھے، دولت پیاری تھی۔

اچانک مجھے بابا سائیں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

''تمہارے باپ نے مجھے روبی کو مارنے کا ایڈوانس دیا تھا، پانچ لاکھ روپیا، باقی پندرہ لاکھ کام ہونے کے بعد ملتا۔ میں عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ مائرہ اور اس کی ماں کو بھی میرے ایک آدمی نے ہلاک کیا تھا۔ روبی پر بھی آج میرے ہی دو آدمیوں نے حملہ کیا تھا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس نے تمہارے ساتھ مل کر ہمارا جان بچایا تھا۔ میرے آدمیوں نے بتایا تھا کہ کام نہیں ہو سکا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے وہاں گیا تھا۔ پھر مجھے تم نظر آیا، تمہارے ساتھ روبی بھی تھی۔ ہم کو پھر بھی یقین نہیں آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے پکڑنا ہے۔ ہم نے تمہارا باپ سے ٹیلی فون پر کنفرم کیا تو اس نے بتایا کہ ہاں، وہ میری بہو ہے لیکن اب وہ مجھے آنکھیں دکھانے لگی ہے۔''

اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔

دلاور نے مجھے باتھ روم میں چھپنے کا اشارہ کیا اور روبی کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیے اور خود گن لے کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا رکھا تھا۔

بابا سائیں کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں بڑا سا ایک بریف کیس بھی تھا۔ مجھے وہاں سے کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ روبی کو دیکھ کر بابا سائیں کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ انہوں نے بریف کیس دلاور کی طرف پھینک دیا۔ دلاور نے بریف کیس کھول کر نوٹوں کا جائزہ لیا۔ کچھ اندازہ لگایا اور بولا۔ ''پورے تو ہیں نا؟''

''تمہیں شبہ ہے تو تم خود گن لو۔'' بابا سائیں نے کہا۔

''آپ اتنا بڑا آدمی ہے صاحب! آپ دو چار لاکھ کے لیے ایسا حرکت تو نہیں کرے گا۔''

''اب باتیں مت بناؤ اور جلدی سے اس لڑکی کا کام تمام کرو۔''

مجھے اس بات کا صدمہ تھا کہ بابا سائیں نے ایک دفعہ بھی میرے بارے میں نہیں پوچھا کہ کمال مر گیا تو اس کی لاش کہاں ہے۔

''اب جلدی کرنا تو کے پیچھے۔'' بابا سائیں چیخ کر بولے۔

''آپ کو بہت جلدی ہے صاحب؟'' دلاور نے کہا پھر اچانک اپنی گن کا رخ بابا سائیں کی کھوپڑی کی طرف کر دیا اور بولا۔ ''ہم لوگ نے اپنی زندگی میں بہت لوگوں کو پکڑا کیا ہے لیکن پیسے کے لیے۔ آج ہم ایک ایسا قتل کرے گا جو ہم پیسے کے لیے نہیں بلکہ ثواب کے لیے کرے گا۔ تم جیسا لوگ اس زمین پر بوجھ ہوتا ہے۔ ہم آج اس بوجھ کو زمین کے اندر پہنچا دے گا۔''

''دلاور!'' بابا سائیں چیخے۔ ان کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ ''تو پاگل ہو گیا ہے۔''

''ہاں، شاید ہم پاگل ہو گیا ہے۔ کلمہ پڑھ لو صاحب۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''پر تم کو کلمہ بھی کب یاد ہوگا۔ جاؤ، غرق ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گن سے دو فائر کیے لیکن اس کا پہلا فائر ہی کافی تھا۔ وہ بابا سائیں کی پیشانی کے عین وسط میں لگا تھا۔ دوسرا فائر اس نے بابا سائیں کے سینے پر دل کے مقام پر کیا۔

پھر اس نے گن پھینک دی اور بولا۔ ''کمال صاحب! ابھی تم پولیس کو بلا لو، ہم نے آج اپنا آخری ہدف بھی پورا کر لیا۔''

چند لمحوں کی اس کارروائی نے مجھے اپنی جگہ گم صم کر دیا تھا۔ صدمے... دکھ اور تکلیف نے... نڈھال کر ڈالا تھا۔

سرورق کی دوسری کہانی

ٹیڑھی چال

مریم کے خان

عقل مند بازار میں فروخت ہونے والی جنس نہیں کہ کثرت اسے ارزاں بنادے... عقل کی قیمت تو اس کی افراط کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اگر اسے مالِ تجارت بنا بھی دیا جائے تو اس کے قدرداں اور خریدار وہی ہوں گے جو اہلِ دانش ہیں... وقت کے ساتھ لوگوں کے اطوار اور شرافت کے معیار بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدل رہے ہیں... پہلے نیک فطرت اور شرافت ہی اچھائی کا سنگِ میل سمجھے جاتے تھے... مگر آج کی معاشرت نے ماحول، فطرت اور نیت میں اس طرح دراڑیں ڈال دی ہیں کہ ایک پتھر کو اپنی جگہ سے ہلانے پر پوری عمارت ڈھے جاتی ہے... جاسوسی کے خاص صفحات پر رونق افروز ایسی ہی کہانی جو آپ کو اپنے آس پاس سانس لیتی محسوس ہوگی... ایسے کردار جو خود کو مستحکم کرنے کے لیے دوسروں کو گرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اپنے دوستوں کی شخصیت اختیار کرنے والے زیادہ دیر تک حکمرانی نہیں کرسکتے...

اپنے سہانے مستقبل کے لیے دوسروں کا مستقبل تاریک کردینے والے بےضمیر چہروں کا ایک رخ

احمر پانچ سال سے اس ڈسٹری بیوشن فرم میں جاب کررہا تھا۔ وہ تقریباً چھبیس برس کا خوش شکل نوجوان تھا۔ آنکھوں پر ریم لیس عینک اچھی لگتی تھی۔ جسامت متناسب تھی۔ پانچ سال پہلے بی سی ایس کر کے وہ یہاں آیا۔ اگرچہ جاب اس کی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن اسے جاب کی اشد ضرورت تھی اور دوسرے اس کا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا۔ جب اس نے اشتہار دیکھا تو فوراً سی وی بھیج دی۔ اسے انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا اور پھر منتخب بھی کرلیا گیا۔ یہ کمپیوٹر آپریٹر کی جاب تھی۔ جس کے لیے کمپیوٹر کا عمومی استعمال اور مائیکروسوفٹ آفس جاننا لازمی تھا۔ احمر یہ دونوں کام جانتا تھا بلکہ اس کی کوالی فکیشن اس سے کہیں زیادہ تھی۔ کام آنے اور جانے والے سامان کی انٹری کرنا تھا۔ کمپنی کے پاس درجنوں کمپنیوں کی پروڈکٹس کی ڈسٹری بیوشن تھی اور سالانہ اربوں روپے کا کاروبار تھا۔

کمپنی کے مالک زاہد بھائی نے بیس سال پہلے بہت معمولی پیمانے پر کام شروع کیا تھا مگر ترقی کر کے وہ آج اس مقام پر پہنچ گئے تھے۔ اب ان کے تین بیٹے بھی ان کے ساتھ کاروبار میں شامل ہوگئے تھے۔ آغاز میں چند ملازمین تھے اور اب ملازمین کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ تمام ملازمین کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔

گول چہرے اور گھنی بھنوؤں کے موٹی آنکھوں والے زاہد بھائی دیکھنے میں بھی مہذب اور نرم مزاج لگتے تھے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ احمر سے چڑتے تھے۔ جب بھی اس سے بات کرتے تو ان کا لہجہ سخت اور کھردرا ہو جاتا۔ حالانکہ شاذ ہی ایسا ہوا کہ کسی غلطی کی وجہ سے انہوں نے اسے جھاڑا ہو۔ کیونکہ احمر اپنا کام پوری توجہ اور محنت سے کرتا تھا۔ وہ صبح ٹھیک نو بجے دفتر پہنچ جاتا تھا۔ جبکہ دوسرے لوگ عام طور سے سوا نو ساڑھے نو اور بعض تو دس بجے تک آتے تھے۔ زاہد بھائی نے نہ جانے کیوں ٹائمنگ پنچ مشین نہیں رکھی تھی۔ اس کام کے لیے ایک آدمی تھا جو سب کی آمد کا وقت ایک رجسٹر میں درج کرتا تھا۔ رزاق صاحب پندرہ سال سے یہی کام کر رہے تھے اور کمپنی کا یہ واحد شعبہ تھا جو اب تک کاغذ اور پین پر چل رہا تھا۔ اب جو رزاق صاحب سے بنا کر رکھتا تھا اس کی آمد کا وقت نو بجے ہی درج ہوتا تھا اور جو بنا کر نہیں رکھتا تھا اس کی آمد کا ٹھیک وقت لکھا جاتا تھا۔ کبھی اتفاق سے ایسا ہوتا کہ احمر ٹریفک کی وجہ سے چند منٹ کی تاخیر سے پہنچتا تو بس کی لیٹ لگا دی جاتی اور مہینے میں تین بار لیٹ ہونے پر ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی جیسا کہ کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ صرف ایک بار وہ اس سانحے سے دوچار ہوا اور تب اسے پتا چلا کہ آدمی کی محنت کی کمائی اس سے چھین لی جائے تو وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔

چھ سال پہلے جب احمر کے والد احمد انصاری اچانک ہارٹ اٹیک کے باعث دنیا سے رخصت ہوئے تو اس کا گھرانا بہت زیادہ مالی مشکل میں آگیا۔ گھر میں احمر کے علاوہ اس کی امی اور احمر سے پانچ سال چھوٹی بہن روما تھی۔ ان سے بڑے چار بہن بھائی اور تھے۔ دو بڑے بھائی، ایک بڑی بہن شائستہ اور احمر کے ساتھ کی جڑواں بہن شگفتہ کی شادی ہو گئی تھی اور یہ سب اپنے گھروں میں خوشحال تھے۔ خاص طور سے دو بڑے شبیر اور ظہیر ایک مشترکہ بزنس چلا رہے تھے۔ کاروبار کے لیے سرمایہ احمد صاحب نے انہیں مکان فروخت کر کے دیا اور باقی رقم سے انہوں شگفتہ اور شائستہ کی شادی کی تھی۔ احمد صاحب سرکاری ملازم تھے انہوں نے زندگی میں ایک یہ گھر ہی بنایا تھا۔ احمر نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اور اس کا بچپن یہیں گزرا تھا اس لیے اسے مکان کی فروخت پر صدمہ ہوا تھا مگر وہ اپنے باپ کی مجبوری سمجھتا تھا۔ گھر کی فروخت کے بعد وہ کرائے کے فلیٹ میں اٹھ آئے جو چار افراد کے لحاظ سے کافی تھا۔ یہ تین کمروں کا مناسب فلیٹ تھا۔

اسی فلیٹ میں احمد صاحب کا اچانک ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا۔ ان کو تکلیف خاصے عرصے سے تھی مگر وہ گھر

والوں سے چھپاتے تھے۔ علاج وہ کرا رہے تھے مگر ڈاکٹرز نے انہیں بائی پاس کا کہا تھا۔ اس کا پتا بیوی بچوں کو ان کے انتقال کے بعد ان کی رپورٹس سے ہوا۔ وہ دوران ملازمت ہی اپنی گریجویٹی کا بیشتر حصہ لے چکے تھے اس لیے ان کے بعد بہت کم رقم ملی اور بس پنشن تھی۔ اس وقت احمر بی سی ایس کے آخری سال میں تھا۔ اس کا اور ماں کا خیال تھا کہ ایسے میں بھائی اور شاید بہنیں بھی آگے آئیں اور ان کی مدد کریں مگر ان کا رویہ اس لحاظ سے بہت سرد تھا۔ ہاں وہ ملنے کے لیے خوب آتے، کھاتے پیتے اور چلے جاتے۔ انہوں نے ایک بار بھی ماں سے نہیں پوچھا کہ گھر کیسے چل رہا ہے؟ وہ لوگ کرایہ اور بل کیسے ادا کر رہے ہیں؟ احمر یہ سب دیکھتا اور جلتا کڑھتا تھا۔ بالآخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ایک دن جب سب بہن بھائی مع بیوی بچوں کے آئے ہوئے تھے تو اس نے کہا۔

"آپ لوگ یہ محفلیں اپنے گھر میں کیوں نہیں سجاتے ہیں؟"

"کیا مطلب، ہم اپنی ماں کے گھر نہیں آسکتے؟" شبیر بگڑ کر بولا۔

"آپ کو خیال ہے ماں کا؟" احمر نے تلخی سے کہا۔ "کبھی آپ میں سے کسی نے کہا کہ سب اس کے ہاں آجائیں۔ سب کو چھوڑیں کبھی ہمیں ہی بلایا آپ لوگوں نے؟ آپ کو پتا ہے امی کیسے گھر چلا رہی ہیں اور آپ لوگوں کی دعوتیں کرتی ہیں۔"

احمر کی اس بات پر بھائیوں کے ساتھ بہنوں اور بھابیوں نے برا منایا تو۔ سب بدمزہ ہو کر اٹھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ صفیہ دکھی تھیں مگر اب وہ سکون سے بھی تھیں کہ خود چٹنی روٹی کھا کر بھی گزارا کر سکتے تھے۔ آنے والے کے سامنے کچھ نہ کچھ تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ پھر افراد کی تعداد بھی مارتی ہے۔ سب مل ملا کے اٹھارہ افراد تھے جو احمد صاحب کے انتقال کے بعد باقاعدگی سے ہر اتوار کو ان کے ہاں آتے تھے۔ بعض اوقات تو صبح سے آجاتے تھے اور رات کا کھانا کھا کر جاتے تھے۔ اس ایک دن میں اتنا خرچ ہو جاتا جتنا کہ باقی ہفتے کے چھ دنوں میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے احمر نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ حالانکہ اس میں اسی چیز کی کمی تھی۔ وہ بچپن سے شرمیلا بات کرنے میں جھجکنے والا لڑکا تھا۔ دس بارہ سال کی عمر تک وہ باہر بھی کم نکلتا تھا بس اسکول جاتا یا صفیہ کسی کام سے بھیجتیں تو چلا جاتا۔ اس کے دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ میٹرک، کالج میں اس نے چند ایک دوست بنائے تھے مگر ان سے ملنا جلنا بھی کم تھا۔ گھر میں بھی وہ پیچھے رہتا تھا۔ دوسرے جو کہتے وہ فوراً مان جاتا۔ ماں باپ کی بات الگ تھی مگر بہن بھائی اسے خاص حیثیت نہیں دیتے تھے۔ صرف ایک روما تھی جو اسے اہمیت دیتی تھی۔ اسے بھی حیرت ہوئی کہ اس نے کیسے بھائی بہنوں سے یہ بات کہہ دی اور پیچھے نہیں ہٹا۔

روما ان دنوں میٹرک میں تھی۔ اس کے پرائیویٹ اسکول کی فیس خاصی تھی جب تک احمد صاحب تھے تو فیس دینا آسان تھا مگر ان کے بعد یہ کام بہت مشکل ہو گیا۔ اس کے باوجود صفیہ نے روما کا اسکول جاری رکھا اگر اس میں وقفہ آجاتا تو دوبارہ تعلیم شروع کرنا آسان نہیں تھا اور پھر وہ بہت ذہین تھی۔ نویں تک ہر کلاس میں ٹاپ کرتی آئی تھی۔ روما کو اندازہ تھا کہ امی اتنی فیس نہیں دے پا رہی تھیں۔ اس لیے اس نے کہا کہ وہ اسکول چھوڑ دیتی ہے اور جب احمر بھائی کو جاب مل جائے گی تو وہ دوبارہ اسکول جوائن کر لے گی مگر صفیہ اور احمر نے اسے منع کر دیا۔ امی اسکول والوں سے ملیں اور اپنی معاشی مشکلات کا بتایا پھر روما کی ذہانت سے اسکول انتظامیہ بھی متاثر تھی اس لیے فیس آدھی کر دی گئی مگر یہ آدھی فیس بھی تو دینا ہی تھی اور انہوں نے چند مہینے جس طرح دی، وہی جانتے تھے۔

خوش قسمتی سے احمر کے بی سی ایس کے آخری سال کی فیس احمد صاحب نے پیشگی جمع کرا دی تھی اور اب اسے اس کی فکر نہیں تھی۔ پیپرز دینے کے دوران ہی اس نے ملازمت کے لیے سی وی بھیجنا شروع کر دی تھی۔ زیڈ اے ٹریڈرز کو کمپیوٹر آپریٹر کی ضرورت تھی۔ احمر نے وہاں بھی سی وی بھیج دی حالانکہ اس جاب کے لیے کوئی انٹر پاس اور کمپیوٹر چلانے والا بھی اہل تھا۔ مگر احمر کو اس کی امید بھی نہیں تھی اس لیے جب جاب ملی تو اسے یقین نہیں آیا تھا۔ تنخواہ بھی مناسب تھی۔ اتنی ضرور تھی کہ انہوں نے تنگی ترشی کا جو دور گزارا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ لیکن ملازمت کے کچھ عرصے بعد احمر نے محسوس کیا کہ زاہد صاحب اس سے چڑتے ہیں۔ حالانکہ اس نے روز اول سے اپنا کام پوری طرح سمجھ لیا تھا اور اس کی انتہائی حد تک کوشش ہوتی کہ زاہد صاحب یا اس کے باس کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اس کے لیے وہ بعض اوقات لنچ کے وقفے میں بھی کام کرتا تھا۔

اس کے باوجود زاہد صاحب جو دوسروں سے ٹھیک طریقے سے پیش آتے تھے، احمر کے سامنے آتے ہی ان کی فراخ پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے اور لہجہ سخت ہو جاتا۔ جبکہ

معمول میں وہ بہت کم کسی سے سخت لہجے میں بات کرتے تھے۔ بلاوجہ تو کبھی وجہ سے بھی بہت کم کسی کو سخت سناتے یا جھاڑتے تھے۔ ایسا تو کبھی احمر کے ساتھ بھی نہیں ہوا تھا مگر لہجہ اور رویہ بہرحال مختلف ہی ہوتا تھا۔ کمپیوٹر سیکشن میں احمر سمیت پانچ افراد تھے۔ اس کے ساتھ، نذیر شاہ، احمد بلال اور عباس خان آپریٹر تھے جبکہ صدیقی صاحب سیکشن باس تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ صدیقی صاحب صرف بی اے تھے اور انہوں نے کچھ کمپیوٹر کورس وغیرہ کیے تھے۔ باقی تینوں آپریٹر معمولی تعلیم یافتہ اور صرف کمپیوٹر اور آفس کا استعمال جانتے تھے۔ مگر احمر تعلیم میں ان سب سے بہت آگے تھا۔ اس نے ایک اچھے آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ سے بی ایس کیا تھا۔ اس کے باوجود صدیقی صاحب باس تھے۔

احمر نے بہت غور کیا کہ زاہد صاحب کا رویہ ایسا کیوں ہے؟ وہ ویسے ہی ذرا کم گو اور شرمیلا قسم کا نوجوان تھا۔ زاہد صاحب کے سامنے جاتے ہی اس کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔ نظریں اٹھتی نہیں تھیں اور بات کرتا تو زبان لڑکھڑاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ ان کا رویہ بھی تھا اس لیے احمر کی کوشش ہوتی کہ ان سے کم سے کم سامنا ہو۔ جب ان کے کمرے سے نکلتا تو خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ دوسرے بھی تعجب کرتے تھے کہ زاہد صاحب اس کے معاملے میں اتنے سخت کیوں تھے جبکہ وہ کام کے لحاظ سے ٹھیک تھا۔ کام کے لحاظ سے غیر مطمئن ہوتے تو اسے بہت پہلے جاب سے نکال چکے ہوتے۔ کچھ عرصے بعد یہ ہوا کہ زاہد صاحب کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی احمر سے ذرا روکھے انداز میں پیش آنا شروع کر دیا۔ یہ کچھ دفتری مجبوری بھی تھی اور کچھ انسان کی فطری خواہش کہ کوئی اسے دبانے والا ملے تو وہ اپنی حیثیت جتائے۔ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔ اگر اسے کسی سے کام ہوتا تو وہ یوں کر کے دیتا جیسے احمر پر ذاتی احسان کر رہا ہو۔

صدیقی صاحب پہلے ہی اسے ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ تعلیم میں ان سے آگے تھا۔ انہیں یہ خوف تو نہیں تھا کہ احمر ان کی جگہ لے سکتا ہے کیونکہ وہ زاہد صاحب کے ساتھ برسوں سے تھے اور زاہد صاحب میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ پرانے ورکرز کا بہت خیال رکھتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ مگر صدیقی صاحب کے اندر کہیں احساسِ کمتری تھا۔ جب انہوں نے احمر کے ساتھ زاہد صاحب کا خشک رویہ دیکھا تو وہ بھی اس پر بلاوجہ کا رعب جھاڑنے لگے اور دورانِ کام یوں اس کی نگرانی کرتے جیسے کمرائے امتحان میں پیپر دینے والوں کی نگرانی کی جاتی ہے۔ احمر کے کام میں وہ غلطی نکال نہیں سکتے تھے۔ وہ اس چیز کا بہت خیال رکھتا تھا مگر وہ ایسا ظاہر کرتے کہ ان کی کڑی نگرانی کی وجہ سے احمر غلطی نہیں کرتا ورنہ شاید وہ بہت غلطیاں کرتا۔ اگرچہ ان میں اتنی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی غلطی پکڑ سکتے۔

صدیقی صاحب اور دوسرے لوگوں کے رویے سے اسے تکلیف ہوتی لیکن وہ شکایت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس کی خاموشی سے دوسروں کو اور شہ ملتی۔ حد یہ کہ شعبے کا چپراسی ظفر جو دوسروں کے کام بھاگ کر کرتا تھا ایک آواز پر دوڑا چلا آتا اور ذرا دیر کرنے پر لوگ اسے جھاڑ دیتے تھے جب احمر اسے بلاتا تو وہ خاصی دیر سے یوں آتا کہ جیسے آنا تو نہیں تھا مگر اس پر احسان کرنے کے لیے آگیا۔ احمر اسے ہمیشہ تمیز سے اور مناسب طریقے سے بلاتا تھا کبھی تو کر کے بات نہیں کی اور جھاڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا رویہ دوسروں جیسا تھا۔ ریسپشن اور فون بورڈ پر کام کرنے والی لڑکی شہلا دوسروں سے ٹھیک طرح بات کرتی تھی۔ ہنسی مذاق بھی کرتی لیکن احمر کو دیکھ کر سنجیدہ ہو جاتی اور بہت اجنبی سے لہجے میں بات کرتی۔ احمر اس سے کچھ کہتا تو اسے بہت بے پروائی سے لیتی۔ وہ شہلا کو کہیں کال ملانے کو کہتا تو خاصی دیر بعد جا کر لائن ملاتی یا پھر سرے سے اس کی بات گول کر جاتی۔ جب وہ دوبارہ کہتا تو چالاکی سے بھول جانے کا عذر پیش کرتی تھی۔

اس ماحول میں احمر نے پانچ سال گزار دیے تھے۔ اس عرصے میں کمپنی نے مزید ترقی کی تھی۔ ہیڈ آفس جو پہلے پرانے صدر کی ایک پرانی بلڈنگ میں تھا۔ اب شاہراہِ فیصل کی ایک شاندار شیشوں والی عمارت کے ایک پورے فلور پر منتقل ہو گیا تھا۔ نیا فرنیچر اور نیا سامان ملا۔ سیکشن کے لیے نئے جدید کمپیوٹر لیے گئے۔ احمر کو بھی نیا کمپیوٹر ملا تھا۔ یہ پرانے کمپیوٹر سے بہت بہتر اور تیز تھا۔ اسے اس پر کام کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ پہلے وہ ایک بڑے سے کمرے میں ساتھ بیٹھتے تھے۔ یہاں سب کو الگ کیبن ملے تھے۔ اس وجہ سے احمر، صدیقی صاحب کی ہر وقت نگرانی سے بھی بچ گیا تھا۔ اگرچہ ان کا بیشتر وقت اب بھی قدِ آدم دیوار کے اوپر سے احمر کے حصے میں جھانکتے گزرتا تھا۔ بہرحال وہ پھر بھی خوش تھا۔ ماحول بدلا تو لوگوں کے رویے بھی بہتر ہوئے۔ دفتر بڑا ہونے سے دوسروں سے شاذ ہی واسطہ پڑتا تھا۔ مگر اس کی یہ خوشی بس چند دن کی تھی پھر

راحیل آ گیا۔ ایک صبح جب اسٹاف دفتر میں داخل ہو رہا تھا تو زاہد صاحب اناؤنسنگ ڈائس پر ایک خوش پوش نوجوان کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب آ گئے تو انہوں نے نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اعلان کے انداز میں کہا۔ ''آج ہماری کمپنی میں ایک باصلاحیت اور ذہین نوجوان کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ہیں راحیل نیاز۔''

سب نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ وہ گورا چٹا اور کسی قدر طویل قامت تھا اس لیے جسم کا چھریرا لگتا تھا۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور اس نے اس گرمی میں بھی اسمارٹ لگنے کے لیے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ آفس اے سی تھا مگر بسوں اور موٹر سائیکلوں پر آنے والے نارمل لباس میں آتے تھے سوٹ صرف وہی افسران پہنتے تھے جو اے سی کاروں میں آتے تھے۔ اس لیے احمر اور دوسرے لوگ سمجھے کہ راحیل کسی بڑی پوسٹ پر آیا ہوگا تبھی زاہد صاحب اس کا یوں تعارف کرا رہے ہیں۔ مگر کچھ دیر بعد زاہد صاحب اسے لے کر کمپیوٹر سیکشن میں آئے اور صدیقی صاحب سے کہا۔ ''آج سے یہ آپ کے شعبے میں کام کریں گے۔ یہ صرف آغاز ہے، مجھے امید ہے یہ بہت آگے تک جائیں گے۔''

کمپنی مالک کی طرف سے ایسے تعارف کے بعد صدیقی صاحب کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ راحیل کو خاص پروٹوکول نہ دیتے۔ کمپیوٹر سیکشن کو سات کیبن الاٹ ہوئے تھے اور ان میں سے دو ابھی خالی تھے۔ احمر کا خیال تھا کہ راحیل کو ان میں سے کوئی ملے گا۔ مگر چند منٹ بعد ہی صدیقی صاحب راحیل کے ہمراہ احمر کے کیبن کے سامنے نمودار ہوئے اور بولے۔ ''احمر! راحیل تمہارے کیبن میں بیٹھے گا۔''

وہ دنگ رہ گیا۔ پھر اس نے بہ مشکل کہا۔ ''اور سر میں...''

''تمہیں جلد دوسرا کیبن مل جائے گا۔ ابھی اپنا سامان سمیٹو اور یہاں سے نکلو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ان کا لہجہ اہانت آمیز تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن سر میں شیٹ پر کام کر رہا ہوں، اسے ادھورا کیسے چھوڑ دوں؟''

''راحیل کرے گا۔''

احمر کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور سسٹم سے اپنی مخصوص چیزیں یو ایس بی میں منتقل کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔ جاتے ہوئے وہ کمپیوٹر بند کر گیا تھا اور اس پر ہونے والے کام کے بارے میں راحیل کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ جب وہ اتنا ہی باصلاحیت تھا تو وہ خود سے سیکھ سکتا تھا۔ جب تک احمر کیبن سے نکل نہیں گیا راحیل بےپروائی سے ایک طرف کھڑا مسکراتا رہا۔ اس نے مروتاً بھی نہیں کہا کہ اسے کوئی اور کیبن دے دیا جائے۔ ممکن ہے احمر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو زاہد صاحب کے پاس پہنچ جاتا اور ان کے علم میں معاملہ لاتا مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ کسی سے شکایت کرنے کے بجائے وہ ایک خالی کیبن میں جا کر بیٹھ گیا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا اور استعفیٰ دینے کے خیالات اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس خیال پر عمل نہیں کر سکتا۔ چند منٹ بعد ہی راحیل نمودار ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر احمر کا غصہ سرد پڑنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اس معاملے میں اس کا قصور تو نہیں تھا۔

''سوری، میں تمہارا نام پوچھنا بھول گیا تھا۔''

''احمر۔'' اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔ وہ ریک پر ٹک گیا۔

''سوری، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ صدیقی صاحب ایسا کریں گے مگر وہ باس ہیں میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔''

اس کی بات نے احمر کا غصہ ذرا کم کیا اور کچھ دیر بعد اس نے خود کو اس سے محو گفتگو پایا۔ وہ منٹوں میں احمر سے یوں بےتکلف ہو گیا جیسے برسوں پرانا دوست ہو۔ گفتگو کے دوران میں اس نے اٹھ کر آس پاس دیکھا اور جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور جلدی جلدی کش لینے لگا۔ دفتر کی حدود میں سگریٹ نوشی منع تھی۔ جو عادی تھے، وہ لنچ میں اپنی طلب پوری کر لیتے تھے۔ اس نے احمر کو بھی پیشکش کی مگر وہ نہیں پیتا تھا۔ سگریٹ ختم کر کے اس نے بجھا ہوا ٹکڑا ٹشو میں لپیٹا اور وہ اسی پر راکھ جھاڑتا رہا تھا۔ اسے رول کر کے وہ کہیں گیا اور ایک منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے کوٹ سے ایک چھوٹا سا ماؤتھ فریشنر اسپرے نکال کر منہ میں اسپرے کیا تاکہ سگریٹ کی بو ختم ہو جائے۔ دوران گفتگو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے پہلے کبھی انوینٹری شیٹ پر کام نہیں کیا اس لیے اسے مشکل پیش آ رہی ہے کیا احمر اس کی مدد کر سکتا ہے؟

احمر فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اس کی کوئی مدد نہیں کروں گا مگر اس نے اس طرح کہا کہ اس کا دل پسیج گیا اور وہ اس کے ساتھ اپنے کیبن میں آیا جو اب اس کا کیبن تھا۔ احمر اسے تقریباً آدھے گھنٹے تک کام سمجھاتا رہا اور اس دوران میں

صدیقی صاحب نے ایک بار بھی اندر نہیں جھانکا۔ اسے کام سمجھا کر وہ واپس خالی کیبن میں آ گیا۔ شام کو چھٹی سے پہلے صدیقی صاحب تشریف لائے اور احمر کو مطلع کیا۔ ”یہ کیبن تمہارے لیے سیٹ کر دیا جائے گا۔ تب تک تم فارغ ہو ویسے بھی تم کرتے ہی کیا ہو؟“

”جی سر، میں کچھ نہیں کرتا۔“ احمر نے خفیف سے تلخ لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب آپ کے پاس ایک باصلاحیت شخص آ گیا ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے، اس نے پہلے ہی دن سب سیکھ لیا ہے جو تمہیں سیکھنے میں برسوں لگے۔“

احمر اس صریحاً غلط بیانی پر احتجاج کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس کا جواب سنے بغیر چلے گئے۔ وہ حیران بھی تھا کہ صدیقی صاحب راحیل کی یوں تعریف کر رہے تھے، کیا اس نے بتایا نہیں کہ اسے کام احمر نے سکھایا ہے۔ کچھ دیر بعد چھٹی میں سب ایک ساتھ باہر جا رہے تھے۔ باہر احمر کو راحیل مل گیا اور اس نے اس سے شکوہ کیا تو اس نے معصومیت سے کہا۔

”سوری شاید میں ذکر کرنا بھول گیا تھا۔“

دفتر کی عمارت سے باہر آتے ہی اس نے کوٹ اتار کر بازو پر ٹانگ لیا اور شرٹ کی آستین چڑھا لی تھی۔ احمر نے دیکھا اس کی شرٹ خاصی میلی ہو رہی تھی مگر کوٹ کی وجہ سے پتا نہیں چل رہا تھا۔ احمر ڈریس پینٹ اور شرٹ میں دفتر آتا تھا اور اس نے ہمیشہ خیال رکھا کہ اس کے کپڑے صاف ستھرے ہوں۔ اس نے راحیل سے پوچھا کہ وہ گھر کیسے جائے گا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”ظاہر ہے بس سے۔“

اتفاق سے وہ احمر کے ساتھ بس پر سوار ہوا اور راستے میں جس آبادی کے سامنے اترا، احمر جانتا تھا وہاں نچلے طبقے کے افراد بہ کثرت رہتے تھے اور اس آبادی کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ یہاں زیادہ تر جرائم پیشہ اور الٹے سیدھے دھندے کرنے والے رہتے تھے۔ اگرچہ یہ جگہ شہر کے وسط میں ہے اور اس کے چاروں طرف بہت پوش علاقے ہیں مگر یہ جگہ ہاتھوں کے درمیان کسی گندے جوہڑ کی طرح ہے۔ احمر اس جگہ سے کچھ ہی آگے مگر اس کے مقابلے میں بہت اچھی سوسائٹی میں رہتا تھا۔ صبح جب زاہد صاحب نے اس کا تعارف کرایا تھا تب وہ انداز سے ہائی کلاس سوسائٹی کا فرد لگ رہا تھا اور تقریباً سب اسے ایگزیکٹو سمجھے تھے۔ مگر شام تک کم سے کم احمر اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔

دوسرے دن وہ دفتر پہنچا تو کیبن میں کمپیوٹر آ گیا تھا اور یہ وہی پرانا کمپیوٹر تھا جس پر احمر پچھلے تین سال سے کام کر رہا تھا۔ جبکہ راحیل احمر کے سابق کیبن میں اس کے نئے کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا تھا۔ احمر نے صدیقی صاحب سے کہا۔ ”سر یہ کمپیوٹر آؤٹ آف ڈیٹ ہو گیا ہے، سست ہے اور کچھ ضروری سوفٹ ویئر اس پر نہیں چلتے ہیں۔ اس پر میں کیسے کام کروں گا؟“

”تم کرتے ہی کیا ہو جو تمہیں تیز کمپیوٹر کی ضرورت ہو۔“ انہوں نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو احمر نے احتجاج کیا۔

”سر میں اپنا کام ہمیشہ وقت سے پہلے دیتا ہوں۔“

”سب اپنا کام وقت پر ہی دیتے ہیں، اب تم اسی کمپیوٹر پر کام کرو جب تک دوسرا نہیں آ جاتا۔ اس کے لیے زاہد صاحب سے اجازت لینا ہوگی۔“

احمر جانتا تھا کہ اس قسم کے اخراجات زاہد صاحب نے شعبوں کے سربراہوں پر چھوڑے ہوئے تھے، وہ صرف منظوری دیتے تھے۔ یعنی صدیقی صاحب چاہتے تو اسے نیا کمپیوٹر دلوا سکتے تھے۔ مجبوراً اس نے اسی کمپیوٹر پر کام شروع کر دیا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جب تنخواہ ملی تو دو دن کی تنخواہ کاٹ لی گئی کیونکہ احمر نے کام نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر صدیقی صاحب سے احتجاج کیا کہ میں کام کیسے کرتا جبکہ میرا کمپیوٹر ہی لے لیا گیا تھا اس پر انہوں نے بادل ناخواستہ دو دن کی تنخواہ دلوائی۔ مگر ایک ہفتے بعد احمر کو وہی کمپیوٹر واپس کر دیا گیا جو راحیل کو دیا تھا۔ ابھی وہ اس پر حیران ہو رہا تھا کہ یہ چمتکار کیسے ہوا تو پتا چلا کہ راحیل کے کیبن میں جدید ترین نئے کمپیوٹر کی تنصیب ہو رہی تھی جو اس نے فرمائش کر کے منگوایا تھا۔ اس کے نزدیک یہ نیا کمپیوٹر بھی سست تھا۔ اس لیے خاص زاہد صاحب کے حکم سے اس کے لیے یہ نیا کمپیوٹر آیا تھا۔ احمر کو غصہ تو آیا مگر ساتھ ہی خوشی ہوئی کہ اسے اس کا کمپیوٹر واپس مل گیا تھا۔

مالی فراغت کے بعد احمر نے سوچا کہ اپنی فیلڈ میں بھی کچھ کام کرے۔ اس فیلڈ میں آگے بڑھنے کے لیے مستقل سیکھنا پڑتا ہے۔ پہلے اس نے گھر پر ایک کمپیوٹر لے لیا تھا اور آفس سے آ کر رات گئے اس پر نت نئے سوفٹ ویئر اور کاموں کے تجربات کرتا۔ کیونکہ وہ ایک ڈسٹری بیوشن کمپنی میں کام کرتا تھا اس لیے اسے خیال آیا کہ وہ اسی سے متعلق کوئی سوفٹ ویئر تیار کرے۔ جب زیڈ اے ٹریڈرز کا دفتر صدر میں گودام کے پاس تھا تو احمر کا بے شمار بار وہاں جانا ہوا تھا اور اس نے دیکھا کہ وہاں بغیر کسی سسٹم کے سامان لایا، رکھا اور اٹھایا جاتا تھا۔ اس کا سارا ریکارڈ مینول تھا۔ یعنی کیا تو کمپیوٹر پر کیا جاتا تھا مگر بغیر کسی سوفٹ ویئر کے اور وہ بھی

سادہ انٹرپرائز کی مدد سے۔ اس میں غلطیوں کا امکان بہت زیادہ تھا۔ گودام میں پچاس ورکرز کام کرتے تھے اور یہ صبح چھ سے رات دس بجے تک دو شفٹوں میں کام کرتے تھے۔

گودام بہت بڑا تھا مگر بزنس کے لحاظ سے کم پڑ جاتا تھا۔ اس کے باوجود احمر کا خیال تھا کہ اگر یہ کام کسی جدید انوینٹری سوفٹ ویئر کی مدد سے کیا جائے تو ورکرز بھی کم ہو سکتے تھے اور غلطی کا امکان بھی کم ہو جاتا جبکہ کم وقت میں سامان رکھا اور اٹھایا جاسکتا تھا۔

اکثر اچانک ہی سامان آجاتا اور بعض اوقات اسے رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ پھر ہڑبونگ مچتی اور اس میں سامان خراب بھی ہوتا تھا اور آرڈر بھی دیر سے جاتے تھے۔ شہر میں گاڑیاں جاتی تھیں اور دوسرے شہروں میں مال بلٹی کرایا جاتا تھا۔ ان سارے کاموں میں اس وقت مشکل ہوتی تھی جب کام کا دباؤ بڑھ جاتا۔ تب ملازمین اور گودام کا ریکارڈ رکھنے والے غلطیاں کرتے تھے۔ احمر نے سوچا کہ اس سارے کام کو کمپیوٹر سوفٹ ویئر کی مدد سے منظم کر دیا جائے۔ ہر چیز کے بارے میں مکمل معلومات ہوں کہ وہ کہاں سے آرہی ہے۔ کب تک پہنچے گی۔ اسے کہاں رکھنا ہوگا اور اسے وہاں سے کب اٹھانا ہوگا۔ اسی لحاظ سے چیزوں کے لیے گودام کی جگہیں طے کی جائیں گی۔

احمر نے یہ سب خود سوچا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں کسی سے بات نہیں کی تھی۔ راحیل کے آنے کے بعد یہ ہوا کہ تقریباً سب کی توجہ اس پر مرکوز ہوگئی۔ وہ تھا بھی بولنے اور ملنے والا آدمی۔ ہر ایک سے منٹوں میں بے تکلف ہو جاتا۔ زاہد صاحب نے اسے ایڈمن کے لیے بلایا تھا مگر انہوں نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اسے کمپیوٹر سیکشن بھیج دیا تھا۔ اس نے ایک نجی کالج سے کچھ اس قسم کا گریجویشن کیا تھا کہ وہ بیک وقت اکاؤنٹس سے متعلق بھی تھا اور کمپیوٹر سے متعلق بھی۔ مگر احمر نے ایک مہینے میں جان لیا تھا کہ وہ کسی چیز سے بھی متعلق نہیں تھا۔ جب اسے کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ اس کے پاس چلا آتا اور وہ مروت میں یہ مسئلہ حل بھی کر دیتا تھا مگر مجال ہے جو اس نے کبھی اس بارے میں کسی کو بتایا ہو یا احمر کا شکریہ ہی ادا کیا ہو۔ اس کے باوجود وہ اسے انکار نہیں کرتا تھا۔

احمر نے یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ زبان کا تیز تھا اور اپنی اسی خوبی کی وجہ سے وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا تھا۔ اس نے زاہد صاحب کی طرح سب کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے اور سب کر سکتا ہے۔ احمر میں یہ خوبی نہیں تھی بلکہ وہ اس کے مخالف طرزِ عمل رکھتا تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا اور اس کا کوئی نوٹس بھی نہیں لیتا۔ وہی کام راحیل اس سے کہیں زیادہ غلطیوں کے ساتھ کرنے کے باوجود سب کے سامنے یوں پیش کرتا تھا جیسے اس نے روٹین ورک نہیں کیا بلکہ کوئی بہت انوکھا کام کیا ہے اور سب اس کی واہ واہ کرتے نہیں تھکتے تھے۔ حالانکہ زاہد صاحب اور صدیقی صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جو کر رہا تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی مگر وہ اس پر بھی اس کی پیٹھ تھپکتے نظر آتے۔ اس کی صرف زبانی کلامی تعریف نہیں ہوتی تھی بلکہ دو مہینے بعد اتفاق سے احمر کو پتا چلا کہ تقریباً اس کے مساوی پوسٹ اور کام کے باوجود اس کی تنخواہ احمر سے پانچ ہزار روپے زیادہ تھی۔ جبکہ وہ یہاں پانچ۔۔۔ سال سے کام کر رہا تھا اور راحیل کو آئے ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے۔

وہ اس ناانصافی پر کڑھ کر رہ گیا اور اس وقت احمر کا شدت سے دل چاہا کہ کاش اسے کہیں اور جاب مل جائے اور وہ یہاں لعنت بھیج کر چلا جائے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اول تو کوئی اور جاب تھی نہیں اور وہ کوشش بھی کرتا تو اس کی جھجک اور شرم آڑے آتی۔ اس لیے وہ جلتا کڑھتا تھا اور پھر خود کو اس کیفیت سے بچانے کے لیے اس نے اپنی توجہ سوفٹ ویئر کی تیاری پر مرکوز کرلی۔ اسے خیال آیا کہ شاید اس طرح سے وہ زاہد صاحب کی نظروں میں اہمیت اختیار کرلے۔ اس کے پاس آگے جانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ وہ اس کا کام گھر پر بھی کرتا تھا اور آفس میں بھی۔ کیونکہ آفس کا کمپیوٹر اچھا تھا اور وہاں کام کا ماحول ہوتا تھا۔ گھر میں تھکا ہوا ہوتا تھا اور معمولات نمٹاتے نمٹاتے رات دیر ہو جاتی تھی اس لیے جب کام کرنے بیٹھتا تو دماغ زیادہ دیر کام نہیں کرتا تھا۔

مارکیٹ میں انوینٹری سسٹم کے سافٹ ویئر موجود تھے لیکن ایک تو وہ غیر ملکی تھے۔ مقامی لحاظ سے مشکل تھے اگر ان کو لیا جاتا تو ان کو چلانے کے لیے باقاعدہ تربیت یافتہ عملہ رکھنا پڑتا اور پھر یہ مہنگے بھی بہت تھے۔ شاید اسی وجہ سے زاہد صاحب نے ایسا کوئی سوفٹ ویئر لینے سے گریز کیا تھا۔

احمر ایک ایسا انوینٹری سوفٹ ویئر تیار کرنا چاہتا تھا جو ہمارے ماحول اور طریقوں کے مطابق ہو اور اسے چلانا اتنا آسان ہو کہ عام کمپیوٹر آپریٹر بھی جلد سیکھ کر آسانی سے استعمال کر سکے۔ لیکن اسے اس سوفٹ ویئر کی تیاری سے پہلے خود کو اس کے لیے تیار کرنا پڑا تھا۔

احمر روز کچھ وقت اس کام پر لگاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک مناسب سوفٹ ویئر کا خاکہ تیار کرلیا۔ پھر اس نے

اس کا ایک تھری ڈی ماڈل بھی تیار کرلیا تھا اگرچہ یہ سب سے مشکل تھا مگر یہی اس سوفٹ ویئر کی جان تھا۔ اس کی مدد سے آپریٹر ایک منٹ میں بتا سکتا تھا کہ کون سی چیز کہاں گی۔

اس کام کے لیے احمر نے خاص طور سے تھری ڈی سوفٹ ویئرز کا استعمال سیکھا تھا۔ اس ماڈل میں چیزوں کو شامل کرنا اور نکالنا آسان تھا مگر اس کی تیاری اتنی ہی مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ تھری ڈی کے لحاظ سے یہ کمپیوٹر بھی سست تھا۔ ہاں جو کمپیوٹر راحیل کے پاس تھا اس پر یہ کام زیادہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔ مگر احمر اسے یا کسی کو اس بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن وہ دفتر میں اپنے کمپیوٹر پر سوفٹ ویئر پر ہی کام کر رہا تھا اور اسے پتا نہیں چلا کہ کب زاہد صاحب وہاں آگئے۔ حالانکہ وہ اس طرح خاموشی سے کبھی نہیں آتے تھے اور نہ ہی شعبوں میں گھستے تھے۔

''گیم کھیلا جا رہا ہے؟'' اچانک ان کی آواز آئی تو احمر اچھل پڑا تھا۔

''نن... نہیں سر یہ سوفٹ...'' اس نے کہنا چاہا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' ان کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''تمہیں یہاں کام کرنے کی تنخواہ دی جاتی ہے گیم کھیلنے کی نہیں۔''

''سر میری بات تو سنیں، میں یہ سوفٹ ویئر...''

''شٹ اَپ اینڈ ڈو یور ورک۔'' انہوں نے کہا اور چلے گئے۔ احمر کے شعبے میں تقریباً سب نے یہ بے عزتی سنی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اسی لمحے راحیل نمودار ہوا تو احمر نے جلدی سے سوفٹ ویئر بند کر دیا۔ اصل میں وہ اس کے تھری ڈی ماڈل پر کام کر رہا تھا جسے زاہد صاحب گیم سمجھے تھے۔ راحیل نے دیکھ لیا تھا۔

''یہ کیا تھا؟''

''کچھ نہیں۔'' احمر نے رکھائی سے کہا اور رخ موڑ کر اپنا کام کرنے لگا۔ احمر فارغ وقت میں یہ کام کرتا تھا۔ پہلے دفتر کا کام نمٹاتا تھا اور اس کے بعد سوفٹ ویئر پر کام کرتا تھا۔ اس نے آج کا کام نمٹا لیا تھا اور اب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے اس نے سوفٹ ویئر پر کام شروع کر دیا۔ راحیل اس وقت تو چلا گیا مگر چھٹی کے بعد جب وہ ساتھ باہر نکلے تو اس نے پھر احمر سے پوچھا۔

''تمہارے کمپیوٹر پر وہ کون سا سوفٹ ویئر تھا جسے سر گیم سمجھے تھے؟''

''وہ ایک سوفٹ ویئر تھا۔'' اس نے کہا۔ ''انوینٹری سے متعلق۔''

''لیکن کمپنی تو ایسا کوئی سوفٹ ویئر استعمال نہیں کرتی ہے۔''

''یہ کمپنی کا نہیں ہے۔''

''اچھا تو تم ایسا کوئی سوفٹ ویئر انسٹال کر کے تجربہ کر رہے تھے؟''

تب شاید احمر نے شاید صرف یہ بتانے کے لیے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اسے بتا دیا کہ یہ سوفٹ ویئر کسی کمپنی کا نہیں بلکہ اس کا ہے اور وہ اسے تیار کر رہا ہے۔ راحیل اچھل پڑا تھا۔ ''رئیلی... میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم ایسا کوئی کام کر سکتے ہو۔''

''تم کیا کوئی نہیں سمجھتا۔'' احمر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بلکہ سر اور صدیقی صاحب تو سمجھتے ہیں کہ میں سرے سے کوئی کام ہی نہیں کر سکتا ہوں۔''

''ایسا نہیں ہے یار، میں تو مان گیا ہوں تم بہت باصلاحیت ہو، تم غلط جگہ جاب کر رہے ہو تمہیں تو کسی آئی ٹی فرم میں ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں لیکن میں اس ڈسٹری بیوشن کمپنی میں دھکے اور جھاڑیں کھا رہا ہوں۔'' اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''یہ کام خاصا مشکل ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں لیکن سوفٹ ویئر کے لحاظ سے نہیں ہے۔ میں تمام ٹولز کا استعمال سیکھ چکا ہوں۔''

''پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''میرا کمپیوٹر اس کے لحاظ سے سست ہے۔ تھری ڈی ماڈل کے لیے طاقتور کمپیوٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ایسا کہتے ہوئے احمر کو خیال آیا کہ اگر اسے راحیل کا کمپیوٹر مل جائے تو وہ آدھے گھنٹے میں اس پر وہ کام کر سکتا ہے جو اس کے کمپیوٹر پر ایک گھنٹے میں ہوتا تھا۔ مگر وہ یہ بات اس سے کہنا نہیں چاہتا تھا۔

''تم میرا کمپیوٹر استعمال کر لو۔'' اس نے خلافِ توقع کہا تو احمر خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

''سچ مچ؟'' پھر اسے خیال آیا۔ ''تو پھر تم کیسے کام کرو گے؟''

''جب ہم لنچ کے لیے جائیں تو تم اسے استعمال کر سکتے ہو۔'' اس نے تجویز پیش کی۔ ''اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوتا ہے اس لیے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کیا کر رہے ہو۔''

اگلے دن سے احمر نے لنچ کے وقفے میں اس کے

کمپیوٹر پر کام شروع کر دیا۔ ایک دن تو اسے اس کے کمپیوٹر میں ضروری سوفٹ ویئرز اور ٹولز انسٹال کرنے میں لگ گیا۔ احمر نے یہ کیا کہ اپنا کام اس نے یو ایس بی میں رکھا تھا۔ اسی پر کام کرتا۔ اس سے اسے آسانی ہوتی تھی کہ وہ گھر اور دفتر ہر جگہ اپنا کام لے جا سکتا تھا اسی وجہ اسے راحیل کے کمپیوٹر میں کام کرنے میں آسانی ہوئی۔ اس کا کمپیوٹر ہیچ بہت طاقتور مشین تھا۔ اس پر ایک گھنٹے کا کام پچیس منٹ میں ہو جاتا تھا۔ اب احمر روز آدھا گھنٹا لگاتا اور اچھا خاصا کام کر لیتا تھا۔ کیونکہ سب لنچ پر گئے ہوتے تھے اس لیے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی کہ وہ راحیل کے کیبن میں ہے۔ چند دن تک تو راحیل لنچ کے بعد ہی آتا تھا تب تک احمر اپنا کام نمٹا لیتا تھا مگر پھر یہ ہوا کہ وہ خلاف توقع جلد آ جاتا اور کیبن میں اس کے پیچھے اپنے ریک سے ٹک کر دیکھتا رہتا کہ احمر کیا کر رہا ہوں۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ کوئی اس کے کام کو دیکھے لیکن وہ اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسی کے کیبن میں اور اسی کے کمپیوٹر پر تو بیٹھا ہوتا تھا۔ کیسے کہتا کہ وہ نہ دیکھے۔

رفتہ رفتہ راحیل نے اس سے سوفٹ ویئر کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ وہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ احمر کس طرح اور کن ٹولز کی مدد سے یہ سب بنا رہا ہوں۔ جواب میں وہ اسے بہت پیچیدہ انداز میں بتاتا کہ وہ یہ کام کیسے کر رہا ہوں۔ احمر کے جواب اس کے سر پر سے گزر جاتے تھے۔ اس لیے اس نے تیاری کے بارے میں سوالات ترک کر دیے۔ اب وہ احمر سے سوفٹ ویئر کے ممکنہ استعمال کے بارے میں پوچھتا تھا۔ وہ اس طرح کرید کرید کر سوالات کرتا تھا کہ احمر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بہت کچھ بتانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز سے بعض اوقات احمر کو اس پر.... شبہ ہوتا تھا کہ کہیں وہ اس کی محنت اُڑانے کی فکر میں تو نہیں ہے۔ وہ بہت موقع پرست شخص تھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ مگر ساتھ ہی احمر کو یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا کیونکہ سوفٹ ویئر کا سارا کام یو ایس بی میں تھا اور یو ایس بی.... وہ ساتھ لاتا اور لے جاتا تھا۔

احمر نے ایک مہینا راحیل کے کمپیوٹر پر کام کیا اور سوفٹ ویئر تقریباً مکمل ہو گیا تھا۔ بس کچھ فنشنگ تھی جو کسی آئی ٹی اسپیشلسٹ سے کرانی تھی اور اس کے لیے خاصی رقم درکار تھی اس لیے احمر نے فی الحال فنشنگ کا ارادہ ترک کر دیا۔ کمپنی میں ہر سال جون کے مہینے میں تنخواہوں میں انکریمنٹ لگتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ جب جون پاس آئے گا تب یہ سوفٹ ویئر زاہد صاحب کے سامنے پیش کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے قبول کریں گے کیونکہ اس سے ان کی کمپنی کو فائدہ ہوگا۔ کم عملے، نقصان اور دوسری مد... میں سالانہ لاکھوں روپے کی بچت ہو سکے گی اور ڈیل کی بروقت ترسیل سے بزنس بہتر ہوگا اس کا فائدہ الگ ہو گا۔ احمر نے راحیل کے کمپیوٹر کا استعمال چھوڑ دیا تھا۔ اس پر وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے احمر سے پوچھا۔ ”تم اب کام کیوں نہیں کر رہے ہو؟“

”کچھ مشکلات ہیں ان کے لیے نئے ٹولز تلاش کر رہا ہوں۔“ احمر نے بہانہ کیا۔ ”جیسے ہی ملیں گے میں آگے کام شروع کر دوں گا۔“

وہ مطمئن تو ہوا تھا مگر اس کی بے چینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کئی بار احمر نے اسے دیکھا کہ وہ زاہد صاحب کے کمرے سے نکل رہا ہے۔ جبکہ اس درجے کے ملازمین کا زاہد صاحب کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ کیونکہ وہ باس کی آنکھ کا تارا تھا اس لیے سب ہی اسے خاص اہمیت دیتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے کمپیوٹر سیکشن میں اضافہ ہوا اور زیبا نامی لڑکی اپائنٹ ہوئی۔ وہ بھی کمپیوٹر آپریٹر کی حیثیت سے آئی تھی۔ احمر کام کر رہا تھا کہ اس کی کھنکتی آواز سن کر چونکا کیونکہ اس سیکشن میں سارے مرد تھے۔ پہلے وہ یہ سمجھا کہ دفتر کی کوئی لڑکی یا خاتون کسی کام سے آئی ہوگی مگر یہ آواز مستقل آتی رہی۔ اس کے ساتھ راحیل کی آواز بھی شامل تھی وہ اسے کام سمجھا رہا تھا حالانکہ خود اسے ابھی تک یہ آسان کام بھی پوری طرح نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود وہ یوں استاد بنا ہوا تھا جیسے کسی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل ہو۔ احمر لنچ کے لیے نکلا تب میں نے زیبا کو دیکھا وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ نقوش کسی قدر غیر روایتی مگر جاذب نظر تھے۔ گہرے رنگ کی آنکھیں اور اسی رنگ کے بال تھے۔ اس نے سلیقے سے سلا ہوا جدید فیشن کا سوٹ پہنا ہوا تھا البتہ اس میں رکھ رکھاؤ کا خیال تھا۔ دفتر میں آنے والی بہت سی دوسری لڑکیوں کی طرح اس نے مکمل کر ڈریسنگ نہیں کی تھی۔ اپنی فطری جھجک کی وجہ سے احمر جاتے ہوئے اس سے بات بھی نہیں کر سکا۔ جب لنچ سے واپس آیا تو زیبا نے خود احمر کو روک لیا۔ وہ لنچ کے لیے نہیں گئی تھی۔

”ایکسکیوزمی، میں آپ کی نئی کولیگ زیبا احمد ہوں۔“

”احمر انصاری، ویلکم مس زیبا۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔ ”سوری مجھے علم نہیں تھا ورنہ میں آپ سے بات کرتا۔“

''کوئی بات نہیں یہ تو شعبے کے سربراہ کا کام ہے مگر وہ...'' وہ کہتے کہتے رکی اور پھر بولی۔ ''دراصل مجھے کام سے متعلق کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیوں نہیں جو چاہیں پوچھ لیں۔''

زیبا ذہین تھی مگر کام نیا تھا اس لیے سیکھنا لازمی تھا۔ احمر نے اسے پوچھی گئی چیزوں کے بارے میں گائیڈ کیا۔ اس نے تعجب سے کہا۔ ''آپ نے اتنی آسان زبان میں اور اتنی جلدی سمجھا دیا۔ جب میں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ کوئی گائیڈ کردے تو انہوں نے راحیل کو یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ اس شعبے کے سب سے ذہین آدمی ہیں۔ مگر انہوں نے بہت مشکل طریقے سے بتایا تھا۔''

''مجھے کام آسانی سے اور جلدی کرنے کی عادت ہے۔'' احمر نے کہا اور اپنے کیبن میں آ گیا۔ شام جانے سے پہلے زیبا خاص طور سے تھینک یو کہنے آئی تو اسے حیرت ہوئی کیونکہ یہاں اس قسم کا کوئی رواج نہیں تھا۔ احمر نے حسب معمول انکساری سے کہا۔ ''یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کولیگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔''

وہ جانتا تھا کہ راحیل صبح دو گھنٹے اس کے ساتھ لگا رہا اور اس نے ونیز جہان کی بک بک کرلی مگر اسے کام کی بات نہیں سمجھائی ہوگی۔ اول وہ اس فطرت کا آدمی نہیں تھا کہ کسی کو کچھ سمجھائے یا سکھائے دوسرے اسے آتا بھی معمولی سا تھا۔ چند دن میں احمر نے محسوس کیا کہ راحیل، زیبا کے آس پاس کچھ زیادہ ہی منڈلاتا تھا۔ وہ چرب زبان تھا اور کسی کو بھی آسانی سے باتوں میں گھیر لیتا تھا۔ لازمی بات ہے زیبا بھی جواب دیتی تھی۔ اکثر و بیشتر راحیل اس کے کیبن کے آس پاس رہتا تھا۔ احمر کو تعجب ہوتا کہ ایک کیبن کی دوری پر موجود صدیقی صاحب کو یہ سب نظر نہیں آرہا تھا۔ چند دن کے بعد زیبا نے کام سیکھ لیا اور اس کے بعد وہ باتوں کے بجائے کام پر توجہ دینے لگی۔ وہ خوش مزاج اور خود اعتماد تھی مگر کسی سے بھی ایک حد سے زیادہ فری نہیں ہوتی تھی۔ دفتر میں اس سے کہیں زیادہ حسین اور ماڈرن لڑکیاں تھیں مگر جو بات اس میں تھی وہ اس نے کسی اور میں محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اس کی جھجک اسے اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بارے میں اس طرح سے سوچے، کیونکہ احمر جانتا تھا کہ وہ کبھی اس سے اظہارِ محبت نہیں کرسکے گا۔ اس لیے بلاوجہ دل کو روگ لگانے کا فائدہ۔

زیبا کے آنے سے یہ ہوا کہ کوئی تو دفتر میں تھا جو اس سے عزت اور نارمل انداز میں بات کرنے لگا تھا۔ فارغ اوقات میں وہ اپنے سوفٹ ویئر پر کام کرتا تھا مگر اس طرح کہ کوئی اچانک آجائے تو اس کا کام نہ دیکھ سکے۔ لنچ کے وقت یہ آسانی ہوتی تھی کہ سب کھانے کے لیے گئے ہوتے تھے اور اس وقت کوئی نہیں ہوتا تھا۔ یوں وہ سکون سے اپنا کام کرتا تھا۔ اس دن بھی احمر اپنے کام میں مگن تھا کہ اسے کیبن کے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ زیبا تھی جو نہ جانے کب سے کھڑی تھی اور اسے کام کرتا دیکھ رہی تھی۔ اس نے کسی قدر نروس انداز میں کہا۔ ''آپ کب آئیں؟''

''کچھ دیر پہلے۔'' وہ کیبن میں آ گئی۔ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''یہ آپ کس سوفٹ ویئر پر کام کررہے ہیں؟''

وہ راحیل کو بتا کر پچھتا رہا تھا کیونکہ اب وہ آئے دن اس کا دماغ کھاتا رہتا تھا کہ احمر سوفٹ ویئر پر کب کام شروع کر رہا ہے اور وہ اسے ٹالتا رہتا تھا۔ زاہد صاحب نے بھی دیکھا تھا مگر وہ اسے گیم سمجھے تھے مگر زیبا نے اسے سوفٹ ویئر ہی سمجھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے ان چیزوں کی شد بد تھی۔ احمر نے اسے بتایا کہ وہ کس قسم کے سوفٹ ویئر پر کام کررہا ہے۔ وہ حیران ہوئی۔ ''آپ اتنا بڑا کام بھی کرسکتے ہیں! میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ بس ڈیٹا انٹری آپریٹر ہیں۔''

''یہ آپ کی مہربانی ہے ورنہ یہاں تو لوگ مجھے انٹری آپریٹر کے قابل بھی نہیں سمجھتے ہیں۔'' احمر نے ہنس کر کہا۔ ''شکر ہے آپ نے اسے سوفٹ ویئر سمجھا، ایک دن زاہد سر نے دیکھا تو سمجھے میں گیم کھیل رہا ہوں اور اس پر مجھے جھاڑ پڑی تھی۔''

وہ آہستہ سے بولی۔ ''مجھے افسوس ہوتا ہے جب میں یہاں کے لوگوں کا رویہ آپ کے ساتھ دیکھتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟''

''شاید اس لیے کہ میں شریف اور بزدل آدمی ہوں۔'' احمر نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میں جواب نہیں دے سکتا شاید وضاحت بھی نہیں کرسکتا۔ میں تو حق پر ہوتے ہوئے بھی حق بات نہیں کہہ سکتا۔'' وہ کہتے ہوئے جذباتی ہو گیا۔ نہ جانے اسے کیا ہوا تھا ورنہ وہ کسی بھی کولیگ سے اس طرح بات نہیں کرسکتا تھا۔ شاید یہ زیبا کی ہمدردی اور نرم طبیعت کا اثر تھا جو وہ یوں اس کے سامنے کھل گیا۔ احمر کی بات سن کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں نے بھی یہ سب محسوس کیا ہے۔ احمر دنیا بہت

سخت اور سفاک ہے، آدمی کو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلے سے کام لینا پڑتا ہے۔''

''میرے پاس یہی چیز نہیں ہے اس لیے میں کام جانتے ہوئے بھی سب سے پیچھے ہوں اور جو کچھ نہیں جانتے وہ سب سے آگے ہیں۔''

''آپ کو حوصلہ کرنا ہوگا۔ آپ پر صرف کی آپ کی ذمے داری تو نہیں ہے گھر والے .... بیوی بچے...''

''میری شادی نہیں ہوئی ہے۔''

''اوہ تو دوسرے گھر والے ہیں؟''

''اللہ رکھے والدہ ہیں، ایک چھوٹی بہن ہیں۔ چار دوسرے بہن بھائی بھی ہیں مگر وہ صرف رشتے کی حد تک ہیں۔ باقی سارے مسائل ہمیں ہی دیکھنے ہوتے ہیں۔ مجھ سے چھوٹی روما نے گریجویشن کر لیا ہے اور گھر میں چھوٹا سا کوچنگ سینٹر چلا رہی ہے۔''

''یقیناً آپ کو بہن کی شادی کرنا ہوگی اور کل کو آپ کی شادی بھی ہوگی اور فیملی ہوگی تو آپ کو مزید آمدنی کی ضرورت پڑے گی۔ میں پھر کہوں گی آگے بڑھنے کے لیے آپ کو خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔''

''مجھے امید ہے اس سوفٹ ویئر کا ڈیمو دیکھ کر زاہد صاحب اسے کمپنی کے لیے حاصل کریں گے۔''

زیبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''آپ ان کو اپنی محنت کیوں دے رہے ہیں؟''

''تو پھر کیا کروں؟''

''آپ نے بہت اہم چیز بنائی ہے، اسے خود سیل کریں۔''

''میری اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں اپنی کمپنی قائم کروں اور پھر اسے سیل کروں۔ اس کے لیے خاصا سرمایہ درکار ہوگا۔'' احمر نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں نے سنا ہے یہ واحد کام ہے جس میں زیادہ سرمایہ درکار نہیں ہوتا ہے۔''

''آپ نے ٹھیک سنا ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ سرمایہ لگتا ہے اب ہارڈ ویئر بہت مہنگا ہے۔ پھر کمپنی رجسٹرڈ کرانا اور دوسرے لوازمات پورے کرنا آسان نہیں ہے۔ میرے لیے آسان کام یہی ہے کہ میں زاہد صاحب کو اپنا سوفٹ ویئر استعمال کرنے پر آمادہ کروں اور اس سے ترقی کروں۔''

''مرضی ہے آپ کی۔'' زیبا نے کہا۔ ''لیکن میں اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔ یہ مالکان اسے اپنا حق سمجھ لیں گے اور شاید آپ کو کچھ نہ ملے۔''

استادیاں

استاد صاحب۔ ''تم بھائیوں نے کُتے پر جو مضمون لکھا ہے، وہ لفظ بہ لفظ ملتا ہے۔''

پہلا لڑکا معصومیت سے۔ ''سر، ہم دونوں نے ایک ہی کُتے پر مضمون لکھا ہے۔''

☆☆☆

استاد شاگرد سے: ''جب لیاقت علی خان تمہاری عمر کے تھے تو مشکل ترین سوالات حل کر لیا کرتے تھے۔''

شاگرد: ''اور جب وہ آپ کی عمر کو پہنچے تو وزیراعظم بن گئے۔''

☆☆☆

استاد صاحب: ''کوئی سے دو اسم نکرہ بتاؤ۔''

شاگرد: ''کون... کس؟''

مظفر آباد، آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی استادیاں

مگر احمر کی دنیا امید پر قائم تھی۔ جون نزدیک آیا تو اس نے خاص طور سے اپنی تنخواہ میں اضافے کی درخواست کے ساتھ اس سوفٹ ویئر کے ڈیمو کی درخواست بھی کی۔ اس پر زاہد صاحب نے اسے دو دن بعد بلا لیا۔ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں زاہد صاحب کے ساتھ راحیل اور صدیقی صاحب کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے زاہد صاحب سے کہا۔ ''جی سر آپ نے بلایا ہے۔''

''یہ تم نے کیا بکواس لکھی ہے۔'' زاہد صاحب نے سوفٹ ویئر ڈیمو کی درخواست احمر کے سامنے پھینک دی۔ اگرچہ اس کے ساتھ ان کا رویہ کبھی اچھا نہیں رہا تھا مگر ایسا خراب لہجہ بھی زاہد صاحب نے کبھی نہیں اپنایا تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

''سر میں نے کمپنی کے لیے ایک انوینٹری سوفٹ ویئر تیار کیا ہے میں اس کے ڈیمو کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''سوفٹ ویئر اور تم نے؟'' صدیقی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں کمپیوٹر پر ڈھنگ سے اپنا کام تو کرنا آتا نہیں ہے اور تم سوفٹ ویئر بناؤ گے۔''

''سر میں بی سی ایس ڈگری ہولڈر ہوں۔'' احمر نے پہلی بار جرأت کر کے زبان کھولی۔ ''آپ کی طرح صرف چند کورس نہیں کیے ہیں۔''

''تم صرف جھوٹے ہی نہیں بلکہ چور بھی ہو۔ یہ سوفٹ ویئر جس کا تم ڈیمو کرنا چاہ رہے ہو، اصل میں راحیل نے بنایا

ہے۔'' صدیقی صاحب بولے تو احمر دنگ رہ گیا تھا۔

''راحیل نے...''

''ہاں، یہ سوفٹ ویئر راحیل نے تیار کیا ہے۔'' اس بار زاہد صاحب نے کہا۔ ''اس نے مجھے ڈیمو بھی دکھایا ہے۔''

ایک لمحے کو احمر کا سر چکرا گیا مگر وہ جلد سمجھ گیا کہ راحیل نے کسی طریقے سے اس کا سوفٹ ویئر حاصل کرلیا تھا۔ یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے اپنے کمپیوٹر میں کوئی اسپائی سوفٹ ویئر انسٹال کیا ہوگا جس نے چپکے سے احمر کی یو ایس بی سے سارا ڈیٹا چرا لیا اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔ احمر نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''سر یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اس کے کمپیوٹر پر کچھ دن کام کیا تھا اور اس نے وہاں سے یہ سوفٹ ویئر چرایا ہے۔ سر میں ثبوت دے سکتا ہوں کہ یہ میرا بنایا ہوا ہے اور اسے اس سوفٹ ویئر کی اے بی سی بھی نہیں آتی۔''

''شٹ اپ۔'' زاہد صاحب دہاڑے۔ ''مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔''

احمر شاک میں رہ گیا تھا۔ کہاں تو وہ سوفٹ ویئر پیش کر کے اپنی تنخواہ اور عہدہ بڑھوانے کی فکر میں تھا اور کہاں نہ صرف اس کا سوفٹ ویئر چرا لیا گیا بلکہ اسے نوکری سے بھی فارغ کر دیا گیا۔ اس سے پہلے اسے حقارت آمیز اور ناپسندیدہ رویے کا سامنا تھا لیکن آج تک کسی نے اسے جھوٹا اور چور نہیں سمجھا تھا۔ آج ذلت کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ تب احمر نے دیکھا راحیل کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ ذمے دار تھا اس ساری صورتِ حال کا۔ احمر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''سر میری ایک بات سن لیں۔''

''نو... گیٹ آؤٹ۔'' لہجے کے ساتھ ان کا چہرہ اس سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اب بات کرنے کا مطلب اپنی مزید بے عزتی کرانا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا پھر اس نے رک کر راحیل کی طرف دیکھا۔ ''تم نے جو کیا ہے، اس سے تمہیں صرف عارضی فائدہ ہوگا کیونکہ وہ سوفٹ ویئر نامکمل ہے۔''

''وہ میں نے بنایا ہے اور جلد میں اسے مکمل کرلوں گا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''مجھے تمہاری ڈھٹائی پر حیرت ہے کہ تم اسے اپنا سوفٹ ویئر کہہ رہے ہو۔''

''اس کے جھوٹ کا پول کھل گیا ہے۔'' صدیقی صاحب حقارت سے بولے۔

''سر جب یہ سوفٹ ویئر مکمل کرنے میں ناکام رہے تو آپ ایک بار مجھ سے رابطہ کر لیجیے گا۔'' احمر نے زاہد صاحب سے کہا تو انہوں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔

''تم اسی وقت اکاؤنٹس میں جا کر اپنا حساب لو اور دوبارہ یہاں نظر مت آنا۔''

وہ ڈولتے قدموں سے اپنے کیبن تک آیا۔ اس نے یہاں سے اپنی چیزیں لیں اور پھر اکاؤنٹس جہاں زاہد صاحب کی ہدایت پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اس کے واجبات کا چیک تیار تھا، وہ اسے تھما کر اس سے سائن لیے گئے اور ڈسمس لیٹر تھما دیا گیا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اسے نااہلی کا الزام لگا کر ملازمت سے نکالا گیا تھا اور اب وہ نہ تو یہاں سے تجربے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرسکتا تھا اور نہ ہی کہیں اور ملازمت کے لیے درخواست دیتے ہوئے اس جاب کا حوالہ دے سکتا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے زیبا کے کیبن میں دیکھا تو اس کا کیبن خالی تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ آج آفس نہیں آئی تھی۔ اس واقعے نے اسے ذہنی طور پر اتنا منتشر کر دیا تھا کہ اسے خیال ہی نہیں آیا کہ زیبا بھی اس کے سوفٹ ویئر کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ اس کی گواہی دلوا سکتا تھا۔ وہ آفس سے باہر آیا اور بے دھیانی میں سڑک پر پہنچ گیا جہاں ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ بہت سی گاڑیوں نے بیک وقت ہارن دیا تو اسے ہوش آیا۔ وہ بے خیالی میں چلتے ٹریفک میں اتر آیا تھا۔

گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ گھر اس کی تنخواہ سے چلتا تھا۔ کرایہ، بلز، گروسری اور دوسرے اخراجات سب اس کی تنخواہ سے پورے ہوتے تھے۔ روما کوچنگ سینٹر سے جو کماتی تھی، اس سے صفیہ اس کے جہیز کے لیے کچھ نہ کچھ لیتی رہتی تھیں کیونکہ احمر کی تنخواہ میں تو بس گزارہ ہوتا۔ ظہیر اور شبیر کچھ دیتے تھے تو اس سے اوپر کے خرچے پورے ہو جاتے تھے۔ جمع پونجی بھی نہیں تھی کہ جب تک دوسری ملازمت ملتی ان کا گزارہ ہوتا رہتا۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم گھر پہنچا تو اندر داخل ہوتے ہی صفیہ اور روما اس کی صورت سے سمجھ گئیں کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ صفیہ نے پوچھا۔ ''خیر تو ہے احمر صورت کیوں اتری ہوئی ہے میرے بچے؟''

وہ تھکے انداز میں لاؤنج میں صوفے پر گر گیا۔ ''مجھے جاب سے نکال دیا ہے۔''

صفیہ اور روما پریشان ہو کر اس کے پاس چلی آئی تھیں۔

"کیا ہوا کیوں نکال دیا، تو تو اپنا کام اتنی محنت اور ایمان داری سے کرتا ہے۔"

"میری ایمان داری ہی میرا جرم بن گئی ہے۔" اس نے تلخی سے کہا۔ صفیہ اور روما کے چہرے اتر گئے تو اسے خیال آیا کہ وہ مرد ہے اور اسے ان عورتوں کو اس طرح مایوس نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "مگر آپ فکر نہ کریں، اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔ میں جلد دوسری جاب تلاش کرلوں گا۔"

"احمر بھائی آپ فکر نہ کریں۔ میرا کوچنگ سینٹر بہت اچھا چل رہا ہے۔" روما نے بھی اسے تسلی دی۔ "اب میرے پاس بارہ بچے آتے ہیں۔ مہینے کے اکیس ہزار بنتے تھے۔"

احمر حیران ہوا۔ "اچھا مجھے تو پتا نہیں تھا کہ تو میرے جتنا کما رہی ہے مگر یہ تیری کمائی ہے گھر میری ذمے داری ہے۔"

"ہاں بھائی لیکن جب تک آپ کو جاب نہیں ملتی، اخراجات تو ہوں گے۔" روما نے کہا۔ صفیہ بھی اسے تسلی دینے لگیں کہ اسے جلد دوسری جاب مل جائے گی۔ اس وقت اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے جلد جاب مل جائے۔ مگر جب اس نے جاب کی تلاش شروع کی تو اسے پتا چلا کہ مارکیٹ میں جاب نایاب ہیں اور جو ہیں ان کے لیے کچھ نہ کچھ جان پہچان لازمی تھی۔ سی وی تو اس نے پہلے بھی کچھ جگہوں پر جمع کرائی تھی مگر ان کی طرف سے ویکنسی کی صورت میں کال آتی۔ اب اس نے ملازمت کے اشتہاروں کے جواب میں سی وی بھیجنا شروع کی اور کئی جگہوں سے اسے انٹرویو کال بھی آئی۔ مگر وہ بتاتا کہ وہ جہاں جاب کرتا تھا، اسے وہاں سے جاب کا سرٹیفکیٹ نہیں ملا ہے۔ زیڈ اے ٹریڈرز معمولی کمپنی نہیں تھی اور اس کا سرٹیفکیٹ نہ ہونا ہی شک کرنے کو کافی ہوتا تھا۔ تنگ آکر اس نے اپنی سی وی سے اس ملازمت کا حوالہ ہی نکال دیا۔ مگر اس کے بعد اس کے پاس جاب کا تجربہ ہی نہیں تھا۔ بغیر تجربے کے ذکر کے جہاں سی وی بھیجی وہاں سے کوئی جواب ہی نہیں آتا۔

ایک مہینا گزرا تو اس کے خدشات گہرے ہونے لگے۔ اس سے کہیں معمولی صلاحیتوں والے لڑکے جابس کر رہے تھے اور کامیاب تھے۔ وہ موقع ملتے ایک کمپنی چھوڑ کر دوسری کمپنی میں چلے جاتے تھے اور پہلے سے زیادہ بہتر تنخواہ اور پوسٹ حاصل کرلیتے تھے۔ وہ ایک ہی جاب سے چمٹا رہا اور بالآخر اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے اپنے سوفٹ ویئر کو فروخت کرنے کا خیال آیا۔ مگر یہ سوچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی کہ وہ جاب تو حاصل کر نہیں پا رہا ہے۔ یہ مشکل کام کیسے کرے گا جو براہِ راست بزنس میں آتا ہے۔

ایک دن اتفاق سے وہ اسی بلڈنگ میں انٹرویو دینے گیا اور وہاں سے نکلتے ہوئے اسے ذرا دیر ہوگئی جب وہ نیچے آیا تو عقب سے کسی نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ زیبا تھی جو تیز قدموں سے اس کی طرف آرہی تھی۔ وہ اتنی تیزی سے آئی تھی کہ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے رکتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے تم نظر تو آئے اس دن کے بعد سے ایسے غائب ہوئے کہ کبھی نظر بھی نہیں آئے۔"

وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ "اب بھی اس عمارت میں ڈرتے ڈرتے آیا ہوں۔"

وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "میں جانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا زیادتی ہوئی ہے اور میں تم سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی۔"

"خیریت؟"

"ہاں، میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔ "کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کرسکتے؟"

جب تک وہ جاب میں تھا، زیبا اس سے آپ جناب سے بات کرتی تھی اور اس وقت وہ بہت بے تکلف انداز میں بات کررہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ ایک نزدیکی کیفے میں بیٹھے تھے۔ احمر نے اپنی جیب کا خیال کرتے ہوئے چائے اور چند ہلکی پھلکی چیزیں منگوائی تھیں۔ حال احوال کی رسمی باتوں کے بعد زیبا نے کہا۔ "مجھے پتا چل گیا تھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے اور میرا دل چاہا کہ میں جا کر زاہد صاحب کو وہ سب بتادوں جو میں جانتی ہوں۔"

"لیکن تم نے بتایا نہیں۔"

"ہاں، لیکن میں ڈر کر نہیں رکی بلکہ مجھے خیال آیا کہ شاید اس کا فائدہ نہ ہو۔ پھر میں نے ماما جی سے مشورہ کیا اور انہوں نے بھی تائید کی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے میں تمہیں تلاش کروں۔"

"ماما جی کون ہیں؟"

"میرے سرپرست ہیں۔" اس نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ "میں ان ہی سے تمہیں ملوانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اگر تم چاہو تو انکار کرسکتے ہو لیکن میری التجا ہے کہ

ایک بار مل کر دیکھ لو میں یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں کوئی فائدہ ہی ہوگا نقصان نہیں ہوگا۔"

"کیسا فائدہ؟"

زیبا نے گہری سانس لی۔ "دیکھو تم اس طرح سوال کرو گے اور میں جواب دیتی رہوں گی تب بھی تمہاری تسلی نہیں ہوگی۔ بہتر ہے تم ایک بار ماما جی سے مل لو اس کے بعد میں تمہارے سوالوں کا جواب دے سکوں گی۔"

احمر ہچکچایا۔ "کیا یہ مناسب ہوگا۔ دیکھو میں تمہارے ریفرنس سے ملوں تو ان کے ذہن میں کوئی اور خیال نہ آئے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ان سے ذکر کیا ہے اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے تم فکر مت کرو وہ کوئی الٹا سیدھا خیال ذہن میں نہیں لائیں گے۔" کہتے ہوئے زیبا کا رنگ ذرا سرخ ہوا تھا۔ احمر بھی جھینپ گیا۔ اس نے موضوع بدل دیا۔

"کمپنی کا کیا حال ہے؟" کہتے ہوئے اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "راحیل نے سوفٹ ویئر مکمل کر لیا؟"

"بے وقوف بنا رہا ہے۔ روز نئے بہانے کرتا ہے کئی آئی ٹی ماہرین سے کام لے چکا ہے۔ دو ملازم رکھے ہیں مگر سوفٹ ویئر اب تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ اب دو ہفتے سے بیمار ہے۔ دفتر نہیں آ رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ بہانہ کر رہا ہے۔"

"وہ اسے مکمل نہیں کر سکتا، میں نے اس میں کچھ لاک لگائے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے آئی ٹی ماہرین بھی اسے مکمل نہیں کر سکتے۔ جو ماہرین ان لاکس کو کھول سکتے ہیں، وہ بہت پیشہ ور اور مہنگے ہوں گے۔"

"تم نے اب تک سوفٹ ویئر کا کیا کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں، میں تو جاب کی تلاش میں لگا ہوا ہوں۔"

"سنو، تم اس سوفٹ ویئر کی مدد سے بہت آگے جا سکتے ہو۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میری بنیاد کمزور ہے۔"

"میں اسی لیے تمہیں ماما جی سے ملوانا چاہتی ہوں۔"

احمر نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے ملوا دو۔"

☆☆☆

احمر نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زیبا کا ماما جی ایسی جگہ رہتا ہوگا۔ یہ پرانے شہر کا علاقہ تھا۔ کئی منزلہ اونچی عمارتوں کے درمیان تنگ گلیاں اور ٹوٹے پھوٹے راستے تھے۔ جگہ جگہ چرسی سوالی ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ وہ ٹیکسی میں یہاں تک آئے تھے۔ راستے میں احمر نے پوچھا۔ "تم یہاں رہتی ہو؟"

"نہیں میں تو طارق روڈ کے پاس ایک وومین ہوسٹل میں رہتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہاں ماما جی رہتے ہیں۔"

ماما جی کھرے نقوش، سامنے سے اُڑتے بالوں اور جمی ہوئی مونچھوں والا ادھیڑ عمر آدمی نکلا۔ اس کی سرمئی آنکھوں میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ سفیدی مائل براؤن بال بے ترتیب تھے اور عمر پچاس کے آس پاس تھی۔ وہ دوسری منزل پر تین کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور یہاں عام سا ساز و سامان اور فرنیچر تھا مگر فلیٹ بہت صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ وہ اس وقت کوکنگ کر رہا تھا۔ پتلون اور آدھی آستین کی شرٹ کے اوپر اس نے ایپرن باندھ رکھا تھا اور ہاتھ میں فرائنگ پین میں چلانے والا چمچ تھا۔ زیبا کو دیکھ کر وہ بولا۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ماما جی۔" زیبا نے جواب دیا۔ "ماما جی یہ احمر ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔"

"اچھا اچھا۔" ماما جی نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "کیسے ہو نوجوان؟ آؤ اندر آؤ۔"

سلام دعا کے ساتھ وہ اندر آئے۔ اوپن کچن کے ساتھ لاؤنج تھا، اس نے وہیں انہیں بٹھایا اور زیبا سے کہا۔ "فریج سے کچھ نکال لو، آج کچھ نا کھا کر جانا۔"

وہ فریج سے کولڈ ڈرنک کے ٹن نکال لائی۔ ماما جی کچن میں فرائنگ پین میں چمچ چلاتے ہوئے ان سے بات کر رہا تھا۔ اس نے احمر کو اجازت دے دی کہ وہ بھی اسے ماما جی کہہ سکتا ہے۔ زیبا نے احمر سے کہا تو اس نے ہچکچاتے ہوئے ماما جی کو اپنی کہانی سنائی۔ اس نے درمیان میں چند ایک سوالات کیے مگر زیادہ تر خاموشی سے سنتا رہا۔ اس دوران میں اس نے ڈش تیار کر لی تھی۔ اس نے مٹن کڑاہی کے ساتھ ساتھ سادہ چاول بنائے تھے۔ اس کے علاوہ سلاد تھی۔ احمر نے بھی ایسی عجیب ڈش نہیں کھائی تھی مگر جب اس نے کھائی تو اسے اچھی لگی۔ ماما جی کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ لاؤنج میں چھوٹی سی چار افراد کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد زیبا نے برتن اٹھائے اور ماما جی نے اس سے اپنے لیے قہوے کی فرمائش کی۔ زیبا نے احمر سے پوچھا۔

"تم کیا پیو گے؟"

"چائے۔" احمر نے جواب دیا۔ وہ لاؤنج میں آگئے تھے۔ ماماجی اب تک بڑے دوستانہ اور عام سے انداز میں گفتگو کررہا تھا مگر اچانک اس کا لہجہ بدل گیا۔

"ہاں بیٹا اب کہو تم کیا چاہتے ہو؟"

احمر نروس ہوگیا۔ "میں سمجھا نہیں جناب۔"

"میں سمجھاتا ہوں۔ تم زیبا کے توسط سے آئے ہو اور زیبا اس دنیا میں واحد ہستی ہے جس کی میں پروا کرتا ہوں اور اس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔ یہ چاہتی ہے تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کا ازالہ کیا جائے۔ اب ازالے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔"

"مثلاً؟"

"ایک تو یہ کہ تمہارا مسئلہ حل کردیا جائے۔ تم بے روزگار ہوگئے ہو، تمہارے لیے دوسری جاب کا بندوبست کیا جائے۔"

احمر خوش ہوگیا۔ "ایسا ہوسکتا ہے ماماجی؟"

"کیوں نہیں ہوسکتا۔" وہ بولا۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ تمہیں اپنا بزنس شروع کرنے کے لیے سرمائے اور مدد کی ضرورت ہے تو وہ بھی مل سکتی ہے۔"

ماماجی کا انداز بتارہا تھا کہ اس کے علاوہ بھی مزید کوئی صورت ہے۔ اس نے پوچھ لیا۔ "ماماجی اس کے علاوہ بھی کوئی صورت ہے؟"

"ہاں جن لوگوں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، ان کو سبق سکھایا جائے اور ان سے تاوان لیا جائے۔ انہوں نے تمہارا جو نقصان کیا ہے، وہ پورا کیا جائے۔"

ماماجی کی یہ بات سنتے ہی اسے راحیل کا خیال آیا اور اس کا خون کھولنے لگا۔ وہی شخص اس کی مشکلات کا ذمے دار تھا۔ اگرچہ زاہد بھائی کو اتنے کچے کانوں کا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اصل قصوروار یہی تھا۔ اس نے بلاوجہ احمر کی پشت پر وار کیا۔ وہ قیامت تک اس سوفٹ ویئر کو مکمل نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا، اس کے باوجود اس نے احمر کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اس کی وجہ سے اس کا چانس ضائع ہوا۔ اس کی جاب گئی اور اب اسے دوسری جاب بھی نہیں مل رہی تھی۔ اپنی تجاویز سامنے رکھ کر ماماجی اب بے پروائی سے سگریٹ نوشی میں مگن تھا اور اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بھی تجویز پر جو احمر مان لے عمل کرنا اس کے لیے مسئلہ ہی نہیں تھا۔ زیبا اپنے اور احمر کے لیے چائے اور ماماجی کے لیے قہوہ بنا لائی۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس نے سب سنا تھا مگر کوئی مداخلت نہیں کی۔

احمر سوچ میں گم تھا اور اس کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات تھے... بالآخر اس نے کہا۔ "ماماجی مجھے آپ کی تیسری تجویز منظور ہے۔"

ماماجی نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی اور کہا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم تیسری تجویز مان لوگے۔"

☆☆☆

زاہد بھائی کا موڈ آف تھا۔ آج راحیل سترہ دن بعد دفتر آیا تھا۔ ہر تیسرے دن اس کی طرف سے بیماری کی درخواست آرہی تھی۔ اس کے آتے ہی زاہد صاحب نے اسے طلب کرلیا۔ راحیل اندر آیا تو ہشاش بشاش تھا اور اس نے زاہد صاحب کے موڈ کی پروا کیے بغیر چہک کر کہا۔ "سر میں نے مسئلہ حل کرلیا ہے۔"

"یہ بات تم پچھلے دو مہینے سے کہہ رہے ہو۔" زاہد بھائی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس دوران میں تم ڈھائی لاکھ روپے خرچ کرچکے ہو اور نتیجہ صفر ہے۔"

"سر کچھ مشکلات تھیں مگر میں انہیں حل کرچکا ہوں۔" راحیل نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "بس اب چند اسٹیپ رہ گئے ہیں اور پھر سوفٹ ویئر تیار ہوگا۔"

"یہ بات بھی میں کئی بار سن چکا ہوں۔ آخر یہ چند اسٹیپ کب طے ہوں گے؟" زاہد بھائی نے میز پر ہاتھ مارا۔

"سر آپ ڈھائی لاکھ کو دیکھ رہے ہیں۔" راحیل نے اس کی بات نظر انداز کرکے شکوہ کیا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اتنی بچت تو آپ کو پہلے مہینے میں ہوجائے گی۔ سر یہ بہت قیمتی چیز ہے، آپ باہر کا سوفٹ ویئر لیں گے تو آپ کو بہت بڑی رقم صرف کرنا پڑے گی۔ جبکہ اس کے لحاظ سے ماہرین اور ہارڈ ویئر بھی رکھنا ہوگا۔ یہ سوفٹ ویئر فری ہوگا اور میں اسے چلاؤں گا اور دوسروں کو بھی میں تربیت دوں گا۔ آپ کو نہ ایکسٹرا اسٹاف رکھنا ہوگا اور نہ ہارڈ ویئر۔"

ان دو مہینوں میں مسلسل سوفٹ ویئر کے موضوع پر بات کرنے سے زاہد بھائی بھی کچھ سمجھنے لگے تھے۔ ان کے بزنس مائنڈ میں آگیا تھا کہ مذکورہ سوفٹ ویئر ان کے بزنس کو بہت آگے لے جاسکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ راحیل بلند بانگ دعووں کے باوجود اب تک اسے حتمی صورت دینے میں ناکام رہا تھا۔ زاہد بھائی نے اس کے لیے ایک علیحدہ شعبہ بنا کر اسے آئی ٹی کے دو ماہرین سمیت جدید کمپیوٹرز اور دوسرے آلات مہیا کردیے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی زاہد بھائی کو خیال آتا

کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ احمر ٹھیک کہہ رہا ہو۔ مگر ان کا دل فوراً اس خیال کو جھٹک دیتا۔ انہیں احمر سے چڑ تھی اور وہ مان ہی نہیں سکتے تھے کہ احمر نے ایسا کوئی کام کیا ہے۔ ان کے خیال میں وہ صرف ان کے رحم و کرم کی وجہ سے اس کمپنی میں اتنے عرصے سے ٹکا ہوا تھا۔

''اب یہ بتاؤ کہ اس کام میں مزید کتنا عرصہ لگے گا؟'' زاہد بھائی نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''سر میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ جلد از جلد اسے مکمل کر لوں۔'' راحیل نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ''بیماری کی وجہ سے آفس نہیں آ رہا تھا مگر گھر میں اس پر مسلسل کام کرتا رہا ہوں۔''

''تمہارے پاس اب صرف ایک مہینا ہے۔'' زاہد بھائی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک مہینے سے مراد اس مہینے کی آخری تاریخ کو شام چھ بجے تک کا وقت ہے۔ چھ بج کر ایک منٹ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھ گئے تم؟''

''یس سر۔'' راحیل نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

''تب وقت ضائع مت کرو۔'' زاہد بھائی نے اسے مہذب انداز میں گیٹ آؤٹ کہا۔ وہ اٹھ کر باہر آیا اور اس نے ماتھے پر آیا ہوا پسینا صاف کیا۔ ان چند مہینوں میں وہ یہ بات جان گیا تھا کہ چرب زبانی کے بل بوتے پر وہ دوسروں کو کچھ دیر کے لیے بے وقوف بنا سکتا ہے لیکن اس کے بل بوتے پر وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سوفٹ ویئر اس کے بس کی بات نہیں ہے مگر اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ راحیل نے چند آئی ٹی فرمز سے سوفٹ ویئر کے بارے میں معلوم کیا تو انہوں نے جو رقم بتائی، اسے سن کر اس کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ اب اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے خود سے کہا۔

''بس میاں ایک مہینے یہاں اور عیش کر لو، اس کے بعد چھٹی۔''

راحیل کو جاب کی فکر نہیں تھی۔ وہ اس مقولے پر یقین رکھتا تھا کہ دنیا میں بے وقوف بننے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے بس بنانے والا ہونا چاہیے۔ البتہ اسے افسوس تھا کہ اس سوفٹ ویئر کی صورت میں اس کا جیک پاٹ لگ سکتا تھا۔ اگر احمر اسے مکمل کر دیتا تو آج وہ کمپنی ایگزیکٹوز میں شامل ہوتا۔ جب احمر نے اسے اپنے سوفٹ ویئر کے بارے میں بتایا تھا تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے ہتھیا لے گا۔

اسی لیے اس نے اپنا کمپیوٹر اسے پیش کر دیا اور پھر اس میں ایک اسپائی سوفٹ ویئر لگا دیا جو احمر کے کام کا سارا ڈیٹا اتارتا رہتا تھا۔ اسے احمر پر غصہ آ رہا تھا۔ کیا تھا کہ وہ مکمل کر لیتا مگر شاید اسے موقع نہیں ملا تھا اور جب راحیل کے علم میں آیا کہ وہ سوفٹ ویئر کا ڈیمو پیش کرنا چاہتا ہے تو اسے حرکت میں آنا پڑا۔ اس نے فوراً زاہد بھائی سے رابطہ کیا اور بڑے موثر انداز میں اسٹوری بنا کر پیش کی۔ اس نے زاہد بھائی کو احمر کے اتنا خلاف کر دیا کہ انہوں نے اس کی بات ہی نہیں سنی اور اسے فائر کر دیا۔ راحیل نے اتنی کامیابی حاصل کر لی تھی مگر اس سے آگے وہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اچانک پاس سے ہی صدیقی صاحب کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔ صدیقی صاحب پاس کھڑے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب سے اس نے زاہد بھائی سے کہہ کر اپنا ڈیپارٹمنٹ الگ کرایا تھا وہ اس سے کچھ فرنٹ ہو گئے تھے۔ جب ملتے طنزیہ انداز میں بات کرتے .... مگر راحیل، احمر نہیں تھا جو اُن کی باتیں سن لیتا، وہ برابر کا جواب دیتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بدمزگی سے کہا۔

''ظاہر ہے کیونکہ میرے پاس دماغ ہے۔''

''ہاں بس تمہارے پاس دماغ ہے۔'' انہوں نے بھی طنز کرنے میں پی ایچ ڈی کیا ہوا تھا۔ ''دیکھتے ہیں کب تک اس سے کام چلاتے ہو۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں کام چلا ہی لوں گا۔'' راحیل نے وہاں سے جاتے ہوئے کہا مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے جتنا کام چلانا تھا، اس نے چلا لیا ہے۔ اب اسے جلد یہاں سے بوریا بستر گول کرنا پڑے گا۔ وہ یہاں سے خالی ہاتھ نہ جاتا اس نے بہت سے فائدے اٹھا لیے تھے۔ خاصی رقم اس نے اس منصوبے سے حاصل کی تھی جو نام نہاد سوفٹ ویئر کی تیاری میں لگانے کے لیے اس نے مختلف حیلے بہانوں سے وصول کی تھی۔ وہ آ کر کمرے میں بیٹھ گیا اور پھر لنچ کے وقت باہر آیا۔ اس نے اپنے لیے لنچ بھی باہر سے منظور کروا لیا تھا اور وہ روز ہی کہیں باہر لنچ کے لیے جاتا تھا۔ اس کا بل کمپنی ادا کرتی تھی۔ اس نے ایک نزدیکی ریستوران کا رخ کیا اور ابھی ٹیبل پر بیٹھا تھا کہ کوئی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور احمر کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔

''تم...''

احمر مسکرایا۔ ''ہاں میں۔''

''کس لیے آئے ہو؟'' راحیل ڈھٹائی سے بولا۔ اس کے انداز میں ذرا بھی شرمساری نہیں تھی۔

''تم نے میرا سوفٹ ویئر چرا لیا لیکن میں جانتا تھا کہ تم اسے مکمل نہیں کر سکو گے۔''

''میں نے اسے مکمل کر لیا ہے۔۔۔''

''وہ نامکمل ہے اور مجھے معلوم ہے تم نے آج ہی زاہد بھائی سے اس سلسلے میں جھاڑ کھائی ہے۔''

راحیل حیران ہوا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''میں نے پچھلے کچھ عرصے میں بہت کچھ معلوم کیا ہے۔''

راحیل یک دم محتاط ہو گیا۔ ''تم میری جاسوسی کرتے رہے ہو لیکن تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی تمہاری بات پر یقین نہیں کرے گا۔''

''میں کسی کو یقین دلانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے اور کسی حد تک تمہارے فائدے کے لیے یہ سب کر رہا ہوں۔''

''میرا فائدہ۔'' راحیل نے بے یقینی سے کہا۔ ''وہ کیسے؟''

''دیکھو تمہیں سوفٹ ویئر مکمل چاہیے کہ تم زاہد بھائی کے سامنے سرخرو ہو سکو اور مجھے یہ سوفٹ ویئر مکمل کرنا ہے کہ اب میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ میں اسے مکمل کروں گا تو پھر مجھے آگے کام یا جاب ملے گی۔''

راحیل نے پہلی بار دلچسپی لی۔ ''اوہ تو یہ مسئلہ ہے لیکن تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟ تم خود بھی اس کام کو کر سکتے ہو۔''

''نہیں کر سکتا کیونکہ سوفٹ ویئر کی فنشنگ کے لیے رقم درکار ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''رقم تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔'' راحیل نے جلدی سے کہا۔

''جھوٹ مت بولو، تم نے اس دوران میں کمپنی سے خاصا مال کھینچا ہے۔ تمہاری تنخواہ بھی اچھی خاصی ہے اور دوسرے حیلے بہانوں سے بھی ان سے رقم وصول کی ہوگی۔''

''فرض کر لو ایسا ہے تب بھی تمہیں اس سے کیا؟''

''میں بتا چکا ہوں کہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی راستہ نہیں ہوگا۔''

''میرے پاس راستے ہیں، میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے اگر تم ناکام رہے تو کہیں اور چلے جاؤ گے لیکن وہاں تمہیں یہ پوزیشن نہیں ملے گی۔ یہاں تم کامیاب ہو گئے تو زاہد بھائی کی آنکھ کا تارا بن جاؤ گے۔ تمہیں فوری ایگزیکٹو پوسٹ مل جائے گی۔ اس کا مطلب ہوگا کہ تمہاری تنخواہ ہی کم سے کم لاکھ روپے ہوگی اور ساتھ ہی تم اپنے شعبے کے انچارج بن جاؤ گے۔ صرف زاہد بھائی کو جواب دہ ہو گے۔''

احمر نے کہا تو راحیل سوچ میں پڑ گیا اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے؟''

احمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''بتا تو چکا ہوں کہ میرا کیا فائدہ ہے۔ ایک بار میں نے یہ سوفٹ ویئر مکمل کر لیا تو کسی بھی اچھی آئی ٹی کمپنی میں لگ سکتا ہوں اور پھر یہ میرا بنایا ہوا ہے اس لیے میں اسے سیل بھی کر سکتا ہوں۔''

''یہ میرا ہے۔'' راحیل فوراً بولا۔

''ہاں تم نے اسے چرا لیا ہے۔'' احمر نے طنز کیا۔ ''لیکن یوں چرا لینے سے یہ تمہارا نہیں ہو جائے گا۔ سب زاہد بھائی کی طرح عقل کے اندھے اور متعصب نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ بھی ہوشیار ہیں، اصل بات وہی ہے کہ وہ مجھ سے نہ جانے کیوں خار کھاتے ہیں۔ ایک ہوشیار آدمی ایک منٹ میں فیصلہ کر لے گا کہ اصل ڈیولپر کون ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے زاہد بھائی کے سامنے کیا کہا ہے۔ اگر فیصلے کا موقع آیا تو جج زاہد بھائی نہیں ہوں گے۔''

راحیل کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بات اس کے ہوشیار ذہن میں آ رہی تھی کہ اگر اس بات میں احمر کا فائدہ ہے تو اس کا کہیں زیادہ فائدہ ہے۔ دوسری صورت میں اسے یہاں سے جانا ہوگا اور اسے معلوم تھا کہ آج کل جاب کا کال تھا۔ اس کے سامنے احمر جیسا باصلاحیت آدمی بے روزگار تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''خرچہ۔'' احمر نے اطمینان سے کہا۔ ''میں بے روزگار ہوں اور میرے پاس جمع پونجی بھی نہیں ہے۔ اس لیے اگر میں چاہوں بھی تو سوفٹ ویئر مکمل نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ اگر تم مانتے ہو اور خرچہ کرتے ہو تو ہم دونوں کا فائدہ ہے اور اگر تم نہیں مانتے تو ہم دونوں کا نقصان ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

راحیل لنچ بھول گیا تھا، اس نے سگریٹ سلگائی اور گہرے کش لگانے لگا۔ احمر آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے یہ ریستوران پسند تھا اور بعض اوقات وہ

یہاں سے لنچ منگواتا تھا۔ کچھ دیر بعد راحیل نے کہا۔ ''میں سوچ کر جواب دوں گا بلکہ مجھ سے یہیں ملو۔''

''یہ سوچ کر ملنا کہ یہ پہلی اور آخری بار کا معاملہ ہوگا، میں بار بار تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔'' احمر نے اسے وارننگ دی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ چند دن پہلے ماماجی نے اسے بلایا تھا اور اس کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔ وہ حیران رہ گیا۔

''اس پر عمل کیسے ہوگا؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' ماماجی نے کہا۔ ''جیسا میں کہوں ویسا کرتے جاؤ۔ اگر کوئی نقصان ہوا تو وہ میری ذمے داری ہے۔ میں نے پوری بات تمہارے سامنے اس لیے رکھی ہے کہ بعد میں تم کسی مرحلے پر چوک نہ جاؤ۔''

''یہ جو آخری بات ہے...'' اس نے ہچکچا کر کہنا چاہا۔

''نہیں۔'' ماماجی نے بات کاٹی۔ ''اگر عمل کرنا ہے تو پورا کرنا ہے۔''

زیبا اس کے ساتھ تھی، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ماماجی نے سوچ سمجھ کر پلان کیا ہے، تم بالکل بے فکر رہو۔''

احمر ڈر رہا تھا مگر زیبا کے حوصلہ دلانے پر وہ مان گیا۔ ''ٹھیک ہے ماماجی مجھے منظور ہے لیکن مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو....؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' ماماجی نے کہا۔ یہ ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ آج ان کے ہاتھ میں کفگیر نہیں تھا مگر ماماجی نے ان کے لیے بھی کھانا بنایا تھا۔ احمر حیران تھا کہ وہ کس قسم کا شخص تھا۔ بہ ظاہر اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور مالی حیثیت بھی متوسط ہی تھی۔ مگر اس نے جو پلان پیش کیا تھا، وہ حیرت انگیز تھا۔ ایسا تو احمر نے کہانیوں میں پڑھا تھا یا پھر فلموں میں دیکھا تھا۔ اس بار وہ دن میں گئے تھے۔ ماماجی کے گھر سے نکلے تو احمر نے زیبا سے کہا۔

''میں اب تک ماماجی کو نہیں سمجھ سکا۔''

''انہیں سمجھنے کے لیے تمہیں ان کا پس منظر جاننا ہوگا۔'' زیبا بولی۔ احمر اور اس کے درمیان اب خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اگرچہ ان کے درمیان ایک خاص حجاب بھی موجود تھا۔ احمر نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس میں ڈھکی چھپی دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ بھی اسے اچھی لگتی تھی مگر اس کی کم ہمتی اسے اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اس کی طرف بڑھے یا اس سے اس کے اور اپنے موضوع پر بات کرے۔ وہ ماماجی کے بارے میں بس اتنا جانتا تھا کہ انہوں نے کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی زیبا کی پرورش کی تھی اور وہ ان پر اسی طرح اعتماد کرتی تھی جیسے کوئی بیٹی اپنے باپ پر کرتی ہے۔ خود ماماجی زیبا پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ احمر کو باہر گھومنا پسند نہیں تھا اور زیبا اسے اپنے ہوسٹل لے جا نہیں سکتی تھی کہ وہاں رہنے والی لڑکیوں اور خواتین کو باہر سے کسی کو لانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ ایک ریستوران میں آ گئے۔

''اب بتاؤ کہ ماماجی کون ہیں؟''

''یہ پہلے کسٹم انٹیلی جنس میں تھے۔'' زیبا نے انکشاف کیا۔

''کسٹم انٹیلی جنس۔'' احمر حیران ہوا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی دوسری قسم کے شخص ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے جرائم سے متعلق؟''

''ہاں، معاف کرنا مگر ان کی شخصیت اور انداز سے مجھے لگا کہ وہ کچھ اسی قسم کے آدمی ہیں۔''

''ان کا جرائم سے کبھی تعلق نہیں رہا۔'' زیبا نے پُرزور تردید کی۔ ''مگر ملازمت کے زمانے میں ان کے بہت سے لوگوں سے تعلقات تھے۔ انہوں نے کبھی رشوت نہیں لی، حرام کا ایک پیسہ بھی نہیں کمایا مگر بدقسمتی سے ان پر رشوت لینے کا الزام لگا اور انہوں نے دل برداشتہ ہو کر ملازمت چھوڑ دی۔ پہلے وہ پولیس میں تھے اور کسٹم میں چلے گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے بہت سے بڑے اسمگلرز پکڑے اور کئی ایسے علاقے جو اسمگلروں کی جنت تھے، انہیں ان سے پاک کیا۔ اس پر محکمے کے اپنے لوگ ان کے دشمن بن گئے کیونکہ ماماجی کی وجہ سے ان کی آمدنی بند ہو گئی تھی۔ ان کے خلاف سازش کر کے بالآخر انہیں استعفا دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ چند سال پہلے کی بات ہے تب سے وہ خاموشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

''تمہاری پرورش ماماجی نے کی؟''

''ہاں لیکن میں ان کے پاس نہیں رہی، انہوں نے مجھے ایک کرسچن ماما کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میری پرورش اسی نے کی اور وہ بہت اچھی عورت تھی۔ شاید وہ ماماجی کو پسند کرتی تھی مگر ماماجی اس کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ ملازمت کی وجہ سے وہ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتے تھے اس لیے مہینے دو مہینے میں ایک ہی بار مجھ سے ملنے آتے تھے۔''

''جب تمہارا ماماجی سے کوئی رشتہ نہیں ہے تو انہوں نے تمہاری پرورش کیوں کی؟''

زیبا نے گہری سانس لی۔ ''ایک بار ماماجی نے اپنی

نیم کے ہمراہ ایک سرحدی علاقے میں چھاپا مارا تو وہاں موجود اسمگلرز مقابلے پر اتر آئے۔ فائرنگ رکنے کے بعد جب کسٹم والے اس مکان میں داخل ہوئے تو وہاں میں ہی ایک زندہ ہستی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہاں اور کون تھا اور ان سے میرا کیا رشتہ تھا؟ ماما جی نے مجھے بس اسی حد تک بتایا ہے، اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے میری ذمے داری قبول کرلی اور باقاعدہ قانونی کارروائی کر کے مجھے اپنا لیا۔ وہ اکیلے ہوتے تھے اور پھر ملازمت بھی کرتے تھے اس لیے انہوں نے مجھے ماریہ بی بی کے حوالے کردیا۔ وہ میرا خرچ دیتے تھے۔ میں سولہ سال تک ان کے پاس رہی۔ پھر ان کا انتقال ہوگیا تو ماما جی نے مجھے کالج کے ساتھ ہاسٹل میں داخل کرادیا۔ گریجویشن تک میں ہاسٹل میں رہی۔ اس دوران میں ماما جی واپس آگئے مگر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بظاہر میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے اس لیے میرا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ جب میں نے گریجویشن کرلیا تو ماما جی نے مجھے اس ویمن ہاسٹل میں جگہ دلوادی اور پھر زید اے ٹریڈرز میں جاب دلوادی۔"

"ماما جی کی زاہد بھائی سے جان پہچان ہے۔"

"نہیں انہوں نے کسی کے توسط سے یہ کام کرایا ہے۔ میں نے کہا نا کہ ماما جی کے تعلقات بہت ہیں اور وہ سب کراسکتے ہیں۔ لوگ ان کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ماما جی اپنی ذات کے لیے ان سے کبھی کچھ نہیں مانگیں گے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے جیسے تمہارے لیے کررہے ہیں۔"

"تمہارے کہنے پر۔" احمر نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

"اور تم میرے لیے یہ سب کیوں کررہی ہو؟" احمر نے بہت دنوں سے دل میں دبا ہوا سوال کردیا۔ زیبا نے نظریں چرالیں۔

"کیونکہ تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔"

"ناانصافی تو بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے۔"

"ہاں لیکن وہ سب احمر نہیں ہوتے۔ تم کیوں بھول جاتے ہو کہ جب میں آئی تو تم نے کس طرح میری مدد کی تھی بنا کسی غرض کے، یہاں تو لوگوں کا رویہ یہ تھا کہ میں ان کے ساتھ ہنس بول لوں، فری ہوجاؤں مگر جب کام سکھانے کی بات آتی تو انجان بن جاتے تھے۔ راشیل سارا دن میرے سر پر سوار رہنے کی کوشش کرتا تھا اور تم نے ایک بار بھی

میرے کیبن میں جھانک کر نہیں دیکھا جبکہ تم دن میں کئی بار میرے کیبن کے پاس سے گزرتے تھے۔"

وہ جھینپ گیا۔ "تم میری فطرت جان گئی ہو، میں ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔"

"لیکن اب تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔" زیبا نے کہا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں جو کر سکتی تھی وہ کر دیا اب تمہیں آگے خود بڑھنا ہے۔"

احمر بڑبڑایا۔ "کیا مطلب آگے بڑھنا ہے؟"

اس کی بات سمجھ کر زیبا جھینپ گئی پھر اس نے ہنس کر کہا۔ "احمق میں کہہ رہی ہوں کہ ماماجی نے پلان کر دیا ہے اب تمہیں اس پر عمل کرنا ہے، تم کیا سمجھ رہے ہو؟"

اس بار جھینپنے کی باری احمر کی تھی پھر اس نے کہا۔ "تم فکر مت کرو میں ویسا ہی کروں گا جیسا ماماجی نے کہا ہے۔"

ماماجی کے پلان کے پہلے حصے میں وہ راحیل سے ملا۔ زیبا کی مدد سے آفس کی تمام رپورٹس اسے مل رہی تھیں اور اسے معلوم ہو گیا کہ زاہد بھائی نے راحیل کو آخری موقع دیا ہے کہ وہ سوفٹ ویئر مکمل کر کے دکھائے دوسری صورت میں کمپنی سے اس کی چھٹی ہو جاتی۔ لوہا گرم تھا، احمر نے چوٹ لگانے کا فیصلہ کیا اگرچہ اس کا امکان بھی تھا کہ راحیل انکار کر دے۔ مگر ماماجی کا کہنا تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔ اس پہلی ملاقات کی رپورٹ دینے وہ خود ماماجی کے فلیٹ پہنچا۔ آج زیبا ساتھ نہیں تھی۔ رپورٹ سن کر ماماجی نے اسے تسلی دی۔ "تم اطمینان رکھو وہ مانے گا اگر کل نہیں مانا تب بھی بعد میں مانے گا۔ تم اسے اپنا کونٹیکٹ نمبر دے دینا۔ لیکن اس سم کا نمبر دینا۔"

ماماجی نے اسے سم تھما دی۔ شروع میں احمر جھجک رہا تھا مگر جب اس نے پہلے مرحلے میں راحیل کا سامنا کیا تو اسے مزہ آنے لگا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔"

"تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔"

"میں سمجھا زیبا نے بتا دیا ہوگا۔" احمر نے جواب دیا اور کسی قدر تفصیل سے اپنے بارے میں بتایا۔ ماماجی نے اس کا شانہ تھپکا۔

"تم اچھے نوجوان ہو، مجھے امید ہے بہت آگے جاؤ گے۔"

"ہاں مگر مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"ہمت ہے تم میں، صرف تم اسے استعمال کرنا نہیں جانتے ہو۔ بے فکر رہو اگر تم نے اس پلان پر کامیابی سے عمل کر لیا تو اس کے بعد بھی کوئی کام کرتے ہوئے نہیں جھجکو گے۔"

"لیکن میں تو اپنوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی جھجکتا ہوں جو کہنا چاہتا ہوں کبھی کسی بات پر احتجاج کرنا چاہتا ہوں مگر نہیں کر پاتا۔"

"یہ جھجک نہیں بلکہ اللہ کا انعام ہے۔ اس نے تم کو اپنوں کے معاملے میں قوت برداشت دی ہے اور وہی اس کا صلہ دے گا۔ صلہ رحمی کا صلہ اوپر والا ہی دیتا ہے۔"

احمر خوش ہو گیا کہ ماماجی جیسے مضبوط شخص نے اس کی یوں تعریف کی تھی۔ اگلے دن وہ ذرا دیر سے ریستوران پہنچا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ راحیل ٹھیک وقت پر آ گیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد اندر آیا۔ راحیل لنچ کر رہا تھا مگر اس کی توجہ کھانے کی طرف نہیں تھی اور اس کی جسمانی زبان اس کی اندرونی بے چینی بیان کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چونکا اور پھر جلدی سے اپنی کیفیت نارمل کرنے لگا۔ احمر زیرلب مسکرایا مگر اس تک جاتے جاتے وہ یوں سنجیدہ ہو گیا جیسے اس کا موڈ اچھا نہ ہو۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ راحیل نے پانی پیا اور بولا۔

"میں تیار ہوں لیکن..."

"لیکن کیا؟" احمر کھردرے لہجے میں بولا۔

"ساری فنڈنگ میں اکیلا نہیں کروں گا۔"

"تب تم کوئی اور شراکت دار تلاش کر لو۔"

"تم بھی..."

"تم بہت اسمارٹ بنتے ہو۔" احمر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اتنی سی بات تمہاری عقل میں نہیں آ رہی کہ میرے پاس رقم ہوتی یا کوئی فنانسر ہوتا تو میں تمہارے پاس کیوں آتا؟"

راحیل کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے احمر کی پیشکش مان لی ہے مگر اس کے کچھ تحفظات تھے۔ جلد ہی تھیلے سے باہر آ گئی۔ راحیل نے پوچھا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ایک بار سوفٹ ویئر مکمل کر لو گے تو مجھے بھی دو گے۔"

"تم کس قسم کی ضمانت چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ اس کی تکمیل میرے سامنے اور میرے کمپیوٹر پر ہو اور میں اس کے ہر مرحلے میں شامل رہوں۔"

"اگر تم سیکھنا چاہتے ہو تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ سوفٹ ویئر تو آئی ٹی کے ماہر تشکیل کریں گے۔ وہ اپنا کام کسی کو نہیں دکھاتے... صرف رزلٹ دیتے ہیں۔"

''تب یہ کام میرے توسط سے ہوگا۔''

''اس صورت میں میرا خدشہ برقرار رہے گا کہ تم پھر چیٹ کر جاؤ گے اور میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔''

''تب کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہم ایک باقاعدہ ایگری منٹ کے تحت یہ کام کرائیں گے اور جس سے کرائیں گے، وہ ہمیں اس کی دو کاپیاں دینے کا پابند ہوگا اور دونوں میں ایک جیسا سوفٹ ویئر ہوگا۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ میں اسے اپنے نام پر کاپی رائٹ کراؤں گا اور تم ایسا نہیں کر سکو گے۔''

راحیل نے سوچا اور مان گیا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟''

راحیل نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''جتنی رقم ہوگی اسی حساب سے آئی ٹی ماہر ملے گا اور اسی لحاظ سے کام میں دیر ہوگی۔ اچھا کام کرنے والا جلد فنش کر دے اور معمولی پروفیشنل دیر لگائے گا۔''

راحیل نے ہچکچا کر کہا۔ ''میرے پاس دو لاکھ ہیں۔''

احمر سوچ میں پڑ گیا۔ ''دو لاکھ تو کم ہیں۔ اس کام کے لیے کم سے کم چار لاکھ درکار ہیں۔''

راحیل جانتا تھا کہ احمر ٹھیک کہہ رہا ہے کیونکہ اس نے خود جو معلوم کیا تھا، اس میں کم سے کم بھی چھ لاکھ روپے لگ رہے تھے۔ ''مگر میرے پاس اس سے زیادہ نہیں ہیں، کچھ تم بھی کرو۔''

احمر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس جو کچھ تھا، وہ میں پہلے ہی لگا چکا ہوں، تمہارا کیا خیال ہے یہ سوفٹ ویئر یہاں تک ایسے ہی پہنچ گیا ہے۔ میرے بھی تقریباً دو لاکھ لگ چکے ہیں۔ اب میں بالکل خالی ہوں۔ سمجھو میں کیپر بنا چکا ہوں صرف میٹھا ڈالنا باقی ہے۔''

''لیکن میں...''

''تم زاہد بھائی سے لے سکتے ہو۔''

''وہ اب کچھ نہیں دے گا۔''

''وہ کاروباری ہیں اور انہوں نے تم پر جو خرچ کیا ہے، انہیں اس کی فکر ہوگی۔ اگر تم ڈراؤ کہ اگر انہوں نے مزید رقم خرچ نہ کی تو پہلے والی بھی ڈوب جائے گی۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ مزید خرچ کے لیے تیار ہو جائیں گے۔''

راحیل سوچ میں پڑ گیا۔ احمر نے اصرار کیا۔ ''تم ان کی گڈ بک میں ہو اور وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ایک بار کسی کو پسند کر لیں تو اسے ہمیشہ پسند کریں گے جیسے اگر وہ ایک بار کسی کو ناپسند کر لیں تو اسے ہمیشہ ناپسند ہی کریں گے چاہے وہ ان کے لیے سونے کا بن کر کیوں نہ آ جائے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔''

''کوشش نہیں، یہ کام کرو۔'' احمر نے کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ میں نے اپنے نامکمل سوفٹ ویئر میں کچھ کوڈز لگا رکھے ہیں جب تک وہ کوڈز نہیں کھلیں گے، اس پر آگے کام نہیں ہو سکتا۔''

''کیسے کوڈز؟''

''میں نے درمیان میں کچھ پارٹس غائب کر دیے ہیں جب وہ اپنی جگہ فٹ ہو جائیں گے تو سوفٹ ویئر پر آگے کام کیا جا سکے گا۔ آئی ٹی کا کوئی بہت بڑا ماہر ان کوڈز کو توڑ سکتا ہے مگر وہ فیس اتنی لے گا کہ تم کیا زاہد بھائی بھی نہیں دے سکیں گے۔''

راحیل نے سر ہلایا۔ ''او کے میں بات کرتا ہوں لیکن اب ہمارا یوں ملنا مناسب نہیں ہے، یہاں آفس کے لوگ آتے رہتے ہیں اگر کسی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا اور زاہد بھائی تک بات پہنچ گئی تو تم سمجھ سکتے ہو کہ آگے کیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے تم میرا نمبر لے لو اور اپنا نمبر مجھے دے دو۔'' احمر نے کہا۔ راحیل نے اپنا نمبر دیا اور اس کا نمبر لے کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

''میں جلد رابطہ کروں گا۔''

احمر کھڑا ہو گیا۔ ''اسی میں تمہاری بہتری بھی ہے کیونکہ اب تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے۔''

اس کے جانے کے بعد راحیل دانت پیسنے لگا اور زیر لب بولا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے مجھے بے وقوف بنا رہا ہے، جلد تجھے پتا چل جائے گا کہ بے وقوف کون بنتا ہے۔''

لنچ کے بعد وہ دفتر آیا اور اس نے ایک گھنٹا کمپیوٹر پر لگا کر ایک درخواست لکھی اور اس کی درستگی کے لیے اپنے آئی ٹی ماتحتوں سے مدد لیتا رہا پھر اس نے اسے زاہد بھائی کو ای میل کر دیا۔ جب سے اس کا شعبہ الگ ہوا تھا، صدیقی صاحب کے ساتھ دفتر کے دوسرے لوگ بھی اس سے چڑنے لگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی جائے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت نازک پوزیشن میں تھا۔ اس کے پیروں تلے زیادہ زمین نہیں تھی اور اسے بہت آسانی سے گرایا جا سکتا تھا اس لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اگر وہ زاہد بھائی سے کوئی مطالبہ کرے یا منوانا چاہے تو زیادہ لوگوں کو اس کا علم نہ ہو۔ اس لیے وہ اس قسم کی

درخواستیں خود دینے کے بجائے ای میل کر دیتا تھا۔ اسے امید تھی کہ چند گھنٹوں میں اسے طلب کر لیا جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ چار بجے اس کی طلبی ہوئی اور وہ زاہد بھائی کے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے درخواست کا پرنٹ آؤٹ اس کے سامنے پھینک دیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟''

انداز وہی تھا جو انہوں نے چند مہینے پہلے احمر کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ پرنٹ آؤٹ بھی انہوں نے یقیناً اسی لیے نکلوایا تھا کہ اسے اس کے سامنے پھینک سکیں مگر راحیل، احمر نہیں تھا وہ سکون سے کھڑا رہا اور اس نے کہا۔ ''سر یہ بکواس نہیں بلکہ بہت بڑی ضرورت ہے۔ میں آپ کے لیے بہت بڑا سوفٹ ویئر بنا رہا ہوں۔ یہ کوئی عام چیز نہیں ہے آپ مارکیٹ سے اٹھائیں تو سالانہ لاکھوں روپے اس کے دینے ہوں گے۔ دیگر اخراجات بھی لاکھوں میں ہوں گے۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا اور اپنی محنت اٹھا کر آپ کے سامنے رکھ دی۔ اب صرف اس کی تیاری کے لیے مزید تین لاکھ کی ضرورت ہے۔''

اس کا جواب سن کر زاہد بھائی کے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔ ''مگر تم پہلے ہی بہت زیادہ خرچ کر چکے ہو اب مزید تین لاکھ روپے...''

''ٹھیک ہے سر۔'' راحیل نے پرنٹ آؤٹ اٹھا لیا۔ ''آپ کی مرضی، اگر میں خود اسے مکمل کرنے کی کوشش کروں گا تو اس میں چھ مہینے سے زیادہ کا وقت لگ سکتا ہے اور اتنی دیر آپ انتظار نہیں کریں گے۔ مجھے ایک مہینے کی وارننگ دے چکے ہیں۔''

زاہد بھائی تھوڑے مضطرب ہو گئے۔ ''ایک منٹ رکو، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔''

راحیل رک گیا۔ ''جی سر، ویسے میں سوچ کر آیا تھا کہ اگر آپ نہیں مانے تو میں استعفا دے دوں گا۔ کیا فائدہ اس مہینے بھی یہاں کام کر کے۔''

''بیٹھو! مجھے کچھ سوچنے دو۔'' زاہد بھائی نے جواب دیا۔ ان کے بزنس مائنڈ نے اشارہ دیا تھا کہ راحیل کا چلے جانا ان کے لیے گھاٹے کا سودا ہو سکتا تھا۔ اس ملک میں ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کی کمی نہیں تھی۔ کئی بڑی کمپنیاں تھیں جو اس سوفٹ ویئر کے منہ مانگے دام دینے کو تیار ہوں کیونکہ راحیل درست کہہ رہا تھا کہ اگر وہ مارکیٹ سے غیر ملکی سوفٹ ویئر لیں تو نہ صرف وہ لاکھوں روپے مالیت کا ملتا بلکہ سروس اور دوسری مد میں بھی سالانہ لاکھوں روپے دینے پڑتے۔ پھر ماہرین رکھنے پڑتے جو بھاری تنخواہیں لیتے۔ یہ سب مل ملا کر ان کے لیے خسارے کا سودا ہو جاتا جبکہ راحیل کا سوفٹ ویئر ان کے لیے گھر کی دال ہوتا وہ اسے صرف ایک اچھی ملازمت اور تنخواہ کے بدلے بھی حاصل کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ اسے کسی صورت ہاتھ سے جانے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد انہوں نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے، تم کام شروع کرو لیکن اس بار رقم براہِ راست ادا کر دی جائے گی۔''

راحیل خوش ہو گیا کہ اس کا ایک لاکھ تو بچ جائے گا۔ اس نے کہا۔ ''بالکل سر آپ بے شک اس کمپنی کو ادائیگی کریں جس سے میں کام کراؤں گا۔''

غالباً زاہد بھائی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بنائے بلوں پر انہوں نے جو ادائیگیاں کی ہیں، ان میں راحیل نے اچھی خاصی رقم ماری تھی اس لیے انہوں نے براہِ راست ادائیگی کی بات کی تھی اور جب راحیل فوراً مان گیا تو انہیں ذرا حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ ''تم یہ کام کب تک کر لو گے؟''

''سر، مارکیٹ میں بیٹھے تو بہت سے ہیں مگر اچھا اور مناسب ریٹ پر کام کرنے والا تلاش کرنا ہو گا۔ اس... لیے میں شاید دو دن دفتر نہ آسکوں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے، تم بے شک ہفتے بھر میں تلاش کرو۔'' زاہد بھائی نے فراخ دلی سے کہا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے کہا کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے دفتر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

''تھینک یو سر، اس بار میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''دیکھتے ہیں۔''

☆☆☆

احمر اور راحیل آئی آئی چندریگر روڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آفس سے خاصا دور تھا اور انہیں فکر نہیں تھی کہ کوئی انہیں دیکھ لے گا۔ راحیل اسے بتا رہا تھا کہ انتظام ہو گیا ہے لیکن زاہد بھائی ادائیگی براہِ راست کریں گے۔ اس کا خیال تھا کہ احمر شاید یہ بات نہ مانے کیونکہ اس کے ذہن میں کہیں موجود تھا کہ وہ اسے دھوکا دے رہا ہے اس لیے جب وہ مان گیا تو راحیل کو حیرت ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم نے آئی ٹی ماہر تلاش کر لیے ہے؟''

''دو ہیں۔'' احمر نے کہا۔ ''دونوں ایک جیسی کوالٹی رکھتے ہیں مگر ان میں سے ایک بڑی آئی ٹی فرم میں کام کرتا

ہے اور دوسرا اپنے طور پر کام کرتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کس سے کام کرایا جائے؟"

"میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" راحیل بولا۔ "لیکن مجھے پرائیویٹ کام کرنے والا ٹھیک لگ رہا ہے کیونکہ فرم میں کام کرنے والا یقیناً فارغ وقت میں کام کرتا ہوگا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے مگر وہ نصف رقم کام سے پہلے لے گا اور نصف بعد میں۔"

"اس سے کہو کہ چوتھائی رقم پہلے لے لے اور باقی کام کے بعد ملے گی۔"

"رقم تمہارا مسئلہ ہے اس لیے تم خود اس سے بات کر لو۔" احمر نے کہا اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ آئی ٹی ماہر ڈیفنس کے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور اس کے اپارٹمنٹ میں ہر طرف کمپیوٹرز اور اس سے متعلق آلات بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نوجوان تھا۔ بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا اور احمر کو دیکھ کر کہا۔

"دس منٹ بعد آنا۔"

وہ دس منٹ تک وہیں کھڑے رہے اور اس نے دس منٹ بعد دروازہ کھول کر انہیں اندر بلا لیا۔ ایک صوفے سے ڈی وی ڈیز کے پیک ہٹا کر اس نے جگہ بنائی اور پوچھا۔ "رقم لائے ہو۔"

"اسی سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں۔"

"بات کیسی؟" اس نے بگڑ کر کہا۔ "جب بتا دیا تھا کہ ہاف پے منٹ پہلے دینا ہوگی۔ باقی کام کے بعد تو پھر کیا بات کرنے آئے ہو۔ میرا وقت فالتو سمجھ رکھا ہے۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو یار، رقم بھی دے دیں گے مگر ہمارا اطمینان بھی ہونا چاہیے۔"

"اس نے ساری بات کر لی ہے۔" نوجوان نے احمر کی طرف اشارہ کیا۔ "میں سوفٹ ویئر کی دو کاپیاں دوں گا اور دونوں ایک جیسی ہوں گی۔ ایک اسے دوں گا اور ایک تمہیں۔"

"لیکن۔" راحیل نے کہنا چاہا تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"تم لوگ کام کرانے نہیں آئے ہو، میرا وقت ضائع کرنے آئے ہو۔" اس نے دروازہ کھولا۔ "کام کرانا ہو تو دو لاکھ لے آنا ورنہ زحمت مت کرنا۔"

"کر لی بات۔" احمر نے باہر آ کر کہا۔

"اس کا دماغ درست ہے۔" راحیل غصے میں تھا۔

"کیا ہم اس سے فری میں کام کرا رہے ہیں۔"

"اس فیلڈ میں ایسے سر پھرے بھی ہوتے ہیں مگر بہت تیز بندہ ہے اور ایک ہفتے میں کام دے دے گا۔"

"اس کی کیا گارنٹی ہوگی کہ کام ٹھیک ہے؟"

"ہمیں ڈیمو کرا کے دے گا۔"

"اور اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ خود اسے استعمال نہیں کرے گا۔"

"یہ تمہارا نہیں، میرا مسئلہ ہے کیونکہ سوفٹ ویئر میرا ہے۔" احمر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "اب زاہد بھائی سے دو لاکھ روپے پکڑ دو تا کہ یہ کام شروع کر سکے۔"

"یہ کون ہے، وہ کراس چیک دیں گے۔ میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا۔"

جواب میں احمر نے اسے ایک بزنس کارڈ پکڑا دیا۔ یہ زین سوفٹ نامی کمپنی کا تھا اور اس کا مالک زین زی ڈی تھا۔ راحیل نے پوچھا۔ "یہ زین زی ڈی کون ہے؟"

"یہ زین ذہین الدین نام ہے۔ اسے زین زی ڈی کر لیا ہے۔"

کارڈ پر فون نمبر کے بجائے صرف ای میل تھا اور کوئی پتا بھی نہیں تھا۔ راحیل فکر مند تھا مگر احمر نے اسے تسلی دی۔

"اس فیلڈ میں ایسے ہی بزنس کارڈ چلتے ہیں۔"

اگلے دن راحیل، زاہد بھائی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کارڈ دیکھ رہے تھے اور انہوں نے بھی وہی سوال کیا کہ یہ کس قسم کا بزنس کارڈ ہے۔ راحیل نے احمر والا جواب دیا۔

"سر اس فیلڈ میں ایسے ہی کارڈ چلتے ہیں۔"

"کیا گارنٹی ہے کہ یہ کام کر کے دے گا، پیسے کھا نہیں جائے گا؟"

"سر، میں اس سے مل کر آیا ہوں۔ پرائیویٹ کام کرتا ہے لیکن بہت بڑا سیٹ اپ لگا رکھا ہے اس نے۔ پیسے لے کر بھاگنے والا بندہ نہیں لگتا ہے۔"

"تم مطمئن ہو؟" زاہد بھائی نے اسے کڑے تیوروں سے دیکھا۔ "اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ذمے داری تمہاری ہوگی۔"

"یس سر۔" راحیل نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "میں پوری ذمے داری لیتا ہوں۔"

"کام کتنے عرصے میں ہو جائے گا؟"

"اس نے ایک ہفتے کا کہا ہے لیکن احتیاطاً دس دن سمجھ سکتے ہیں۔"

زاہد بھائی نے زین زی ڈی کے نام سے کراس

چیک بنا دیا اور راحیل کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں کہ میں یہ رقم بھی ضائع کر رہا ہوں لیکن اب ذمے داری تم لے چکے ہو۔ حساب دینا ہوگا۔''

راحیل نے سر ہلا دیا اور چیک اٹھا لیا۔ ''آپ بے فکر رہیں سر۔''

زاہد بھائی کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ آگئی۔ جیسے کہہ رہے ہوں دیکھیں گے۔

☆☆☆

راحیل فکرمند تھا کیونکہ زاہد بھائی نے واضح لفظوں میں ساری ذمے داری اس پر ڈال دی تھی۔ اب اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو وہ مارا جاتا۔ جب وہ چیک لے کر آیا تو احمر اس کی صورت دیکھ کر لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے چٹکی لینے کے انداز میں کہا۔ ''اتنے پریشان کیوں ہو اسمارٹ بوائے؟''

''بات پریشانی کی ہے۔'' وہ کسی قدر جھنجلا کر بولا۔

''اگر یہ زیڈ کی اور دغا کر گیا تو...''

''تو پیسے واپس کرے گا۔''

''آج کل کون پیسے لے کر واپس کرتا ہے؟''

''سب کو اپنی طرح مت سمجھو۔'' احمر نے کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ پروفیشنل لوگ کبھی دھوکا نہیں کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے کمانا چاہتے ہیں اور اپنے کام سے عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے جیسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ تم لوگ ہمیشہ شارٹ کٹ تلاش کرتے ہو اور صحیح غلط کی پروا نہیں کرتے ہو۔''

''میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔'' راحیل نے بدمزگی سے کہا۔ ''اب کام نہ کرلیا جائے؟''

''تم چیک لائے ہو؟''

راحیل نے اسے چیک دکھایا اور وہ زین زی ڈی کے پاس روانہ ہوگئے۔ حسب معمول اس نے بکھرے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ باہر جھانکا تو اس کے کچھ کہنے سے پہلے راحیل نے چیک اس کے سامنے کر دیا۔ مگر وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ''میں چیک نہیں لیتا، کیش لاؤ۔''

''ایک منٹ۔'' احمر نے کہا۔ ''ذرا غور کرو یہ کسی عام آدمی کا چیک نہیں ہے بلکہ زیڈ اے ٹریڈرز کے مالک زاہد احمد کا چیک ہے۔ اسے کیش سے زیادہ قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' زین نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''وہ ایسے کہ آج کل جعلی نوٹ بہت ہیں اور ہر کوئی ان کو شناخت بھی نہیں کر سکتا ہے۔''

''اس پر کل کی تاریخ ہے تم جمع کرا دو اور کام میں لگ جاؤ۔ ابھی نصف کام بھی نہیں کرو گے اور آدھی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں آجائے گی۔''

زین نے سوچا اور دروازہ کھول دیا۔ احمر معاہدہ تیار کرا کے لایا۔ اس نے زین سے اس پر سائن لیے اور اسے دو لاکھ کا چیک اور اپنے سوفٹ ویئر کی ڈی وی ڈی دے دی۔ ساتھ ہی اسے لاک کے بارے میں بھی بتا دیا۔ زین کا کام کوڈنگ کی مدد سے سوفٹ ویئر کو مربوط اور مختصر کرنا تھا۔ اس کے بعد یہ استعمال کے قابل ہو جاتا۔ اس نے چیک اور ڈی وی ڈی سامنے میز پر ڈال دیں اور بے پروائی سے بولا۔ ''ٹھیک ایک ہفتے بعد آجانا۔''

''کام میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔'' راحیل نے اسے خبردار کیا۔ ''ورنہ پوری رقم واپس کرنا ہوگی۔''

''تم فکر مت کرو ایسی صورت میں، میں خود رقم واپس کردوں گا۔'' زین نے کہا اور دروازہ کھول دیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ جا سکتے ہیں۔ باہر نکل کر راحیل نے پھر بدمزگی سے کہا۔

''اِل مینرڈ آدمی ہے۔''

''وہ جیسا اندر سے ہے ویسا ہی باہر سے ہے۔'' احمر نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس نے خود پر خول نہیں چڑھا رکھے ہیں۔''

''تم مجھ پر طنز کر رہے ہو؟''

''اب ایک ہفتے بعد ملاقات ہوگی۔'' احمر نے اس سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔ ''دو لاکھ روپے کا چیک مزید لے آنا۔''

احمر کو اب ماما جی کے پاس جانا تھا اور اسے رپورٹ دینا تھی۔ اب تک سب پلاننگ کے مطابق چل رہا تھا جیسا ماما جی نے کہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ ماما جی کیسا شخص ہے، وہ کبھی راحیل سے نہیں ملا اور نہ ہی زاہد بھائی کے بارے میں جانتا تھا مگر وہ ان کے بارے میں جیسی پیش گوئی کرتا وہ پوری ہوتی تھی۔

☆☆☆

آج زیبا کچن میں مصروف تھی اور ماما جی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا۔ ''یہ احمر کیسا لڑکا ہے؟''

زیبا ہنسی۔ ''اب پوچھ رہے ہیں، اس کے بارے

میں سب تو جان گئے ہیں۔''

''میں تمہارا خیال پوچھ رہا ہوں۔''

زیبا کی ہنسی غائب ہو گئی۔ ''اچھا ہے۔''

''تمہیں اچھا لگتا ہے؟''

اس بار زیبا شرما گئی اس نے احتجاج کیا۔ ''ماما جی کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

ماما جی اٹھ کر کچن تک چلا آیا۔ ''میں نے دنیا دیکھی ہے، کوئی لڑکی کسی غیر لڑکے کے لیے یہ سب نہیں کرتی ہے جو تم احمر کے لیے کر رہی ہو۔ جب تک کہ وہ اس کے دل میں کوئی جگہ نہ رکھتا ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے صاف بتا دو، میں آگے معاملہ سنبھال لوں گا۔''

اس بار زیبا سنجیدہ ہو گئی۔ ''میرے دل کی بات چھوڑیں، اسے مجھ میں شاید کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''بس میں نے محسوس کیا ہے۔''

''وہ ان لڑکوں میں سے ہے جن کے اندر ہمت کم ہوتی ہے اور ایسے لوگ کبھی خود سے پیش قدمی نہیں کرتے ہیں۔''

''تب میں کیا کروں؟'' زیبا نے بہ مشکل کہا۔ اس نے ایک طرح سے اقرار کر لیا تھا کہ اسے احمر پسند ہے۔

''اگر تم سنجیدہ ہو تو مجھ پر چھوڑ دو۔''

''آپ کیا کریں گے؟''

''میں نے کہا نا مجھ پر چھوڑ دو۔'' ماما جی نے کہا اور دوبارہ ٹی وی کے آگے جا کر بیٹھ گیا۔ زیبا اب خوش نظر آ رہی تھی۔ کال بیل بجی تو وہ سمجھ گئی کہ احمر آیا ہے۔ ماما جی نے دروازہ کھولا تو احمر پُر جوش لگ رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ان دونوں کو سارا احوال سنا دیا۔ ماما جی ہنسا۔

''کھیل اب شروع ہوا ہے، دونوں کو مزہ آ جائے گا۔''

''ماما جی۔'' احمر سنجیدہ ہو گیا۔ ''مجھے آخری مرحلے سے خوف آ رہا ہے، کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''میں ذمے داری لے چکا ہوں، تم اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو؟''

''اب مجھے صرف اپنی نہیں بلکہ آپ کی اور زیبا کی بھی فکر ہے۔''

''اگر ہماری فکر ہے تو سب ویسے ہی کرنا جیسا میں کہہ رہا ہوں۔''

احمر نے سر ہلایا اور کچن کی طرف دیکھا۔ ''آج کھانا زیبا بنا رہی ہے؟''

''تم دیکھنا ماما جی سے کم نہیں بناتی۔'' وہ بولی۔ کچھ دیر بعد کھانے کی میز پر اس کا دعویٰ درست ثابت ہوا تھا۔ زیبا کو ہاسٹل جانا تھا اس لیے انہوں نے کھانا جلد کھا لیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ جانے لگے تو ماما جی نے آہستہ سے کہا۔

''احمر کل میرے پاس آنا مگر اکیلے میں، زیبا کو پتا نہ چلے۔''

زیبا کچن سمیٹ رہی تھی اس لیے وہ نہ سن سکی۔ احمر نے سر ہلایا۔ ''میں آ جاؤں گا۔''

وہ باہر نکلے۔ احمر نے زیبا کو اسٹاپ پر اس کے ہاسٹل کی طرف جانے والی وین پر بٹھایا اور خود گھر روانہ ہو گیا۔ اس چکر کو دو ہفتے گزر گئے تھے اور اب معاملہ ہاتھ میں آیا تھا مگر ماما جی شروع سے مطمئن تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس کا کہنا تھا کہ بس کچھ عرصے کی بات تھی اس کے بعد وہ اپنا کام کر سکے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ماما جی نے اسے اسی لیے بلایا ہوگا وہ اسے آگے کا کچھ سمجھانا چاہتا ہوگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس صورت میں زیبا کو نہ بتانے کی ہدایت کیوں کی گئی۔ اگلے دن وہ صبح کے وقت وہاں گیا۔ اس نے حسبِ ہدایت زیبا کو نہیں بتایا تھا۔ ماما جی اس کا منتظر تھا۔ اسے اندر لا کر اس نے چائے رکھی اور بولا۔ ''میں نے تمہیں زیبا کے بارے میں بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔''

وہ بوکھلا گیا۔ ''زیبا کے بارے میں؟''

''ہاں تم جانتے ہو میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن میں نے اسے اولاد اور بیٹی کی طرح پالا ہے۔ اسے پڑھایا لکھایا اور ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی اسے جاب بھی دلائی تا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اور میری محتاج بھی نہ رہے۔ مگر ایک باپ ہونے کے ناتے میری خواہش ہے کہ اب وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔''

''جی ماما جی۔'' اس نے کہا۔

''وہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟'' ماما جی نے براہِ راست پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے بہ مشکل کہا۔ ''اچھی لگتی ہے۔''

''ہر مرد کے ذہن میں اپنی شریکِ حیات کا ایک تصور ہوتا ہے۔ کیا زیبا اس پر پوری اترتی ہے؟''

''میں نے اس بارے میں سوچا نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''تب سوچو اور اگر تم زیبا کے لیے اس انداز سے

نہیں سوچتے ہو تو بہتر ہوگا کہ اس معاملے کے بعد اس سے ملنا بند کر دینا۔"

"کیا یہ لازمی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں کیونکہ وہ اس راہ پر قدم رکھ چکی ہے اس سے پہلے کہ واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے، رابطہ ختم کر دیا جائے۔" ماما جی کا انداز دوٹوک تھا۔

"میں سوچ کر جواب دوں گا۔" احمر نے وعدہ کیا۔

☆☆☆

راحیل پُرجوش ہو رہا تھا اور اپنا جوش چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اور احمر، زین کے فلیٹ میں تھے اور وہ انہیں سوفٹ ویئر دکھا رہا تھا۔ ابتدا اس کی انسٹالیشن سے کی۔ ایک مخصوص کی کی مدد سے کوئی بھی اسے انسٹال کر سکتا تھا۔ اس کی کمانڈز بہت آسان اور زیادہ نہیں تھیں۔ اس میں اسے اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی سہولت بھی دی ہوئی تھی۔ راحیل اس سوفٹ ویئر کی تیاری کے چکر میں مارکیٹ میں موجود ایسے تمام سوفٹ ویئر جو بڑی آئی ٹی کمپنیوں نے بنائے تھے، ان کو دیکھ چکا تھا۔ اسے فوراً اندازہ ہو گیا کہ احمر کا بنایا ہوا ان کے مقابلے میں بہت آسان تھا۔ اس کی رفتار تیز تھی اور یہ کسی بھی مقدار میں سامان کی ہینڈلنگ کر سکتا تھا اور لامحدود کیٹگریز دے رہا تھا۔ احمر اور راحیل نے اسے باری باری استعمال کر کے دیکھا اور دونوں اس سے مطمئن تھے۔ احمر نے زین کو شاباشی دی۔

"تم نے شاندار کام کیا ہے۔"

اس نے ہاتھ آگے کیا تو احمر نے اس پر ہاتھ مارنا چاہا مگر اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور بولا۔ "باقی معاوضہ؟"

"لو یار۔" راحیل نے اسے دوسرا چیک دیا، یہ بھی دو لاکھ کا تھا۔ اس نے کوشش کر کے زاہد بھائی سے رقم بڑھوائی تھی اور اپنا ایک لاکھ بھی بچا لیا تھا۔ زین نے چیک لے کر غور سے دیکھا اور پھر دو عدد ڈی وی ڈی پیک حالت میں ان کے حوالے کیں۔ "تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ کوئی مشکل یا خامی ہو تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ اس کے بعد میں اپنے سسٹم سے یہ سب اُڑا دوں گا اور کسی قسم کی ذمے داری نہیں لوں گا۔"

"ایک ہفتہ تو کم ہے۔" راحیل نے اعتراض کیا۔

"بہت ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

"ہمیشہ بے عزت کر کے رخصت کرتا ہے۔" احمر نے باہر آ کر کہا۔ "پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔"

"لیکن کام کر دیا۔" راحیل نے خوش ہو کر کہا، پھر اس نے احمر کی طرف دیکھا۔ "امید ہے اب تم دوبارہ دکھائی نہیں دو گے۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے۔" احمر نے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے اسے اپنے نام کاپی رائٹ کرانے کی کوشش کی تو پھر کھلی جنگ ہوگی اور اس میں سب سامنے آ جائے گا۔ تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ اسے خاموشی سے زاہد بھائی کی کمپنی میں یوز کرتے رہو اور مزے کرتے رہو۔ کوشش کرنا کہ اصل سوفٹ ویئر ان کو نہ دو ورنہ کل کو تمہاری چھٹی بھی ہو سکتی ہے۔"

راحیل نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم میری نہیں اپنی فکر کرو، سوفٹ ویئر بیچنا آسان کام نہیں ہوتا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا لیکن میں نے آسان کام چھوڑ دیے ہیں اور اب مشکل کام کر رہا ہوں۔" احمر نے کہا اور رخصت ہو گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی ڈی وی ڈی زین سے وصول کرتے ہی اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ کچھ دیر بعد احمر، زیبا کے سامنے موجود تھا۔ وہ اسی کیفے میں تھے جہاں وہ اکثر ملاقات کے لیے آتے تھے۔ احمر نے زیبا کے سامنے ڈی وی ڈی رکھی اور بولا۔ "یہ کام تو ہو گیا۔"

"اب دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔"

"ہاں لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ایک بات واضح ہو جائے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ آئندہ ہمارے درمیان کیا تعلق ہوگا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ ہنسی۔

"یہی اصل بات ہے۔" احمر سنجیدہ رہا۔ "ہم دونوں کا تعلق جس ملک سے ہے وہاں مرد اور عورت کے درمیان صرف دوستی ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ایسا تعلق زیادہ عرصے چل سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" زیبا نے اس کی تائید کی۔

"اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم آج یہاں سے فیصلہ کر کے اٹھیں کہ آگے ہمارے درمیان تعلق کیا ہوگا۔"

زیبا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تم کیا سوچتے ہو اس بارے میں؟"

احمر نے گہری سانس لی۔ "جس دن تمہاری آواز پہلی بار سنی تھی تو اس وقت میرے دل میں انوکھی خواہش جاگی۔

کاش یہ آواز ہمیشہ میرے آس پاس رہے اور میں اس وقت اپنی سوچ پر حیران ہوا تھا۔"

زیبا کا رنگ سرخ ہوا اس نے نظریں جھکاتے ہوئے پوچھا۔ "اور اب؟"

"اب میری یہ خواہش میری زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہے۔" احمر نے کہا اور جرأت کر کے پہلی بار زیبا کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا تم میرے ساتھ زندگی گزارنا پسند کرو گی جبکہ تم مجھے اچھی طرح جان بھی گئی ہو۔"

اس بار زیبا کی آنکھوں میں حیا آگئی مگر اس نے جواب دیا۔ "ہاں کیونکہ جب تم نے پہلی بار میری مدد کی اور میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تب میرے دل نے کہا کہ مجھے ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے۔ جیسے جیسے تمہارے ساتھ وقت گزرا اور اب بھی گزر رہا ہے تو یہ تاثر پکا ہو گیا۔"

"اسی لیے تم نے میری مدد کی کوشش کی اور مجھے ماما جی سے ملوایا؟"

"ہاں اور ایک دوسرا مقصد بھی تھا۔"

"دوسرا کیا؟" احمر نے سادگی سے پوچھا اور جب زیبا مسکرائی تو وہ خفیف سا ہو گیا۔ "میں سمجھ گیا۔"

زیبا زور سے ہنسی۔ "تم سچ مچ بہت سادہ ہو۔"

احمر مسکرانے لگا۔ "اب اتنا بھی سادہ نہیں رہا ہوں۔ تم نے اور ماما جی نے مل کر مجھے چالاک کر دیا ہے۔"

"جی نہیں تم پہلے سے چالاک تھے۔" زیبا نے شوخی سے کہا۔ "بس ظاہر نہیں کرتے تھے ورنہ صرف آواز سن کر کون سوچ لیتا ہے۔"

احمر پھر سنجیدہ ہو گیا۔ "اب مجھے آخری مرحلے کی فکر ہے۔"

"تم فکر مت کرو، ماما جی ہیں نا وہ سب دیکھ لیں گے۔" زیبا نے اسے تسلی دی۔

"انہوں نے ہی حوصلہ دیا ہے جو میں نے اتنا کچھ کر لیا۔"

"بس تو اپنا حوصلہ برقرار رکھو۔"

☆☆☆

کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع اس گودام میں رات کے وقت بھی خاصی چہل پہل تھی۔ گودام والا حصہ تو تقریباً چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ مال آتا اور جاتا رہتا تھا مگر اس وقت رونق اس کے آفس میں تھی۔ یہ آفس چند دن میں سیٹ کیا گیا تھا اور یہاں جدید ترین کمپیوٹرز لگائے گئے تھے۔ راحیل اس کا روح رواں تھا۔ اسی نے یہ سارا سیٹ اپ لگوایا تھا اور آج اس سوفٹ ویئر کا افتتاح تھا۔ زاہد بھائی خود بھی آئے ہوئے تھے۔ گزشتہ تین دن سے اس سوفٹ ویئر کے تحت گودام میں مال کی آمد و رفت ریکارڈ کی جا رہی تھی اور دو آپریٹر کام کرتے تھے۔ تیسرا مین سسٹم راحیل کا تھا جس سے وہ پورے کام کی نگرانی کر سکتا تھا۔ راحیل چہک رہا تھا اور چمک رہا تھا۔ زاہد بھائی بھی خوش تھے کہ ان کی لگائی رقم رائیگاں نہیں گئی اور انہیں اتنا قیمتی سوفٹ ویئر کوڑیوں کے مول مل گیا۔ راحیل ان کو بتا رہا تھا کہ سوفٹ ویئر کس طرح کام کرتا ہے۔ زاہد بھائی کے موبائل نے مخصوص ٹون بجائی۔ یہ جدید ترین موبائل تھا جس میں ایک جدید کمپیوٹر کی تمام خصوصیات تھیں۔ اس میں ای میل سسٹم بھی تھا جو ہمہ وقت آن رہتا تھا اور جیسے ہی کوئی ای میل آتی زاہد بھائی کو اطلاع مل جاتی تھی۔ اس وقت بھی ایک ای میل آئی تھی اور اس کے ٹائٹل کی جگہ ارجنٹ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ای میل آن کی تو ایک تصویر آئی تھی۔ انہوں نے تصویر کھول کر دیکھی۔ عجیب تصویر تھی، ان کی تصویر کے نیچے ایک مشین گن تھی جسے کسی آدمی نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور زاہد بھائی کے سر سے خون کی ایک لکیر بہہ کر ان کے چہرے تک آ رہی تھی۔ شاید کسی نے ان سے مذاق کیا تھا۔ انہوں نے تصویر ڈیلیٹ کر کے موبائل بند کیا تھا کہ اس نے بیل دی۔ انہوں نے دیکھا، ایک اجنبی نمبر سے کال آ رہی تھی مگر انہوں نے ریسیو کر لی۔

"زاہد احمد۔" دوسری طرف سے کسی نے کھردرے اور کسی قدر بدتمیز انداز میں کہا۔

"بات کر رہا ہوں۔" ان کے ماتھے پر شکن آ گئی۔

"تم اس وقت اپنے کورنگی والے گودام میں ہو؟"

زاہد بھائی چونکنا ہو گئے۔ خاصے عرصے سے شہر کے حالات تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے اچھے نہیں تھے۔ ان کا چونکنا فطری تھا۔ "تم کون ہو اور کیوں پوچھ رہے ہو؟"

وہ ہنسا۔ "یہ چھوڑو، یہ جو تم نے لونڈا رکھا ہے جو تمہیں چونا لگا رہا ہے اور جھوٹ بول رہا ہے کہ اس نے سوفٹ ویئر بنایا ہے۔ اس کی بات کرو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تین دن میں تمہارے گودام میں جو سامان آیا ہے اس کے ایک پیک میں ایک کیمیکل بم ہے۔ اس کے ٹائمر میں وقت سیٹ تھا اور وہ وقت پورا ہونے میں اب صرف دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ وقت نوٹ کر لو ٹھیک دو بج کر بیس منٹ پر بم پھٹ جائے گا اور اس کا کیمیکل ایسی آگ لگائے گا کہ سارے شہر کے فائر بریگیڈ والے مل کر بھی اسے نہیں بجھا سکیں گے۔ تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں۔ وہ بم تلاش کروا لو ورنہ تیار ہو جاؤ نقصان کے لیے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔"

"میں بکواس کر رہا ہوں یا سچ کہہ رہا ہوں، اس کا پتا تمہیں دو گھنٹے بعد چل جائے گا۔" آدمی نے کہا۔

"اب تم رقم کی بات کرو گے۔"

"نہیں کھیل صاف ہے اگر تم دو گھنٹے میں بم تلاش کرنے میں کامیاب رہے تو نقصان سے بچ جاؤ گے ورنہ۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور لائن کاٹ دی۔

راحیل کال کے دوران میں اسے دیکھ رہا تھا اور معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا سر؟"

"کوئی بدمعاش تھا۔" زاہد بھائی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دھمکی دے رہا تھا کہ تین دن میں جو سامان آیا ہے اس میں ایک بم ہے دو گھنٹے بعد وہ پھٹ جائے گا۔"

آپریٹرز دوسرے کمرے میں تھے اور یہ کمرا صرف راحیل کے لیے تھا اس لیے سن کر اس کی ہوا خراب ہوگی۔ "بم۔" اس نے بہ مشکل کہا۔ "ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔"

اسی لمحے زاہد بھائی کا موبائل پھر بجا اور اس بار بھی وہی نمبر تھا، انہوں نے کال ریسیو کی۔ آدمی نے کہا۔ "پولیس کو کال مت کرنا ورنہ بم فوراً پھٹ جائے گا، یہ ریموٹ سے بھی بلاسٹ ہو سکتا ہے۔"

"تم۔۔۔ تم چاہتے کیا ہو؟" زاہد بھائی نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔

"میں چاہتا ہوں تم راحیل سے اس بم کو تلاش کرواؤ اور اس کے لیے میں تمہیں اشارے بھی دے سکتا ہوں۔ ان اشاروں کو اگر اس سوفٹ ویئر سے مربوط کرو گے تو بم تلاش کرنے میں صرف دس منٹ لگیں گے۔ دوسری صورت میں تم سمجھ جانا کہ اسے سوفٹ ویئر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"دیکھو اگر تم رقم۔۔۔"

"اشارے نوٹ کر لو، میں دوبارہ نہیں کہوں گا۔" آدمی نے بات کاٹ کر کہا۔ زاہد بھائی نے جلدی سے نوٹ پیڈ اپنی طرف کھینچا اور پین نکال لیا۔ آدمی نے کہنا شروع کیا۔ "پہلا اشارہ چھبیس، بیس، تیس اور چوبیس، دو، چودہ۔۔۔ لکھو۔"

"لکھ لیا۔"

"دوسرا اشارہ آخری چار عدد دو چار سات ایک۔"

"یہ کیسے اشارے ہیں؟"

"بہت واضح اشارے ہیں۔ ایک اشارے کی مدد سے بھی تم بم تک پہنچ سکتے ہو، میں نے تو دو اشارے دیے ہیں اور دونوں اس سوفٹ ویئر سے متعلق ہیں۔" آدمی نے کہا۔ "یاد رکھنا اگر گودام کے آس پاس پولیس یا فائر بریگیڈ کی سرگرمی دکھائی تو کھیل اسی وقت ختم ہو جائے گا۔"

کال ختم ہوئی تو زاہد بھائی نے موبائل رکھ کر نہایت سرد نظروں سے راحیل کی طرف دیکھا اور نوٹ پیڈ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ دو اشارے ہیں جو اس سوفٹ ویئر سے منسلک ہیں اور ان کی مدد سے تم بم تلاش کر سکتے ہو۔"

راحیل نے نوٹ پیڈ دیکھا اور بولا۔ "میں نہیں سمجھ سکا۔"

"حالانکہ یہ سوفٹ ویئر تمہارا بنایا ہوا ہے۔" زاہد بھائی کے لہجے میں طنز آ گیا۔ "کال کرنے والے کا کہنا ہے کہ تم تلاش کر سکتے ہو اگر سوفٹ ویئر تمہارا بنایا ہوا ہے۔"

راحیل کو خاصے سرد موسم میں بھی پسینا آ گیا مگر اس کی ڈھٹائی برقرار رہی۔ "یہ میرا بنایا ہوا ہے۔"

"تب تلاش کرو۔"

"آپ پولیس اور بم ڈسپوزل والوں کو اطلاع کیوں نہیں دیتے۔"

"اس صورت میں وہ بم فوراً بلاسٹ کر دے گا، اس کے پاس اس کا ریموٹ کنٹرول بھی ہے۔"

راحیل کے پسینے میں اضافہ ہو گیا۔ "لیکن یہ تو بہت مبہم اشارے ہیں۔"

"راحیل اگر اس گودام میں بم بلاسٹ ہو گیا تو میرا کروڑوں کا نقصان ہوگا۔ تم سوچ سکتے ہو اس صورت میں میں کیا کروں گا۔"

راحیل سوچ سکتا تھا کہ سب سے پہلے اس کی شامت آئے گی۔ اس نے مرے انداز میں کہا۔ "آپ مجھے فائر کر دیں گے۔"

"نہیں، میں تمہیں دہشت گردی کے کیس میں اندر کرا دوں گا۔ یہاں جو بم پھٹے گا، اس کے اصل مجرم تم ہو گے اور میں تمہیں سالوں کیس میں رگڑنے کے بعد لمبے عرصے کے لیے جیل بھجوا دوں گا۔ میرے لیے یہ ذرا مشکل کام نہیں ہے۔"

اس بار راحیل لرز کر رہ گیا۔ زاہد بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے ان کے لیے یہ ذرا بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھجوا دیں۔ اس نے جلدی سے نوٹ پیڈ اپنی طرف کیا اور اسکرین آن کی۔ سوفٹ ویئر آن ہی تھا اور وہ اس کی مختلف کمانڈز چیک کرنے لگا۔ اس نے پہلے اشارے پر غور کیا اور اسے لگا کہ یہ تاریخ اور وقت ہے۔ مگر جب اس نے سوفٹ ویئر میں یہ تاریخ اور وقت ڈالا تو اس نے بتایا کہ اس وقت کوئی سامان نہیں آیا تھا۔ سامان آنے کا وقت اس سے سوا گھنٹے پہلے تھا یا چالیس منٹ بعد کا تھا۔ دونوں بار سامان بہت زیادہ آیا تھا اور کئی گھنٹوں میں جا کر اسے رکھا گیا تھا۔ انٹری کا وقت وہ ہوتا تھا جب سارا سامان

اپنی جگہ رکھا جا چکا ہوتا... تو سوفٹ ویئر میں فائل انٹری کر دی جاتی تھی۔ اس نے زاہد بھائی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے ٹھیک اس وقت کوئی سامان کہیں رکھا گیا ہو اور اسی میں بم ہو۔"

"کیا سوفٹ ویئر یہ بتا سکتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں اس میں ایسی کوئی کمانڈ نہیں ہے۔"

"پھر تم غلط کہہ رہے ہو، اس آدمی نے واضح کہا ہے کہ سوفٹ ویئر کے دونوں اشاروں کی مدد سے پتا چلایا جا سکتا ہے۔"

راحیل کو چرب زبانی اور مکاری میں ملکہ حاصل تھا مگر جہاں تک مسائل حل کرنے کا تعلق تھا تو وہ اس معاملے میں صفر تھا۔ اسے مسائل حل کرنے آتے تو وہ چکر بازیاں کیوں کرتا۔ مگر اس وقت اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے نوٹ پیڈ پر دوسرا اشارہ دیکھا۔ پھر ان اعداد کو سوفٹ ویئر میں ڈال کر دیکھنے لگا مگر کہیں سے کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ بار بار چیک کر رہا تھا اور ہر بار نتیجہ صفر نکل رہا تھا۔ زاہد بھائی کا اضطراب اور فکر سے برا حال تھا۔ یہ ایک ایکڑ پر پھیلا ہوا گودام تھا اور اس وقت اس کا ستر فیصد ایریا بھرا ہوا تھا۔ اس میں موجود مال شاید کروڑوں سے بھی اوپر کا تھا۔ راحیل نے مسلسل ناکامی کے بعد اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"سر میں یقین سے کہتا ہوں یہ چکر احمر کا چلایا ہوا ہے۔"

"احمر۔" زاہد بھائی چونکے۔ "تمہارا دماغ درست ہے وہ کہاں سے درمیان میں آگیا۔"

"آپ جانتے ہیں وہ مُصر تھا کہ یہ سوفٹ ویئر اس کا ہے اور اب اس نے مجھے آپ کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لیے یہ کام کیا ہے۔"

"مجھے لگ رہا ہے تمہارے ذہن میں احمر گھس گیا ہے۔ مجھے کال کرنے والا مکمل طور پر باخبر ہے اور اس نے جس طرح بات کی ہے احمر دس بار بھی پیدا ہو جائے تو اس طرح بات نہیں کر سکتا۔"

راحیل اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ احمر اب بالکل بدل گیا ہے۔ مگر اس کے بارے میں بتانے کی صورت میں وہ خود پھنس جاتا۔ خود اسے یقین تھا کہ اس کے پیچھے احمر تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "سر میں یقین سے کہہ رہا ہوں اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ گودام میں کوئی بم نہیں ہے۔"

"تم باتیں کرنے کے بجائے اپنا کام کرو۔" زاہد بھائی غرائے۔ "اگر بم ہوا اور وہ پھٹ گیا تو اس کا خمیازہ میرے ساتھ تمہیں بھی بھگتنا پڑے گا۔"

"آپ خود سوچیں سر اور کسے مجھ سے پرخاش ہو سکتی ہے۔" راحیل دوبارہ اسکرین کی طرف گھوم گیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ معما کیسے حل کرے۔

"اسے صرف ایک صورت میں تم سے پرخاش ہو سکتی ہے اور وہ اس حد تک جا سکتا ہے کہ تم نے سچ مچ اس کا سوفٹ ویئر چرایا ہے۔"

"فرض کریں سر کہ یہ بات درست ہے اور میں نے اس کا سوفٹ ویئر چرایا ہے تو کیا آپ اسے واپس بلائیں گے؟"

"نہیں۔" زاہد بھائی نے قطعی لہجے میں کہا۔

راحیل کا شاطر ذہن اب اپنے بچاؤ کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ "سر میں ایک بات آج تک نہیں سمجھ سکا کہ آپ احمر کو کیوں نہ پسند کرتے تھے۔ اس میں ایسی کیا خرابی تھی؟"

"کوئی خرابی نہیں تھی۔" زاہد بھائی نے جواب دیا۔ "اصل میں اس کی صورت میرے ایک کلاس فیلو سے ملتی ہے جو کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں میرے ساتھ رہا اور تعلیم میں وہ ہمیشہ مجھ سے آگے نکل جاتا تھا۔ میں اس سے دوگنی محنت کرتا تھا مگر مارکس اس کے اچھے ہوتے تھے۔ مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ بعد میں ملک سے باہر چلا گیا تھا۔"

"تو احمر کا قصور بس اتنا ہے؟" راحیل حیران رہ گیا۔

"اس میں اس کا ذاتی قصور تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

زاہد بھائی جھینپ گئے۔ انہوں نے آج تک کسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی ورنہ اس سے پہلے بھی کئی افراد نے ان سے یہی سوال کیا تھا۔ مگر آج پریشانی میں ان کے منہ سے اصل بات نکل گئی تھی۔ انہوں نے گھڑی دیکھی اور بولے۔

"اب صرف ایک گھنٹا اور پچیس منٹ رہ گئے ہیں۔"

"سر پلیز میری بات مان لیں، اس میں احمر کا ہاتھ ہے۔"

"وہ اس فطرت کا آدمی ہی نہیں ہے۔" زاہد بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہتر ہوگا کہ تم اس کا ہاتھ تلاش کرنے کے بجائے بم تلاش کرو۔"

زاہد بھائی کہتے ہوئے کمرے سے نکلے اور گیٹ کیپر کو طلب کر لیا۔ وہ پرانا آدمی تھا اور اپنا کام اچھی طرح کرتا تھا۔ زاہد بھائی نے اس سے پوچھا کہ مذکورہ تاریخ کو رات آٹھ بجے کے بعد یہاں کیا آیا تھا۔ گیٹ کیپر نے وہی جواب دیا کہ اس وقت یہاں دو الگ الگ جگہوں سے آیا ہوا مال اتر رہا تھا۔ اس نے گیٹ انٹری کا وقت بتایا۔ یہ خاصے مختلف تھے اور ان کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ زاہد بھائی نے گیٹ کیپر سے پوچھا کہ اس وقت کوئی کام چل رہا

ہے۔ مگر اتفاق سے گودام کے اندر اس وقت کوئی کام نہیں تھا اور ورکر جو ڈیوٹی پر تھے، وہ باہر شیڈ تلے رکھی بینچوں پر لیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گیٹ کیپر سے کہا کہ فی الحال کوئی بھی گودام کی طرف نہ جائے اور گیٹ بند کر دیا جائے۔

گیٹ کیپر نے ایسا ہی کیا۔ وہ واپس آیا تو راحیل الجھا ہوا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی معاونت کے لیے دونوں آپریٹرز کو بھی بلوا لیا تھا۔ عام طور سے ایک وقت میں ایک آپریٹر ہوتا تھا مگر کیونکہ راحیل، زاہد بھائی کو اپنی کارکردگی دکھانا چاہتا تھا اس لیے اس نے دونوں کو بلوا لیا۔

زاہد بھائی نے راحیل کو گھورا۔ ''انہیں کیوں بلوایا ہے؟''

''سر میں نے سوچا کہ شاید ان کو سمجھ آجائے۔''

''ان کو کیوں سمجھ میں آجائے، کیا انہوں نے یہ سوفٹ ویئر بنایا ہے۔'' وہ گرج کر بولے اور آپریٹرز کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں منہ کیا دیکھ رہے ہو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

وہ دونوں فوراً کمرے سے نکل گئے۔ زاہد بھائی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ انہوں نے موبائل نکال کر وہی نمبر ملایا جس سے کال آئی تھی۔ خلافِ توقع اس پر بیل جا رہی تھی اور کال ریسیو بھی کر لی گئی۔ ''بولو کیا بات ہے، تم نے اشارہ سمجھ لیا۔''

''نہیں، وہ کوشش کر رہا ہے۔'' زاہد بھائی نرمی سے بولے۔ ''ممکن ہے وہ حل کر لے لیکن ممکن ہے نہ کر سکے تو اس صورت میں میرا بہت بڑا نقصان ہوگا جبکہ اس سارے معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق کیوں نہیں ہے، تم نے اسے جاب دی اور اگر یہ آن جاب کسی کرمنل ایکٹی ویٹی میں ملوث ہے تو اس کا خمیازہ تمہیں بھی بھگتنا پڑے گا۔''

''میری کمپنی میں چار سو کے قریب افراد کام کرتے ہیں، میں ان کے کیے کا ذمے دار نہیں ہوں۔''

''درست کہا لیکن اس کیے کے ذمے دار ضرور ہو جس میں تمہاری رضامندی شامل ہو۔ اس سوفٹ ویئر کے معاملے میں کیا تمہاری رضامندی شامل نہیں تھی۔ تم نے صرف اس کی بات سن کر فیصلہ دے دیا کہ سوفٹ ویئر کا خالق یہ ہے تو تم کس طرح خود کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہو۔ تم نے انصاف سے ہٹ کر اس کی حمایت کی اس لیے اب کوئی سزا ہے تو اس میں تم بھی شامل ہو گے۔''

''خدا کے لیے۔'' زاہد بھائی کی آواز لرزنے لگی۔ ''اس وقت گودام میں کروڑوں سے اوپر کا مال ہے، میں برباد ہو جاؤں گا۔''

''تم اربوں کی آسامی ہو۔'' آدمی نے ہنس کر کہا۔ ''کروڑوں کے نقصان سے یقیناً برباد نہیں ہو گے۔''

''سنو میں تم کو دس کروڑ دوں گا۔''

''دس کروڑ۔'' راحیل اچھل پڑا مگر دوسری طرف موجود آدمی نے قہقہہ لگایا۔

''زاہد بھائی تم نے میری بہت کم قیمت لگائی ہے۔''

''تب تم جو کہو، میں پچیس کروڑ تک دے سکتا ہوں۔''

اگر اس آفر میں راحیل کا ذرا بھی شیئر ہوتا تو اسے شاید ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ کم سے کم اس کی حالت سے یہی لگ رہا تھا۔ اس بار آدمی سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ یہ صاف گیم ہے تم اپنا سب کچھ بچا لو گے یا سب گنوا دو گے اور دونوں صورتوں میں ذمے دار صرف ایک شخص ہو گا جو تمہارے پاس موجود ہے۔''

آدمی نے کال کاٹ دی اور زاہد بھائی نے عجلت میں دوبارہ نمبر ملایا مگر اس بار نمبر بند گیا۔ انہوں نے خونخوار نظروں سے راحیل کی طرف دیکھا جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ سوفٹ ویئر تمہارا بنایا ہوا نہیں ہے۔''

''آپ میری کسی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔'' راحیل نے چالاکی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں یہ اکیلے میرا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں احمر کا بھی حصہ ہے لیکن اس کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ وہ اسے اکیلا آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔''

''اس لیے تم نے اس سے پہلے یہ کام کر دیا۔'' زاہد بھائی بولے اور میز پر مکا مارا۔ ''زندگی میں کبھی آدمی پرکھنے میں مجھ سے اتنی بڑی بھول نہیں ہوئی۔''

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ جب دس منٹ رہ گئے تو انہوں نے فائر بریگیڈ کو کال کرنے کا سوچا اگرچہ اس کا فائدہ نہیں تھا۔ انہوں نے موبائل اٹھایا تھا کہ اس کی بیل بجی۔ اسی نمبر سے ایک بار پھر کال آرہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اشارے سے راحیل سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے جا کر فائر بریگیڈ کو کال کرے۔ وہ چلا گیا اور زاہد بھائی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں نے ہار مان لی۔''

''شاید تم فائر بریگیڈ کو کال کر دو مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر میں نے سچ مچ بم رکھا ہوتا تو اس کے آنے سے پہلے آگ بے قابو ہو چکی ہوتی۔''

زاہد بھائی اچھل پڑے۔ ''بم نہیں ہے، اس کا مطلب ہے تم بلف کر رہے تھے۔ وہ سارے اشارے بوگس تھے۔''

''صرف بم نہیں ہے ورنہ چیز بھی ہے اور اشارے بھی درست ہیں۔'' آدمی نے کہا۔ ''اب پہلا اشارہ سمجھو۔ جس چیز میں بم ہے۔ وہ آنی تھی چودہ فروری کے دن لیکن وہ جائے گی چھبیس فروری کی رات دس بجے۔ یہ ایک مشین ہے جس کی ڈیلیوری ایک مقامی فیکٹری میں کی جانی ہے۔ اور دوسرا اشارہ اس کی جی پی ایس لوکیشن ہے اور یہ اس لوکیشن کے آخری چار نمبر ہیں۔ کسی بھی گودام میں اب ان چیزوں کی مدد سے بھی لوکیشن نکالی جاتی ہے اور یہ کام سوفٹ ویئر کی مدد سے ہوتا ہے۔ اگر راحیل کو اسے استعمال کرنا آتا ہوتا تو وہ نہایت آسانی سے بتا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے تمہارا شبہ رخصت ہو گیا ہوگا مگر اب بھی باقی ہے تو تم اس لوکیشن پر موجود مشین تک جا کر اس پر لکھا ہوا یہی نمبر دیکھ سکتے ہو۔''

زاہد بھائی عجلت میں باہر کی طرف لپکے کہ راحیل کو کال کرنے سے منع کر سکیں مگر راحیل وہاں تھا ہی نہیں، آپریٹرز نے بتایا کہ وہ کمرے سے نکلا اور پھر باہر چلا گیا۔ جب تک زاہد بھائی نے گیٹ کیپر کو کال کی وہ بائیک لے کر نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے گودام کے انچارج اور گیٹ کیپر کو طلب کیا اور اس مشین تک آئے، اسے کھلوا کر دیکھا اور اس پر واقعی وہی نمبر لکھا ہوا تھا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے اسی وقت پولیس کو کال کی اور کہا کہ ان کا ایک ملازم کئی لاکھ روپے غبن کر کے بھاگ گیا ہے، وہ اس کے خلاف رپورٹ لکھوانا چاہتے ہیں۔ چند منٹ بعد ان کے موبائل کی بیل بجی اور اسی نمبر سے کال تھی انہوں نے کال ریسیو کی۔ کیونکہ وہ نقصان سے بچ گئے تھے اس لیے ان کا لہجہ بدل گیا۔

''اب کس لیے کال کی ہے؟''

''دو باتوں کے لیے، اول یہ کہ راحیل کو اس کے کیے کی سزا مل گئی ہے مگر تم ابھی باقی ہو اور سزا کا انتظار کرو۔ دوسرے راحیل نے اپنا جو پتا کمپنی میں لکھوایا ہے، وہ غلط ہے اس کا درست پتا نوٹ کر لو۔''

☆☆☆
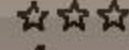
راحیل باہر نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ یہی وقت ہے یہاں سے بھاگ نکلنے کا ورنہ پھر اسے موقع نہیں ملے گا اور زاہد بھائی اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اس لیے وہ باہر آیا اور فائر بریگیڈ کو کال کرنے کے بجائے باہر کی طرف لپکا اور بائیک لے کر گیٹ سے نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے سکون کا سانس لیا اور گھر روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے اور اس کی حرکتوں کی وجہ سے بہن بھائیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ بہ مشکل یہ بھائی اسے رکھنے پر آمادہ ہوا تھا۔ چند گھنٹے پہلے تک وہ اس عزم پر قائم تھا کہ جیسے ہی اسے ایگزیکٹو پوسٹ ملے گی اور تنخواہ اس قابل ہو گی کہ کسی اچھی جگہ رہائش اختیار کر سکے وہ بھائی کے گھر سے نکل جائے گا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ایک بار دوست ہاتھ آ گئی تو وہ کسی رشتے دار کو منہ نہیں لگائے گا۔

اسے بھائی کے خستہ حال گھر سے نفرت ہو گئی تھی جو ایک کچی اور مشکوک سمجھی جانے والی آبادی میں تھا۔ مگر اس وقت وہی گھر اسے اپنی پناہ گاہ لگ رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ٹریڈرز میں اس نے جو پتا دیا تھا، وہ اس کچی آبادی کے نزدیک ہی ایک پوش سوسائٹی کا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اگر زاہد بھائی نے پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ بھی لکھوائی تو پولیس اس کے گھر تک نہیں آ سکے گی۔ وہ نائٹ شفٹ کا کہہ کر آیا تھا اس لیے جب خلاف توقع گھر پہنچا تو نیند سے اٹھ کر آنے والے بھائی نے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیسے آ گیا۔ اس نے بہانہ کیا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے چھٹی کر کے آ گیا۔ وہ اوپر والی منزل میں ایک کھولی نما کمرے میں رہتا تھا۔ وہ زیر لب گالیاں دیتا ہوا اوپر آیا اور کھینچ کھینچ کر کوٹ اتارنے لگا۔ کوٹ اور ٹائی اتار کر پھینکی اور پھر جوتوں سمیت میلے بستر پر دراز ہو گیا۔

وہ اندر پر دانت پیس رہا تھا اور دل ہی دل میں قسمیں کھا رہا تھا کہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ یہ سب اسی کی سازش تھی۔ اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ بستر پر مکے مارنے لگا۔ اس حالت میں نیند تو نہیں آئی لیکن رفتہ رفتہ اس کا غصہ سرد ہو گیا تھا۔ اچانک نیچے کسی نے دروازہ توڑنے کے انداز میں بجایا اور جب تک وہ اتر کر نیچے آتا پولیس والے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی دو سپاہی چیل کی طرح لپکے اور دبوچ کر بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ وہ چلا رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ مگر پولیس والے ذرا جو متاثر ہوئے ہوں۔ بھائی اور اس کے بیوی بچے ایک طرف کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ بیوی اس کے بھائی سے کہہ رہی تھی۔ ''مجھے معلوم تھا اس گھر میں ایک دن یہی تماشا ہوگا۔''

راحیل کی مرمت کے دوران میں ہی باقی ماندہ پولیس پارٹی نے تلاشی کے نام پر پورا گھر الٹ پلٹ کر رکھ دیا مگر بیا نے راحیل نے رقم گھر میں نہیں رکھی تھی۔ رقم ملنے میں ناکامی کے بعد پولیس نے اسے موبائل میں ڈالا اور اپنے ساتھ لے گئے۔

☆☆☆

احمر دم بہ خود سا سن رہا تھا۔ اس نے ماماجی کی ہدایت پر زاہد بھائی کی تصویر کے ساتھ ایک مشین گن والا ہاتھ بنایا تھا اور پھر زاہد بھائی کے ماتھے سے خون بہتا ہوا دکھایا تھا۔ یہ تصویر چند منٹ پہلے ماماجی نے اپنے موبائل سے ای میل کی اور اب زاہد بھائی سے بات کر رہا تھا اور اس کے موبائل میں وائس چینجر بھی تھا اور وہ آواز تبدیل کر کے بات کر رہا تھا۔ جب اس نے زاہد بھائی کو بتایا کہ مشین میں بم نہیں ہے تو وہ بھی دنگ رہ گیا تھا کیونکہ اب تک وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ مشین میں بم ہے جو مقررہ وقت پر پھٹ جائے گا۔ زاہد بھائی سے بات کر کے ماماجی نے کال ختم کی تو اس نے شکوہ کیا۔ ”آپ نے مجھے اصل بات نہیں بتائی۔“

”کیونکہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم آخر تک حوصلہ دکھاتے ہو یا نہیں۔“ ماماجی نے سگریٹ سلگائی۔ احمر نے سکون کا سانس لیا۔

”شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اب میں یہ بات خوف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرے خیال میں انسان کو ہر حالت میں قانون شکنی سے گریز کرنا چاہیے۔“

”اچھا خیال ہے۔“ ماماجی بولا۔ زیبا ان کے ساتھ نہیں تھی کیونکہ وہ رات نو بجے کے بعد ہاسٹل سے باہر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت گودام سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی میں موجود تھے۔ اس دوران میں راحیل بائیک پر ان کے سامنے سے گزر گیا تھا۔ ماماجی نے کہا۔ ”تین گھنٹے سے بھی پہلے یہ حوالات میں ہوگا۔“

”ماماجی آپ یہ سب کیسے کر لیتے ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی سے؟“

”یار عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ کچھ اندر کے بندوں کی مدد حاصل کی اور کچھ خود مغز کھپا کر لیا۔ بس اسی پر گیم کھیلی۔ اصل کھیل وہ ہوتے تھے جس میں ہر لمحہ جان خطرے میں رہتی تھی اور اگلے پل کا پتا نہیں ہوتا تھا۔“ اس نے ختم ہو جانے والی سگریٹ کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے باہر اچھالی اور دوبارہ موبائل اٹھایا۔ ”چلو اب آخری بات کر لی جائے۔“

ماماجی نے زاہد بھائی کو آخری وارننگ دی اور پھر اسے راحیل کا درست پتا نوٹ کرایا۔ پتا احمر نے اس کا تعاقب کر کے حاصل کیا تھا۔ ماماجی نے موبائل بند کر کے سم نکالی اور اسے انگلیوں میں دبا کر توڑ دیا اور اس کے ٹکڑے بھی باہر پھینک دیے۔ احمر نے پوچھا۔ ”سم کی مدد سے ہمارا سراغ نہیں لگایا جا سکتا؟“

”نہیں کیونکہ یہ سم کسی کے نام پر نہیں ہے عرصے سے میرے پاس رکھی تھی اور میں کبھی کبھی استعمال کرتا ہوں اس لیے ایکٹو تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماماجی نے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”کہو تمہارا اور زیبا کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔“

احمر مسکرانے لگا۔ ”آپ انجان نہ بنیں۔ آپ سب جان گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں سب جان گیا ہوں تو یہ بتاؤ کہ اپنی ماں کو کب بھیج رہے ہو رشتے کے لیے؟“

”آنے والے اتوار کو لا رہا ہوں لیکن شادی میں اس وقت کروں گا جب میں بیوی رکھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“

”اس کی تم فکر مت کرو صرف چھ مہینے بعد تم کہیں آگے جا چکے ہوگے۔“ ماماجی نے یقین سے کہا۔

احمر نے ہچکچا کر پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

ماماجی نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم خود دار اب یہ تمہیں سوچنا اور اس پر عمل کرنا ہے کہ نوٹ کیسے کماتے ہیں۔ بس ایک بات یاد رکھنا حرام سے مجھے نفرت ہے اور زیبا بھی اس سے نفرت کرے گی۔“

”حرام سے مجھے بھی نفرت ہے اور آپ بے فکر رہیں، زیبا پر خرچ کیا جانے والا ہر روپیہ میری حق حلال کی کمائی کا ہوگا۔“ احمر نے یقین سے کہا۔

☆☆☆

زاہد بھائی بہت خوش تھے۔ پولیس نے نہ صرف ساڑھے تین لاکھ روپے برآمد کر لیے تھے بلکہ راحیل کے خلاف غبن کا کیس بھی عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔ امکان تھا کہ وہ کم سے کم تین سال کے لیے جیل جائے گا۔ زاہد بھائی نے غبن کی جانے والی رقم کی مالیت پانچ لاکھ لکھوائی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اس چکر میں کوئی سات لاکھ روپے خرچ کیے تھے مگر انہیں اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ دو باتوں سے خوش تھے۔ اول راحیل کو سزا ہو گی اور دوسرے انہیں سوفٹ ویئر مفت میں مل گیا تھا۔ انہوں نے ایک تجربے کار آپریٹر اپائنٹ کیا تھا جس نے چند دن میں سوفٹ ویئر کو مکمل طور پر سمجھ لیا تھا اور اب ان کے آدمیوں کو سکھا رہا تھا۔ اس سوفٹ ویئر کی وجہ ملازمین کی تعداد میں ایک درجن کی کمی ہوئی تھی اور سوا دو لاکھ ماہانہ کی ایک بچت تو سامنے تھی۔ اتنی ملازمین کی تنخواہ بنتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار فوائد تھے۔ وہ دفتر میں اپنے کمرے میں موجود تھے کہ اچانک بنا

اجازت کوئی اندر آیا۔ ایسا صرف ان کی سیکریٹری کر سکتی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو خلافِ توقع سیکریٹری کے بجائے احمر کو کھڑے پایا مگر اس کا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ انہیں ایک لمحے کو شناخت کرنے میں مشکل پیش آئی تھی۔ اس نے اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں قیمتی لیدر بریف کیس تھا۔ بال کسی ہیئر اسٹائلسٹ نے بہترین انداز میں بنائے تھے۔ اسے پہچان کر وہ برہم ہو گئے۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی اندر آنے کی۔" انہوں نے کہتے ہوئے پیون بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ایک منٹ زاہد بھائی۔" احمر نے اطمینان سے کہا۔ "اگر آپ نے یہ بٹن دبا دیا تو اگلی ملاقات کورٹ میں ہوگی۔ دوسری صورت میں آپ متوقع نقصان سے بچ سکتے ہیں۔"

زاہد بھائی کا ہاتھ رک گیا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرا بنایا ہوا انوینٹری سوفٹ ویئر ہے جو بلا اجازت اور چوری کر کے آپ کی کمپنی میں استعمال ہو رہا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ برہمی سے بولے اور پھر بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ثبوت کے ساتھ آیا ہوں۔ کیا فائدہ عدالت میں پیش کیے تو آپ کی جگ ہنسائی ہو جائے گی۔ آپ ہی دیکھ لیں۔" احمر نے کہا۔ "آپ نیک نام آدمی ہیں سالانہ کروڑوں کا ٹیکس ایمان داری سے ادا کرتے ہیں اور ایک سوفٹ ویئر کی چوری کا دھبا آپ کی ساری عمر کی ساکھ ختم کر دے گا۔"

زاہد بھائی کا ہاتھ پھر رک گیا۔ وہ چور تھے اور یہ بات جانتے تھے مگر اوپر سے دم خم برقرار رکھا۔ "کیا ثبوت ہے؟"

"اب کی نا آپ نے کام کی بات۔" احمر چہک کر بولا اور آگے آیا۔ اس نے بریف کیس میز پر رکھا اور اسے کھول کر کچھ نکالنے لگا تو زاہد بھائی ڈر گئے۔ مگر پھر اس کے ہاتھ میں ٹیب دیکھ کر ان کی سانس بحال ہوئی۔ احمر نے ایک ویڈیو چلائی اور اسکرین ان کے سامنے کر دی۔ "یہ ویڈیو ثبوت ہے کہ سوفٹ ویئر میں نے بنایا ہے اس میں آپ کو اس پر کام کرتا دکھائی دے رہا ہوں۔ یہ دیکھیں زین زی ڈی نامی آئی ٹی پروفیشنل اسے لانچ کر رہا ہے۔ میں اس سوفٹ ویئر کے کاپی رائٹ حاصل کر چکا ہوں۔" احمر نے کہا۔ زاہد بھائی ویڈیو دیکھ رہے تھے اور ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ان کی اندرونی حالت اچھی نہیں تھی۔ جب ویڈیو ختم ہوئی تو انہوں نے... مزاحمت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

پھر "ٹھیک ہے یہ تمہارا سوفٹ ویئر ہے لیکن کیا ثبوت ہے کہ میں اسے یہاں استعمال کر رہا ہوں۔"

"اس کے لیے یہ ایک اور ویڈیو ملاحظہ فرمائیں۔" احمر نے ویڈیو چلا کر ٹیب سامنے کیا۔ "یہ آپ کا آفس ہے، دیکھیں آپ کے کمپیوٹر سیکشن میں سوفٹ ویئر استعمال ہو رہا ہے۔ آگے آپ کو گوداموں کے آفسز میں بھی سوفٹ ویئر استعمال ہوتا دکھائی دے گا۔ اس کے بعد آپ کس طرح انکار کریں گے کہ آپ اسے استعمال نہیں کر رہے ہیں؟"

ویڈیو ختم ہوتے ہوتے زاہد بھائی کے شانے ڈھلک گئے۔ انہوں نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بولے۔ "تمہارا کیا خیال ہے تم عدالت سے اپنا حق لے لو گے؟"

"آپ نے ٹھیک کہا، یہ ایک مشکل کام ہے۔" احمر نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو آدمی کو بعض اوقات انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑتی ہیں اور ان ٹیڑھی انگلیوں کا آپ کو کچھ عرصے پہلے تجربہ ہو چکا ہے۔"

"تت... تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"زاہد بھائی لازمی نہیں ہے کہ اگلی بار بلف کیا جائے۔" احمر نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ضروری نہیں ہے کہ آدمی جرائم پیشہ ہو، بہت کچھ انسان کو اپنے حق کے لیے بھی کرنا پڑتا ہے۔"

احمر نے ٹیب آف کر کے اسے واپس بریف کیس میں رکھا تو زاہد بھائی نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں نے اس سوفٹ ویئر کے انٹرپرائز ایڈیشن کی قیمت پچیس لاکھ رکھی ہے اور اس کی سالانہ سروس فیس دس لاکھ روپے ہوگی۔ کسی بھی اپ ڈیٹ کی رقم سے ادائیگی کرنا ہوگا۔ مگر آپ خریدیں گے تو پہلی ادائیگی پچیس لاکھ کی ہوگی۔"

"اور اگر میں نہ خریدنا چاہوں تو..."

"تب بھی پائریسی کے جرم میں آپ کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں میرا وکیل آپ سے رابطہ کرے گا۔ اگر آپ بائے کرنا چاہتے تو میری کمپنی میں سیلز ڈیپارٹمنٹ سے کونٹیکٹ کر سکتے ہیں۔" احمر نے کہتے ہوئے اپنا بزنس کارڈ میز پر رکھ دیا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد زاہد بھائی نے کارڈ اٹھایا اور اپنے ذہن میں کچھ حساب کتاب کرنے لگے۔ نفع نقصان کے حساب کے لیے کمپیوٹر ان کے دماغ میں فٹ تھا اور جلد اس کمپیوٹر نے فیصلہ دے دیا کہ سوفٹ ویئر خرید لینا ہی ان کے لیے فائدے مند ہوگا۔ انہوں نے کارڈ دیکھا اور اس پر دیا ہوا نمبر ڈائل کرنے لگے۔